

مؤرخین اسلام

ہماری کتاب خلافت اسلامیہ کا ماخذ مؤرخین اسلام کی مشہور کتابیں ہیں ان میں سے کچھ تو ہم نے اصل اور کچھ تراجم میں مطالعہ کیں۔ کچھ اقتباس ہیں جو ان کتابوں میں جو ہمارے مطالعہ میں رہیں دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ یورپین مورخین کی بہت کتابیں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں ان میں سے "گبن" انگریز مورخ کا حوالہ ہم نے مناسب مقام پر دیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "دمشق" اور "بغداد" میں مورخین اسلام اور ان کی تواریخ کا حوالہ دیا ہے اس لئے ان اوراق میں بار بار حوالہ کی ضرورت نہیں تھی۔

تواریخ کے اصناف بہت سے ہیں۔ ان میں سے "تواریخ عموی" میں مؤلف اپنے زمانہ کے حالات عمومیہ کے علاوہ وہ واقعات بھی قلم بند کرتا ہے جو اس کے اپنے زمانہ سے پیشتر مختلف اقوام اور ممالک میں رونما ہو چکے ہیں۔ اس قسم کی تواریخ "طبری" اور "ابن اثیر کی مشہور ہیں کہ حضرت آدم سے لے کر اپنے زمانہ کے حالات لکھے۔ دوسری قسم "تواریخ خصوصی" کی ہے۔ اس میں مورخ کسی ایک زمانہ یا قوم یا ملک کے حالات بیان کرتا ہے اس قسم کی تاریخ میں "واقدی" کی فتوح الشام وغیرہ داخل ہیں۔ اور ہماری کتاب بغداد اور دمشق بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی قسمیں ہیں جن میں سے "طبقات" ہیں۔ اس میں مورخ کسی ایک طبقہ کے

مشاہیر کا تذکرہ لکھتا ہے ان میں سے ابن صیبعہ کی کتاب "طبقات الاطبا" اور عبداللہ الانباری کی کتاب "طبقات الادبا" اور ابوالقاسم کی کتاب "طبقات الامم" محمد بن سعید (سنہ ۲۳۰ھ) کی طبقات الصحابہ" ابن قیتبہ کی کتاب "طبقات الشعرا" (سنہ ۳۷۶ھ) ہے۔

ایک اور قسم "تراجم احوال" سے موسوم ہے۔ اس میں "وفیات" ابن خلکان داخل ہے۔ ان کے علاوہ وہ کتب بھی جو "مذاہب" کے متعلق لکھی گئی ہیں اس کی ذیل میں کتاب "ملل ونحل" طاہر بغدادی (سنہ ۴۲۹ھ) اور محمد بن الاسفراینی اور قاضی ابوبکر الباقلانی اور ابن حزم الظاہری (سنہ ۴۵۶ھ) اور عبدالکریم شہرستانی (سنہ ۵۴۸ھ) کی مشہور ہیں۔ سیاسیات اور انتظام امور ملکی پر بھی تاریخی کتب میں امام ابویوسف کی "کتاب الخراج" اور ماوردی کی "احکام السلطانیہ" اور خواجہ نظام الملک کا "سیاست نامہ" اور "کتاب الاغانی" ابوالفرج اصفہانی اور "العقد الفرید" ابن عبدربہ کی خاص شہرت رکھتی ہیں۔

ان میں سے بعض مؤرخین کے حالات بالاختصار ہم ذیل میں لکھتے ہیں،

"ابوعبداللہ محمد بن عمر الواقدی"

اس کی کتاب المغازی ہے۔ واقدی سنہ ۱۳۰ھ میں بمقام مدینہ منورہ پیدا ہوا۔ ابتدا میں پیشہ تجارت تھا مگر دستِ سخا آمادہ اتنا تھا کہ اس میں خسارہ کی وجہ سے دست کش ہونا پڑا یحییٰ برمکی کی سخاوت کا شہرہ سنا تو اس سے وابستہ ہوگیا۔ یحییٰ نے اس کو غربی بغداد کے محلہ رصافہ کا جو بجائے خود ایک شہر تھا قاضی مقرر کر دیا واقدی مامون الرشید کے عہد خلافت میں بھی منصب قضا پر متمکن رہا۔ اور ۲۰۷ھ مطابق سنہ ۸۲۳ء رصافہ میں فوت ہوا۔ اس کی زندگی کا شاہکار کتاب المغازی ہے اس میں شام و مصر کی فتوحات مذکور ہیں جو خلافت راشدہ میں مسلمانوں کے ہاتھ پر ہوئیں۔ اس کو شاہنامہ اسلام سمجھنا چاہئیے۔ واقدی کی طرز تحریر اور طبری اور ابن اثیر کی وہی ہے۔ جو کتب احادیث کی ہے۔ عینی شاہد ایک واقعہ بیان کرتا ہے اور جو کچھ عینی شاہد سے ایک شخص سنتا ہے وہ دوسرے سے اور دوسرا تیسرے سے بیان کرتا ہے یہاں تک کہ یہ روایت مؤرخ تک پہنچ جاتی ہے تاریخ نویسی کا یہ

طریقہ امم سامیہ میں شروع سے رائج رہا ہے۔ احادیث کی کتابوں میں ان تمام راویوں کے نام لکھے ہوئے ہیں جنہوں نے اوّل راوی سے سلسلہ وار کوئی حدیث سُنی اور جب اختصار کے لئے کوئی حدیث بیان کی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ فلاں حدیث حسب روائیت ابوہریرہ وغیرہ اسی طرح انجیل کی بھی تدوین ہوئی۔ انجیل حسب روایت مقدس متی کا یہ مفہوم ہے کہ اوّل راوی مقدس متی ہے اس نے خود کچھ نہیں لکھا البتہ جس شخص کو اس کی روایات سلسلہ وار پہنچیں اس نے قلم بند کیں۔ کسی گذشتہ واقعہ کی صحت اس سے بہتر طریقہ سے نہیں ہوسکتی لیکن اتنے راویوں کی روایات میں بہت کچھ ایسی باتوں کا دخل بھی عموماً ہوجاتا ہے کہ واقعہ کی اصلیت کا پتہ نہیں ملتا۔ اسی طرح واقدی اور طبری اور ابن اثیر کی تواریخ کی کیفیت ہے۔ بلاشبہ ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہوگا تحقیق کے بعد ہی لکھا ہوگا۔ مگر جیسا کہ علامہ ابن خلدون نے "مقدمہ" میں واضح کیا ہے خود مؤرخین اور اُن کے راویوں کے عقائد کی رنگ آمیزی کی جھلک ان روایات میں پائی جاتی ہے جو وہ بیان کرتے ہیں تو اس کی صحت مشتبہ ہوجاتی ہے

واقدی کی تاریخ میں اگرچہ افسانوی رنگ ہے مگر یہ پہلی تاریخ ہے جو تاریخ خلافت اسلامیہ ہے اور واقعات جس تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں بعد کے مؤرخین نے استفادہ کیا ہے۔ واقدی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مجاہدین اسلام کی دینی حرارت و غیرت کو ایسے لفظوں میں بیان کرتا ہے کہ اُن ایام کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے مناسب ہے کہ اس کی تاریخ سے بعض واقعات مثلاً محاربہ یرموک اور قادسیہ اور محاصرہ دمشق نصاب تعلیم میں داخل کئے جائیں تاکہ مسلمانوں کی اولاد میں بھی وہ جذبہ پیدا ہو جو خلافت راشدہ کے وقت دلوں میں جوش پر تھا۔

احمد ابن یحییٰ البلاذری یہ مؤرخ ایرانی نژاد تھا۔ خلفاء عباسیہ متوکل اور مستعین کے عہد میں دربار خلافت میں باریابی حاصل کی خلیفہ المعتز باللہ کے بیٹے عبداللہ کا اتالیق مقرر ہوا۔ ان ہی دنوں میں اس نے "فتوح البلدان" لکھی۔ اس نے واقدی کی کتاب المغازی اور ابوالحسن مدائنی سے

استفادہ کیا۔ مدائنی ۱۳۶ھ مطابق ۷۵۳ء مدائن پایہ تخت ساسانی شاہان ایران میں متولد ہوا اور ۸۳۰ء میں فوت ہوا۔

"ابو جعفر بن جریر طبری"

طبرستان یا مازندران میں واقع تھا۔ ۲۲۴ھ میں یہ نامور مورخ اسی مقام میں پیدا ہوا۔ کہتے ہیں کہ ابن جریر نے شاہان ایران کی گذشتہ شان و شوکت اور آتش کدہ شہر آمل کے جواب کھنڈر تھے دیدۂ عبرت سے مطالعہ کیا۔ اور تاریخ نویسی کا شوق پیدا ہوا

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　　آثار پدید است صنادید عجم را

اُس وقت آلِ طاہر کی حکومت خراسان میں تھی۔ بانی طاہر ذو الیمنین ماموں الرشید کا فوجی اعلیٰ افسر تھا۔ جب ہارون الرشید کے دونوں بیٹوں ماموں اور امین میں جنگ چھڑ گئی تو یہی طاہر تھا جس نے امین کو بغداد میں محاصرہ میں لے کر قتل کیا۔ طبری کا لڑکپن آلِ طاہر کے زیر سایہ بسر ہوا۔ ہوش سنبھالی تو شام اور مصر کا سفر اختیار کیا۔ علماء و فضلاء کے حلقہ درس میں ایک مدت رہا۔ حافظ قرآن تھا اور علم حدیث، قرات اور تفسیر میں وہ نام پیدا کیا کہ اس کی شہرت میں آج بھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ خونی واقعات جو اُس نے بغداد میں رہتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے تاریخ نویسی کے اور زیادہ محرک ہوئے جس کا شوق لڑکپن میں پیدا ہو چکا تھا۔ "تاریخ الامم و الملوک" لکھی۔ طبری مورخ اور مفسر قرآن و معلم حدیث سب کچھ تھا۔ "امام ابن حنبل" کا مرتبہ فقہ میں بہت بلند ہے طبری شافعی تھا جہاں مسالک مجتہدین پر بحث کرتا ہے امام احمد بن حنبل کی نسبت لکھتا ہے کہ فقیہ تو نہ تھا۔ محدث تھا۔ اس لئے حنبلیوں نے اس کو ہدف طعن و تشنیع بنایا اور "رفض" سے متہم کیا۔ ابن جریر اگرچہ مذہباً شافعی تھا۔ مگر خود بھی مجتہد رہا۔ ابن خلکان "وفیات" میں ابن جریر کے حال میں لکھتا ہے کہ اس کو کئی علوم میں دسترس تھی۔ کبھی کبھی شعر و شاعری سے دل بہلاتا۔

اگرچہ بغداد کی شان و شوکت اور خوشحالی کا دور ماموں رشید پر ختم ہو چکا

لیکن المعتمد اور المعتضد اور المکتفی کا عہد خلافت بھی امن سے گزر گیا مصر مرکز خلافت سے جدا ہو چکا تھا۔ بہر حال اس دورِ خلافت میں طبری کے دن بھی امن سے گزرے اُس نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خلافت عباسیہ کو سرعت کے ساتھ پستی کی طرف گرتے دیکھا۔ قرامطہ نے اسلامی شہروں میں جو شورش برپا رکھی وہ بھی دیکھی آخر ۳۱۰ھ مطابق ۹۳۲ء بغداد میں فوت ہوا اور یہیں مدفون ہوا۔ اور اپنے پیچھے غیر فانی یادگار "تاریخ الامم والملوک" اور تفسیر چھوڑ گیا۔ تاریخ میں طبری نے حضرت آدم سے لے کر ۳۰۲ھ تک یعنی اپنی وفات سے آٹھ سال پیشتر کے حالات لکھے ہیں اس نے جو کچھ سنا یا جو کچھ پڑھا نقل کر دیا۔ آپ ہی لکھتا ہے کہ جو کچھ راوی نے کہا نقل کر دیا۔ دروغ برگردنِ راوی۔ اس تاریخ کا خلاصہ ابو علی محمد البلعمی نے فارسی میں لکھا۔ یونانیوں کے خرافات اور نجوم و ہیئت اور مجوسی روایات کو اگر نظر انداز کر دیا جائے اور صرف طبری کے اپنے زمانہ کے حالات کو دیکھا جائے تو تاریخ میں طبری بقول ابن خلکان کسی مورخ سے کم نہیں۔ اور متقدمین میں تو اس کا پایہ بہت بلند ہے۔ یورپ کی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے ان میں سے "گوئز" (Goeje) اور "نولڈ کی" (Noldeke) کے ترجمے مشہور ہیں۔

"ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری"

دینور ہمدان میں جو ایک بڑا شہر تھا۔ اب کھنڈر ہی باقی ہیں یہاں یہ مورخ شروع تیسری صدی ہجری میں متولد ہوا تاریخ اور علم ریاضی و طبعی میں کافی دسترس تھی۔ ان ایام میں ابن سکیت کی شہرت لغت اور ادب میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی شاگردی اختیار کی۔ ابن سکیت سخت متعصب شیعہ تھا۔ اور اسی قدر خلیفہ متوکل کو آل علیؑ سے خصومت تھی۔ بلحاظ علم و عمل متوکل نے اپنے بیٹوں کا استاد مقرر کیا۔ ایک روز پوچھا کہ "میرے بیٹے تجھے محبوب تر ہیں یا حسن حسین" جواب دیا کہ "حد نسبت خاک را با عالم پاک" ان سے محبوب تر حسن حسین کا غلام قنبر ہے"! متوکل نے زبان کاٹ دی اور ۲۴۴ھ میں قتل کیا جس کا استاد ایسا ہو شاگرد کیسا ہو گا۔ اس میں کلام

نہیں کہ دینوری بہت بڑا عالم تھا۔ ریاضی میں کتاب "فی الجبر والمقابلہ" اور کتاب "فی الحساب" لکھی۔ ہیئت میں زیج ابی حنیفہ کا ذکر کاتب چلپی "کشف الظنون" میں کرتا ہے۔ تاریخ میں اس کی کتاب "الاخبار الطوال" ہے جس کی تعریف و توصیف مسعودی بھی کرتا ہے صاحب کشف الظنون بحوالہ مسعودی لکھتا ہے کہ تاریخ دینوری ابن قتیبہ کی تاریخ کی بنیاد ہے۔ اس نے اپنی تاریخ میں خلافت راشدہ کے تحت فتوحات مجاہدین اور کش مکش حضرت علی اور امیر معاویہ اور حوادث خوارج اور خلافت امویہ اور ظہور مختار اور اموی خلافت کے زوال اور خراسان میں علوی شورش کا مفصل ذکر کیا ہے اس کی تاریخ میں جو بات خاص ہے وہ خوارج کے حالات کی تفصیل ہے اگرچہ "قلم در کف دشمن است" مگر یہ دینوری کے حق میں کہنا پڑتا ہے کہ اس نے مورخ کی حیثیت برقرار رکھنے میں سعی بلیغ کی ہے۔

"ابو محمد عبداللہ بن قتیبہ الدینوری"

ابو حنیفہ اور ابن قتیبہ ہم عصر تھے ۲۱۳ھ میں بغداد میں ولادت ہوئی۔ ابن قتیبہ کو لغت و نحو و تفسیر و حدیث میں بھی شہرت حاصل ہے۔ دینور میں قاضی تھا۔ مگر درس و تدریس اور تالیف میں زیادہ وقت صرف کرتا۔ اس کا شمار آئمہ لغت میں ہوتا ہے آخر عہدہ قضا سے دست کش ہو کر بغداد میں آیا اور وہیں تدریس و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ابن خلکان نے اس کی تالیف میں "غریب القرآن" "غریب الحدیث" "عیون الاخبار" "ادب الکاتب" "مشکل القرآن" "مشکل الحدیث" "طبقات الشعراء" "کتاب الخیل" "کتاب دلائل النبوۃ" "جامع النحو الکبیر" "کتاب المعارف" وغیرہم شمار کی ہیں۔ آخر الذکر "کتاب المعارف" کی خوبی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ مسعودی اور ابن جریر جیسے بلند پایہ مورخین نے اسے اپنی تواریخ کا ماخذ قرار دیا ہے۔ ابن قتیبہ اپنے ہمعصر ابن داؤد دینوری سے چھ سال پہلے ۲۷۶ھ میں فوت ہوا۔ ابن قتیبہ کی کتاب المعارف اور اخبار الطوال کی نسبت یہ کہنا چاہیئے کہ ایک ہی زمانہ کی دو مختصر تاریخیں تھیں۔ لیکن دونوں مورخوں کے عقائد کی جھلک ان کی تاریخوں میں نظر آتی ہے۔ بحیاء الدلائل ان

میں تو تاریخ ایران کو اہمیت دی گئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ واقعات جو اسلامی خلافت کے دور میں ایران میں رونما ہوئے ان کی تفصیل بھی ایرانی نقطہ نگاہ سے کی گئی ہے۔ لیکن کتاب المعارف میں تاریخ عرب سے ہی سروکار ہے۔ اور ایرانیوں کے حالات مختصر بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں اسلام سے پیشتر اور ظہور اسلام کے بعد تاریخ عرب پہلی اور دوسری صدی ہجری میں نمایاں نظر آتی ہے یہ کتاب مصر میں چھپ چکی ہے۔

ابوبکر محمد بن یحییٰ الصولی

چوتھی صدی ہجری میں تین شخصیتوں نے خاص شہرت حاصل کی جو آج بھی قائم ہے۔ ان میں سے ایک ابو نصر فارابی فلسفہ و حکمت اور فنون لطیفہ عروض و موسیقی میں اور دوسرا امیر ابو نصر بن علی بن عراق ریاضی اور ہیئت میں اور تیسرا ابوبکر الصولی ادبیات اور تاریخ میں دنیائے اسلام میں مشہور ہوئے صولی نے ادبیاتِ عرب اور تاریخ خلافت عباسیہ مفصل لکھی ہے۔

صولی کے اجداد میں ایک شخص "صول تکین" نامی گذرا ہے اور "جرجان" کے اُمراء میں سے تھا۔ اس کا مذہب بھی گبری آتش پرستی تھا۔ پہلی صدی ہجری کے آخر میں "امیر مہلب" کی اولاد جو "آلِ مہلب" اور "مہلبی" کہلائی اور جس کو خلافتِ امویہ میں وہی حشمت اور قدر و منزلت حاصل تھی جو آل برامکہ کو خلافتِ عباسیہ میں تھی سلیمان بن عبد الملک کے عہدِ خلافت میں طبرستان اور دہستان اور جرجان اور گرد و نواح کو تسخیر کرنے کے بعد ان ممالک پر چھا گئی۔ ترکوں نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ اکثر مارے گئے آل مہلب میں سے یزید ان ممالک پر عامل تھا۔ "صول تکین" نے اسلام قبول کر لیا۔ یزید بن مہلب نے اس کو اپنا ندیم بنا لیا۔ تا عہدِ خلافت عمر بن عبد العزیز یزید کی مصاحبت میں رہا۔ یزید بن مہلب اپنی خود مختار حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت اموی خلافت کا ستارۂ اقبال اوج پر تھا۔ گرفتار ہو کر قید ہوا۔ یزید بن عبد الملک تختِ خلافت پر بیٹھا۔ تو یہ قید خانہ سے بھاگ کر بصرہ میں آیا اور بنو ہاشم سے ساز باز کے بعد ماوراء النہر اور خراسان میں ہڑبونگ مچا دی۔ "صول تکین" اس کا ندیم ساتھ تھا اگرچہ بڑی جمعیت بہم پہنچائی مگر آخر شکست خوردہ گوشہ گمنامی میں رہ گئے۔

خلافت عباسیہ کے دَورِ دورہ میں صولی تکین کی اولاد نے علم و ادب پر توجہ مبذول کی۔ ابوبکر صولی دربارِ خلافت میں بھی پہنچا۔ خوش سخن۔ مجلس آرا اور ادبیات و تاریخ عرب سے خوب واقف تھا۔ شطرنج کا کھلاڑی خوب اعلیٰ پایہ کا تھا۔ اور اسی وجہ سے خلیفہ المتکفی کا ندیم بن گیا۔ المقتدر باللہ نے اُسے اپنے بیٹے ابوالعباس کو اس کی شاگردی میں دے دیا۔ المقتدر باللہ کے عہدِ خلافت کے حالات دیکھ رہا تھا کہ امورِ دولت تو عورتوں اور بداخلاق لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔ اور خلیفہ کے محل سے طاؤس و رباب کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ مشرق میں سامانی اور کوفہ و نجد و بحرین میں قرامطہ اور دیلم اور طبرستان میں المرزشی خلافتِ عباسیہ کی بیخ کنی کر رہے تھے۔ دیارِ مغرب (افریقہ) میں ابوعبداللہ اور بنی اغلب نے مستقل حکومت قائم کر لی اور عبیداللہ المہدی کو تختِ خلافت پر بٹھا دیا۔ المہدی حضرت امام جعفر صادق کے بڑے بیٹے اسمٰعیل کی اولاد سے تھا۔ ایشیا میں خلافت عباسی رو بزوال تھی۔ افریقہ میں خلافتِ علوی یا بنو فاطمہ عروج پر تھی۔ صولی نے یہ سب واقعات مشاہدہ کئے۔ ان ایام میں مسلمانوں میں فرقہ بندی اور شرانگیز تفرقہ کا بھی زور تھا۔ خلفاء کی دنیوی اور دینی حکومت دونوں رنگ لا رہی تھیں۔ حنبلی تو مزے میں تھے۔ معتزلہ اور دیگر فرقوں کے مذہبی مجادلہ کی کیفیت بھی صولی کی نظر سے پوشیدہ نہ تھی۔ ابن مقلہ جس نے عربی خطِ کوفی کو نسخ میں بدل دیا سیاسی شعبدہ باز تھا۔

ان ہی ایام میں شلمغانی نے عقائد حلول و تناسخ شائع کئے اور حنبلیوں کا عقیدہ تھا کہ خدا زمین پر نازل ہوتا ہے۔ غرض نہ دنیا کی وجاہت رہی اور نہ دینی شہامت اخشیدی مصر میں، بنی حمدان دیار بکر اور موصل میں قرمطی بحرین و یمامہ میں ابن رائق۔ بصرہ میں ابن بریدی۔ اہواز میں آل بویہ، فارس میں محمد بن الیاس کرمان میں مستقل حکمران اور برائے نام نائب الخلافت تھے۔ صولی نے یہ سب کچھ دیکھا اور قلم بند کیا۔ اگرچہ الراضی باللہ کے عہد میں صولی زندگی امن و خوشحالی سے بسر کر رہا تھا۔ اور خلیفہ نے بھی حتی الوسع تمام فسق و فجور کے آلات کو توڑ ڈالا۔ علم و

ادب کی محفل گرم ہونے لگی۔ فوج کی از سرِ نو تنظیم کی۔ لیکن جیسا راجہ ویسی پرجا۔ متقدم خلفا نے عوام کالانعام کو بھی عیش پرست بنا رکھا تھا۔ پانی سر سے گذر چکا تھا۔ اس لئے الراضی کی اصلاحات سے بھی کام نہ چلا۔ راضی کے بعد المتقی خلیفہ ہوا تو والیٔ بصرہ ابن بریدی نے دارالخلافت اور خلافت دونوں کو اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ خلیفہ نے بھاگ کر موصل میں ناصر الدولہ شہزادہ آل حمدان کے پاس پناہ لی یہ طوفانِ بے تمیزی برپا ہوتے دیکھ کر صولی نے خیر اسی میں دیکھی کہ مبادا جو ابن مقلہ کا حشر ہوا کہ فقر و فلاکت میں دست و زباں بریدہ ہوگیا۔ وہی اس کے بھی پیش آئے۔ بصرہ میں بھاگ کر گوشۂ گمنامی میں زندگی کے دن کاٹے اور ۳۳۵ھ مطابق ۹۴۶ء میں فوت ہوا۔

ابوالحسن علی بن حسین بن علی المسعودی

جب مسلمانوں میں خلافت اپنی پوری شان میں جلوہ گر تھی۔ علم و حکمت کا گھر گھر چرچا تھا۔ سیاح بھی اکثر پیدا ہوئے۔ اُن میں سے مشہور مسعودی اور ابن جبیر اور ابن بطوطہ ہیں۔ ابن جبیر متوفی ۶۱۴ھ) اور ابن بطوطہ ولادت ۷۰۳ھ) کا تذکرہ ہم نے "بغداد" میں لکھا ہے۔ ان میں مسعودی تیسری صدی ہجری میں بغداد میں تولد ہوا اور ۳۴۶ھ میں مصر کہنہ جس کو "فسطاط" کہتے ہیں فوت ہوا۔ یہ سیاح ۳۰۳ھ میں جب کہ اس کا عالم شباب تھا۔ بغداد سے نکلا۔ تین سال کے بعد ہم اُسے ہندوستان میں دیکھتے ہیں۔ ایک عرصہ تک یہاں پھرتا رہا۔ ۳۰۴ھ میں جزیرہ سیلون میں آیا اور یہاں سے جزیرہ "کمبالو" میں جسے اب "مڈغاسکر" کہتے ہیں اور "زنگبار" سے عمان اور شام اور مصر اور دیار مغرب اور اندلس میں وارد ہوا۔ مسعودی کی کتاب "مروج الذہب" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سواحل چین تک بھی گیا۔ اور ایسے ایسے مقامات سے اس کا گذر ہوا جہاں اب تک مسلمانوں کا قدم تک نہیں گیا تھا۔ اس طرف اسلام کی رہنائی اسی نے کی۔ اس نے اپنی عمر کا اکثر حصہ اور بہترین حصہ سیاحت میں صرف کیا اور شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھرتا رہا۔ اور ان مقامات کے تاریخی حالات

اور جغرافیائی خصوصیات کو ناقدانہ نظر سے دیکھتا رہا۔ مسعودی کو تاریخ گذشتہ اور
جغرافیہ اور فقہ اور طب پر پورا عبور تھا۔ "کشف الظنون" میں اس کی تصنیفات
میں سے زیادہ نام بنام درج ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ سیر و سیاحت کے علاوہ مسعودی
کو وقت فرصت کون سا ملتا ہوگا کہ تصنیف و تالیف کثیر میں صرف کیا۔ افسوس کہ یہ
علمی خزانہ جو مسعودی نے چھوڑا یا تو دست برد زمانہ کی نذر ہوگیا یا کسی خزانہ میں
مدفون ہے۔ صرف دو کتابیں "مروج الذہب" اور "کتاب التنبیہ" یادگار باقی رہ گئیں۔
"کتاب اخبار الزمان" جرمن کے ایک مستشرق روداگیر (Ro daegner) کی رائے ہے
کہ وہی ہے جو ۱۸۴۹ء میں ودکرمرد (Dekhremer) کے ہاتھ لگی۔ لیکن یہ
اس ضخیم کتاب کی جلد اول ہی ہے۔ مسعودی کی آخری کتاب "التنبیہ" ہے جو ۳۴۴ھ
مطابق ۹۵۵ء شہر فسطاط میں لکھی۔ اصل اور ترجمہ یورپ (لیدن) میں شائع ہو
چکا ہے۔ اس کتاب کا خلاصہ مسعودی کی کتاب "کتاب الاوسط" ہے اور اسی کا خلاصہ
دو جلدوں میں "مروج الذہب" ہے۔ روایت یہ ہے کہ مسعودی نے خود یہ خلاصہ لکھا
جلد اول میں اُن اقوام اور ان کے حالات کا تذکرہ ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھیں
دوسری جلد میں عہد رسالت سے خلافت المطیع اللہ عباسی کا تذکرہ ہے۔ علماء مغرب
اہل یورپ کی علم دوستی نے مسعودی کا نام زندہ رکھا۔ اور اس کی کتاب کا ترجمہ
اپنی زبانوں میں کیا۔ ۱۳۰۳ھ میں مطبع ازہریہ مصر نے شائع کی۔ مسعودی اور ابن جریر
آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ابن جریر فقیہہ متبحر اور محدث تھا۔ اس لئے تاریخ میں احادیث
سے سند لیتا ہے۔ مسعودی کے معلومات کا دائرہ وسیع تر ہے۔ وہ ہر ایک مذہب و ملت
کے علماء سے ملتا ہے۔ اور جو کچھ تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے قلم بند کرتا ہے اپنے معاصر
مسیحی علماء سے ملتا رہا۔ فلسفہ یونان قدیم اور ہند کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ علماء یہود
صابئی، اور داعیان قرمطی سے بھی اس کی دوستی تھی۔ سکندریہ میں "بطریق" اور "نیکولیس"
و (Eutychius) جو مورخ بھی ہے ملا۔ اور اس کی تاریخ کا بھی مطالعہ کیا۔ مختلف
مذاہب کے علماء و حکماء سے مناظرہ و مباحثہ بھی کرتا ہے۔ "قرامطہ" کو مورخین نے مورد

لعن طعن بنایا مگر مسعودی کہتا کہ ان کو حالات و عقائد کا صحیح علم نہیں۔ ابونصر فارابی چند سال پیشتر فوت ہو چکا تھا۔ اس کی نسبت لکھتا ہے کہ آج اس دانشمند متبحر کا جواب نہیں

ابوالفرج علی بن الحسین الاصفہانی اصفہانی ۲۸۴ھ مطابق ۸۹۷ء اصفہان میں پیدا ہوا۔ خالص عرب اس کا نسب خاندان مروانیہ امویہ سے ملتا ہے۔ اس لئے اہلِ تشیع اس کے مذہب میں جو زیدیہ تھا۔ شک و شبہ کرتے ہیں۔ بہت بے تکلف تھا۔ اگرچہ امراء و وزرا کی مجلس میں اکثر آمد و رفت رہتی۔ مگر آداب مجلس کا کبھی پاس نہ کیا۔ اور وہ بھی برداشت کرتے حلب میں سیف الدولہ کے دربار میں رسائی تھی۔ یہاں اکابر علماء و ادباء کا اجتماع ہو رہا تھا۔ یہاں بھی اس کا احترام ہوتا۔ جب آلِ بویہ جو ایرانی تھے خلافتِ عباسیہ کے سرپرست ہوئے تو ان سے بھی سلسلہ مودت گانٹھا۔ ابو محمد مہلبی وزیر معزالدولہ اس کے علم و فضل کا اتنا گرویدہ تھا کہ جدائی گوارا نہ تھی۔ ۳۵۶ھ مطابق ۹۶۷ء وفات پائی۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ اس یگانہ روزگار اور عالم متبحر کے بعد کوئی شخص اس کا مثل نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی گرد تک نہ پہنچا۔ اگرچہ علم و حدیث و طب و نجوم میں بھی واقف تھا مگر موسیقی اور ادبیات اور تاریخ و سیر میں اس کا جواب نہیں۔ اس کی کتاب "الاغانی" تاریخ ادبیات عرب میں شاہکار تسلیم کیا گیا ہے۔ بادہ نشینوں سے لے کر شہریوں اور خصوصاً امراء وزراء، خلفاء تک وہ باتیں نقل کرتا ہے کہ ہر کتاب تاریخ و سیر میں اس کا نظیر نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کتاب "الاغانی" ایک گراں بہا خزانہ ہے۔ جس میں وہ جواہرات تابناک ہیں کہ ان کی قدر و قیمت سے وہی علماء و حکماء واقف ہیں جو اس سے مستفید ہوتے رہے۔ بہ دائرۃ المعارف نے ۱۲۸۵ھ مطبع بولاق میں بیس جلدوں میں یہ کتاب شائع ہوئی اور برونو (Brannou) نے بیدہ زیب اکیس مجلدات بمقام "لیدن" شائع کیں۔

حمزہ بن حسن الاصفہانی اس کتاب میں خلافتِ امویہ کے تحت ہم نے لکھا ہے کہ یہ خالص عربی حکومت تھی اموی خلافت کے دوسرے دور کے بعد اس حکومت میں یہ قومی تعصب پیدا ہو گیا تھا کہ نجابت اور شرافت صرف

اہلِ عرب کا خاص حصّہ سمجھتے تھے۔ اور ریاست و سیاست ان کا واحد خاص شغل تھا۔ زراعت و صناعت و تجارت و حرفت اور حتیٰ ہے کہ تمام دیگر علوم و فنون کو بطور پیشہ حقیر سمجھتے تھے۔ یہ کام عجمیوں کا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح ہمارے ہندوستان میں ویش اور شودر آریائی عروج کے زمانہ میں تھے۔ یا یونان و روم کی حکومت میں غیر رومی یا غیر یونانیوں کی حالت تھی۔ علامہ ابن خلدون نے اپنے "مقدمہ" میں لکھا ہے کہ "تمام اہلِ علم و قلم عجمی تھے"۔ یہی وجہ ہے کہ ریاست و سیاست سے عربوں کو فرصت نہ ملتی۔ اس طرف توجہ کب ہوتی۔ لیکن وہ علم و ہنر کے قدردان تھے۔ اور اہلِ علم کی حوصلہ افزائی انعام و اکرام سے کرتے رہے۔ اگر یہ کیفیت نہ ہوتی تو ہمارے پاس کوئی شئے قابلِ فخر نہ ہوتی۔

اموی عقیدہ دربارہ فوقیت عرب کا ردِ عمل فرقہ "شعوبیہ" میں ہوا۔ اموی عجمیوں کو "موالی" کہتے۔ غلط فہمی سے یورپ کے مؤرخین لفظ "مولی" کا مفہوم غلام یا آزاد کردہ غلام سمجھتے ہیں جو کسی حد تک یہ صحیح ہے اس لئے اہلِ اسلام نے کبھی غلام ان معنوں میں استعمال نہیں کیا۔ جو یونانی اور رومی لغت میں ہے۔ اہل اسلام "موالی" اُن عجمی مسلمانوں کو کہتے جو یا تو خلافت کی سرپرستی تسلیم کر چکے تھے۔ یا جن سے ان کے مراسم دوستانہ تھے۔ لفظ "ولی" اسی معنی میں قرآن میں استعمال ہوا ہے اور جیسا کہ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ خلافت عرب کے دور دورہ میں شعراء اور حفاظ و منشیان و مفسران و محدثان و فقہا و مؤرخان و علماء ہیئت و ریاضی و اطباء و اہلِ صنعت و حرفت تمام موالی ہی تھے۔ عرب اُن کو عجمی ہی کہتے جو حدودِ عرب سے باہر آباد ہو چکے تھے۔ خواہ بہ نسباً عرب ہی تھے۔ خلفاء امویہ کو خالص عربی کا اس قدر پاس تھا کہ وہ اپنی اولاد کو بادیہ نشینوں میں کچھ عرصہ کے لئے بھیج دیتے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ "موالی" اس تحقیر کو بُری طرح محسوس کرتے تھے جو اموی خلافت نے روا سمجھا۔ اور کہتے کہ یہ رُوحِ اسلام کے منافی ہے۔ جب مختار ثقفی نے عراق میں عبداللہ بن زبیر نے حجاز میں علمِ بغاوت بلند کیا ہوا۔ اس کے نیچے موالی کثرت سے جمع ہو گئے۔ اگرچہ کامیابی نہ ہوئی مگر ردِ عمل شروع ہو گیا اور خلافت عباسیہ نے اس کا

کا فائدہ خاطر خواہ اُٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کا دور ٹوٹ گیا۔

ہارون رشید نے خلافت اپنے دو بیٹوں امین اور مامون میں تقسیم کر دی۔ امین عرب پر اور مامون ایران پر حکمران تھا۔ امین زبیدہ کے بطن سے ہاشمی تھا۔ مامون کی رگوں میں عجمی خون تھا۔ امین کے دورِ خلافت میں عربوں میں پھر جان پڑنے لگی۔ مگر مامون کے ساتھ جنگ چھڑی تو امین مارا گیا۔ اور خلافت مامون کے ہاتھ آگئی۔ اس کے پشت پناہ اکثر موالی ہی تھے۔ فرقہ شعوبیہ کی تشکیل اسمٰعیل بن یاسر نے جو ایرانی شاعر تھا کی۔ جو ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت میں گذرا ہے۔ اس فرقہ کے نامور علمبردار عبدالاسلام حمص کا ایک شاعر تھا جس کو عرب "دیک الجن" یعنی جن کا مرغ کہتے۔ اور "ابو عبیدہ ومعمر بن المثنیٰ" ہارون رشید کی خلافت میں تھا۔ اس نے اپنی کتاب "المطالب" میں عربیوں کے نقائص کی وہ تصویر کھینچی کہ جب مرا تو اس کے جنازے میں کوئی عرب شریک نہ ہوا۔

اس فرقہ کے لوگوں سے ایک سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ اپنی ملت کی اشاعت عربی زبان ہی میں کی۔ اور یہ اموی خلافت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ عربی زبان دنیا اسلام میں اس حد تک رائج کی کہ ہمارے زمانہ میں بہاء اللہ ایرانی مدعی نبوت بانی مذہب بہائیہ کو بھی مجبوراً عربی ہی سے کام لینا پڑا۔ جو بھی ملک فتح کرتے وہاں مدرسوں میں تعلیم عربی زبان میں دی جاتی۔

فرقہ شعوبیہ کے مخالف بھی تھے۔ ان میں استاد ابوطالب پسر فخر الدولہ مدرس ہمدانی اور ابوالقاسم محمود الزمخشری مشہور گزرے ہیں۔ حمزہ اصفہانی فرقہ شعوبیہ کا دلدادہ تھا۔ اس نے تاریخ پیدائش آدم سے المطیع اللہ یمنی ۳۳۳ھ تک لکھی۔ اس میں اس نے تاریخ ایران کو اہمیت دی ہے۔ ایرانی پیشوایانِ دین "موبد" ان ایام میں پہاڑوں میں آتش مقدس کی حفاظت کر رہے تھے ابو حمزہ ان کی تلاش میں نکلا۔ اور ان سے داستان باستان ایران جو سینہ بسینہ روائت ہو رہی تھی سنی۔ جمع کی اور لکھی۔ ابو حمزہ کی کتاب سینٹ پیٹرس برگ ماسکو میں چھپ چکی ہے۔ اس نے امثال عرب پر بھی ایک کتاب لکھی جس کا ایک نسخہ "میونخ" اور دوسرا معہ ترجمہ فارسی کتب خانہ قاہرہ (مصر) میں محفوظ ہے۔

مطہر بن طاہر المقدسی مقدسی نے کتاب "البدء والتاریخ" ۳۵۶ھ میں لکھی۔ اس مؤرخ کی تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ فلسطین میں پیدا ہوا۔ اور ۳۴۶ھ میں سجستان میں تھا۔ جو اُس وقت اُمرائے آلِ سامان کے قبضہ میں تھا۔ منصور بن نوح تختِ سلطنت پر متمکن تھا۔ جس نے اُمرائے آلِ بویہ میں عضدالدولہ کی مینیٔ سے نکاح کیا اور عضدالدولہ اُسے پانچ ہزار سالانہ خراج دیتا رہا۔

مقدسی کی کتاب میں سیاسیات دینیات اور تمدن غرض سب کچھ تاریخی نقطۂ نگاہ سے موجود ہے۔ بائیس فصل میں سے چودھویں فصل میں انساب عرب اور ایامِ جاہلیت کا ذکور ہے۔ اور پندرھویں فصل میں اسلامی دورِ خلافت کی تاریخ ہے انیسویں فصل میں ان تمام مذاہب کا مذکور ہے جو اسلام میں رائج الوقت تھے۔ مقدسی خوش تھا اس کے اپنے زمانہ میں ایک اور مذہب جس کا اُس نے نام نہیں لکھا اور غالباً کسی نام سے اس وقت موسوم نہ تھا شائع ہو رہا تھا۔ اس کے متعلق لکھتا ہے کہ اس مذہب کے متبعین کا یہ عقیدہ تھا۔ کہ اللہ تعالےٰ نہ جسم ہے نہ عرض۔ علم کے ذریعے اس کا فہم ناممکن ہے۔ اللہ کے بعد "عقل کلی" موجود ہے "نفسِ کلیہ" "دوئن" "عقل کلی" اور "مادہ" نفس کلیہ اور دخان (اثیر) دون مادہ تھے یا ہیں۔ اور سب سے آخر نوبت "قوائی طبعیہ" کی آئی اس مذہب کے پیرو ہر ایک حرکت اور قوت جو محسوس ہوتی ہے منجانب اللہ یقین کرتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ مقدسی فرقہ اسماعلیہ کے عقیدے بیان کر رہا ہے

عزالدین ابن الاثیر ابن اثیر کی موصل میں رہائش تھی۔ اس کی تاریخ "الکامل" جس میں ۶۳۱ھ تک کے حالات درج ہیں مستند تسلیم کی گئی ہے اس میں موصل کے "اتابک" کے حالات بھی قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس کی کتاب "اسد الغابہ فی سیرۃ الصوابہ" ہمارے مطالعہ میں رہی ہے اس میں اُس نے تمام اصحاب رسول اللہ کے سوانح حیات قلم بند کئے ہیں۔ اور جو بھی حدیث کسی سے روایت ہوئی وہ بھی بیان کی ہے

ابن خلدون ابوزید عبدالرحمن بن ابوبکر محمد ۷۳۲ھ میں پیدا ہوا۔ اس کا خاندان سویلی (Seville) واقع ہسپانیہ میں تھا۔ ۶۲۶ھ میں جب

"فریڈرک ثانی نے سسلی لے لیا۔ یہ لوگ تونس میں پناہ گزین ہوئے۔ ابن خلدون سلاطین تونس اور فیض کے ہاں ملازم رہا۔ سنہ ۱۳۶۳ء میں غرناطہ گیا۔ اور بطور سفیر قسطلانی بادشاہ پطرس کے دربار میں آیا۔ سنہ ۱۳۶۵ء سے سنہ ۱۳۸۲ء تک وہ مختلف سلاطین کی خدمت میں رہا۔ اور اپنی مشہور تاریخ بھی لکھتا رہا۔ سنہ ۱۳۸۲ء میں قاہرہ میں مستقل رہائش رکھی اور یہاں مالکی قاضی القضات کے فرائض سرانجام دیتا رہا۔ اور آخر عمر تک اسی خدمت پر مامور رہا۔ سنہ ۱۴۰۱ء میں وہ تیمور لنگ کے پاس آیا۔ سنہ ۱۴۰۶ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس کے سلسلہ نسب میں دسویں پشت میں مورث خلدون نامی تھا۔ اور یہ بھی ابن خلدون کے نام سے مشہور ہوا۔ ان کی اصل "حضرموت" ہے۔ بقول گبن "ابن خلدون کے پایہ کا کوئی مورخ آج تک نہیں ہوا" تاریخ علم وادب کی ایک شاخ سمجھی جاتی تھی۔ لیکن ابن خلدون نے اس کو علم میں تشکیل دی "مقدمہ" میں اس نے قوانین تاریخ واضح کئے ہیں۔ ہم نے بھی ان اوراق میں اس کے اتباع میں کچھ اضافہ کیا ہے۔

ابوریحان محمد بن احمد البیرونی۔ بیرونی اصل میں خوارزم کے رہنے والا تھا۔ ہندوستان میں بہت عرصہ رہا۔ اور غائر نظر سے یہاں کے مذاہب اور ہندوؤں کے رسم ورواج وبود وباش کی طرز اور علوم بالخصوص ہیئت اور فلسفہ کا مطالعہ کیا اور اسے اپنی کتاب "تحقیق الہند" میں لکھا۔ اس کا ترجمہ یورپ کی اکثر زبانوں میں ہوچکا ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں جو کچھ ہندوستان کے حالات تھے۔ اس نے ان کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ بیرونی لکھتا ہے کہ یوں تو اکثر باتیں ہندوؤں میں اچھی ہیں۔ مگر فرقہ اناث کی جو گت یہاں ہورہی ہے قابل مذمت ہے۔ ستی کی رسم عام ہے۔ بیوہ اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جلائی جاتی ہے۔ لیکن کبھی کوئی رنڈوا اپنی مردہ زوجہ کے ساتھ اس طرح ست دھرم کا ثبوت نہیں دیتا۔ صغر سنی کی شادی عام ہے۔ بیرونی یہ بھی لکھتا ہے کہ حکماء اور علماء ہند تو توحید کے قائل ہیں۔ مگر عوام مورتی پوجا کرتے ہیں برہمن خواہ کیسی جرم کے مرتکب ہوں سنگین سزا سے بری ہیں۔ اور کسی قسم کا مالیہ ادا نہیں کرتے شمالی ہند میں ہی چھ خود مختار ریاستیں کشمیر اور سندھ اور گجرات اور مالوہ اور قنوج

اور بنگال میں ہیں اور ان کے تحت چھوٹے چھوٹے راجے اور رئیس ہیں۔

بیرونی نے "کتاب الہند" میں علم ہیئت اور ریاضی اور جغرافیہ اور تقویم اور طبعیات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ جب وہ ہندو پنڈتوں سے ہیئت پر گفتگو کرتا اور ان کی غلطی اس موضوع پر واضح کرتا تو وہ حیران ہو کر پوچھتے کہ آپ نے کس پنڈت سے یہ سب کچھ سیکھا ہے۔

حکیم ناصر خسرو علوی اسماعیلی

ابن جبیر اور ابن بطوطہ اور ابن حوقل وغیرہم مسلمان سیاحان کی فہرست طویل ہے ان میں ناصر خسرو بھی ہے اس کا "سفرنامہ" مشہور ہے۔ "مرو" میں تحصیل علم کے بعد ۴۲۶ھ میں نیشاپور اور قم۔ تبریز۔ حلب اور شام کے مشہور مقامات کی سیر کرتا ہوا مصر میں آیا اور یہاں سے الاحصا اور بصرہ سے ہوتا ہوا پھر بلخ میں آیا۔ ان مقامات کے حالات چشم دید جو کچھ اس نے لکھے ہیں وہ زمانہ کی بہترین تاریخ ہیں۔ ناصر خسرو اور کتابوں کا بھی مصنف ہے۔ شاعر بھی تھا۔ اس پر بے دینی کا الزام بھی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہ فلسفی تھا اور جو کچھ اس کے عقائد تھے وہ اس زمانہ کے عام مسلمان فلسفیوں سے کچھ نرالے نہ تھے۔ اور یہ وہی ہیں جس کو ہم آج تصوف سے تعبیر کرتے ہیں۔

سید امیر علی

ہمارے زمانہ کے مورخین میں سے سید امیر علی۔ پی۔ سی سی آئی ای۔ ایل ایل ڈی۔ ڈی ایل P.C., C.I.E. LLD. DL پریوی کونسلر ایک روشن دماغ جج اور مورخ ہیں۔ ان کی تصنیفات میں "سپرٹ آف اسلام" (The Spirit of Islam) اور "ہسٹری آف سیرین" (History of the Saracens) بہت مشہور ہیں۔ تمام کتب انگریزی میں لکھی گئی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اہل برطانیہ کو بالخصوص اور اہل یورپ کو بالعموم اسلام اور اس کی برکات سے روشناس کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خدمت آپ خوش اسلوبی سے سر انجام دیتے رہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے۔ کہ آپ بنگالی تھے۔ اور اردو میں اتنی دسترس

نہ تھی کہ آپ اس کی بھی خدمت کرتے۔ آپ کی سہ حرفی میں یوں تو بہت خوبیاں ہیں مگر ایک عیب بھی ہے۔ جو ایک مؤرخ کے دامن پر بدنما داغ ہے۔ آپ شیعہ ہیں۔ اور قبائلی تعصب۔ جہاں کہیں اہل بیت کا ذکر آتا ہے۔ آپ کے الفاظ میں اتنا نمایاں ہے کہ اس کی تائید میں ضعیف سے ضعیف روایت بھی تاریخی صداقت خیال فرماتے ہیں

دیباچہ عموماً ہر ایک انسان زندگی کے تین مرحلے طے کرتا ہے۔ لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپا۔

ھو الذی خلقکم من تراب ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم یخرجکم طفلاً ثم لتبلغوآ اشدکم ثم لتکونوا شیوخا و منکم من یتوفی من قبل و لتبلغوا اجلا مسمی و لعلکم تعقلون (۲۴/۱۲)

وہ اللہ ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ پھر علقہ سے پھر تم کو طفل بنا کر ماؤں کے پیٹ سے نکالا۔ پھر تمہاری پرورش کرتا ہے تاکہ تم اپنی جوانی کو پہنچو اور (اس کے بعد) بوڑھے ہو جاؤ۔ تم میں سے بعض وہ ہیں کہ (ان تمام مرحلوں کو طے کرنے سے) پہلے مر جاتے ہیں اور بعض وہ ہیں (جو ان تمام مرحلوں کو طے کرنے کے بعد) اجل مقررہ تک پہنچتے ہیں (غرض یہ ہے) کہ تم عقل و فکر سے کام لو۔

وَ اللہ خلقکم ثم یتوفکم و منکم من یرد الی ارذل العمر لکی لا یعلم بعد علم شیئاً ان اللہ علیم قدیر (۱۲/۱۵)

اور اللہ تعالےٰ تم کو پیدا کرتا ہے پھر وفات دیتا ہے اور تم میں وہ بھی ہیں جو ارذل عمر تک پہنچتے ہیں کہ علم کے بعد کچھ نہیں جانتے اللہ علیم و قدیر ہے۔

یہی حالات انسانی جو کچھ انفرادی حیثیت میں پیش آتے ہیں۔ وہی جماعتی زندگی میں رونما ہوتے ہیں۔

وَ لکل امۃ اجل فاذا جآء اجلھم لا یستاخرون

اور ہر ایک اُمت کا ایک وقت مقرر ہے پس جب اُن کو اجل آلیتی ہے۔ تو ایک ساعت

ساعۃ ولایستقدمون" (۱۱پ) آگے پیچھے نہیں ہوتی۔

آدم سے تا ایں دم جو کچھ انسان پر جماعتی زندگی میں گزرا ہے اور گزر رہا ہے اہلِ علم و حکمت کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ آثار قدیمہ اور تاریخ کے صفحات پر اُس کی زندگی اور موت کے حالات ثبت ہیں۔ اور ذہنی ارتقاء کے ساتھ ہیں اور ذرائع کا علم بھی ہوتا جائے گا اور ان علمی انکشافات کے ساتھ اور حقائق بھی ہمارے سامنے آئیں گے جن کا علم متقدین کو نہ تھا۔

"علمت نفس ما قدمت و اخرت" (۳۰پ) ہر ایک انسان کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ آگے بھیجا اور جو کچھ پیچھے چھوڑا۔

زمانہ "حجریہ" سے اس وقت تک جو کچھ انسان نے ذہنی اور مادی ترقی کی ہے۔ وہ اس ارتقاء کی روشن دلیل ہے جو انسانیت کا حقیقی مقام ہے قرآن کتاب علوم و فنون نہیں لیکن کتاب اصولِ علوم ہے۔ اس میں انسان ہی کا بیان بہ تعلق کائنات اور خالق کائنات ہے۔ بالخصوص ان سورتوں میں جو حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں انسانی ذہنی اور مادی ترقیات کا مفصل مذکور ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "خاتم النبیین" میں اس کا ذکر کیا ہے اس لئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ان میں سے ایک بات جو ان اوراق پر ہماری بحث کا موضوع ہے۔ خلافت ہے اور یہ وہ دینی یا دنیوی حکومت ہے جس کے ذریعہ کسی قوم کے قبضہ تصرف میں وہ ممکن ذرائع زندگی آجاتے ہیں جو اس کی ذہنی ترقی میں مدد دیتے ہیں۔ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں "کل نفسٍ ذائقۃ الموت" (۲۱پ) ہر ایک نفس موت کا ذائقہ شناس ہوتا ہے۔ ہر ایک قوم ابھرتی اور گرتی ہے۔ انسانیت کی ترقی مسلسل جاری ہے اور جاری رہے گی۔ قوموں کے عروج و تنزل کی تاریخ ایک مقصد اعلیٰ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جو انسانیت کلہ ہے اور پھر یہ وہ مقصد ہے جس کا مذکور قرآن عظیم اور صرف قرآن عظیم میں ہے۔ کوئی شخص مرنا نہیں چاہتا۔ قیام زندگی کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی زندگی اسی دنیا کی زندگی ہے مر کر خاک میں مل گئے۔ تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ عقیدہ حیات بعد الموت حکماء کے نزدیک محض ایک عقیدہ ہے

ایک تمنا ہے۔ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ لیکن مرنا ضرور ہے اس لئے اطمینان قلب کے لئے یہ آرزو مایک عقیدہ بھی ہے۔ جو وہ اختراع کرتا ہے کہ میں مر کر بھی زندہ رہوں گا۔ یہ طفل تسلی فائدہ سے خالی نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر عقیدہ حیات بعد ممات کسی نہ کسی رنگ میں نہ ہو تو نہ صرف ہر ایک مذہب ختم ہو کے رہ جاتا ہے بلکہ انسان کے اطمینانِ خاطر کے لئے بھی کچھ نہ رہتا۔ اس لئے علماء کی یہ رائے کہ یہ عقیدہ انسان نے اپنے ہی تسکین قلب کے لئے اختراع کیا ہے کسی حد تک صحیح ہے اور ان اوراق میں ہم قوموں کے اعمال ناشائستہ کے تذکرہ میں بتائیں گے کہ قوموں کو کبھی یقین نہ تھا کہ ان کے اعمال کی بازپرس بھی کبھی ہوگی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس علم و حکمت کے دور میں بھی یقین نہیں۔ قرآن جہاں اس ناقابل انکار حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ زندگی اور موت دونوں مخلوق ہیں حقیقت مطلق نہیں دو مختلف حالتیں ہیں جو نفس انسانی پر وارد ہوتی ہیں وہاں یہ بھی فرماتا ہے کہ ان کا مقصد کیا ہے؟

تبرک الذی بیدہ الملک وھو علی کل شیءٍ قدیر الذی خلق الموت والحیوٰۃ لیبلوکم أیکم احسن عملا، و ھو العزیز الغفور (۲۹/۱)	بہت برکت والی ہے وہ ذات ہے جس کے قبضہ شاہی میں حکومت السموٰت والارض ہیں اور وہ ہر شے پر قادر ہے اس نے موت و حیات خلق فرمائے تاکہ تمہاری آزمائش ہو۔ کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرتا ہے اور وہ غالب بخشنے والا ہے۔

موت و حیات ذرائع ہیں مقصد اعمال اور اعمال کا مقصد جہاں تک ہمارے نفوس کا تعلق ہے سزا و جزا اور سزا و جزا کا مقصد ارتقاء یعنی ان برکات خداوندی سے مستفیض ہونا جو اللہ تعالیٰ ارزانی فرما رہا ہے یہ مقصد عالی انسان انفرادی اور جماعتی زندگی میں حاصل کرتا رہا۔ اور جماعتی زندگی میں زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکتا ہے بالخصوص اس خلافت یا حکومت کے تحت جو امم کے حصہ میں آتی ہے۔

وھو الذی جعلکم خلٰئف الارض	وہی اللہ ہے جس نے تم کو کرہ ارض پر جانشین

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ، اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ، وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ" (۶)

(بیلوں کا) کیا اور ایک کے دوسرے سے درجات بلند کئے تاکہ تم کو اس شے میں آزمائے جو تم کو دی (خلافت) تحقیق تیرا پروردگار جلد عذاب بھی کرتا ہے۔ اور تحقیق وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

ہماری بحث کا موضوع یہی ہے کہ امم سابقہ نے اس خلافت کے تحت کیا اعمال شائستہ یا ناشائستہ کئے اور بخشش و مغفرت یا عذاب کے مستحق د مورد کیسے بنے اور اس تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم ان کی داستان سے کیا عبرت حاصل کر سکتے ہیں تاریخی واقعات کا مقصد بھی یہ ہے کہ جو کچھ انسان نے کیا انسان کر سکتا ہے اور یہ کہ ایک اسباب کے نتائج ہمیشہ ایک جیسے ہوا کرتے ہیں۔ لوح کائنات پر قوموں کا عروج و زوال جلی حروف میں لکھا ہوا ہے ہر ایک قوم نے ایک دن ختم ضرور ہوتا ہے دیکھنا یہ ہے کہ متقدمین متاخرین کے لئے کیا چھوڑ گئے۔ اور اولیں کی وراثت آخرین نے کس طرح سنبھالی۔ اور اس پر کیا کچھ اضافہ کیا۔

ہم اس داستان یا نشان کو ابتدا سے شروع نہیں کرتے خلافت کی تاریخ کا آغاز آنحضرت کی بعثت سے کرتے ہیں ان ایام میں دو عظیم الشان شاہنشاہتیں بر سر پیکار تھیں ایک ایرانی اور دوسری رومی۔ رومی تو کل کرہ ارض پر چھا جانا چاہتے تھے رومی سلطنت دو حصوں میں منقسم تھی۔ ایک حصہ کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا اور اس کی حدود یونان والیشیا کوچک اور شمالی افریقہ مصر سے تا الجزائر تیونس پھیلی ہوئی تھیں۔ ایران کی حکومت ان ایام میں ایران سے باہر عراق اور شام پر بھی تھی۔ لیکن ان دونوں ممالک پر قبضہ کبھی ایرانیوں کا کبھی رومیوں کا ہوتا رہا۔ اور ارض شام و عراق میں یہ دونوں حریف قومیں زور آزمائی کرتی رہیں ایران سرزمین یمن پر عرصہ سے قابض تھا۔ اور رومی عرب کے اس حصہ پر قابض ہو چکے تھے جس کو وہ "پیٹرا" (پیتھر) اور مورخ جوزیفس (یوسف یہودی) ارض کہف الرقیم" لکھتا ہے اس کو ایک طرف خلیج سویز (اب اَتبا) مصر سے جدا کرتی ہے)

اور دوسری جانب شرق وہ تجارتی راستہ تھا۔ جو ارضِ حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ اس قطعہ زمین کو جزیرہ نما سینا بھی کہتے ہیں۔ اور عرب "الجزیرہ" بھی کہتے ہیں۔

ہمارا مقصد تاریخی واقعات بیان کرنا نہیں ہے۔ غرض ان نتائج سے ہے جو ان واقعات سے پیدا ہوئے۔ اس لئے ان نتائج کی وضاحت کے لئے ان تاریخی واقعات کا حوالہ ناگزیر امر ہے جن کی تفصیل ان کتب میں ملے گی۔ جن کی فہرست ہم نے اس کتاب کے شروع میں دی ہے۔

آنحضرتؐ کی ولادت سے پیشتر دونوں حریف طاقتیں ایرانی اور رومی ایک دوسرے کو نیچا دکھلانے پر تلی ہوئی تھیں۔ ان میں خونریز جنگ صدیوں سے جاری تھی اور میدان جنگ عموماً وہ ممالک تھے جہاں اقوام سامیہ قدیم الایام سے آباد تھیں۔ یہ ممالک دریائے نیل، دجلہ اور فرات سے محدود تھے۔ ارض شام اور مصر اور عراق اور عرب جس کو الجزیرہ کہتے ہیں۔ ان میں شامل ہیں۔ جزیرہ نمائے عرب کا وہ حصہ جہاں ان حریف طاقتوں کا قدم نامبارک نہیں گیا وہی تھا جہاں ان کو کوئی دنیوی فائدہ نظر نہ آتا تھا۔ کئی ایک دفعہ ہوس ملک گیری نے اس طرف توجہ دلائی مگر نقصان جان و مال کے بعد تلخ تجربہ سے فائدہ اٹھایا۔ قیصر روم بہت سا لاؤ لشکر لے کر ارض حجاز کی تسخیر کے لئے بڑھا لیکن پہلی ہی منزل پر حواس جمع درست ہو گئے۔ ان ایام میں رومیوں کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے۔ کہ ٹھان لی تھی کہ کل کرۂ ارض کو زیر نگیں رکھ کر دم لیں گے۔ اس لئے قیصر جو اسی ارادہ سے نکلا تھا حیران تھا کہ کیا کرے۔ "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن"! فاضل لیبان نے اپنی کتاب "تمدنِ عرب" میں عربی مورخین کے حوالے سے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ عرب قبائلی سرداروں کا ایک وفد عین اس پریشان حالی میں قیصر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کچھ تحائف جو ساتھ لائے تھے پیش کرنے کے بعد کہا کہ آپ عرب کی تسخیر کا خیال ترک کر دیں۔ یہاں رکھا ہی کیا ہے یہی کھجوروں کے جھنڈ اور خارِ مغیلاں۔ ریگستانی میدان جہاں بادِ سموم میں زندگی ناممکن ہے ہم نے مانا کہ آپ غالب طاقت سے ہماری بستیوں کو تباہ کر دیں گے وہاں آپ کو ایسی کوئی شے نہیں ملے گی جو آپ کے کام کی ہو۔ ہم نے مانا۔ کہ آپ ہمارے

جوانوں کو اسیر کر کے غلام بنا سکتے ہیں۔ لیکن وہ صحرانشین آپ کے تمدن سے ناآشنا ہیں وہ وحشی انسانوں کی طرح ہیں۔ وحشی حیوانوں کو آپ رام کر سکتے ہیں لیکن جوانانِ عرب کو نہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تنگ آ کر وہ یا خودکشی کریں گے یا تمہیں چین سے بیٹھنے نہ دیں گے۔ اس لئے آپ انہیں قتل کرنے میں اپنی غلطی سمجھیں گے۔ اس مہم کا کیا فائدہ جو سراسر دردِسر ثابت ہوگی۔" قیصر نے مناسب سمجھا اور تحائف لے کر لوٹ گیا۔ وہ سمجھ گیا۔ کہ اول تو عرب کی تسخیر ہی ممکن نہیں اگر کچھ حصّے کو مسخر کر لیا تو یہاں رومی سپاہیوں کی رہائش بالاستقلال ممکن نہیں۔ عرب ان کو کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیں گے۔ اس لئے "دردِ سر کمتر بہ"

جزیرہ نما سینا چونکہ مصر اور شام کے درمیان پڑتا ہے۔ اس لئے اس پر رومیوں کا قبضہ دونوں ممالک کے درمیان ربط و ضبط قائم رکھنے کے لئے ناگزیر تھا۔ شام اور جزیرہ نما عرب کے اس حصّہ میں عربی یا تو بدویانہ زندگی میں آزادی محسوس کرتے تھے یا حکومت کا مذہب مسیحیت اختیار کر چکے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی تھیں۔ ان میں سے عراق میں "حیرہ" اور شام میں "بنو غسان" کی طوائف الملوکی مشہور ہے۔ عربی قبائل جو عرب اور شام کی حدود پر آباد تھے۔ اکثر مسیحیت کے آغوش میں آ چکے تھے۔ آنحضرتؐ کے سفیر جب رومی سرحد پر مارے گئے تو انتقام کے لئے ایک مہم بسر کردگی "زید" روانہ کی گئی تو اسلامی لشکر "معان" تک بڑھتا گیا۔ اس جگہ پرچہ لگا کہ "ہرقل" ایک لاکھ عرب مستنصرہ کے ساتھ مقابلہ کے لئے آ رہا ہے اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ مسیحیت کی اشاعت عربی قبائل میں کس حد تک ہو چکی تھی۔

یمن تو عرصہ تک مسیحی حکومت کے تحت رہا۔ اس سال جب آنحضرت کی ولادت ہوئی۔ ابرہہ اشرم مسیحی بادشاہ یمن نے ہاتھیوں کے ساتھ خاص مکہ پر حملہ کیا تھا۔

ان حالات میں جب کہ شمال مغرب یعنی شام اور جزیرہ نما سینا اور مصر پر

رومی قابض ہو چکے تھے۔ اور شمال مشرق اور جنوب عرب میں ایرانیوں کی حکومت تھی۔ جس میں الجزیرہ سے یمن تک ایرانی حکومت اور تہذیب و تمدن کا اثر تھا جب عرب من حیث القوم آنحضرت اور خلافت راشدہ میں اُٹھے تو دونوں ہمسایہ غاصب سلطنتوں سے تصادم ناگزیر امر تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ہم بیان کر چکے ہیں کہ قومیں عروج و زوال کے مراتب طے کرنے کے بعد ختم ہوتی رہیں اور ہوتی رہیں گی۔ لیکن عالم انسانی بہ ہیئت مجموعی ترقی کرتا چلا آرہا ہے ہر ایک قوم کسی خاص نصب العین کو لے کر اٹھی۔ جو اس کا مقصد حیات تھا۔ لیکن یہ مقصدِ حیات ہمیشہ کسی ممتاز اور واحد شخصیت کا تصور ہوتا ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل بھی اسی قوم کے ذریعہ ممکن ہے جو اس کو امتِ واحدہ بناتا ہے جس میں کوئی اختلاف کوئی تفرقہ نہیں ہوتا اور تمام قوم ایک بنیان مرصوص کی صورت ہوتی ہے جس میں رخنہ اندازی کوئی مخالف قوت اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک یہ مقصد اس قوم کا روحِ حیات ہوتا ہے لیکن یہ دُنیا عالم اضداد ہے اگر بیرونی مخالف قوتیں تھک کر رہ جاتی ہیں تو اندرونی رخنوں سے قوم کی وحدت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔

"درعالمِ اضداد چہ اندیشۂ صلح ہست — باخود نتواں ساخت اگر جنگ نکردے"

مادہ حیات میں موت کا سامان موجود ہوتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ موت و حیات جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں ایک ہی قوت کی دو صورتیں ہیں جن کا اظہار مناسب خارجی تاثرات کے تحت ہوتا رہتا ہے۔ موت سے حیات اور حیات سے موت کی صورت کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

یونانی اُٹھے تو اُنہوں نے سکندرِاعظم کی قیادت میں متمدن دنیا کو روند ڈالا۔ یہ آخر گوشۂ گمنامی میں بیٹھ رہے اس قوم نے عالمِ انسانی کو کیا دیا۔ فلسفہ اور آرٹ" رومی اُن کے جانشین ہوئے اور یونانی شہنشاہیت کے ساتھ یونانی فلسفہ اور آرٹ کے بھی وارث ہوئے۔ اُنہوں نے عالمِ انسانی کو "قوانین" کا سبق دیا۔ آج بھی "رومن لاء" اقوامِ یورپ میں ایک مقدس "وراثت" ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہ کرنا چاہیئے کہ جب غالب اور مغلوب اقوام میں سیاسی رابطہ قائم ہوا۔ اور تصادم کے بعد ناگزیر امر تھا کہ ایسا ہو تو مغلوب قوم میں بھی وہ خوبو پیدا ہوئی جو غالب قوم کی امتیازی خوبی تھی۔ اور اسطرح مغلوب کو اُبھرنے کا موقعہ ملا تو غالب قوم کا تختہ الٹ دیا۔ قوموں کی ذہنی اور مادی ترقی کا راز یہی "جنگ" میں مضمر ہے جو آفرینش سے عالمِ انسانی کو تنازعہ للبقا کے لیئے پیش آ رہا۔ قرآنِ عظیم کی اس آیت میں ایک عظیم الشان صداقت ہے۔ کہ جب ملائکہ کے بعد آدم کو خلافت ملی تو ملائکہ نے کہا۔

أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ"	کیا تو زمین میں ایسی شخصیت کو خلیفہ بنا رہا ہے جو اس میں فساد برپا کرے گا۔ اور خونریزی کرے گا ہم ہیں کہ تیری تسبیح و حمد کرتے ہیں اور تیری تقدیس بیان کرتے ہیں

ارشاد ہوا کہ "انی اعلم ما لا تعلمون" اس حقیقت کو میں ہی جانتا ہوں تم نہیں جانتے جس نصب العین کے ساتھ کسی قوم کا عروج ہوا وہ تاریخی زمانہ میں ایک دستورالعمل کی صورت میں پہلے ہی منزل ہوتا رہا۔ اور ایسی ہی تحریریں قوموں کی مذہبی کتب سے موسوم ہیں۔ توراۃ۔ اور صحف انبیاء اور انجیل اور ژند اوستا اور وید وغیرہم ایسی ہی کتب ہیں ہم امم اسلامیہ کی تواریخ بیان کر رہے ہیں اس لیئے ان کی کتاب قرآن عظیم سردست ہماری بحث کا موضوع ہے۔

الاسلام | فاضل لیبان نے اپنی کتاب "تمدنِ عرب" میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ

آنحضرت کوئی نیا مذہب نہیں لائے"۔ لیکن وہ اور دیگر محققین یورپ یہ نہ سمجھ سکے کہ آنحضرت کس دین کی تبلیغ فرماتے رہے۔ آیا یہ کوئی نیا مذہب تھا یا کسی شخصیت کا کسی معلوم یا نامعلوم زمانہ میں پرانا تصور تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ آنحضرت کوئی نیا مذہب نہیں لائے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر ایک مذہب کا انکار کر دیا جو قوموں کا خود ساختہ تھا۔ ایسے مذاہب جو قوموں میں فرقہ بندی اور نفرت انگیز تفرقہ کے موجب تھے اور ہیں آنحضرت نے باطل قرار دیئے۔ اور ایک دین پیش کیا جس کو "دین اللہ اور دین الحق" سے تعبیر فرمایا۔ یہ دین نہ صرف عالم انسانی کا ہے بلکہ کل کائنات سموٰت الارض وما بینہما کا ہے۔

الو اسلم من فی السموات — اسی کے حضور سر تسلیم خم کرتے ہیں جو کچھ
والارض طوعاً وکرھاً والیہ — بھی آسمانوں اور زمین میں ہے طوعاً و کرہاً۔
یرجعون" (۳/۱۴) — اور اسی کی طرف ہر ایک امر کا رجوع ہے؛

آنحضرت نے یہود و نصاریٰ کو ملامت کرتے ہوئے کہا کہ تم نے اس دین الحق کی تکا بوٹی کر کے رکھ دی اور ایک دوسرے کی نسبت کہتے ہو کہ تم اور تمہارا مذہب باطل ہے اور یہ سب کچھ خود ساختہ عقائد کی بنا پر کہتے ہو دین ایک ہی ہے اور یہ انسانی اختراع نہیں، تمام انبیاء اور رسل اسی کی تبلیغ کرتے آئے۔ اور یہ دین الحق "اسلام" ہے۔ جس سے تمام کائنات کا نظم و نسق قائم ہے یہود نے اس دین کو اپنی قومیت سے اور نصاریٰ نے ایک بشری شخصیت عیسیٰ ابن مریم سے وابستہ کر کے ایسے مذاہب کا شاخسانہ کھڑا کر دیا جو سرے سے اس دین اللہ کے منافی ہے۔ کسی نبی کسی رسول نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے نام سے وابستہ ہو جاؤ۔ کیا اس سے یہ توقع ہو سکتی ہے کہ اسلام کی طرف دعوت دینے کے بعد تمہیں کفر کی باتیں سکھائے۔

علاوہ صحیح الفاظ میں ارشاد قرآن ہے کہ:-

وما محمد الا رسول، قد خلت من قبلہ — اور محمد تو ایک رسول ہے، اس سے پیشتر کئی رسول گزر چکے
افائن مات او قتل انقلبتم — ہیں (جو سب فوت ہو گئے) تو کیا یہ اپنی طبعی موت سے مر جائے

علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیه فلن یضر اللہ شیا وسیجزی اللہ الشکرین" (۳/۱۴۴)	(جو یقینی امر ہے) یا مارا جائے (جس کا امکان ہے) تو تم (دین اللہ سے روگرداں ہو کر) اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے تم میں سے جو بھی پھر جائے گا وہ دین اللہ کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتا جو کسی کی موت و حیات سے وابستہ نہیں البتہ خود ہی خسارہ میں رہیگا اور جو بھی اس دین سے وابستہ رہے گا تو اللہ شکر گذار بندوں کو جلد ہی نوازے گا!

ظاہر ہے کہ یہ دین جو ہر ایک شے کی فطرت میں ودیعت ہے کسی شخصیت من دون اللہ سے وابستہ نہیں۔ آنحضرت اور آنحضرت سے پیشتر تمام انبیاء و رسل کی شخصیت سے بے نیاز ہے اُن نفوس قدسیہ پر اس کا انکشاف ہوا اور اُنہوں نے اپنی اپنی قوم کو اس سے آگاہ کیا سب انبیاء و رسل فوت ہو گئے۔ اور یہ اسی طرح کائنات میں سرگرم عمل آفرینش سے ہے جیسا ان انبیاء کی ولادت سے پہلے تھا اور موت کے بعد ہے۔

اس دین کو لسان قرآن میں "الاسلام" سے موسوم کیا گیا ہے یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ ان اوراق میں اس پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ ہم نے اپنے مقالات میں اس پر علیحدہ بحث کی ہے اس مقام پر ہم صرف چند اشارات پر اکتفا کرتے ہیں قارئین کرام مفصل بحث ہمارے دوسرے مقالات میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

القرآن قرآن اپنی تعریف حسب ذیل الفاظ میں کرتا ہے:۔

ماکان ھذا القرآن ان یفتری من دون اللہ ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل الکتب لاریب فیہ من رب العلمین" (۱۰/۳۷)	یہ قرآن ایسا نہیں کہ اللہ کے سوا اس کا کوئی مصنف ہو (منکرین کا یہ خیال کہ یہ بشری کلام ہے باطل ہے) لیکن (اس میں دو ہی امور کا مذکور ہے ایک) تصدیق اس امر کی جو اللہ کی طرف سے نازل ہوتا رہا ہو۔ جو ان کی کتب مقدسہ میں مذکور ہے اور (دوسرا) الکتاب (کائنات یا صحیفۂ فطرت) کی تفصیل (اور کتاب فطرت وہ ہے جس کی تعریف ہے) لاریب فیہ (جس میں کچھ الجھنیں اور الجھنیں کی وجہ سے شک و شبہ نہیں) تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کے شروع میں اسی احد معیار صداقت کو جو صحیح معنی میں الکتاب ہے اور جس سے تمام کتب مقدسہ و غیر مقدسہ کے علوم ماخوذ ہیں پیش کیا گیا ہے۔

"الٓمٓ ذٰلِکَ الکتاب لاریبَ فیہ" (۱/۱) — وہ کتاب (فطرت) جس کی تعریف ہے لاریب فیہ (جس میں کچھ الجھن نہیں ہے)

جس طرح قرآن خود توراۃ وغیرہ نہیں ہے لیکن ان کا "مصدق" ہے۔ اسی طرح خود "الکتٰب" نہیں۔ اس کی تفصیل اور بیان ہے۔ حسب ذیل آیات میں تدبر سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

"الٓمٓ تنزیل الکتٰب لاریب فیہ من رب العٰلمین" (۲۱/۱۷) — الم کتاب (کائنات) اس کی تفصیل یہ قرآن تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل شدہ ہے اور کتاب کی تعریف ہے لاریب فیہ

"تلک اٰیٰت الکتٰب و قرآن مبین" (۱۴) — وہ آیات ہیں کتاب (کائنات) مبین اور قرآن کی

"الٓرٰ تلک اٰیٰت القرآن و کتاب مبین" (۱۹/۱۱) — وہ آیات ہیں قرآن اور کتاب مبین کی

"الٓرٰ تلک اٰیٰت الکتٰب المبین انا انزلنٰہ قرآنا عربیاً" (۱۲/۱۱) — "الر" وہ آیات ہیں کتاب مبین کی جن کی ترجمانی عربی زبان (مبین غیر ذی عوج) میں نازل فرمائی۔

"ہر آں کو را کہ جانش پر تجلی است — ہمہ عالم کتاب حق تعالیٰ است"

کتاب کائنات مصور تصویری حروف میں لکھی گئی ہے اس فطری زبان سے جو نفوس قدسیہ آگاہ ہیں وہ اس کتاب کے معانی اور حقائق سے واقف ہوتے ہیں چنانچہ حضرت عیسیٰ کی نسبت ارشاد ہے کہ

ع۱۔ قرآن کے ساتھ اشارہ قریب "ھذا" استعمال ہوا ہے۔ اشارہ بعید "ھذاک" ہے جس کا مخفف "ذاک" ہے۔ بعید تر اشیاء کے لئے لفظ "ذالک" ہے اس کا مؤنث "تلک" ہے۔ لفظ ذالک اور مؤنث تلک "عظمت" کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور عظمت والی شے دور تر بھی ہوتی ہے۔ جو ہر کس و ناکس کی دسترس سے باہر ہو۔ "لا یمسہ الا المطھرون" (۲۷/۱۷)

"یعلمه الکتٰب والحکمة والتورٰة والانجیل" (۳/۴۸) اللہ اس کو صحیفہ نظرت اور اس کی حکمت اور توراۃ اور انجیل (جو اسی کی ترجمانی ہے) سکھائے گا۔

صحیفہ نظرت کتاب مبین ہے "کتٰب ینطق بالحق" جو کچھ بیان کرتی ہے حق ہے اور یہی ہر ایک وحی، ہر ایک الہام، ہر ایک القا کا سرچشمہ ہے۔ "واتل ما اوحی الیک من الکتٰب" (۲۹/۴۵) اور تلاوت کر (قرآن) جو تیری طرف الکتاب سے وحی ہوتا ہے۔

تمام کتب مقدسہ سابقہ اور قرآن میں "ریب" کی گنجائش ہے اور کفار و مشرکین کو اس میں الجھن رہی ہے اور ہے۔

"وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا" (۲/۲۳) اور اگر تم کو اس (قرآن) میں ریب ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل فرمایا۔

لیکن کتاب کائنات کا کوئی دہریہ بھی منکر نہیں۔ جو سرے سے خدا کا منکر ہے اس کا منکر بنے تو اس، اپنی عقل و ہوش کا منکر ہے ان سب علوم کا منکر ہے جو اس سے ماخوذ ہیں۔ ایسے باطل پرست کا قول بھی باطل ہے۔ "از باطل سخن حق کہ باور دارد" اس لئے اس واحد معیار صداقت پر قرآن نے اپنے آپ کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ

"افلا یتدبرون القرآن، ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیه اختلافا کثیرا" (۴/۸۲) کیا تم قرآن میں تدبر نہیں کرتے اگر یہ کسی غیر اللہ کا کلام ہوتا تو اس میں (اور کتاب کائنات میں) اختلاف کثیر پاتے۔

"ہربرٹ سپنسر" لکھتا ہے کہ انسانی کام اور کلام میں اختلاف کثیر واجب ہے اول تو ایک ہی زمانہ کے حکماء کے نظریوں میں اختلاف ہوتا ہے اور اگر یہ ممکن بھی ہو کہ سب کا اتفاق کسی ایک امر پر ہو تو ناممکن ہے کہ خلف سلف سے اختلاف نہ کرے اگر ایسا ہو تو ذہنی ارتقاء رک جائے گا۔" جن قوموں پر ذہنی جمود چھا جاتا ہے وہ پرانی لکیر پیٹتے رہتے ہیں اور دیر سویر مٹ جاتی ہیں۔

آیات محولہ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کے بعد ایسی کوئی کتاب نہیں ہو گی جس کو

اس سے اختلاف ہو۔ البتہ اس کی تصدیق ہر ایک زمانہ میں اہلِ علم و حکمت کرتے رہیں گے یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ قرآن کتاب احکام توراۃ کی طرح نہیں ہے کتاب اصول احکام تھے اصول فطری ہوتے ہیں اور کبھی نہیں بدلتے احکام حالات کے تابع ہوتے ہیں اور حالات خارجی غیر محدود اور ہمیشہ بدلتے ہیں۔ انہی کے مناسب احکام میں بھی ترمیم و تنسیخ واجب ہے جو قوم اپنی ذہنیت کو خارجی حالات کے مناسب نہیں بدلتی حسب فتوی قرآن زیر سو پرمٹ جاتی ہے اس کتاب میں قوموں کے تنزل اور ہلاکت کا سبب بھی بیان کیا گیا ہے۔

آن اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم، و اذا اراد اللہ بقوم سوء فلا مرد لہ و ما لھم من وال" (۱۳/۸)	اللہ تعالے کسی قوم کے حالات نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی ذہنیت کو (خارجی حالات کے مناسب) نہیں بدلتی اور جب باوجود انتباہ غذاب کے نہیں بدلتی تم اس قوم کے بُرے دن آجاتے ہیں جو ٹلے سے نہیں ٹلتے۔ البتہ اگر متنبہ ہو کر اللہ کی طرف رجوع کرے تو اللہ کے سوا اور کوئی کارساز بھی نہیں۔

احکام کا وضع کرنا "شوریٰ" کے عقل و فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے جہاں اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جن کی جامع و مانع کتاب قرآن ہے امر و نہی کا نفاذ خارجی حالات کے مناسب کرتا ہے۔

اسی طرح قرآن کتاب علوم نہیں جو ذہنی ارتقا کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن قرآن اس کتاب کائنات کی طرف متوجہ کرتا ہے جو تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔

"وسخر لکم ما فی السموٰت و ما فی الارض جمیعا منہ' ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون"	اور تمہارے لئے جو کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے سب کچھ اپنی رحمت سے مسخر کر دیا اس میں نشانیاں ہیں اہلِ فکر کے لئے

ایک اور خاص بات جو قرآن نے اہلِ قرآن کے دل نشین کی یہ ہے کہ حق حکومت کُل کائنات پر ایک ذات بابرکات اللہ تعالیٰ کا ہے جو کائنات کا خالق بھی ہے اور اس کی

تخلیق کا مقصد بھی اسی کا مقرر کردہ ہے۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے ہر ایک شئے کی ربوبیت بھی فرماتا ہے۔

"الا له الخلق والامر، تبارک اللہ رب العٰلمین" (۵۴) اچھی طرح ذِل نشین کرلو کہ پیدا کرنا اور پیدائش کا مقصد مقرر کرنا اسی اللہ کا کام ہے جو بہت برکت والا رب العالمین ہے۔

ہر ایک مخلوق اللہ کی عبد ہے اور "عبودیت" اور "عبدیت" بندوں کی طرف سے صرف اللہ تعالےٰ کے لئے خاص ہے۔ جو شخص مخلوق کا بندہ بنتا ہے "مشرک است آں فضول ناہنجار"

بیدل بحصول رزق آمادہ بسر — سگ جا کر سگ نگشت و خربندہ خر
از مخترعات کارگاہِ امکاں کو — ایں ننگ شعور نیست جز صنع بشر

دوسری خاص بات جو بطور پیش گوئی قرآن نے واضح الفاظ میں فرمائی وہ یہ ہے کہ اللہ ہی کا حکم اور حکومت ازلی و ابدی ہے اور انسان نے جو حکومتیں اختراع کی ہیں سب مٹ جائیں گی یہ بلندی و پستی اور اعلیٰ و ادنےٰ کا امتیاز جو بندگانِ ہوا و ہوس نے پیدا کر رکھا ہے محو ہو جائے گا یہ جبال جو آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور یہ پست زمین متصادم ہوں گی۔ پستی میں حرکت پیدا ہو گی اور جبال کو توڑ پھوڑ کر خاک کے برابر کر دے گی۔ یہ اس وقت ہو گا جب انسانی ذہنی ارتقاء اس مقام تک پہنچ جائے گا۔ کہ مکتب کے لڑکے بحد مغز بڑے بوڑھوں کی سی علم و حکمت میں باتیں کریں گے جب آسمانوں کے پوشیدہ امکانات منکشف ہو جائیں گے

"یوما یجعل الولدان شیبا السماء منفطر به کان وعده مفعولا" (۱۲/۲۹)

یہ اشارات جن کی تفصیل ہم نے اپنے مقالات میں بیان کی ہے فہم و تفہیم کے لئے جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے کافی ہیں یہ وہ نصب العین ہے۔ وہ مقصد حیات ہے جس کو آنحضرتؐ نے عالم انسانی کے سامنے رکھا "فمن شاء اتخذ الی ربه سبیلا" ہر ایک شخص کو اختیار ہے اگر چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرے

"لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" "دین میں کوئی جبر و تشدد و کراہت نہ"

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو گیر و دار و حاجب و درباں دریں درگاہ نیست

اس کے ساتھ ہی واضح کر دیا کہ وہ "قوت فکریہ" جس کو آج تک باہمی جنگ و جدل میں صرف کرتے رہے ہو تسخیر کائنات پر استعمال کرو۔ یہ ہے اعلیٰ مقصد حیات انسانی۔

"سارعوا الی مغفرۃ من — ادنیٰ زندگی حیواۃ الدنیا کے ادنیٰ مفاد پر کیا لڑتے جھگڑتے

ربکم وجنۃ عرضہا — مرتے ہو جو متاع قلیل ہے، بڑھ کر لو اللہ کی بخشش اور

السمٰوٰت والارض اعدت — اس جنت کو جس کا عرض تمام کائنات سمٰوٰت والا

للمتقین" (۱۳۳) — اور جو پرہیزگاروں راست بازوں کے لئے تیار کی گئی ہے

اس مقصد کی تبلیغ کے لئے ایک منتخب جماعت کی ضرورت تھی ہر ایک کام مناسب اسباب کے ساتھ ہی سرانجام پاتا ہے۔ وضع جہاں کی اُفتاد ہی ایسی ہے چنانچہ ارشاد قرآن ہے کہ

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر — تم میں سے ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے جو

ویامرون بالمعروف وینہون — امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے اور نیکی

عن المنکر واولٰئک ھم المفلحون (۱۰۴) — دعوت دے ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

چنانچہ ایسی جماعت تیار کی گئی جن کی نسبت ارشاد ہے کہ

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس — تم بہترین جماعت ہو جو لوگوں سے منتخب کی گئی تم امر

تامرون بالمعروف وتنہون عن — بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو اور اللہ پہ ایمان

المنکر وتومنون باللہ" — لاتے ہو۔

لیکن یہ جماعت بسہولت تیار نہیں ہوئی اس کو کس ابتلا سے گزرنا پڑا اور تئیس برس کن مصائب کو برداشت کرنا پڑا۔ اور شہر و دیار ترک کر کے ہجرت کی ایسے تاریخی واقعات ہیں جن کی تفصیل اپنی کتب میں ملاحظہ ہو جن کا نام شروع کتاب میں درج کر چکے ہیں۔ ہر ایک تحریک کی صداقت کا اندازہ اس کی قوت مدافعت سے ہو سکتا ہے خاص دنیا میں ایک دین ہی اسلام ہے جس پر ہر طرف سے یورش ہوتی رہی اور ہو رہی ہے۔

لیکن اس کا قدم آگے ہی بڑھتا گیا اور بڑھ رہا ہے۔ اور مقدر ہو چکا ہے کہ کسی وقت تمام عالم انسانی کو اپنی آغوش میں لے لے گا۔ یہ امت آنحضرتؐ کے زیر نگرانی تیار ہوئی اور اسی نے اس مقصد کو عالم انسانی کے سامنے پیش کرنا تھا۔ جو ان کے دلوں پر نقش ہو چکا تھا۔ لیکن ان قرون کے خارجی حالات اس امر کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ اس پیغام حق کو قومیں ٹھنڈے دل سے سنیں گی۔ جب آنحضرتؐ نے تبلیغ کا کام شروع کیا اور ایک جماعت نے آپ کا ساتھ دیا تو ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی کہ کفار و مشرکین عرب جن میں اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی شامل تھے اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مسلمان ایک حالت یاس میں نہیں سمجھ سکتے تھے کہ کریں تو کیا کریں، ارشاد الٰہی ہوا۔ کہ

"قل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول فان تولوا فانما علیه ما حمل وعلیکم ما حملتم، وان تطیعوه تهتدوا، وما علی الرسول الا البلاغ المبین، وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضی لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیا، ومن کفر بعد ذلک فاولئک هم الفسقون"

کہیں کہ وہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اگر روگردانی کرو گے تو ہر ایک شخص کی روگردانی کا خمیازہ اس کی اپنی ذات تک محدود ہے اور اگر اطاعت کرو گے تو سیدھے رستہ پر آجاؤ گے اور رسول کا کام تو علی الاعلان پیغام حق پہنچا دینا ہے اور اللہ وعدہ فرماتا ہے کہ تم میں سے جو صاحب ایمان ہیں اور ایمان کے مناسب ان کے عمل صالح ہیں ان کو ضرور زمین میں خلافت اسی طرح عطا ہو گی جس طرح ان کے پہلوں کو ملی اور یہ دین اسلام جو ان کے لئے پسند کیا گیا ہے قائم ہو جائے گا اور موجودہ خوف جو ان پر طاری ہے امن سے بدل جائے گا وہ میری ہی عبادت خالص بلا شرک کریں گے اس کے بعد جس نے شرک کیا تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

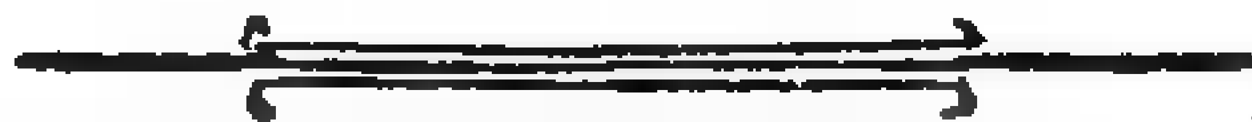
ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اصل مقصد تمکین دین ہے جو بہ تقاضائی حالات خلافت کے ذریعہ ہی تکمیل پا سکتا تھا۔ اور یہ تکمیل بحالت امن ہی ممکن ہے اور خلافت

کے ذریعہ امن اور تمکین و تبلیغ و اشاعت دین ہی اصل مقصد اس امت کے مدِ نظر تھا۔
یہ امت یا جماعت آنحضرتؐ کی اپنی قوم تھی جس میں اس قبیلہ کا زیادہ تر حصّہ تھا،
جس سے آنحضرتؐ کی شخصیت وابستہ تھی۔ چونکہ قریش نے آگے چل کر اس مقصد کی تکمیل
کرنی تھی اس لئے آنحضرت نے کل قوم کو بالعموم اور اہلِ قریش کو بالخصوص تنبیہ کر دیا
تھا کہ خلافت تو تمہیں تمکین دین کے لئے ضرور عطا ہوگی لیکن "چول بدولت برسی
مست نہ گردی مردی" فتح مکہ کے بعد قریش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ :-

"اے جماعت قریش بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تم سے ایامِ جاہلیت کی نخوت اور آباؤ اجداد پر فخر کرنا لے لیا، کل عالم انسانی آدم کی اولاد ہے اور آدم کی پیدائش مٹی سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بے شک ہم نے تم کو نر و مادہ سے پیدا کیا اور تمہاری گوتیں اور ذاتیں بنائیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بیشک اللہ کے نزدیک تقویٰ میں جو شخص زیادہ ہے وہی زیادہ معزز ہے"

آنحضرتؐ کی آخری وصیت یہ تھی :-

"جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وصیت فرمائی میں بھی تمکو اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں میں اللہ ہی کو تمہارا نگہبان چھوڑتا ہوں اور تمہیں اس کے سپرد کرتا ہوں۔ بیشک میں تم کو عذاب دوزخ سے ڈرانے والا اور جنت کی نعمتوں کی بشارت دینے والا ہوں، آگاہ ہوجاؤ کہ ملکِ خدا اور بندگانِ خدا میں برتری اختیار نہ کرو کیونکہ اللہ نے مجھے اور تمہیں مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ یہ دارِ آخرت اُن لوگوں کے لئے ہے جو ملک خدا میں نہ تو برتری کا ارادہ کرتے ہیں اور نہ فساد کا اور آخرت اہل تقویٰ کے لئے ہے اور کیا نہیں ہے ٹھکانہ جہنم غرور والوں کا؟"



خلافتِ راشدہ

اہلِ عرب قریش کی قیادت میں اس مقصد کی تکمیل کے لئے اُٹھے جس کا مذکور ہم کر چکے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب کے شمال کی طرف رومی اور مشرق اور جنوب کی جانب ایرانی بڑھ کر اپنی شہنشاہیت کو وسعت دے رہے تھے۔ اور کئی عربی قبائل ان کے زیر اثر آ چکے تھے۔ اگر اہلِ عرب کا مقصد اشاعتِ دین نہ بھی ہوتا پھر بھی وہ حق بجانب تھے کہ امم سامیہ کو اغیار کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائیں، لیکن جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ان کی غرض ہوسِ ملک گیری نہ تھی۔ البتہ اشاعتِ دین کا مقصد یہ ضرور تھا کہ ملکِ خدا اور بندگانِ خدا میں ہر قسم کی حکومت ختم کر کے ایک اللہ تعالیٰ کی حکومت جو ازلی و ابدی ہے قائم کر دی جائے، اور عالمگیر حریت و مساوات و امن و فلاح کا دور دورہ ہو۔ خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ " اپنی تلواریں قیصر و کسریٰ کی طرف سیدھی کرو اور ان کے خزانے ان پر تقسیم کر دو جن کے خون سے یہ معمور ہیں"۔

اہلِ عرب مسلمانوں سے اللہ کا وعدہ آنحضرتؐ کی زندگی میں ہو چکا تھا کہ ان کو ایسی ہی خلافت عطا ہوگی جیسی پہلی قوموں کو دی گئی تھی۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کن کن ممالک پر ان کا قبضہ ہوگا۔ یہ شام اور مصر اور عراق ہیں ان کے علاوہ ایران کا بھی مذکور ہے جہاں اہلِ عرب بطور مہمان کچھ عرصہ رہیں گے یہ ظاہر ہے کہ شام و مصر و عراق اور عرب میں امم سامیہ ہی آباد تھیں اور ان ممالک میں امن اور آزادی کے ساتھ رہائش رکھنا ان ہی کا حق تھا۔ رومی اور ایرانی غاصب تھے اس لئے یہ ضرور تھا اور اس کے سوا چارہ کار بھی نہ تھا کہ ان دو حریف طاقتوں کو

ان ممالک سے بزورِ شمشیر نکالا جائے ان قوموں سے جنگ ناگزیر امر تھا اور قرآن

۲۔ ارض شام پر حضرت موسیٰ کے وقت سے ذریت ابراہیمؑ بنی اسرائیل قابض تھے۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم کو مصر سے نکال کر لائے اور کہا کہ اس ملک ارض فلسطین کا وعدہ تمہارے آباؤ اجداد ابراہیم و اسحٰق و یعقوب سے خداوند خدا فرما چکا ہے کہ تمہاری ذریت کو ہمیشہ کے لئے دوں گا۔ اب آگے بڑھو اور اسے لے لو۔ یہ وعدہ حضرت موسیٰ کے اسفار میں مفصل مذکور ہے۔ پانچویں کتاب الثانی (۱۱/۸) میں اس زمین اور زمین مصر کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ مصر میں زرعی پیداوار کا انحصار نیل پر ہے اور وہاں محنت و مشقت سے روٹی حاصل کرنی پڑتی ہے لیکن زمین شام میں پہاڑیاں اور سرسبز وادیاں ندی، نالے چشمے ہیں، اس میں گندم اور جو اور انگور اور انجیر اور انار (عربی "رمان" اور عبرانی "رمان") اور دوسرے پھلوں والے درخت ہیں۔ یہاں زیتون کی کثرت ہے اور دودھ اور شہد موج ملتے ہیں۔ اے بنی اسرائیل تو یہاں مہنگی روٹی نہیں کھائے گا اور کسی شے کی کمی محسوس نہیں کرے گا۔ یہ وہ زمین ہے جس کے پتھر لوہا ہیں اور اس کی پہاڑیوں میں پیتل کی کانیں ہیں۔

قرآن میں بھی مسلمانوں سے وعدہ ہوا کہ ان کو ایسی زمین دی جائے گی

ان لہم جنٰت تجری من تحتہا الانہٰر، کلما رزقوا منہا من ثمرۃ رزقا قالوا" (۱/۳)

(اہلِ ایمان اور نیکوکار لوگوں کو بشارت دے کہ) ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے دریا بہتے ہیں ہر ایک وقت جب ان کو رزق دیا جائے گا تو کہیں گے۔

سندخلہم جنٰت تجری من تحتہا الانہٰر خٰلدین فیہا ابدا" (۵/۸)

قریب تر زمانہ میں ہم ان کو ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے دریا جاری ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے

"وعد اللہ حقا و من اصدق من اللہ قیلا" (۵/۱۵)

اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے بڑھ کر وعدہ کا سچا اور کون ہے۔

"وعدا علیہ حقا فی التورٰۃ والانجیل والقرآن (۱۱/۳)

اس پر سچا وعدہ ہے جو توراۃ انجیل اور قرآن میں کیا گیا ہے۔

میں اس کے متعلق بطور پیش گوئی بتایا گیا تھا۔

ان قوموں کے حق میں جن کو بنی اسرائیل نے بیدخل کیا ارشاد ہے کہ

"فاخرجهنم من جنت وعیون، وکنوز والمقام کریم، کذلک واورثنها بنی اسرائیل" (۲۶) — پس نکالا ہم نے ان کو باغات اور چشموں والی زمین سے اور بیدخل کیا خزانوں اور عزت والی مقام سے یہی سلوک ہم بداعمالوں سے کرتے ہیں اور ان کا وارث بنی اسرائیل کو کر دیا ہے۔

"تلک الجنة التی اورثتموها بما کنتم تعملون لکم فیها فاکهة کثیرة منها تاکلون" (۲۵/۱۳) — (جن کے ساتھ وعدہ پورا ہوا ان کو کہا گیا کہ) وہ جنت یہی ہے جس کا وارث تم کو تمہارے نیک اعمال کی وجہ سے کیا گیا تمہارے لئے اس میں میوے ہیں جو تم کھاتے ہو۔"

"قرآن میں شام کے باغات وغیرہ کے علاوہ دو اور الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ "عدن" اور "فردوس"۔ عراق کے آثار قدیمہ سے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں قدیم زمانہ میں "سماری" قوم آباد تھی یہ کون تھے اس کے متعلق محققین کا اختلاف ہے اور یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ انہی کی زبان کا ایک لفظ "عدن" ہے جس سے وہ بابل میدانی علاقہ تعبیر کرتے ہیں۔ اسی باغ عدن کا ذکر تورات میں تخلیق آدم کے ضمن میں کیا گیا ہے ان ایام میں یہ چار دریاؤں سے سیراب ہوتا، دجلہ اور فرات اب بھی موجود ہیں۔ "فردوس" خالص پارسی لفظ ہے اور پارسیوں کی مقدس کتاب "وندیداد" میں استعمال ہوا ہے اس سے سبزہ زار زمین اور خیابان شاہان فارس مراد ہیں۔ اصل پارسی لفظ "پیرازیدۃ" ہے یہاں سے یونان میں یہ لفظ گیا تو پیراڈائس (Paradise) ہو گیا۔ عبرانی اور عربی میں اس کو "فردوس" سے موسوم کیا گیا۔

حسب ذیل آیات میں تدبر کرنا چاہیئے:۔

"ان الذین امنو وعملوا الصلحت — ہم ان لوگوں کا اجر ضائع نہیں کرتے جو اہل ایمان

قل للمخلفین من الاعراب ستدعون الی قوم اولی باس شدید، تقاتلونهم او یسلمون" (۲۶/۱۰)

اعراب میں سے ان لوگوں کو جو پیچھے بیٹھ رہے کہو تم کو قریب تر زمانہ میں ایک سخت جنگجو قوم کے مقابلہ میں بلایا جائے گا تم ان سے لڑتے رہو گے یا وہ مسلمان ہو جائیں گے

ان آیات کا خطاب ان لوگوں سے ہے جو ایک غزوہ میں شریک نہ ہوئے مسلمان اس وقت کمزور تھے ان لوگوں نے خیال کیا کہ شکست کھائیں گے لیکن جب آنحضرتؐ مظفر و منصور لوٹے تو دوسرے غزوہ میں شرکت کے لئے تیار ہو گئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرے ساتھ تمہیں کسی غزوہ میں شرکت کی اجازت نہیں لیکن میرے بعد قریب تر زمانہ میں تمہیں ایک جنگ جو قوم سے محاربہ کی دعوت خلیفہ وقت دے گا ان آیات میں لفظ "مسلمون" استعمال ہوا ہے

انا لا نضیع اجر من احسن عملا، اولئک لھم جنت عدن تجری من تحتھا الانھر یحلون فیھا من اساور من ذھب ویلبسون ثیابا خضرا من سندس واستبرق متکئین فیھا علی الارائک، نعم الثواب وحسنت مرتفقا" (۱۸/۱۲)

نیکوکار ہیں بہترین عمل کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے عدن کے باغات ہیں۔ جن کے نیچے دریا (دجلہ اور فرات) بہتے ہیں ان میں وہ سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور سبز لباس اور ملائم کی پوشاک اور تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے کیا ہی اچھا ثواب ہے ان کے عمل صالح کا اور کیا ہی خوب ٹھکانہ ہے فائدہ اٹھانے کا۔

"ان الذین امنوا وعملوا الصلحت کانت لھم جنت الفردوس نزلا، خلدین فیھا لا یبغون عنھا حولا" (۱۸/۱۲)

جو اہل ایمان نیکوکار ہیں ان کے لئے فردوس کے باغات بطور مہمانی ہیں اس میں رہائش رکھتے ہوئے ان کا دل کسی اور جگہ نقل مکانی نہ چاہے گا۔

ان آیات میں چند لفظوں میں ایرانی تہذیب و تمدن کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا گیا ہے سونے کے زیور دیبا اور حریر کا لباس اور تخت پر تکیہ ایرانی امارت کی صحیح تصویر ہے۔ رومیوں کا قبضہ شام اور مصر پر چھ سو سال تک رہا ان کے تمدن کا نقشہ بھی سورۃ الدھر" میں کھینچا گیا ہے جس میں ایرانی شوو دخشان کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ایرانی اور رومی آریہ نسل سے ہیں ان کا تمدن ملتا جلتا ہے اور یہ زیادہ پینے والے لوگ ہیں آیات میں "ثم رایت نعیما وملکا کبیرا" (۲۹/۱۹)

شجرۂ نسب قبیلہ قریش

نضر القریش
مالک

حارث (چار پشت بعد)
عبد قیس — عقبہ — فاتح افریقہ
عوف — عبد الرحمٰن

فہر — غالب — لوی — کعب

ضبہ (دو پشت بعد)
عبد اللہ
ابو عبیدہ عامر امین الامۃ
فاتح شام

مصیص (تین پشت بعد)
وائل
ابو العاص
عمرو فاتح مصر

عدی (چھ پشت بعد)
عمرو — زید — سعید
خطاب — عمر فاروق اعظم
عبد اللہ
حفصہ ام المومنین

مرہ

کلاب
عبد العزی (دو پشت بعد)
اسد
خویلد — خدیجۃ الکبریٰ
عوام — زبیر
عبد مناف — عبد شمس

زہرہ
عبد مناف
وہب
آمنہ والدہ آنحضرت
ابی وقاص
سعد فاتح ایران

تیم (تین پشت بعد)
عبد اللہ
طلحہ

تیم (تین پشت بعد)
ابو قحافہ
عبد اللہ ابو بکر صدیق اکبر
عبد الرحمٰن — اسماء — عائشہ صدیقہ — محمد

یقظہ
مخزوم
عمرو
عبد اللہ

ابی حذیفہ
ابو ولید
ام سلمہ
(ام المومنین)

ہشام
عمر ابی جہل
عکرمہ

ولید
خالد سیف اللہ

مرہ
کلاب
عبد مناف

عبد شمس
امیہ
ابو العاص
عفان
عثمان ذی النورین
حرب
ابو سفیان
معاویہ
ام حبیبہ
(ام المومنین)

ہاشم
عبد المطلب
حمزہ
ابی لہب
ابو طالب
عقیل
علی
حسن
حسین
ام کلثوم
(زوجہ عمر فاروق اعظم)

عباس
(تین پشت بعد)
محمد
عبد اللہ سفاح
منصور
موسیٰ

عبد اللہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
قاسم
ابراہیم
فاطمہ
(زوجہ حضرت علی)
رقیہ
ام کلثوم
(ازواج عثمان ذی النورین)
زینب
(زوجہ ابی العاص)

لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں اس کا اطلاق صحیح ثابت ہوا۔

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ابوبکرؓ آپ کے خلیفہ منتخب ہوئے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جس مقصد کے لئے کوئی قوم اٹھتی ہے وہ ایک واحد شخصیت کا تصور ہوتا ہے۔ اس کی تکمیل بھی وہی قوم کرتی ہے جس کا وہ ممتاز فرد ہوتا ہے اور اس مقصد اعلیٰ کی تشریح ہم کر چکے ہیں۔ جس کا مفصل مذکور قرآن عظیم میں ہے۔ آنحضرتؐ قبیلہ قریش کے ممتاز فرد تھے اور آپ کے خلفاء بھی اسی قبیلہ کے ممتاز افراد تھے۔ اس کتاب میں ہم نے شجرہ نسب ان قریشی خاندانوں کا لکھ دیا ہے۔ جن کے افراد مسندِ خلافت پر متمکن ہوئے۔

آنحضرتؐ اور ابوبکر قریب قریب ہم عمر تھے اور بعثت سے پیشتر بھی دونوں میں دوستانہ مراسم تھے۔ ابوبکر کے دل میں آنحضرتؐ کا بہت بڑا احترام تھا۔ آنحضرتؐ کے اخلاق حسنہ کا ہر ایک شخص مداح تھا۔ اور "امین" کے لقب سے مشہور تھے۔ ہر ایک شخص جانتا تھا کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ چنانچہ اس کا اشارہ قرآن میں بھی ہے:

فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہٖ افلا تعقلون (۱۱/۱۶)

تحقیق میں دعویٰ رسالت سے پہلے ایک عمر تم میں (چالیس سال) بسر کر چکا ہوں۔ (اور تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تو کیا اب اللہ کے نام پر جھوٹ بول رہا ہوں)، کچھ تو عقل سے کام لو۔

آنحضرتؐ نے جب دعوتِ اسلام اپنے قرابت داروں اور دوستوں کو دی تو ابوبکرؓ نے فوراً بلا تذبذب قبول کی۔ آنحضرتؐ فرمایا کرتے کہ جب میں نے لوگوں کو دعوت اسلام دی۔ تو اکثر نے انکار کیا۔ اور جن لوگوں نے قبول کی۔ ان کو تذبذب ضرور ہوا۔ مگر ابوبکرؓ نے بلا حیل و حجت و تامل و تذبذب تصدیق رسالت کی اس لئے آپ کا لقب صدیق اکبرؓ مشہور ہو گیا۔

آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری ایام میں مسیلمہ کذاب نے دعوئے نبوت

British

یا۔ خلافت صدیق اکبرؓ کے شروع میں جنگ یمامہ میں مسلیمہ مارا گیا۔ اور اس کے کچھ آدمی اسیر ہو کر دارالخلافت مدینہ منورہ میں لائے گئے۔ مسلیمہ نے ایک قرآن بھی بنایا تھا۔ صدیق اکبرؓ نے اسیران جنگ سے کہا کہ مسلیمہ کے قرآن کی کچھ آیات سناؤ۔ ان لوگوں نے سنائیں تو فوراً لاحول پڑھتے ہوئے فرمایا کہ یہ تو انسانی کلام ہے۔ صدیق اکبرؓ کے قلب سلیم میں حق و باطل پرکھنے کی قابلیت فطری تھی۔

ان اوراق میں ہم اُن تاریخی واقعات کو قلم بند نہیں کریں گے۔ جن کی تفصیل کتب تواریخ میں موجود ہے۔ ہم نے صرف یہ دیکھنا ہے کہ اس مقصد اعلیٰ یعنی تمکین دین کی تکمیل اہل قریش نے کس حد تک کی۔ اور ان کے بعد جب خلافت دیگر امم اسلامیہ میں منتقل ہوئی۔ تو انہوں نے دین کی خدمت کہاں تک کی۔

خلافت اوّل کے دور میں جو صرف دو سال چھ ماہ کا عرصہ ہے۔ عربی قبائل بیک وقت ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلے کے لئے نکلے۔ پہلا لشکر اسامہ بن زیدؓ کے تحت رومیوں کے مقابلہ میں آنحضرتؐ خود تیار کر چکے تھے۔ لیکن ابھی یہ لشکر ایک دو منزل طے کرنے پایا تھا۔ کہ آنحضرتؐ رحلت فرما گئے۔ اس لئے یہ لشکر واپس لوٹ آیا۔ صدیق اکبرؓ نے عنان خلافت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا۔ کہ اسامہؓ کو پھر سے اسی مہم پر روانہ کیا۔ اور اس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے چند کلمات گوش ہوش سے سنو۔ اور ان پر عمل کرنا۔ تم نے ایک اہم ذمہ داری سے سبکدوش ہونا ہے۔ اپنے آپ کو اس منصب کا اہل ثابت کرنا۔ اور کسی حالت میں راستی اور راست بازی کو ہاتھ سے نہ دینا۔ کسی شخص کا مثلہ نہ کرنا (اس کے ہاتھ پاؤں۔ ناک کاٹ کر بدصورت نہ بنانا) بچوں۔ بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔ پھل دار درختوں کو نقصان نہ پہنچانا۔ اور نہ کسی بستی کو نذر آتش کرنا۔ تم ایسے لوگوں پر سے گزرو گے جو اپنی خانقاہوں میں گوشہ نشین ہیں۔ اُن راہبوں سے تعرض نہ کرنا۔ میدان جنگ میں

جو بھی تم سے لڑے اُس سے لڑنا۔ اور اگر مخالف فریق صلح کی طرف جھکے تو صلح بہر حال جنگ سے بہتر ہے یہ اور ایسی ہی کئی پند و نصائح کے بعد فرمایا اب آگے بڑھو اور اللہ کا نام لے کر ہر ایک کام سر انجام دو"۔ ادھر یہ لشکر روانہ ہو رہا تھا۔ اور ساتھ ہی عرب کے مختلف قطاع یمن اور بحرین سے ارتداد کی متوحش خبریں آ رہی تھیں۔ صدیق اکبرؓ کو مشورہ دیا گیا کہ ایسی حالت میں جب کہ مرتدین مدینہ منورہ کی طرف بڑھ رہے ہیں مناسب ہے کہ اس مہم کو جو اسامہؓ کے تحت روانہ ہو رہی تھی۔ التواء میں رکھا جائے۔ صدیق اکبرؓ نے اتنا ہی کہا کہ جس کام کا آغاز رسول کریمؐ نے کیا میرا اولین فرض ہے کہ اس کی تکمیل کردں۔ خواہ مجھے یقین ہو کہ کوئی شیر مجھے مدینہ میں پھاڑ کھائے گا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ صدیق اکبرؓ کو اچھی طرح معلوم تھا۔ کہ ایرانی اور رومی اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات کو پھر سے حاصل کرنے کے لئے ریشہ دوانی عربی قبائل میں کر رہے ہیں۔ اس لئے یہ ضرور تھا کہ بیشتر اس کے کہ ان مرتدین کو ان حریف طاقتوں کی طرف سے کوئی عملی مدد ملے۔ ان کا رابطہ رومی اور ایرانی فوج سے ملحق ہونے سے پہلے ہی کاٹ دیا جائے۔ خوش قسمتی سے ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے۔ کہ مرتدین کو متوقع امداد نہ ملی۔ اسامہؓ کی مہم کامیاب رہی۔ اور وہ جلد ہی مدینہ منورہ کی طرف لوٹ آیا صدیق اکبرؓ نے اسامہ کو مدینہ میں چھوڑا اور آپ بذاتِ خود اصحاب رسول اللہ کے ساتھ مرتدین کی سرکوبی کو نکلے۔ فتنہ ارتداد تھوڑے عرصہ میں ختم ہو گیا۔ اور یہ لوگ پھر سے آغوش اسلام میں آ گئے۔ جب عرب کے طول و عرض میں امن و سکون قائم ہو گیا، تو صدیق اکبرؓ نے قبائل کو دعوتِ جہاد فی سبیل اللہ دی۔ سب قبائل اپنے اپنے سرداروں کے تحت فوج در فوج مدینہ منورہ میں جمع ہوتے رہے۔ اور صدیق اکبرؓ ان کو فوراً بیک وقت ایرانیوں اور رومیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کر دیتے۔

فاضل لیبان "تمدن عرب" میں لکھتا ہے کہ عرب فنون حرب سے جیسا کہ اس وقت ایرانی اور رومی جانتے تھے۔ واقف نہ تھے۔ وہ اتنا ہی اور اس طرح لڑنا جانتے تھے کہ میدان جنگ میں حریف مقابل سے دست و گریبان ہو گئے۔ مارا یا مرے۔ فرانسیسی فاضل ان ایام کے طرز حرب سے خود ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ دستور یہ تھا کہ جب دو لشکر ایک دوسرے

کے سامنے صف آرا ہوتے تو اول دونوں طرف سے ایک ایک مبارز نکلتا۔ دونوں لشکروں کے سامنے میدان میں دونوں اپنے جوہر مردانگی دکھاتے۔ یہ سلسلہ بعض اوقات کئی دن جاری رہتا۔ اور اسی زور آزمائی سے ہر ایک کو حریف کی طاقت کا اندازہ ہو جاتا۔ عرب فن حرب سے اس قدر واقف تھے کہ اکثر مبارز اپنے حریف کو نیچا دکھلاتے اس کے بعد جنگ مغلوبہ ہوتی یعنی دونوں لشکروں کی مٹھ بھیڑ ہوتی۔ ہر ایک جنگ میں عرب ہی فتحمند رہے۔ اگر ایرانی اور رومی ایسے ہی اعلیٰ فن حرب سے واقف تھے تو ظاہر ہے کہ وہ ان کے کچھ کام نہ آیا۔

جہاد جہاد فی سبیل اللہ ایک اصطلاح ہے جو قرآن میں حرب کے مقابل استعمال کی گئی ہے۔ اور اسی کی تعلیم آنحضرتؐ مدت العمر عملاً اپنے اصحاب کو دیتے رہے قرآن میں حرب کی سخت مذمت کی گئی ہے جس کا مقصد صرف انقطاع نسل انسانی اور حیوانی اور لوگوں کے وزائع زندگی پر ڈاکہ ڈالنا اور ان کو اپنی خدمت کے لئے لونڈی اور غلام بنانا تھا اور اسی حرب کا بازار لوگوں میں گرم تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صورت قتال فی سبیل اللہ ہے اور اس کی غرض صرف اتنی تھی کہ حرب سے ہتھیار رکھوا لے۔ ارشاد قرآن ہے کہ :-

فاذا لقیتم الذین کفروا، فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق، فامّا منًا بعد واما فداءً حتی تضع الحرب اوزارھا ذالک" (۴۷)	پس جب تمہاری مٹھ بھیڑ کافروں سے ہو (کفر کا خاصہ ہی حرب ہے) تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک کہ ان کا زور ٹوٹ جائے پھر ان کو قید و بند میں رکھو پیچھے بعد یا احسان رکھ کر آزاد کر دیا تاوان جنگ لے کر چھوڑ دو۔ یہ حالات اس وقت تک قائم رہیں گے جب تک حرب اپنے ہتھیار نہ رکھ دے۔

اس حکم کی عظمت کا تقاضا ہے کہ اہل ایمان اس پر سختی سے عمل کریں۔

لہ مقریزی۔ اور مورخین یورپ کہتے ہیں کہ خلفاء اسلامیہ اور قیصران روم میں "الفداو" کے لئے خاص خاص مقامات کے متعلق معاہدہ ہوتا رہا۔ جہاں اسیران جنگ کا مبادلہ ہوتا یہ مقامات سواحل شام کے بندرگاہ اور ایشیا کوچک کے خبر تھے۔ جو بحر کے قریب واقع ہیں۔ ان میں سے طرسوس کا اکثر ذکر آتا ہے۔ بعض اوقات فدیہ بھی دیا جاتا ہے۔

اگرچہ ہمارے زمانہ میں بین الاقوامی قانون یہی ہے کہ اسیران جنگ کو مخالف شکست خوردہ حریف سے تاوان جنگ لیکر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کا مقصد اس سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ آیات محولہ بالا میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگر شکست خوردہ حریف ادائیگی تاوان کی سکت نہ رکھتا ہو تو بہر حال اسیران جنگ کو احسان رکھ کر چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اس لئے احسان کا مذکور مقدم کیا گیا ہے۔ لیکن بات اتنی ہی نہیں۔ غرض تو یہ ہے حرب ہتھیار رکھ دے۔ اور ہمارے زمانے میں تو حرب اس سے کہیں وسیع تر پیمانہ پر جاری ہے جتنا کہ ایام جاہلیت میں تھا۔ اور یہ جو بحر و بر میں فساد برپا ہے یہی خواہش غلو کا کرشمہ ہے جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے۔ جنگ کے بعد مغلوب قوم کو ایسا جکڑ بند کیا جاتا ہے کہ پھر کبھی آزادی کا نام نہ لے۔ فوجی عدالتیں قائم کی جاتی ہیں خود ہی قاضی خود ہی گواہ۔ خود ہی مدعی۔ مغلوب قوم کے بہترین افراد کو پھانسی اور مختلف میعاد کی قید و بند کی سزا دی جاتی ہے۔ اور جب تک مغلوب کا کچومر نکال کر رکھ نہیں دیا جاتا۔ اس پر فوجی قبضہ رکھا جاتا ہے۔ یہ حرب کی بدترین صورت ہے۔ جو اعلیٰ تہذیب و تمدن کے مدعیان نے پیدا کر رکھی ہے۔ ان کے اعمال ناشائستہ کی بازپرس ہوگی۔ اور ضرور ہوگی۔ سنت اللہ کبھی تبدیل و تحویل نہیں ہوتی۔ رومیوں اور ایرانیوں نے اپنا بد انجام دیکھ لیا یہ بھی دیکھ لیں گے۔

تجزیہ خلافت راشدہ کے تحت رومیوں اور ایرانیوں کو ان ممالک سے بالکل بیدخل کیا گیا۔ جہاں امم سامیہ آباد تھیں۔ ان امم میں اسلام سرعت سے شائع ہونے لگا اس مقام پر یہ واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے راشدین کے احکام کے تحت جو معاہدے باندھے گئے ان میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا کہ قوموں کو مذہبی

سلہ سنہ ۲ھ میں آنحضرت نے جزیرہ نما سینا کے گرجا سینٹ کیتھرائن کے بطریق سے معاہدہ کیا کہ آپ اور تمام مسلمانوں پر عیسائیوں کے حقوق شہریت کی حفاظت لازم ہے اور انکی ذات اور املاک کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے گا۔ راہبوں کی خانقاہوں اور کلیساؤں کی حفاظت

آزادی کامل دی گئی۔ ان کے شہری حقوق بالکل محفوظ تھے۔ اور ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کی جاتی۔ اہلِ کتاب اور صرف اہلِ کتاب سے "جزیہ" ضرور وصول کیا جاتا اور یہ رعائت صرف اہل کتاب کو دی گئی تھی۔ اس رقم جزیہ سے اس فوج کے اخراجات پورے کئے جاتے جو اُن کے جان و مال کی حفاظت کے لئے مقرر کی جاتی۔ اور اگر دو تین سالوں کا بقایا جمع ہو جاتا تو کل رقم معاف کی جاتی اور یہ سمجھا جاتا کہ یہ لوگ ادائیگی کے قابل نہیں۔ جزیہ خفیف ٹیکس تھا۔ اور جب ہم اپنے زمانہ کے ٹیکسوں کی بھرمار دیکھتے ہیں تو جزیہ بے حقیقت رہ جاتا ہے۔ خود مسلمانوں کو زکوٰۃ جو صاحب نصاب تھے ادا کرنی پڑتی۔ جزیہ سے وہ لوگ مستثنیٰ تھے جو صاحب استطاعت نہ تھے ان میں عورتیں اور بچے اور بوڑھے اور مذہبی پیشوا راہب وغیرہ شامل تھے۔ ایسے غیر مسلم جن کو "مسکین" کہتے "بیت المال" سے امداد کے مستحق تھے۔ غیر مسلم جو خلافت کے زیر سایہ آچکے تھے "ذمی" سے موسوم تھے۔ ان کے حقوق کی حفاظت کا خیال خلفاء کو اس شدت کا تھا۔ کہ حضرت عمرؓ کی آخری وصیت کا ایک فقرہ یہ ہے۔ کہ

"ذمیوں کے حقوق کا خیال رکھنا وہ اللہ اور رسول کی ذمہ داری میں ہیں"۔

قرآن حکیم کی متعدد آیات سے واضح ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فساد اور مفسدین کو کو پسند نہیں فرماتا۔ رسول کریم کو جنگ و جدل اور خونریزی سے اتنی نفرت تھی جتنی محبت ایام جاہلیت میں قوموں کو حرب سے تھی آپ ہمیشہ صلح اور امن ہی تلقین فرماتے۔ ارشاد قرآن ہے کہ

ہر مسلمان پر فرض ہے کوئی نادوا ٹیکس وصول نہ ہوگا۔ کسی عیسائی کو ترک مذہب پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ اور نہ کسی گرجا کو منہدم کیا جائے گا۔ زائرین کو زیارت مقامات مقدسہ سے روکا نہ جائے گا۔ اگر کوئی عیسائی عورت کسی مسلمان سے نکاح کرلے تو اُسے ترک مذہب پر مجبور نہ کیا جائے گا۔ گرجاؤں کی مرمت میں مسلمان بھی مدد دے سکتے ہیں اگر طلب کی جائے جو مسلمان ان شرائط کی خلاف ورزی کرے گا سخت سزا کا مستوجب ہوگا۔ ان ہی شرائط پر حضرت عمرؓ نے بطریق یروشلم سے معاہدہ کیا۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ، انہ ھو السمیع العلیم، وان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ ھو الذی ایدک بنصرہ وبالمؤمنین و الف بین قلوبھم لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت بین قلوبھم، ولکن اللہ الف بینھم، انہ عزیز حکیم (۸/۶۰)

اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف جھک اور اللہ پر توکل کر تحقیق وہی سمیع و علیم ہے اور اگر دشمن کا ارادہ محض فریب ہو تو تیرے لئے محض اللہ کی مدد کافی ہے جس نے تجھے اپنی نصرت اور مومنوں سے تقویت دی اور اُن کے دلوں کو جوڑا اور اگر تو زمین کے تمام وسائل بھی کام میں لاتا تو پھر بھی ان کے دلوں کو جوڑ نہ سکتا لیکن (دین) اللہ نے ان کے دلوں کو جوڑا اور وہی اللہ غالب حکمت والا ہے۔

ان آیات کے شروع رکوع میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ "واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ"۔ (اور دشمنان دین کے مقابلہ میں) ہر ایک ممکن قوت جتھا رکھو۔ اور اس کا مظاہرہ بھی کرتے رہو۔ تاکہ وہ مرعوب رہیں۔ اور جنگ و جدل سے باز رہیں اور اکثر آیات میں یہ ہدایت ہے کہ دشمن سے کبھی غافل نہ رہو۔ لیکن اصولاً الصلح خیر"(۴/۱۲۸)

اس میں کچھ شک نہیں کہ ایرانیوں اور رومیوں نے اپنی تمام قوت کے ساتھ مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ اور ہر ایک لڑائی میں منہ کی کھائی۔ لیکن شام اور مصر اور عراق پر ان کا قبضہ غاصبانہ ہی تھا۔ جب ان ممالک کے شہریوں کو عربوں کے حسن سلوک کا علم ہوا۔ تو اکثر شہر بذریعہ معاہدہ صلح ہی مفتوح ہوئے۔ ہم صرف ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔ دمشق ارض شام کا ایک مضبوط قلعہ اور کلید سمجھا جاتا تھا۔ صدیق اکبرؓ کی خلافت میں جب عربوں نے اس کا محاصرہ کیا تو محصورین نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ باب جابیہ پر ابوعبیدہ اور باب شرقی پر خالد بن ولید سپہ سالار افواج تمام ڈٹے تھے۔ محاصرہ طول پکڑ رہا تھا۔ اگرچہ شہر میں رسد کا سامان کافی تھا مگر ہرقل کی طرف سے متوقع مدد نہ پہنچی۔ اسلئے عمائدین شہر نے صلح میں خیر دیکھی۔ خالد بن ولید سخت گیر واقع ہوئے تھے، لیکن ابوعبیدہؓ نرم دل تھے۔ اس کا علم اہل شہر کو تھا۔ اسلئے اس خیال سے کہ نرم با غرت شرائط پر ابوعبیدہؓ کے ذریعہ صلح کا معاہدہ ہو سکتا ہے ایک رات ان کا وفد ابوعبیدہؓ کے خیمہ میں آیا اور متوقع شرائط پر صلح کا عہد باندھا

گیا۔ ابو عبیدہ عمائدین شہر کے ساتھ شہر میں داخل ہو گئے۔ اتفاق سے اُسی وقت خالد بن ولید باب مشرقی کے راستے بزور شمشیر داخل ہو چکے تھے دونوں کی ملاقات بمقام مقلاط یا دیر مریم کے سامنے ہو گئی۔ خالد کو جب معلوم ہوا کہ ابو عبیدہ نے اہل شہر سے صلح کر لی ہے تو کہا کہ "میں سپہ سالار ہوں اور میں نے شہر بزور شمشیر لیا ہے اس صلح کو تسلیم نہیں کرتا۔"
عبداللہ ابن عمرؓ (خلیفہ دوم کے فرزند) ابو عبیدہ کے ہمراہ تھے بول اُٹھے۔ کہ تجھے معلوم نہیں کہ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ ایک مسلمان کا عہد تمام دنیائے اسلام کا عہد ہے اور ابو عبیدہ تو امین الامت ہیں اگر تو اس کے عہد کا پاس نہیں کرتا تو کچھ تعجب نہیں۔ تجھ سے ایسی ہی بے اعتدالی آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی ہوتی رہی۔ اور تیری ناشائستہ حرکت سے رسول کریمؐ نے برأت کا اظہار فرمایا اور بنی جذیمہ کو ان کے مقتولوں کی دیت ادا کی۔" خالد سخت برافروختہ ہوا اور کہا کہ تو ایسی باتیں کرتا ہے تجھ سے یہی توقع ہے تیرا باپ ہمیشہ میرا مخالف رہا ہے اور اپنے پیادوں کو حکم دیا کہ آگے بڑھو۔ لیکن ابو عبیدہ راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ اور کہا کہ جب تک اس قضیہ کا فیصلہ جو میرے اور خالد کے درمیان ہے نہ ہو حرکت نہ کرو۔ اور ساتھ ہی عبداللہ بن عمرؓ کو خاموش رہنے کی ہدایت کی کہ بات بڑھ نہ جائے۔ آخر خالد نے یہ شرط پیش کی کہ اس حصہ شہر پر میرا قبضہ بزور شمشیر تسلیم کیا جائے اور باقی حصہ پر معاہدہ صلح کے مطابق عمل ہو۔ ابو عبیدہ نے انکار کر دیا اور آخر یہ طے پایا کہ یہ قضیہ خلیفہ کے آخری فیصلہ پر چھوڑا جائے اور اس وقت تک شہر میں کسی قسم کی بدامنی نہ ہونے پائے۔

اتفاق کی بات ہے یہاں یہ تنازعہ ہو رہا تھا اور صدیق اکبرؓ کو آنحضرت کے پہلو میں دفن کر رہے تھے آپ کا جانشین عمرؓ ہوا اور یہ قضیہ آپ کے روبرو پیش ہوا۔ آپ نے خالد کو معزول کر کے ابو عبیدہ کو اس کی جگہ سپہ سالار مقرر کیا۔ خالد اس عمر کے حقیقی چچا کا بیٹا تھا جو ابو جہل کے نام سے مشہور ہے۔ خالد فن حرب سے خوب واقف تھا۔ اور آنحضرتؐ نے اس کو "سیف اللہ" کا لقب دیا تھا۔ ابوجہل کا لڑکا "عکرمہ" مسلمان ہوا تو لوگ اسے ابن ابی جہل کہہ کر پکارتے تو رسول کریمؐ کے پاس شکایت کی تو آپؐ نے صحابہ کو منع فرماتے ہوئے کہا۔ کہ مُردوں کو بُرا کہنا زندوں کو تکلیف دینا ہے۔

آنحضرتؐ کو جنگ سے اتنی نفرت تھی کہ حضرت علیؓ کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، تو پوچھا کیا نام رکھا ہے۔ کہا کہ "حرب"۔ یہ نام ایام جاہلیت میں عربوں کو بہت محبوب تھا۔ فرمایا کیا بُرا نام ہے حسن رکھو۔ ان ایام کے حالات ہی ایسے تھے کہ آنحضرتؐ کو بھی مدافعت کرنے کے لئے لڑنا پڑا۔ لیکن تمکین دین کا اتنا پاس تھا کہ غزوہ اُحد میں آپ کا چچا وحشی کے ہاتھ سے شہید ہوا اور آپ کی لاش کا مثلہ کیا گیا۔ لیکن جب وحشی نے اسلام قبول کیا تو کچھ تعرض نہ کیا۔ اسی وحشی کے ہاتھ سے مسیلمہ کذاب مارا گیا۔ وہ اکثر کہتا کہ بحالت کفر میں نے بہترین آدمی کو شہید کیا اور بحالت اسلام بدترین مخلوق کو مارا۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ اگر میری کسی کافر سے مٹھ بھیڑ ہو جائے اور وہ میرا ایک ہاتھ کاٹ دے اور پھر ایک درخت کی آڑ لے کر مجھے کہے کہ میں نے اسلام قبول کیا تو مجھے کیا کرنا چاہیئے آپ نے فرمایا کہ اس کے بعد تیرا اس پر ہاتھ اُٹھانا سخت ناواجب ہے۔ اُس نے کہا کہ اس حالت کے بعد بھی کہ اُس نے میرا ہاتھ کاٹ دیا۔ فرمایا "ہاں"۔ اگر تو نے قبول اسلام کے بعد اس پر ہاتھ اُٹھایا تو اس کی جگہ ہوگا جیسا کہ وہ قبول اسلام سے پہلے تھا یعنی کافر اور اگر وہ تیرے ہاتھ سے مارا گیا تو وہ تیری جگہ ہوگا جیسا کہ تو اس سے پہلے تھا یعنی مسلمان۔

اسامہ بن زیدؓ کو لوگ "حب رسول" کہتے۔ ایک لڑائی میں ایک شخص کو نیچے گرا لیا اس نے کلمہ شہادت پڑھا۔ مگر اسامہ نے اس کو قتل کر دیا اور یہ واقعہ رسول کریم کو سنایا آپ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اور فرمایا "اے اسامہ کل لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے"! عذر کیا کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لئے کلمہ پڑھا۔ فرمایا کیا تو نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا۔ تجھ سے ضرور اس کی باز پرس ہوگی۔ حضرت اسامہ یہ واقعہ حضرت علیؓ سے اس وقت بیان فرما رہے تھے جب آپ کو امیر معاویہ کے مقابلہ میں دعوت دی، اور کہا کہ اے برادر رسول میں بار بار عرض کرتا رہا اور آنحضرت بار بار یہی فرماتے کہ کل لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے ہیں اتنا نادم ہوا کہ کہا کہ کاش میں آج مسلمان ہوا ہوتا کہ اسلام پچھلے قصور جو بحالت کفر سرزد ہوں معاف کر دیتا ہے' اور آنحضرتؐ کے حضور عہد کیا کہ آئندہ کسی کلمہ گو پر ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔ اے علی اگر تو کہے تو میں شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے لئے تیار ہوں۔ مگر

کلمہ گو مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے مجھے معذور ہی سمجھو۔

صدیق اکبرؓ کی شروع خلافت میں جب ارتداد کا زور تھا تو بنو کندہ کے سردار اشعث نے بھی مقابلہ کیا۔ قلعہ بند ہو کر کچھ عرصہ لڑا۔ آخر صلح کی یہ شرط پیش کی کہ اس کی قوم کے نو آدمیوں کو ان کے اہل و عیال سمیت امان دی جائے۔ اس فہرست میں اپنا نام لکھنا بھول گیا۔ گرفتار ہو کر جب صدیق اکبرؓ کے حضور پیش ہؤا تو فرمایا کہ تو نے ارتداد کے بعد مسلمانوں کو قتل کیا اس لئے واجب القتل ہے۔ ندامت سے گردن جھکالی اور کہا کہ اے خلیفہ رسول میں توبہ کرتا ہوں میرا اسلام قبول فرمائیے۔ صدیق اکبر نے کہا کہ اچھا امید ہے کہ آئندہ نیکی کے سوا تجھ سے اور کوئی فعل سرزد نہیں ہوگا اور تمام اسیران بنو کندہ کو چھوڑ دیا۔

حضرت صدیق اکبرؓ

آپ کا عہد خلافت دو سال اور چار یا چھ ماہ رہا۔ آپ نحیف البدن تھے، سفید چہرے پر رگیں نمایاں تھیں۔ رخسار ہلکے تھے، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ آپ بہت نرم دل تھے۔ لیکن آپ کی رائے صائب ہوتی۔ اور انتظام خلافت آپ کے مضبوط ہاتھوں سے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام پاتا رہا۔ بازاروں اور کوچوں سے گزرتے تو چھوٹے چھوٹے بچے دوڑ کر "بابا" "بابا" کہتے ہوئے لپٹ جاتے مسجد نبوی میں لیٹے ہوتے تو بچے آپ کے پیٹ پر کھیلتے۔

جمادی الثانی ۱۳ھ میں آپ بیمار ہو گئے اور پندرہ روز شدت کا بخار رہا۔ آپ

آپ جب تک خلیفہ رہے امامت کے فرائض بھی خود ادا کرتے رہے۔ اب آپ کے حکم سے حضرت عمرؓ بحیثیت امام نماز پڑھاتے رہے آپ نے سمجھ لیا تھا کہ وقت آخیر ہے اس لئے صحابہ کبار سے اپنے جانشین کے متعلق مشورہ کرنے آپ کی رائے حضرت عمرؓ کے حق میں تھی۔" طلحہؓ" نے کہا کہ "آپ خدا کو کیا جواب دیں گے کہ عمر جیسے سخت گیر آدمی کو ہم پر امیر مقرر کر دیتے ہیں!" آپ نے حاضرین سے کہا کہ مجھے اٹھا کر بٹھا دو۔ پھر طلحہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "میں اپنے رب کو کہوں گا کہ میں نے تیرے بندوں پر تیرے بہترین بندے کے حق میں وصیت کی ہے اس میں کچھ شک نہیں کہ عمر سخت گیر ہے لیکن غیرت فی الدین کا جذبہ اس میں شدت سے ہے اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں نرم دل تھا جب اس کے سر پر بار خلافت پڑے گا۔ تو خود بخود نرمی اختیار کرے گا۔" اس کے بعد حضرت عثمانؓ کو جو آپ کی طرف سے کتابت کیا کرتے کہا کہ میری وصیت لکھو۔

"یہ وہ عہد ہے جو ابوبکر خلیفہ محمد رسول اللہ نے ایسے وقت میں لکھوایا ہے جب کہ دنیا میں اس کا آخری اور آخرت کا اول وقت ہے، ایسی حالت میں جب کہ کافر بھی ایمان لاتا ہے اور فاجر بھی یقین کرتا ہے میں نے تم لوگوں پر عمر ابن خطاب کو امیر مقرر کیا ہے اور میں نے تمہاری بھلائی میں کوتاہی نہیں کی پس اگر عمر ثابت قدم رہا اور عدل کرتا رہا تو میری ذاتی واقفیت اور رائے اس کی سیرت کے حق میں ایسی ہی ہے اور اگر برائی کی اور بدل گیا تو مجھے غیب کا علم نہیں ہے۔ میں نے تو نیکی کا قصد کیا ہے ہر ایک شخص اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے" وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون"

وصیت لکھوا چکے تو دعا کی۔

"بار خدایا اس کام سے میرا مقصود صرف ان کی اصلاح ہے، مجھے ڈر تھا کہ اگر میں وصیت نہ کروں تو وہ فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے اس لئے میں نے یہ کام کیا اور تو میری نیت سے خوب واقف ہے میں نے اس امر میں اپنے اجتہاد سے کام لیا ہے اور ان پر ایسا والی بنایا ہے جو سب سے بہتر سب سے

قوی تر اور سب سے زیادہ نیکی پر حریص ہے۔"

اس کے بعد عمر کو طلب کیا اور کہا کہ اے عمر میں نے تجھے خلافت کے لئے منتخب کیا ہے۔ عمرؓ نے کہا کہ" مجھے خلافت کی ضرورت نہیں" فرمایا "خلافت کو تیری ضرورت ہے" عمر کا دل صدیق اکبرؓ کی حالت دیکھ کر بھر آیا۔ کچھ لڑکھڑاتی ہوئی آوازیں آنے کو تھیں۔ کہ صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ

"اے عمرؓ میں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ سے ظاہر و باطن ڈرتے رہنا۔" اے عمر بے شک اللہ کا ایک حق رات میں ہے جس کو وہ دن میں قبول نہ کرے گا اور اس کا ایک حق دن میں ہے جس کو وہ رات میں قبول نہ کرے گا۔ بے شک اللہ تعالےٰ نوافل کو قبول نہ کرے گا جب تک فرائض ادا نہ کئے جائیں۔ اے عمر جن کے اعمال قیامت کے دن بھاری ہوں گے وہی گراں قدر ہیں اور جن کے ہلکے ہوں گے وہ سبک ہوں گے اے عمر کیا تم نہیں دیکھتے۔ کہ قرآن میں نرم آیات کے ساتھ شدت کی اور شدت کی آیات کے ساتھ نرم آیات نازل ہوئی ہیں تاکہ مومن اللہ سے ڈرتا رہے اور مغفرت کا طالب ہو۔ اے عمر جب اہلِ نار کا ذکر آئے تو یہ کہنا کہ اے اللہ مجھے امید ہے کہ تو مجھے ان میں سے نہ کرے گا۔ اور جب اہلِ جنت کا مذکور ہو تو اور ان کے اعمال صالح کا بیان ہو تو دعا کرنا کہ اے اللہ مجھے ان میں شامل کر اور جب تم میری وصیت پر عمل کروگے تو مجھے اپنے پاس بیٹھا ہوا پاؤ گے۔"

صدیق اکبرؓ کی عمر آنحضرتؐ کی عمر کے برابر تریسٹھ برس ہوئی۔ عجیب اتفاق ہے کہ آنحضرتؐ اور صدیق اکبرؓ سہ شنبہ کی رات کو دفن ہوئے۔ آپ نے یہ بھی وصیت کی۔ کہ مجھے میرے پرانے کپڑوں میں دفن کرنا۔ نئے کپڑوں کی ضرورت زندوں کو ہوتی ہے۔ آپ کو آنحضرتؐ کے پہلو میں رکھا گیا۔ آپ کا سر آنحضرتؐ کے دوش مبارک کے برابر رکھا گیا آپ کی لحد کو آنحضرتؐ کی لحد سے ملا دیا گیا۔

حسان بن ثابتؓ نے مرثیہ لکھا:۔

اذا تذکرت شجوا من اخی ثقۃ — فاذکر اخاک ابابکر بما فعلا

جب تم اپنے کسی پرہیزگار بھائی کی مصیبت کو یاد کرو تو ابوبکر کے حالات کو پیش نظر رکھو۔

خیر البریۃ اتقاھا واعدلھا — بعد النبی واوفاھا بما حملا

وہ نبی کے بعد تمام مخلوق سے بہتر سب سے زیادہ پرہیزگار۔ اور سب سے زیادہ عادل اور سب سے زیادہ فرائض ادا کرنے والا تھا۔

الثانی التالی المحمود مشہدہ — واول الناس منھم صدق الرسلا

نبی کے ہمراہ وہ دوسرے شخص تھے جن کا مشہد پسندیدہ ہے اور سب سے پہلے رسول کی تصدیق اس نے کی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے حضرت زیدؓ نے تصدیق رسالت کی حضرت زیدؓ کے سوانح حیات ہم نے اپنی کتاب "حضرت زیدؓ" میں بیان کئے ہیں اس مقام اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر زید لڑکپن کی حالت میں ڈاکوؤں کے ہاتھ پڑے اور بطور غلام مکہ کی منڈی عکاظ میں فروخت ہوئے۔ تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بھائی نے خرید لیا۔ اور بہن کی نذر کیا بہن نے آنحضرتؐ کے حوالہ کر دیا۔ آنحضرتؐ نے فوراً آزاد کر دیا، زید کے لواحقین تلاش میں تھے جب سراغ مل گیا، تو روپیہ لے کر آنحضرت کی خدمت میں آئے آپ نے فرمایا کہ وہ تو آزاد ہے اور اگر تمہارے ساتھ جانا چاہے۔ تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن زید نے آنحضرتؐ سے جدا ہونا نہ چاہا۔ لواحقین نے کہا کہ تیرا بُرا ہو تو غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتا ہے، جواب دیا کہ اس شخص کی غلامی ہزار آزادی سے بہتر ہے۔ جو حسن سلوک میں دیکھ چکا ہوں وہ مجھے اس بات پر مجبور کرتا ہے تم مطمئن رہو۔ قرآن میں کسی صحابی کا نام مذکور نہیں لیکن حضرت زید کا ہے۔ پہلا سپہ سالار لشکر اسلام جو آنحضرتؐ نے رومیوں کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا زید تھا۔ اور آپ کے ماتحت معزز صحابی اور رسول کے چچا کا لڑکا جعفر اور خالد بن ولید بھی تھا۔ جنگ موتہ میں زیدؓ شہید ہوئے۔ تو دوسری مہم تیار ہوئی اس کا سپہ سالار زید شہید کا بیٹا اسامہ تھا اور اس کے ماتحت حضرت عمر بھی تھے، مؤرخین کی رائے ہے کہ اگر زید زندہ رہتا تو غالباً وہی خلیفہ اول ہوتا

ان واقعات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس مقصد کے ساتھ عرب اٹھے اور اسکی اشاعت
ہر ایک امر پر مقدم رکھی۔

خلافت

غالباً بعض اہل الرائے حضرات کے دل میں یہ خیال ضرور کھٹکے گا کہ خلافتِ راشدہ وہی کچھ تھی، جسے آج کل "ڈکٹیٹر شپ" (Dictatorship) کہتے ہیں، اس لئے اس مقام پر اس طرزِ حکومت کی جو انتظامیہ تھی اور جس کو "خلافت" سے موسوم کیا گیا ہے تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے

یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ وحدت ہمیشہ کثرت پر غالب رہے گی۔ بلحاظ حکومت اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات کل کائنات پر حکمران ہے جس کے وضع کردہ قوانین کو لسان قرآن میں سنت اللہ" کہتے ہیں کبھی تبدیل و تحویل نہیں ہوتے، حکومت کی مختلف صورتیں ہیں جو انسانی اختراع ہے۔ حکومت خواہ شخصی ہو یا دستوری یا جمہوری ایک فرد شخصیت ہمیشہ ممتاز نظر آئے گی، خواہ یہ مطلق العنان بادشاہ ہو یا وزیر اعظم ہو یا صدر ہو کسی اور نام سے موسوم ہو، حکومت کی مختلف صورتوں میں کون سی بہتر ہے؟ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا صحیح حل حالات وقت ہی کر سکتے ہیں، ایرانیوں اور رومیوں میں حکومت کی ہر ایک صورت رونما ہوتی رہی، جمہوریت کے بعد شخصی حکومت بھی رہی، فرانس میں شخصی حکومت کے بعد انقلاب نے جمہوریت قائم کردی لیکن فرانس کو وہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوئے جو شخصی حکومت کے تحت دیکھ چکا تھا۔

بات اصل میں یہ ہے کہ یہ حکومتیں اور ان کی مختلف صورتیں انسانی ذہنی اور مادی ارتقا کے سلسلہ میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے، حکومت کی کوئی بھی صورت ہو اچھی ہے۔ اگر خارجی حالات کے تقاضہ کو پورا کرتی ہے اور ہر ایک حکومت بری ہے اگر خارجی حالات کے مقتضی نہ ہو۔ بہت کچھ قوموں کی ذہنیت پر منحصر ہے اگر وہ خارجی حالات کے مناسب بدلتی رہے اور اس کا مقصدِ حیات یا وہ نصب العین زندہ ہے جس کے ساتھ وہ ابھریں تو وہ قوم بھی زندہ ہے لیکن یاد رہے کہ نصب العین کو بھی بہ تقاضائے خارجی حالات بدلنا ہوگا۔ اور اگر نہ بدلا گیا تو قوم پر ذہنی جمود چھا جائے گا اور وہ دیر سویر مٹ جائے گی۔

اگر ہم تاریخ عالم کی ورق گردانی کریں تو یہ حقیقت جو ناقابل انکار ہے خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر اور اب بھی غیر مسلم اقوام کا نصب العین قومی علو اور اقتدار رہا ہے، جسے وہ قائم نہ رکھ سکے، جو کل حاکم تھے محکوم اور جو غالب تھے مغلوب ہو کر رہ گئے، مؤرخین نے قوموں کے عروج و تنزل کے اسباب پر بحث کی ہے، جو بلا شبہ وقیع ہے لیکن ہماری تسلی کے لئے کافی نہیں، ہم قوموں کو بلندی کی طرف پرواز کرتے ہوئے دیکھتے چلے آرہے ہیں اور ان کو برباد ہوتا بھی مشاہدہ کرتے چلے آرہے ہیں لیکن انسانیت مسلسل ترقی کر رہی ہے اور یہ کبھی منقطع نہیں ہوئی، اس لئے تاریخی واقعات سے ہمیں سبق ملتا ہے، کہ اصل مقصد انسانیت کا ارتقاء ہے، اس حصول مقصد کے لئے مختلف قرون میں جو بھی ذرائع استعمال ہوتے رہے وہ منقطع ہوتے رہے، یہ حقیقت آنحضرتؐ کے قلب سلیم پر منکشف ہو چکی تھی اور اسی کا بیان قرآن عظیم میں ہے، جس کا خطاب کسی ایک قوم سے نہیں بلکہ کل عالم انسانی سے ہے "یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا" یہ دعوئے رسالت آپ سے پیشتر کسی نے نہیں کیا۔

افراد سے قوم اور قوموں سے عالم انسانی کا نشوونما ہوا ہے اس لئے افراد اور قوموں کی ذہنیت کو بدلنا اور اس حقیقت سے روشناس کرنا آنحضرتؐ کی رسالت کا منشا ہے آنحضرتؐ نے ایک نصب العین عالم انسانی کے سامنے رکھ دیا جس کی تشریح ہم کر چکے ہیں اور واضح کر دیا کہ انسان کی تخلیق کا مقصد یہی ہے جس کی تکمیل اللہ تعالیٰ ذی المعارج درجہ بدرجہ فرما رہا ہے "لترکبن طبقا عن طبق فما لھم لا یؤمنون" (۳۰) البتہ تم ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف ترقی کرتے جاؤ گے، تو تمہیں کیا ہے کہ اس حقیقت پر یقین نہیں کرتے، خلافت اسلامیہ کا مقصد بھی یہی کچھ ہے کہ اول عالم انسانی کو اس حقیقت سے روشناس کیا جائے اور اس کے بعد عالم انسانی اس خلافت کا منشا سمجھ لے جو اس کے جد امجد آدم کو عطا ہوئی اور وہ یہ ہے،

"انسان کہ فلک ہاست سر افگندۂ او | در حیرت از گم است واماندہ او کو
دارد خواہشے کہ در خارج و ذہن کو | ہر چیز کہ آفریدہ شد بندہ او"
(بیدل)

ان اوراق میں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس پیغام حق کو ائمہ اسلامیہ نے کس طرح لوگوں تک پہنچایا اور کس حد تک کامیاب ہوئے۔ آنحضرتؐ اور قرآن کی ذمہ داری اس حد تک تھی کہ آپ پر بلاغ فرض تھا۔ اور اس فرض سے خوش اسلوبی کے ساتھ سبکدوش ہوئے، قرآن عالم انسانی کو تذکر و تفکر کی دعوت دیتا ہے " فمن شاء اتخذ الیٰ ربہ سبیلا"

فاروق اعظمؓ

صدیق اکبر کے بعد حضرت عمر فاروق اعظم مسند خلافت پر متمکن ہوئے بقول ملک الشعراء فردوسی

عمر کرد اسلام را آشکار ۔ بیاراست گیتی چو باغ و بہار

صدیق اکبرؓ کی خلافت کی بہت بڑی کامیابی یہ ہے کہ عمر جیسا شخص جانشین چھوڑا۔ اس خلافت کے دور میں جو تاریخی واقعات ظہور میں آئے اُن کی تفصیل کتب تاریخی میں موجود ہے یہ صحیح ہے کہ فاروق اعظم کے کارناموں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہر ایک مؤرخ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ پھر بھی صدیق اکبرؓ کے درجہ کو نہیں پہنچ سکے اور اسی طرح حضرت عمرؓ کے جانشین آپ کے رتبہ سے کمتر رہے ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں، وہ ایک مؤرخ محقق کی حیثیت سے لکھ رہے ہیں۔

حضرت عمر ستر سال کی عمر میں تیرہ برس خلافت کے بعد ایک ایرانی غلام کے خنجر سے عین نماز کے وقت شہید ہوگئے۔ زخمی ہو کر گرے تو پہلا سوال یہ تھا کہ مجھے کس نے مارا جب لوگوں نے ایرانی غیر مسلم کا نام بتایا تو کہا کہ" الحمد للہ، اگر میں کسی مسلمان کے ہاتھ سے مارا جاتا تو سمجھا جاتا کہ لوگ میری خلافت سے مطمئن نہیں تھے اخلافت کے آخری ایام میں آپ

اکثر مغموم نظر آیا کرتے۔ دریافت پر فرمایا کرتے کہ حیران ہوں کہ اپنے بعد کس کو نامزد کروں، مجھے تو کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جو اس بارِ امانت کا متحمل ہو سکے۔ لیکن آپ نے جب زخمی ہو کر گرے چھ اشخاص کا نام لیا۔ کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ مقرر کر لینا

بعض مؤرخین کو یہ غلط فہمی ہے کہ خلیفہ کا تقرر جمہور کے اکثریت کی رائے پر موقوف ہے ہم بیان کر چکے ہیں کہ خلافت انتظامیہ حکومت ہی ہے اور اس کی کوئی صورت متعین نہیں، خلیفہ کا تقرر خواہ کسی طریق سے ہو اور مختلف طریق بھی ہیں اور ان کے مطابق بننا بھی رہا قابل توجہ امر نہیں۔ اگر بہترین شخص کا تقرر ہو خواہ وہ اپنا راستہ خود پیدا کرے لوگ اس کے حق میں ہوں یا کسی اور طریقہ سے برسر اقتدار آجائے ایسے امور نہیں جو متعین کی بحث کا موضوع ہوں جمہور کی اکثریت کی رائے کا احترام ضرور کیا جاتا ہے حضرت صدیق اکبرؓ جب عمرؓ کے حق میں وصیت کر چکے تو آپ کو باہر لایا گیا لوگ خلیفہ کی بیماری کی خبر سن کر جوق در جوق جمع ہو رہے تھے آپ نے حضرت عثمان کو کہا کہ میری وصیت سنا دو۔ لوگوں نے "سمعنا واطعنا" کی آواز بلند کی۔ لیکن جمہور کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی، اہل الرائے بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ اور اُن ہی کی رائے کا اتباع عام لوگ کرتے ہیں، آنحضرتؐ نے کسی کے حق میں کوئی وصیت نہیں فرمائی صدیق اکبر کا انتخاب فوری واقع ہوا۔ صحابہ رسول کریمؐ کی تجہیز و تکفین سے ابھی فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ اطلاع ملی کہ انصار مدینہ بنی ساعدہ کے سقیفہ میں جمع ہو رہے ہیں، تاکہ سعد بن عبادہ کے ہاتھ پر بیعت کریں سعد قبیلہ خزرج کے سردار تھے اس جگہ صدیق اکبر کی شخصیت نے وہ کام کیا جو ہزار دلائل سے بھی نہ ہوتا۔ اسی جگہ صدیق اکبر کے ہاتھ پر چند مہاجرین نے جو موجود تھے اور اکثر انصار نے بیعت کی بیعت عامہ دوسرے روز ہوئی۔ اسے ایسا انتخاب کہہ سکتے ہیں جو رائے عامہ سے ہو۔ مگر مدینہ منورہ سے باہر کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی، اور نہ اُن سے پوچھا گیا۔ صدیق اکبر نے چند اکابر اصحاب سے مشورہ ضرور کیا اور عمرؓ کے حق میں وصیت کی۔ عمرؓ نے معاملہ شوریٰ کے حوالہ کر دیا جو چھ اشخاص علی زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔ شوریٰ نے حضرت عثمان کو

منتخب کیا۔ حضرت عثمان ایسی حالت میں شہید ہوئے کہ اپنے جانشین کے بارے میں کوئی وصیت نہ کر سکے اور اگر کرتے بھی تو کون تسلیم کرتا، کیونکہ باغیوں کا ان سے مطالبہ یہ تھا کہ خلافت سے دست بردار ہو جاؤ، انہی لوگوں نے عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کو خلیفہ تسلیم کیا۔ حضرت علی کو فہ میں ابن ملجم کے خنجر سے زخمی ہوئے، زخم مہلک ثابت ہؤا، کوفیوں نے آپ سے دریافت کیا کہ کیا آپ کے بعد آپ کے بڑے بیٹے حسن کو خلیفہ مقرر کیا جائے، فرمایا کہ اگر لوگ متفق ہوں، چنانچہ امام حسن کو کوفیوں نے خلیفہ تسلیم کر لیا، مگر آپ امیر معاویہ کے حق میں بردار ہو گئے، ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کے تقرر کا کوئی قانون اور قاعدہ نہ تھا بہ تقاضائے حالات مختلف طریقوں سے تقرر ہوتا رہا، انتخاب تو بحالت امن ہی ممکن ہے ہمارے زمانہ میں ووٹوں کے ذریعہ انتخاب عمل میں آتا ہے، یہ طریقہ بھی مستحسن ہے لیکن اسی صورت میں کہ عوام میں سیاسی بیداری ہو، اور وہ اپنے شہری حقوق کی قدر و قیمت جانتے ہوں۔ اور یہ کہ ہر ایک کے دل میں یہ جذبہ ہو کہ بہترین آدمی کو منتخب کرنا ہے، لیکن یہ "پارٹی بازی" جو اہل یورپ کی سیاسیات میں نمایاں ہے اسلام میں قطعاً ممنوع ہے۔ ان میں قطعاً کوئی فرقہ بندی اور تفرقہ نہیں ہونا چاہیئے، اور "شوریٰ" میں اس کا مظاہرہ کیا جائے، شوریٰ میں ہر ایک شخص کو رائے "المستشار موتمن" کے تحت ہی دینی چاہیئے جس میں قوم اور سلطنت کا خاص مفاد مد نظر ہو، استخلاف اور وصیت اور شوریٰ اصطلاحیں ہیں جن کے ذریعہ اول تین خلفاء کا تقرر ہوا، لیکن ان طریقوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ حالات ہی اس گتھی کا بہترین حل کر سکتے ہیں،

حضرت عثمان کے عہد خلافت میں فتوحات کا سلسلہ مشرق و مغرب میں جاری رہا اور دور دور تک پھیل گیا، لیکن دیرینہ اموی اور ہاشمی رقابت ایک آگ تھی جو اول دو خلفاء کے عہد میں دبی رہی اب بھڑک اٹھی، عثمانؓ اموی تھے اور علیؓ ہاشمی حضرت علیؓ کو یہ توقع تھی کہ عمرؓ کے بعد لوگ آپ کی خلافت کو تسلیم کر لیں گے لیکن انتخاب حریف قبیلہ کے ایک ممتاز فرد کا ہؤا، اگر سعد بن ابی وقاص فاتح ایران خلیفہ مقرر ہوتے جن کی نسبت عمرؓ نے شوریٰ کا تقرر کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ان کو معزول کر دیا تھا، مگر یہ ان کے

انتخاب میں مانع نہ سمجھا جائے تو غالباً حضرت علیؓ بھی اسی طرح خاموش رہتے جس طرح اول دو خلفاء کے عہد میں رہے، خود حضرت علیؓ شاید اب بھی چپکے رہتے مگر قبیلہ ہاشمیہ کے لوگوں کو عثمان کا تقرر ناگوار ہی گذرا شجرہ نسب اس کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے، اس پر ایک ہی نظر سے معلوم ہو جائے گا کہ دونوں قبیلوں میں قرابت قریبہ ہے۔

مدینہ منورہ دار الخلافت تھا اور اسی جگہ باغیوں نے اپنا مرکز سازش قائم کیا، جب ان لوگوں کو کافی تقویت حاصل ہو گئی، تو عثمانؓ سے مطالبہ کیا کہ خلافت سے دست بردار ہو جاؤ۔ آپ نے انکار کیا، تو آپ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور آپ کو وہیں شہید کر دیا، آپ کی عمر اس وقت اسی برس کے لگ بھگ تھی، باغیوں نے تو غالباً یہ سمجھا ہو گا کہ ایک شخص کے قتل کا تمام دنیائے اسلام پر کچھ اثر نہ ہو گا۔ مگر اس ایک واقعہ نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آگ لگا دی اور خانہ جنگی شروع ہو گئی،

امیر معاویہ دمشق میں اول دو خلفاء کے عہد میں عامل شام تھے اور عہد عثمانی میں بھی رہے آپ اموی تھے اور حضرت عثمانؓ سے قرابت قریبہ بھی تھی بغاوت کے حالات کی اطلاع ہوئی، تو ایک لشکر لے کر مدینہ کی طرف بڑھے لیکن جب راستہ میں پتہ لگا کہ باغیوں نے خلیفہ کو شہید کر دیا تو بقول طبری اس خیال سے لوٹ گئے کہ اس سازش میں اصحاب رسول اللہؐ بھی شامل تھے اور امیر معاویہ نے مکروہ جانا کہ ان سے لڑے لیکن جب حضرت علی کا تقرر ہوا اور آپ پر بھی یہ الزام تھا کہ اس سازش میں شریک تھے تو حالات کا تقاضا کچھ اور تھا، حضرت عثمانؓ پر باغیوں نے الزام تراشا وہ یہ تھا کہ آپ اپنے لواحقین بنو امیہ کی زیادہ رعایت کرتے ہیں بات صرف اتنی ہی تھی لیکن بعد میں ایسے واقعات اختراع کئے گئے جو محض کذب کا طومار ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح العامری حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے آنحضرتؐ کے کاتب وحی بھی تھے، اور کتابت میں رد و بدل بھی کیا کرتا اور مرتد ہو گیا، اور مرتد ہو کر مکہ کی طرف بھاگ گیا، جب مکہ فتح ہوا تو آنحضرت نے چند دشمنان دین کا قتل جائز قرار دیا ان میں ایک عبد اللہ مذکور بھی تھا، اس نے حضرت عثمان کے مکان میں پناہ لی، اور آنحضرت نے حضرت عثمان کی سفارش پر معاف کر دیا۔ اسی عبد اللہ کو

حضرت عثمان نے تسخیر افریقہ پر مامور کیا۔

عبداللہ کاتب وحی شاید ہو لیکن جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ نے اپنے ذمہ لیا اور کاتبان وحی کی نسبت ارشاد ہے کہ "بایدی سفرۃ کرام بررۃ" (بپ) اس کی نسبت دشمنان دین یہ ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ محفوظ کتاب نہیں یہ روایت اندلسی ہی اور احادیث موضوعہ جو "صحاح" میں نقل کی گئی ہیں محض اختراع ہیں، البتہ واقعہ صرف اتنا ہی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ذمہ داری کے عہدے انہی کو دیئے جو آپ کے نزدیک قابل اعتماد تھے، عبداللہ کو پہلے افریقہ میں چھاپہ مار دستوں کا افسر مقرر کیا گیا، جب اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تو افریقہ میں سپہ سالار مقرر کر دیا آپ نے بیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ شمالی افریقہ سے رومیوں کو بالکل بے دخل کر دیا، عمرو بن العاص کے بعد عبداللہ بن سعد بن ابی سرح نے اسلامی فتوحات کا سلسلہ کامیابی کے ساتھ افریقہ میں جاری رکھا بعض فسانہ نگار مورخین نے عبداللہ کی نمایاں خدمات کو کم کرنے کے لئے ایک قصہ بطریق اور اس کی لڑکی کا بیان کیا ہے کہ بطریق نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص سپہ سالار افواج اسلامی کو قتل کرے گا اپنی لڑکی اس کے نکاح میں دے گا، عبداللہ ڈر کے مارے خیمہ سے باہر نہ نکلتے تھے، کہ عبداللہ بن زبیر نے مشورہ دیا کہ تم یہ اعلان کر دو کہ جو شخص جرجیس کو قتل کرے گا وہ اس کی لڑکی کا حق دار ہوگا، چنانچہ ابن زبیر نے جرجیس کو قتل کیا، اور خود جرجیس کی لڑکی نے تمام لشکروں سے ابن زبیر کو شناخت کیا کہ وہ اس کے باپ کا قاتل ہے، اور ابن زبیر کو یہ لڑکی ابن ابی سرح نے دے دی۔ یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں محض افسانہ ہے،

بات اتنی ہی ہے کہ حضرت عثمان کے تقرر سے بنو امیہ کا زور بنو ہاشم کو ناگوار گذرا اس لئے آپ اس بغاوت کا شکار ہوئے اس کے ضمن میں جو الزامات تراشے جاتے ہیں، ان کی تاریخی حیثیت کچھ بھی نہیں،

حضرت علیؓ نے عثمان خلافت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ان تمام حاکموں کو جو صدیق اکبرؓ سے لے کر عثمان ذی النورین تک مختلف ممالک میں متعین تھے اور بالخصوص

ان کو جن کا تقرر عہدِ عثمانی میں ہوا تھا معزول کر دیا اور ان کی جگہ ان لوگوں کا تقرر
کیا جو قتل عثمان کی سازش میں سرغنہ تھے، معزول کردہ عمال میں امیر معاویہ بھی تھے
تمام مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اس وقت چار اشخاص عقلاء عرب مشہور تھے
معاویہ بن ابی سفیان، دوم عمرو بن العاص فاتح مصر اس کی نسبت مشہور تھا کہ اگر کسی
شہر کے آٹھ دروازے ہوں اور ان میں داخل ہونا کسی حیلہ پر منحصر ہو۔ تو عمرو بن العاص
آٹھوں دروازوں میں داخل ہو سکتا ہے، سوم مغیرہ بن شعبہ جو آنحضرتؐ اور خلافت
تک سفارت کے اہم فرائض اکثر انجام دیتا رہا۔ چہارم زیاد بن ابی سفیان جیسا ناسخ التواریخ
ایک متعصب ایرانی شیعہ ہے لکھتا ہے کہ "جب حضرت علی مسندِ خلافت پر بیٹھے تو مغیرہ
نے کہا کہ "امیر المومنین ایک مشورہ دیتا ہوں، ماننا نہ ماننا آپ کا اختیار ہے لیکن حالات
کی نزاکت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب ہے کہ سردست امارتِ کوفہ طلحہ بن عبداللہ اور
زبیر بن العوام کو دو اور حکومتِ شام پر معاویہ کو بحال رکھو۔ جب استقلال خاطر خواہ
جائے گا اس وقت اگر تغیر و تبدل مناسب سمجھو تو خلل واقع نہ ہوگا" لیکن امیر نے
مشورہ قبول نہ کیا، صاحب ناسخ التواریخ اپنی رائے ان لفظوں میں بیان کرتا ہے
"حقیقت یہ ہے کہ مغیرہ کی نظر نظم مملکت و سلطنت پر تھی اور دقائق شریعت سے غافل
تھا، اور حضرت علی علیہ السلام دقیقہ حکومت معاویہ را در شام حرام می دانست"
اس مؤرخ نے کیا بے تکی ہانکی ہے، دقائق شریعت سے مغیرہ ناواقف نہ تھا
قرآن میں "مولفۃ القلوب" کی اصطلاح موجود ہے اور سیاسی نقطہ نظر سے اس پر عمل
واجب ہے مغیرہ بھی یہی مشورہ دے رہا تھا۔ کہ اس وقت تالیف قلوب کی ضرورت ہے
یہ امر کہ "دقیقہ حکومتِ معاویہ را در شام حرام می دانست" اس عقیدہ کا آئینہ دار ہے
کہ اول تین خلفاء نے حرام کو حلال قرار دے رکھا۔ لیکن دقیق نکتہ یہ ہے کہ خلافت
کے لئے محض ملائک صفت ہونا ضروری نہیں بلکہ کسی فرشتہ سیرت کا تقرر ہی سرے سے موزوں
نہیں جو اپنے گھر کا انتظام بھی نہیں کر سکتا، وہ ایک مملکت کا نظم و نظام کیسے
رکھ سکتا ہے، خلافت کے لئے علم سیاسیات کی مقدم ضرورت ہے اور اس کے ساتھ

یت کی کہ ہر ایک خرابی کی اصلاح کی قوت بھی رکھتا ہو۔ اس کو قرآن میں "علم
م" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو "طالوت" میں بدرجہ اولیٰ موجود تھی۔ اگرچہ وہ بنی اسرائیل
بارہ قبائل میں سے سب سے چھوٹے قبیلہ کے سب سے چھوٹے خاندان کا رکن تھا۔
حضرت علی میں خواہ اور ملکوتی صفات بدرجہ اولیٰ موجود ہوں مگر اس واقعہ نے ثابت
یا کہ آپ سیاسیات سے ناواقف تھے، اور یہی وجہ ہے کہ آپ کا عہدِ خلافت جس کا آغاز
مکردہ سازش سے ہوا بالکل ناکامیاب رہا۔ سید علی اپنی تاریخ عرب (... of ...
...sarac...) میں لکھتا ہے کہ "پہلے تین خلیفوں کی مجلس شوریٰ میں حضرت علی ممتاز رکن
اور جتنے اہم امور ان ایام میں رونما ہوئے وہ آپ کے مشورے سے ہی طے پاتے رہے"
میں شک نہیں کہ حضرت علی کا احترام ہر ایک خلیفہ اس وجہ سے کرتا رہا۔ کہ آپ آنحضرتؐ
چچا ابی طالب کے بیٹے تھے اور داماد بھی تھے، لیکن ان کے بارے میں یہ کہنا کہ انہی کے
ورہ سے کاروبار خلافت خوش اسلوبی سے چلتا رہا چند موضوع اور ضعیف روایات
بنا پر ایک دعوے ہے۔ جس کو خود حضرت علی کا طرزِ عمل اپنے دورِ خلافت میں باطل
ر دیتا ہے، آپ کے دورِ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ منقطع ہو گیا، اور ساتھ ہی شاعت
سلام رک گئی، خانہ جنگی کا آغاز ہو گیا جس کی آگ عرصہ تک بھڑکتی رہی۔ "صفین" میں امیر
عاویہ اور آپ کے لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ امیر معاویہ کو تو اس حقیقت کا احساس شدت
ے تھا کہ دونوں جانب اصحاب رسول اللہ ہیں اور یہ کہ خانہ جنگی کا فائدہ رومی حکومت خاطر خواہ
ٹھائے گی۔ بلکہ بعض روایات کے مطابق شہنشاہ قسطنطنیہ نے اپنی خدمات بھی امیر معاویہ
ے حق میں پیش کی تھیں لیکن امیر نے دور اندیشی سے مسترد کر دیں جھڑپیں تو وقتاً فوقتاً ہوتی
یں لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی، اس وقت چار عقلاء عرب میں سے تین حضرت علی کے
خلاف تھے گفت و شنید کے بعد طے پایا کہ دو ثالث مقرر کئے جائیں جو قرآن کے مطابق
فیصلہ کریں کہ کون خلافت کا مستحق ہے، حضرت علی کی طرف سے ابو موسیٰ اشعری اور
امیر معاویہ کی جانب سے عمرو بن العاص ثالث مقرر ہوئے اور یہ اندیشہ بجا تھا کہ اگر کسی
فریق کے حق میں فیصلہ نہ ہوا تو ممکن ہے کہ پھر لڑائی شروع ہو جائے، اس لئے فریقین کو

ہدایت کی گئی کردہ اپنے مستقر کی طرف لوٹ جائیں، حکم چھ ماہ بعد دومۃ الجندل پر صحابہ کی ایک مقتدر جماعت کے ساتھ جمع ہوں اور اپنا فیصلہ سنائیں، ابوموسیٰ سیدھا سادہ مسلمان عمرو بن العاص کے سامنے کیا بات کرسکتا تھا، جو بساط سیاست کا مشہور کھلاڑی تھا، ابوموسیٰ کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ حضرت علی کو معزول کیا جائے اور امیر معاویہ کی نسبت اپنا فیصلہ محفوظ رکھا، ابوموسیٰ نے صحابہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں حضرت علی کو خلافت سے معزول کرتا ہوں، عمرو بن العاص نے کھڑے ہو کر کہا کہ علی کے متعلق جو فیصلہ اس کے حکم نے دیا ہے وہ تم نے سن لیا میں معاویہ کو خلافت کا مستحق قرار دیتا ہوں، اس فیصلہ سے ایک سنسنی پھیل گئی، ابوموسیٰ نے کہا کہ مجھے اس غلط فہمی میں رکھا گیا کہ دونوں کو معزول کیا جائے اس کے بعد جسے عامۃ المسلمین چاہیں خلیفہ مقرر کرلیں، بہرحال اس فیصلہ پر عمل نہ ہوا، اور غالباً پھر برہان قاطع تلوار ہی فیصلہ کرتی مگر ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ نے دونوں کو روک دیا اور خلافت دونوں میں تقسیم کردی۔

عموماً مسلمان اس غلط فہمی میں الجھے رہے بلکہ ان کو الجھایا گیا کہ دنیائے اسلام پر ایک ہی خلیفہ ہونا چاہیئے، اور یہ کہ خلافت صرف قریش کا حق ہے، قریش کا حق تو صرف اسی وقت تھا جب تک کہ وہ اس کے اہل تھے لیکن یہ عقیدہ روایاتِ موضوعہ کی بنا پر اتنا پختہ ہوچکا تھا کہ ہندوستان میں مسلمان بادشاہ بھی نام نہاد خلفاء عباسیہ سے سندِ خلافت حاصل کرتے رہے صرف ایک خلیفہ تمام امم اسلامیہ پر کیسے ہوسکتا تھا۔ ایک ہی قبیلہ کے دو حریف خاندان بھی ایک دوسرے کی حکومت تسلیم نہ کرسکے، عربوں کی ترک اور ترکوں کی ایرانی اور ایرانیوں کی افغان سیادت کب تسلیم کرسکتے تھے، یہ عقیدہ ویسے بھی قرآن حکیم کی آیات

۵۔ شہادت عثمان کے فوراً بعد جب حضرت علی خلیفہ مقرر ہوئے تو طلحہ اور زبیر نے باتفاق حضرت علی کا مقابلہ کیا یہ لڑائی "جمل" کے نام سے مشہور ہے بعض مورخین نے حضرت عائشہ صدیقہ کی نسبت لکھا ہے کہ آپ بھی طلحہ اور زبیر کی ترغیب پر اس جنگ میں شامل ہوئیں اس جنگ میں آپ کی شمولیت محض افسانہ ہے آپ کا بھائی محمد تو حضرت علی کے ہواخواہوں میں سے تھا، اور سازش قتل عثمان کا سرغنہ تھا۔

کے خلاف ہے۔ ارشاد قرآن ہے کہ

ادارہ بین الاقوامی

"اگر مومن مسلمانوں کی دو جماعتیں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو، اور اگر ایک فریق نہ مانے اور دوسرے پر زیادتی کرے تو سب مل کر اس سے لڑو، یہاں تک کہ اللہ کے حکم صلح کو قبول کرے پھر جب اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے، تو ان میں عدل اور انصاف کے ساتھ صلح کرا دو، اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔" "انما المومنون اخوۃ" مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو بھائیوں میں صلح کرا دو، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم فرمایا جائے۔" (۴۹:۱۰)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ تمام ممالک اسلام کا ایک بین الاقوامی ادارہ ہونا چاہیئے جس میں ان ممالک کے نمائندگان ان تمام امور کو جو مسلمانوں کے بین الاقوامی ہوں طے کریں اور ان میں جنگ و جدل کی نوبت نہ آنے دے، ہمارے زمانہ میں سبھی حکومتوں نے اس پر عمل کیا اور پہلے "لیگ آف نیشن" اور اس کے بعد اب "یو این او" جو اپنے پیشرو دونوں کی طرح چند روز کی مہمان ہے، چونکہ ان کے نمائندگان کے اغراض میں سخت اختلاف ... صرف ایک مشترکہ فائدہ کے لئے اس مجلس کی طرح ڈالی ہے اس لئے ان کے مقصد کی ... ناممکن ہے۔ مسلمان امت واحدہ ہیں اگر وہ اسی مقصد کو مد نظر رکھیں جس نے ان میں "اخوت" قائم کی ہے تو ان کا ادارہ نہایت کامیاب رہے گا اور پھر سے وہ دنیا پر چھا جائیں گے ہم امید کرتے ہیں کہ زمانہ نے جو تلخ سبق ان کو دیا ہے وہ ضرور ایک دن متحد ہو جائیں گے

کوفہ

اگرچہ خلافت امیر معاویہ اور حضرت علی میں تقسیم ہو گئی لیکن حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ حضرت علی کو چند در چند مشکلات میں الجھنا پڑا۔ جس کو آپ سنبھال نہ سکے ایک جماعت جو آپ کی پُر جوش حامی تھی، آپ سے علیحدہ ہو کر مخالفت پر آمادہ ہو گئی، یہ جماعت "خوارج" کے نام سے موسوم ہوئی، اس جماعت نے نہ صرف آپ کی خلافت کو سخت ضعف پہنچایا بلکہ ختم کر دیا، اسی جماعت کے ایک فرد عبدالرحمٰن ابن ملجم کے ہاتھ سے حضرت علی مسجد کوفہ میں شہید ہوئے، چونکہ ہم نے ان واقعات کو اپنی کتاب "دمشق" ...

لہ ہم نے اپنی کتاب "اسلام اور انسانی حقوق" میں یو این او کے چارٹر پر تنقید کی ہے۔

میں مفصل بیان کیا ہے اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں،

حضرت علیؓ سے ایک اور اہم سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ مدینہ منورہ کو چھوڑ کر کوفہ کو مستقر خلافت مقرر کیا۔

کوفہ کی بنا ۱۶ھ میں حضرت عمر کی خلافت میں ڈالی گئی، فتح عراق اور تسخیر ایران کے بعد سعد بن وقاص نے مدائن دارالسلطنت کسریٰ میں رہائش اختیار کی اور قصر ابیض کسریٰ کو "دارالامارہ" قرار دیا، عربی سپاہ کا ایرانی پایہ تخت میں قیام فاروق اعظم کو ناگوار گذرا، ایرانی تمدن کے اثر سے عربی بچ نہ سکتے تھے اور ان میں آرام طلبی کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، آب و ہوا کی ناموافقت بھی ایک اچھا بہانہ تھا، ریگستان عرب کے باشندے ایسے شہروں میں طاقت و توانائی اور ولولوں کو برقرار نہ رکھ سکتے تھے جو "فردوس" بمیں تھے، تھوڑے دنوں میں ان کا رنگ روپ متغیر ہو گیا۔ فاروق اعظم نے سعد کو لکھا کہ چھاؤنی کے لئے ایسی جگہ تلاش کرو جو دریائے فرات کے غربی کنارہ پر ہو اور دارالخلافت اور اس کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ سلیمان بن ربیعہ الباہلی اور حذیفہ بن محصن نے حیرہ اور فرات کے درمیان وہ قطعہ زمین انتخاب کیا جسے کوفہ کہتے ہیں، حضرت عمر پختہ مکان کی تعمیر کی اجازت نہیں دیتے تھے، ابتدا میں یہاں بانسوں کی جھونپڑیاں تھیں ایک دفعہ آگ لگ گئی، تو خشت خام کی اجازت دے دی، اس پر بھی یہ قید کہ مکان یک منزلہ ہوں اور صرف تین کمرے ہوں، یہ زمانہ گذر گیا، متمدن دنیا سے عرب روشناس ہوئے تو حضرت عثمان کے عہد میں کوفہ ایک بارونق شہر بن گیا،

بلحاظ تمدن اور دارالخلافت کوفہ کو مدینہ پر ترجیح تھی، ممکن ہے کہ حضرت علی کو انتقال دارالخلافت کے وقت بھی یہ امر مدنظر ہو، لیکن واقعات شاہد ہیں کہ اہل حجاز پر آپ کو اعتماد نہ تھا اور وہ بھی آپ سے کھچے رہے۔ کوفہ میں تو مسلم محبوبیوں کا ہجوم ہو رہا تھا، اور یہ قوم کی ذہنیت میں شخصیت پرستی نمایاں ہے وہ اپنی وفاداری اور جانثاری کا یقین دلاتے رہے، مدینہ اور کوفہ ایک دوسرے کے حریف شہر بن گئے۔ اور حضرت علی اور اہل حجاز میں بُعد بڑھتا گیا، اور مصر ہاتھ سے نکل گیا، محمد بن صدیق اکبر جو حضرت علی کے ہواخواہ تھے

ر قتل عثمان کی سازش کا سرغنہ تھا، مصر میں حضرت علی کی طرف سے عامل تھا۔ عمرو بن
عاص کے مقابلہ میں مارا گیا۔ شام اور مصر میں چولی دامن کا ساتھ ہے الحاق مصر سے
میر معاویہ کو تقویت ہوگئی،

علامہ ابن خلدون کی یہ رائے ہے کہ امیر معاویہ کی ریاست اور حکومت کو روز افزوں
ترقی اس لئے ہوتی گئی، اور باستقلال اس لئے قائم ہوگئی کہ وہ ایسا فیاض شخص تھا کہ
س زمانہ میں اس کا نظیر نہ تھا۔ رؤساء عرب اور سرداران مصر کے ساتھ کریمانہ سلوک کرتا۔
ن کی سخت اور بعض اوقات ناشائستہ باتوں کو برداشت کرتا، اور اس اخلاق حسنہ کے ساتھ
پیش آتا کہ وہ گرویدہ ہو جاتے، اس کے تحمل اور بردباری کی کوئی حد نہ تھی، یہی سبب تھا کہ
ن کی حکومت اور ریاست کو کسی قسم کی لغزش نہ ہوئی، طبری لکھتا ہے کہ ایک دن عمرو بن
عاص عائدین مصر سے کہہ رہا تھا کہ میں نے معاویہ سے بڑھ کر قوی تر اور نرم تر کوئی شخص
نہیں دیکھا۔ مہات ملکی کو ناخن تدبیر سے اس طرح سلجھاتا کہ اس کی رائے کبھی خطا نہ گئی،
بتدا میں خوارج کے خروج اور قیصر کی طرف سے شام پر حملہ اور حضرت علی کی لشکر کشی کی
شوش خبریں آتی رہیں، مگر اس کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نمایاں نہ ہوئے، مجھے
مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ قیصر ہاتھ پاؤں ضرور مارے گا اگر حملہ آور بھی ہوا تو صلح پر رضامند
ہو جائے گا، مجھے ذرا علی کی طرف سے فرصت ملے جس سے میں نے خون عثمان کا مطالبہ
کیا ہے تو قیصر کی بھی خبر لے لوں گا!" حاتم جس کی فیاضی عرب میں ضرب المثل ہے اس
کے بیٹے عدیؓ نے حضرت عثمان سے انحراف کرتے ہوئے حضرت علی کا ساتھ دیا، عدی بڑے
پایہ کے اصحابی تھے، ایک دفعہ حضرت عمرؓ سے ملنے آئے کچھ بے التفاتی محسوس کی تو کہا۔
"امیر المومنین کیا آپ نے مجھ کو نہیں پہچانا؟" کہا کہ "واللہ خوب پہچانا۔ تم کو اللہ نے حسن
معرفت کے ساتھ مشرف کیا، تم اس وقت اسلام لائے، جب لوگوں نے کفر کیا، تم نے
اس وقت اقرار کیا جب لوگوں نے انکار کیا، جب لوگوں نے بدعہدی کی تم نے وفا کی، تم ہمیشہ
خدمت ملت کے لئے پیش پیش تھے، جب لوگ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ واللہ میں تم کو خوب
پہچانتا ہوں"، عدی نے کہا کہ "کافی ہے مجھ کو اے امیر المومنین! مجھ کو کافی ہے"۔ عدی

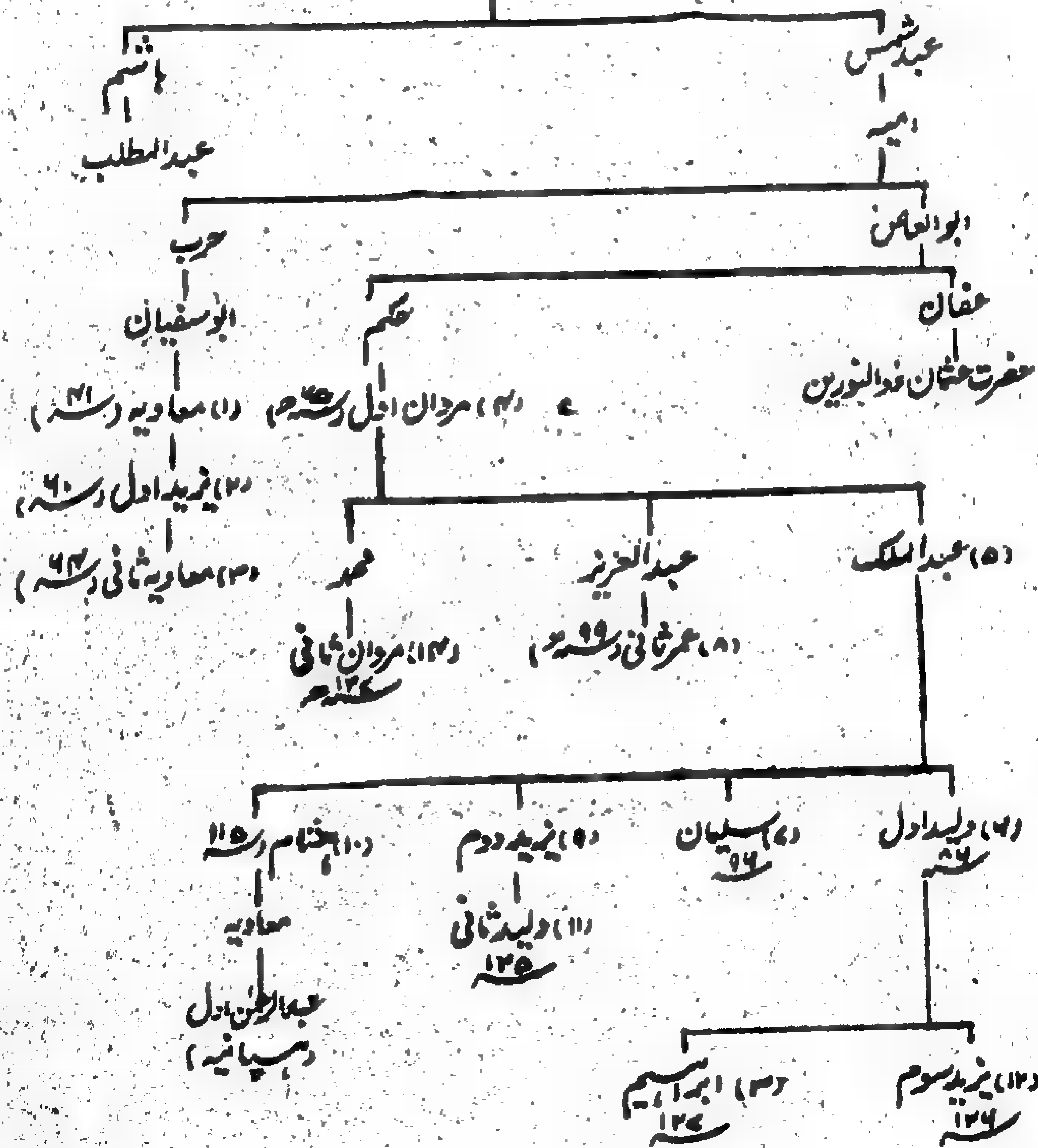
فتح عراق اور جنگ قادسیہ اور مہران اور جسر کی لڑائیوں میں ابوعبیدہ سپہ سالار افواج اسلام کے ہمراہ رہے۔ خالد بن ولید کے ساتھ بھی اکثر فتوحات میں شریک تھے، اگرچہ سازش قتل عثمانؓ میں حصہ نہیں لیا، مگر حضرت علی کے ہواخواہوں میں سے تھے۔ حضرت عثمان کی شہادت پر کہا کہ قتل عثمان کا فدیہ ایک بکری کا بچہ بھی نہ دیا جائے گا۔ واقعہ جمل میں ایک آنکھ پھوٹ گئی، اور ایک بیٹا محمد نامی بھی کام آیا، دوسرا بیٹا خارجیوں کے مقابلہ میں مارا گیا، ابوطریف نے مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا کہ عثمان کی شہادت کا فدیہ ایک بکری کا بچہ ہو گیا، جواب دیا " واللہ فدیتہ بذبح عظیم "۔ جنگ صفین میں حضرت علی کا ساتھ دیا۔ اور جب تک خلافت چہارم کا خاتمہ نہ ہوا امیر معاویہ کی مخالفت پر تلے رہے، زیاد بھی حضرت علی کی زندگی تک ہواخواہوں میں رہا۔ شہادت کے بعد امیر معاویہ سے آملا، معاویہؓ نے عامل عراق مقرر کر دیا اب چار عقلیں ایک جگہ جمع ہو گئیں، عدی کے چچا کے لڑکے عبداللہ بن خلیفہ طائی نے کوفہ میں جہاں عدی نے رہائش اختیار کی تھی شورش برپا کی۔ زیاد نے گرفتاری کا حکم دیا تو عدی نے پناہ دی، زیاد نے مطالبہ کیا تو صاف انکار کر دیا، زیاد نے عدی کو قید خانہ میں ڈال دیا تو لوگوں میں ناراضگی پھیل گئی، ایک وفد زیاد کی خدمت میں آیا اور کہا کہ بڑے غضب کی بات ہے کہ تو یہ سلوک اصحاب رسول اللہ اور سردار قبیلہ سے کرتا ہے زیاد نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ چھوڑ دیا، عدی امیر معاویہ سے ملے آپ بہت عزت اور احترام سے پیش آئے چند روز کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ آپ دوست بن گئے،

عقیل ابن ابی طالب حضرت علی کے علاتی بھائی ہیں ایک دفعہ مقروض ہو گئے تو حضرت علی کو کہا کہ چالیس ہزار درہم قرض ادا کر دیجئے، حضرت علی نے کہا کہ اگر تم صبر کرو مجھے چار ہزار وظیفہ ملتا ہے ملے تو نذر ہے۔ کہا کہ " العاملین " ($\frac{۱}{۱۲}$) کے تحت بیت المال سے دے سکتے ہو۔ حضرت علی نے انکار کیا تو کہا کہ پھر معاویہ کے پاس جانے کی اجازت دیجئے کہا کہ اختیار ہے، آپ معاویہ کے پاس آ گئے، قرضہ بھی ادا ہو گیا اور وظیفہ بھی مقرر ہو گیا، ایک دن معاویہ نے کہا کہ اگر عقیل مجھے اپنے بھائی سے بہتر نہ جانتے تو میرے پاس نہ آتے، کہا کہ میرا بھائی دین میں تم سے بہتر ہے اور تم دنیا میں میرے واسطے بہتر ہو، دنیا تو تمہارے

تمہارے ذریعہ سے بہتر ہو گئی ہے امید ہے کہ اللہ خاتمہ بھی بخیر کرے گا، معاویہ اور عقیل میں دوستی بے تکلفی کی حد تک پہنچ گئی تھی، ایک دن معاویہ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "یہ عقیل ہیں ان کے چچا ابولہب تھے" عقیل نے کہا کہ "یہ معاویہ ہیں ان کی خالہ حمالۃ الحطب تھی"

ایسی مثالیں بہت ہیں، حضرت علی کی شہادت کے بعد تمام اصحاب معاویہ سے آملے، کچھ شک نہیں کہ حضرت علی کی ذات ستودہ صفات ہیں جو خوبیاں بلحاظ دین تھیں وہ معاویہ میں نسبتاً کم تھیں مگر انتظام سلطنت کے لئے جس بات کی ضرورت تھی اور بالخصوص ضرورت وقت کا احساس، اس کا علم معاویہ کو بہتر تھا، شہادت علی کے بعد کوفیوں نے حضرت حسن کی خلافت پر اتفاق کیا، لیکن آپ امیر معاویہ کے حق میں دستبردار ہو گئے، فرمایا "اے لوگو اللہ تعالٰی نے تمہیں ہمارے نبیؐ کے ذریعہ ہدایت فرمائی اور میرے ذریعہ تمہاری جانوں کی حفاظت فرمائی، یاد رکھو عقلمندی تقویٰ ہے اور نادانی بدکاری، یہ معاملہ جو میرے اور امیر معاویہ کے درمیان اختلاف کا باعث ہوا ہمارے دونوں کے حقوق کے متعلق ہے، یا وہ یا میں زیادہ خلافت کا حق دار ہوں، اگر میرا حق ہے تو میں نے اللہ عزوجل کے بندگان اور رسول کریم کی امت کی اصلاح اور تمہاری جانوں کی حفاظت کے لئے ترک کر دیا"

شجرہ خاندان امیّہ



خلافتِ امویہ

سنہ ۴۱ھ میں امیر معاویہ بالاتفاق اہلِ اسلام تمام دنیائے اسلام پر خلیفہ تسلیم کیا گیا اس لئے اس سال کا نام سال جماعت رکھا گیا، اس وقت تک فتوحات اسلامی کا سلسلہ ایک طرف ترکستان تک اور دوسری طرف شمالی افریقہ کی بعض ریاستوں تک پہنچ چکا تھا۔ اگر تنازعِ خلافت میں مسلمان نہ الجھتے تو سلطنت اسلامیہ بحرِ اتلانتک سے بحر الکاہل تک پھیل گئی ہوتی، ایشائے کوچک ابھی تک رومی سلطنت کے تحت تھا، اور کوہ لبنان کا سلسلہ دونوں سلطنتوں کے درمیان حدِ فاصل تھا۔

عمرو بن العاص نے جب خلافت فاروق اعظم میں مصر فتح کیا تو اس جگہ "فسطاط" کی بنیاد رکھی، یہ واقعہ سنہ ۱۸ھ کا ہے ہمارے زمانہ میں اس کا موقع محل شہر قاہرہ اور مصر کہنہ کے درمیان تصوّر کرنا چاہیئے، اس کے آثار میں سے "جامعہ عمرو" اور "مقطم" تک قاہرہ کے گرد کھنڈر اور ویرانے ہیں خلیفہ سوم نے عمرو بن العاص کی جگہ عبداللہ بن سعد کو عامل مصر مقرر کیا، مگر امیر معاویہ نے پھر سے عمرو ہی کو عامل مقرر کیا، اس وقت "فسطاط" تمام شمالی افریقہ کی چھاؤنی تھی، عربی مؤرخین نے مصر کے علاوہ تمام شمالی افریقہ کو "افریقہ" ہی سے تعبیر کیا ہے اور اسے ایک علیحدہ ولایت قرار دے کر عامل مصر کے ماتحت سمجھا ہے، عمرو بن العاص جب دوبارہ عامل مقرر ہوا، تو اس نے فتح افریقہ کا مصمم ارادہ کر لیا، اس سے پیشتر خلافتِ عثمانی میں عبداللہ بن سعد نے کچھ پیش قدمی کی تھی لیکن تنازعاتِ خلافت نے روک دی، عمرو بن العاص نے اپنے خالہ زاد بھائی عقبہ بن نافع

کو افریقہ کا والی مقرر کیا، شمالی افریقہ میں تاحال رومیوں ہی کا قبضہ تھا، یہاں کے لوگ بالخصوص تار تہیج (قریہ حدثہ) رومی مظالم سے تنگ آچکے تھے، ان ہی لوگوں نے مسلمانوں کو دعوت دی، جب مسلمانوں نے تیس ہزار رومیوں کو شکست فاش دے کر ان کو استبداد سے نجات دلائی، تو یہاں کے لوگوں نے بہ طیب خاطر اسلام قبول کیا، اب بربری بستیوں میں اشاعت اسلام کا آغاز ہو گیا، عقبہ نے اس مقام پر جسے قیروان کہتے ہیں، فوجی چھاؤنی قائم کی، یہ جگہ بالکل ویران تھی، اور اس جگہ حشرات الارض ہی نظر آتے تھے کہتے ہیں کہ جب زمین کو صاف کر رہے تھے، تو اس جگہ کسی پرانے شہر کے آثار بھی پائے گئے آج علمی تحقیقات سے ثابت ہو چکا ہے کہ شمالی افریقہ میں فنیقی بستیاں تھیں، اس لئے یہ سمجھنا چاہئیے کہ یہ لوگ اہل فنیقہ کی اولاد عرب ہی تھے۔

عقبہ دس ہزار شامی جمعیت کے ساتھ شہر کے بعد شہر مسخر کرتا بڑھتا گیا، بربری نومسلم بھی شامل ہوتے گئے، یہاں تک کہ عقبہ بحر اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ گیا، سندر کے پانیوں نے پیش قدمی روک دی تو کہا "یا اللہ اگر یہ بحر میرے راستے میں حائل نہ ہوتا، تو اعلائے کلمۃ الحق کے لئے بڑھتا جاتا، اور مغرب کی نامعلوم بستیوں میں تیری توحید کی منادی کرتا اور ان مشرکوں کو جو تیری عبادت میں شریک پیدا کرتے ہیں راہ راست پر لاتا۔"

سے۔ فنیقی عرب تھے "ہیروڈوٹس" لکھتا ہے کہ ارض حجاز سے نکل کر سواحل شام پر آباد ہو گئے تھے، "راولنسن" (Rawlinson) اپنی کتاب "فنیقیہ" میں لکھتا ہے کہ یہ تجارت پیشہ لوگ تھے، حروف ابجد یونانیوں کو انہوں نے سکھائے تھے، فنیقی شہزادی "عربی" کے نام پر براعظم یورپ موسوم ہوا، جس کا عقد یونانی رب الارباب ضیاء (Zeus) سے ہوا جسے بحیرہ روم کہتے ہیں، ان ایام میں فنیقی جھیل سے موسوم تھی، تمام شمالی افریقہ، ہسپانیہ اور جزیرہ صقلیہ وغیرہ ان کے قبضہ میں تھا، روم دار السلطنت اٹلی سے ایک صدی پیشتر تار تہیج (قریہ حدثہ) ان کی نوآبادی تھی، جسے کہ جزائر برطانیہ کو بھی ان ہی لوگوں نے تمدن و تہذیب سے روشناس کرایا، یورپ کی کسی زبان میں بقول اسحاق ٹیلر (Isaac Taylor) یہ لفظ نہیں ملتا غالباً یہ لفظ سینتی ہے۔

۔۔ واقعات اور حالات جو اموی خلافت کے دور میں رونما ہوئے، ہم اپنی کتاب "دمشق" میں بیان کر چکے ہیں اس لئے ان اوراق پر اعادہ کی ضرورت نہیں، ہم نے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ بنو اُمیہ نے کس حد تک مقصدِ خلافت کی تکمیل کی۔

ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ بنی اُمیہ کی خلافت کے مدِ نظر صرف دو باتیں تھیں ایک اشاعت اسلام اور دوسری عربی کی ترویج۔ یہ خلافت ختم ہوئی تو دونوں اس کے ساتھ ختم ہو گئیں، اس کی تائید میں تاریخی واقعات کا جائزہ لیا جائے تو یہ ناقابل انکار حقیقت ہے۔ کہ دنیا اسلام پر بنی اُمیہ کا بڑا احسان ہے کہ جو ممالک اُن کے قبضہ میں آئے ماسوائے ہسپانیہ ایک طرف چین کی حدود سے اور دوسری طرف بحر اوقیانوس سے ملتے ہیں، ان میں اب بھی خالص مسلم آبادی ہے۔ افغانستان اور بلوچستان اور وادی سندھ میں اسلام کی اشاعت بنو اُمیہ نے کی، ان کے جانشین بنو ہاشم ان کی فتوحات پر ایک انچ زمین اضافہ نہ کر سکے اور اشاعت اسلام کی طرف ان کی توجہ کبھی نہیں ہوئی، گبن لکھتا ہے کہ مقام حیرت یہ نہیں کہ بنو اُمیہ نے نہایت سُرعت کے ساتھ ایک دنیا کو مسخر کر لیا۔ ان سے پیشتر سکندر اعظم وغیرہ نے بھی ایسا ہی کیا لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اسلام کا قبضہ ان کے مفتوحہ ممالک پر بالاستقلال ہو گیا۔ اور آج تک ہے، ڈاکٹر ڈریپر اپنی کتاب (Intallectual Development of Europe) میں لکھتا ہے کہ اگرچہ مسیحی تعصب نے عربوں کے احسانات کو ہر ممکن ذریعہ سے فراموش کرنے کی کوشش کی مسلسل کی ہے مگر اس کا کیا جواب ہے کہ ابھی تک عربی زبان کے اکثر الفاظ بالخصوص علمی اصطلاحات کا قبضہ یورپ کی زبانوں پر ہے۔ اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب "مشاہیر اسلام" میں مختصر مگر کافی بحث کی ہے، بنو اُمیہ نے جو کچھ ہسپانیہ میں کام کیا اور اس وقت جب کہ یورپ پر جہالت کی تیرہ و تار گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ نورِ علم و حکمت سے یورپ کو روشن کر دیا۔ اگر ان واقعات کا مطالعہ کرنا ہو تو فاضل لیبان کی کتاب "تمدن عرب" کا مطالعہ کرو۔ "لین پول" کی کتاب (Saracene Arts) پڑھو۔ مورخین کا یہ پختہ فیصلہ ہے کہ ہسپانیہ کو وہ دن دیکھنے پھر نصیب نہ ہوئے جو عربوں کے دورِ حکومت کی امتیازی خوبی ہے،

بنو اُمیہ کی خلافت خالص عربی حکومت تھی ۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ خلافت کے مقصد کی تکمیل بھی اہلِ عرب کے ذریعہ ممکن تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ایک سو سال کے قلیل عرصہ میں ان لوگوں نے جس حد تک تکمیل کی حیرت انگیز تاریخی واقعہ ہے ۔

کیا یہ کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ غیر مسلم محققین تو بنو اُمیہ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں مگر آج دنیائے اسلام میں وہ بدنام ہیں ، اس کی کیا وجہ ہے ؟

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خلافت کا مقصد صرف تمکین دین ہے ، اسلام نے بلا لحاظ اختلاف و الوان ہر ایک شخص کو جو اُسے قبول کرے "اخوت" کے آغوش میں لے لیا اس لئے اہلِ اسلام کی قومیت صرف اسلام سے وابستہ ہے ، ان میں نہ تو نسلی امتیازات ہیں جو غیر مسلم اقوام کی قومیت کا جزو لاینفک ہیں ، اور نہ احساس اختلاف الوان و لسان ہے جس میں قوموں کو ایک دوسرے سے خطرہ محسوس ہوتا ہے ، اس لئے اگر کوئی مسلمان دین اسلام سے پھر جائے تو وہ اس اخوت کے حق سے محروم ہو جائے گا جو نظامِ اسلامی میں رہ کر ہی حاصل ہو سکتے ہیں ۔

بنو امیّہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر حربہ دنیائے اسلام میں اور کوئی نہ تھا کہ ان کی نسبت مشہور کیا جائے کہ وہ فاسق و فاجر تھے اور کبھی بہ طیب خاطر اسلام قبول نہ کیا ، وہ رسول کریمؐ کے ہمیشہ مخالف رہے ، فتح مکہ کے بعد بعض ذاتی مفاد کے لئے اسلام قبول کیا ، اور اسلام کے عروج میں اپنے ہی اقتدار کا ایک ذریعہ ان کو نظر آیا ۔ دراصل وہ بنو ہاشم اور رسول ہاشمی سے متنفر تھے ، اور جب خلافت پر اصحاب رسول اللہ متمکن ہوئے تو وہ مارے حسد کے جل بھن گئے ۔ اور اسی حاسدانہ نظر سے ارکانِ شوریٰ کو بھی دیکھتے رہے ، جو خلافت اول و دوم میں کاروبار سلطنت اپنے بے غرضانہ مشورہ سے چلاتے رہے ، بدوی قبائل جن سے انکی قرابت تھی ان کی سازش سے بسہولت ان سے مل گئے جس کا جال انہوں نے پھیلا رکھا تھا ، اور اس طرح عمرؓ کے بعد علیؓ کو خلافت سے محروم رکھا ، اور عثمان ابن عفان جو اموی تھا خلیفہ منتخب ہو گیا ، اس انتخاب نے آخر کار اسلام کو تباہ کر کے رکھ دیا ۔" یہ الفاظ سید امیر علی کی کتاب "ہسٹری آف سیریسینز" کے

ہیں، انگریزی زبان اصل کتاب کی ہے۔

سید امیر علی نے اپنی تاریخ کا مواد اُن روایات سے فراہم کیا ہے جو بنو ہاشم اور ان کے ہوا خواہ نومسلم مجوسیوں نے اپنی اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے وضع کیں،

اکثر و بیشتر یہ الزام امیر معاویہ پر لگایا جاتا ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اس جمہوریت پر کاری ضرب لگائی، جو خلافت راشدہ میں قائم ہو چکی تھی، اور اس کو شخصی حکومت میں بدل دیا، لیکن اس بدعت کا آغاز حضرت علی کی شہادت کے فوراً بعد بنو ہاشم کی طرف سے فوراً ہو چکا تھا، جب امام حسنؓ کو ان لوگوں نے خلیفہ مقرر کیا اور جب یزید دمشق میں خلیفہ تسلیم کیا گیا، تو کوفیوں کی نظر انتخاب امام حسینؓ پر بھی پڑی، اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کیا جائے، کہ معاویہ نے نہایت نازیبا حرکت کی، تو ان جمہوریت پسند حضرات کو خلافت امویہ کے خاتمہ کے بعد اپنے عقیدہ کو عملاً ثابت کرنے کا وقت تھا۔ لیکن اُنہوں نے ایسی شخصی حکومت قائم کی کہ آج جب کہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں شخصی حکومت ختم ہو چکی ہے دنیائے اسلام میں اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ فرما ہے

سادات پرست منصب خلافت کا رونا تو روتے رہتے ہیں لیکن ایرانیوں کو کبھی یہ توفیق نہ ہوئی کہ کسی صحیح النسب سید کو تخت ایران پر بٹھا دیتے، اور اس طرح عملاً اپنے ایمان کا ثبوت دیتے اور تلافی مافات بھی ہو جاتی،

آیۂ استخلاف کے شروع میں یہ الفاظ ہیں:-

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم	تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ، اللہ کا وعدہ ہے، جو ایمان لائے اور اس کے مناسب نیک عمل کئے ان کو خلافت عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پہلو کو ری

امم سابقہ کو جو خلافت عطا ہوئی وہ ہر ایک صورت کی حکومت تھی، قرآن میں عموماً بنی اسرائیل کا مذکور ہے، داؤد و سلیمان نے جو شخصی حکومت کر چکے تھے، اسرائیلی شان و شوکت کو منتہائے عروج پر پہنچا دیا، اس کے بعد اسرائیلیوں کو پھر یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوئے، ہم اس موضوع پر بحث کر چکے ہیں کہ اسلام کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ کہ

حکومت شخصی ہو یا جمہوری، مقصد اتنا ہی ہے کہ دین کو استقلال ہو، اور اس کی اشاعت میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس مقصد کی تکمیل بنی امیہ نے کی۔

یہ الزام کہ اموی خلفاء فاسق وفاجر تھے ایک سیاسی ڈھونگ ہے جو بنو ہاشم اور ان کے ہوا خواہوں نے کھڑا کیا اور اس سیاسی منصوبہ میں وہ خاطر خواہ کامیاب ہوئے یزید ابن معاویہ پر یہ الزام شدّومد سے لگایا جاتا ہے حالانکہ اس وقت صحابہ کی ایک جماعت موجود تھی اور نبوّت کا ادب نا زمانہ تھا، بات یہی ہے کہ بنو اُمیہ کے جانشین بنو عباس ہاشمی ہوئے، اور انہوں نے دِل کھول کر خلفاء بنو امیہ کی مخالفت کی۔ اس مقام پر چند تاریخی واقعات کا حوالہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، جن میں ان مذموم سیاسی منصوبہ کی آمیزش ہے ان کو ایک اور ہی رنگ میں نمایاں کیا۔

امیر معاویہ کے زمانہ میں ۴۲ھ سے ۵۰ھ تک رومیوں نے مسلسل چھیڑ چھاڑ جاری رکھی، اس لئے امیر معاویہ نے مناسب خیال کیا کہ قسطنطنیہ پر حملہ کیا جائے ۵۰ھ میں ایک لشکر جرار سفیان بن عوف کے تحت روانہ کیا، اس ہم میں ابن عباس، ابن عامر، ابن زبیر اور ابو ایوب انصاری بھی شامل تھے، یہ ہم ناکامیاب رہی اور مسلمانوں کو بہت مصائب کا سامنا ہوا۔ روایت ہے کہ اس وقت یزید بن معاویہ "دیر مران" میں قالین کے فرش پر اپنی زوجہ کو پہلو میں لئے دادِ عیش دے رہا تھا، اور یہ اشعار پڑھتا تھا:

ما ان اُبالی بما لاقت جموعہم	مجھے اس کی کچھ پروا نہیں کہ کیا
بالفرقدونة من حمی ومن موم	کہ کچھ فرقدانہ کے مقام پر اس لشکر کو سختی اور بخار پیش
اذا اتکات علی الانماط مرتفعا	جب کہ میں ایک مرتفع مقام دیر مران میں قالینوں کے فرش تکیہ لگا
بدیر مران وعندی ام کلثوم	اپنی زوجہ ام کلثوم کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں

یہ روایت اس لئے سیاسی اختراع ہے کہ یزید عرب کا ایک بہادر جوان دانا اور سپاہی تھا اور اس ہم میں شامل تھا، قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے جب مجاہدین دادِ مردانگی دے رہے تھے عبدالعزیز بن زرارہ الکلابی کام آئے، امیر معاویہ کو اس کی شہادت کی اطلاع

ہوئی تو اس کے باپ کو کہا "واللّٰہ ھلک فتی العرب" خدا کی قسم عرب کا ایک جوان مارا گیا، پوچھا میرا بیٹا یا تیرا، جواب دیا کہ تیرا بیٹا۔ اللّٰہ اس کو جزائے خیر دے"، ابوایوب انصاری بھی اسی جگہ شہید اور مدفون ہوئے۔ ان کی قبر پر مسلمان فاتحہ خوانی کے لئے جایا کرتے، یزید کا دورِ خلافت تھا، قسطنطین نے سفیرِ اسلام کو کہا کہ یہ قبر مسلمانوں کو جاسوسی کا بہانہ مل گئی ہے، میں اسے اکھڑوا دوں گا، یزید کو اطلاع ہوئی تو رومی سفیر کو سرِ دربار بلا کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا بادشاہ نہایت احمق ہے، وہ تو ایک قبر ہے اور یہاں شام میں تمہارے پیشوایانِ دین کے ہزاروں مزار ہیں، اور بے شمار مقامات مقدسہ ہیں، اگر اس نے ایسی ناشائستہ حرکت کی تو میں سب کو اکھڑوا دوں گا، بنی اُمیہ کے بعد یہ قبر کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی اور رفتہ رفتہ اس کے آثار بھی مٹ گئے جب سلطان محمد ثانی نے قسطنطنیہ فتح کیا، تو ایک صوفی بزرگ شمس الدین نے پتہ بتایا، اس پہ ایک عالیشان عمارت ہے اور سلطان روم کی تخت نشینی کی رسم اسی جگہ ادا ہوتی رہی۔

ولید بن یزید ۱۲۵ھ میں ہشام بن عبدالملک کے بعد تختِ خلافت پر متمکن ہوا اکثر افعال ناپسندیدہ اور حرکات ناشائستہ اس سے منسوب ہیں، اس کے فسق و فجور اور خصائل ذمیمہ اور عاداتِ رذیلہ کا تذکرہ کم و بیش ہر ایک مؤرخ نے کیا ہے۔ مگر بعض نے انکار بھی کیا ہے۔ کیونکہ اس کے دشمن بہت تھے، روایت ہے کہ ایک دفعہ ولید تلاوت قرآن کر رہا تھا، آیہ "وخاب کل جبار عنید" پڑھی تو جھلا اٹھا، قرآن چاک کر دیا۔ اور یہ شعر موزوں کیا:

تھددنی بجبار عنید	تو مجھے جبار عنید سے دھمکاتا ہے
فھا انا ذاک جبار عنید	آج میں جبار عنید ہوں
اذا ما جئت ربک یوم حشر	جب تو حشر کے دن اپنے رب کے پاس جائے گا
فقل یارب مزقنی الولید	تو کہنا اے میرے رب مجھے ولید نے پھاڑ ڈالا۔

خلفاء بنو امیہ کے فسق و فجور کو شہرت دینے کے لئے ایک آدھ شعر ضرور موزوں کیا جاتا، اس میں ایک کشش ہوتی ہے، حافظہ میں محفوظ ہو جاتا ہے اور لوگ ترنم سے لطف اندوز

بھی ہوتے ہیں، عوام کالانعام کو اتنا سوچنے کا وقت ہی نہیں ملتا کہ ابن جبار عنید کا تلاوتِ قرآن مجید سے کیا کام اور حشر و نشر کا کیا مذکور ہے، ایک دفعہ خلیفہ مہدی عباسی کے دربار میں اسی ولید کا ذکر آ گیا، مہدی نے کہا وہ تو فاسق تھا، ابن علاثہ حاضر تھا، عرض کیا، امیر المومنین اللہ تعالےٰ بہت بڑا عادل ہے، وہ کبھی کسی فاسق کو خلافتِ نبوت اور اُمتِ مرحومہ کی حکومت عطا نہ فرمائے گا۔" مجھ سے ایک شخص نے جو ولید کا ندیم تھا بیان کیا ہے کہ جب نماز کا وقت آتا تو ولید شاہانہ لباس اتار کر سفید صاف ستھرے کپڑے پہنتا، نہایت اچھی طرح وضو کرتا، اور نماز خشوع خضوع سے ادا کرتا، کیا ایک زندیق اور فاسق سے یہ امید ہو سکتی ہے؟ مہدی نے کہا کہ" اے ابن علاثہ اللہ تعالےٰ تجھے جزاء خیر دے، اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ولید کے دشمنوں نے اس پر یہ بہتان باندھے۔ اُس کے اپنے قریبی رشتہ داروں نے اُسے بدنام کیا ولید کے اپنے عم زاد بھائی سلیمان بن ہشام کو گرفتار کر کے درّے لگوائے، اور سر اور داڑھی منڈوا کر جلا وطن کیا، یزید بن ہشام کو قید میں رکھا آخر ان لوگوں نے سازش سے ولید اول کو برائیوں سے متہم کیا، بغاوت کی اور قتل کیا،

ایک دفعہ عمر بن یزید کا لڑکا یعنی ولید کے برادر زادہ کا بیٹا ہارون الرشید کے پاس تنگدستی کی حالت میں آیا، رشید نے حسب نسب پوچھا، تو کہا کہ قریشی ہوں، رشید نے کہا کہ مفصل بتاؤ کہ کس قبیلہ سے ہو، ابن عمر خاموش رہا۔ رشید نے کہا کہ میں تم کو امن دیتا ہوں خواہ تم مروان ہی کیوں نہ ہو۔ کہا کہ میں عمر بن یزید کا بیٹا ہوں، رشید نے کہا کہ اللہ تعالےٰ ولید پر رحم فرمائے، اور یزید ناقص پر لعنت، کیونکہ اُس نے ایک ایسے خلیفہ کو قتل کیا جس پر اُمتِ مرحومہ کا اتفاق ہو چکا تھا،

جنگ صفین، یزید کی ولی عہدی، شہادت امام حسین ایسے واقعات ہیں جن کا تعلق امیر معاویہ اور آپ کے جانشین کے عہدِ حکومت سے ہے اور یہی زیادہ تر بنو امیہ کی بدنامی کے وجوہ ہیں، ہم ان پر مختصر جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے بحث کرتے ہیں،

شہادتِ عثمان کا نتیجہ جنگِ صفین ایک ناگزیر واقعہ ہے حضرت علی پر یہ الزام کہ اس سازش میں حضرت علی کا ہاتھ تھا، صحیح ہو یا غلط بحث طلب امر نہیں، لیکن مخالف جماعت کے

اس پر یہ باور کرنے کے معقول وجوہ تھے کہ حضرت علی اس سازش میں شریک تھے آپ کا فوری تقرر بحیثیت خلیفہ اور ان لوگوں کو جو سازش کے سرغنہ تھے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز کرنا بے معنی نہیں، یزید کی ولی عہدی کے بارہ میں مختلف روایات ہیں، خواہ شفقت پدری یا مسلمانوں میں خانہ جنگی کا خوف یا یزید کی ذاتی قابلیت یا کوئی اور خیال محرک ہوا ہو۔ بحث طلب امور نہیں ہیں، استخلاف، یا وصیت یا شوریٰ کے طریقہ انتخاب سے انحراف جس میں پہلے ہی اختلاف ہے. کوئی وجہ الزام نہیں۔ اس زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کا جائزہ لینا چاہیئے جس نے بنی امیہ کو کامیاب بنایا، اور یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ جب خلیفہ کو وصیت کا بھی اختیار ہے تو معاویہ کس کے حق میں وصیت کرتے، آئندہ واقعات نے بتا دیا کہ اس وقت حسین ابن علیؓ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیرہی ایسے لوگ تھے جو دعویدار خلافت ہو سکتے تھے عبداللہ بن عمر تو ایک زاہد اور عابد آدمی تھا، اس نے کبھی خلافت کی خواہش نہ کی۔ دومتہ الجندل پر جب حکمین نے خلافت پیش کی تو انکار کر دیا، باقی دونوں ہاشمی تھے۔ اور دونوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، عبداللہ ابن زبیر نے مکہ میں دارالخلافت قائم کیا اور لڑے مگر کامیاب نہ ہوئے، حسین ابن علیؓ کو کوفیوں نے دعوت دی، عبداللہ بن عمر اور دیگر ہوا خواہوں نے مشورہ دیا کہ اول تو جماعت میں اختلاف اور تفرقہ کا باعث نہ ہو، دوسرے کوفی بے وفا ہیں، آپ کے بھائی اور باپ سے کیا سلوک کیا کہ ان سے وفا کی امید کی جائے، سید امیر علی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ صرف عبداللہ بن زبیر نے یہ مشورہ دیا کہ ضرور کوفیوں کی دعوت قبول کرنی چاہیئے اور یہ مشورہ اس لئے دیا کہ خود خلافت کا ارادہ رکھتا تھا، چاہتا تھا کہ حسینؓ درمیان سے ہٹ جائے۔ امیر معاویہ سے پوچھا گیا کہ آپ اپنے بیٹے کے حق میں کیوں وصیت کرتے ہیں تو کہا کہ اب لونڈے ہی رہ گئے ہیں اور ان میں میرا بیٹا زیادہ تر لائق ہے، معاویہ بہت دور اندیش سیاسی مدبر تھا، وہ جانتا تھا کہ جس طرح بنو ہاشم بنی امیہ کی خلافت تسلیم نہیں کرتے اسی طرح بنو امیہ بھی نہ کریں گے اور خانہ جنگی ناگزیر ہے، بنو امیہ کا پشت و پناہ تمام عرب تھا اور یہ خالص عربی حکومت تھی،

اور دشمن آل محمد تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت پر دین سے تھی۔ حضرت عثمان کے نیچے بچے اور کنبہ کے سارے افراد مذکر بے یار و مددگار نہیں مارے گئے۔ حضرت عثمان کی بیویاں بیٹیاں

صدیق اکبرؓ کی طرح امیر معاویہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر اپنے جانشین کا تقرر اپنی زندگی میں نہ کیا تو تمام دنیائے اسلام میں خانہ جنگی کا آغاز ہو جائے گا۔ عبداللہ بن زبیر نے سختی سے اعتراض کیا، کہ صدیق اکبرؓ نے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا جو آپ کا رشتہ دار نہ تھا۔ معاویہ نے جواب دیا کہ عمر سا شخص لاؤ۔ میں اسی کے حق میں وصیت کرتا ہوں۔ کہا کہ اچھا عمرؓ کی سنت پر عمل کرو۔ آپ نے شوریٰ کے سپرد انتخاب کیا، جواب دیا کہ ایسے چھ آدمی ہی پیدا کر دو۔ میں بھی ان ہی کے سپرد یہ کام کر دوں گا۔ ان چھ آدمیوں میں سے ایک شخص نے آخر خلیفہ مقرر ہونا تھا، اور ہوا۔ تم نے اس منتخب شدہ شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ تم چند لونڈے رہ گئے ہو۔ اور میں جانتا ہوں کہ تم میں سے میرا لڑکا زیادہ لائق ہے اور اسی پر دنیائے اسلام کا اتفاق ہوگا۔" اگرچہ معاویہ نے بہت کوشش کی کہ ابن زبیر اور ابن علی اور ابن عمر اور عبدالرحمن بن ابوبکر بیعت یزید پر رضامند ہو جائیں مگر وہ ٹالتے ہی رہے۔ آخر الذکر دو حضرات میں سے عبدالرحمن کا انتقال ۵۳ھ میں ہو چکا تھا۔ مگر عبداللہ بن عمر تو ہمیشہ یہی کہتے رہے "لا تفرقا جماعۃ المسلمین" یہ ممکن ہے کہ آپ نے بیعت نہ کی ہو مگر آپ مخالف بھی نہ تھے۔

یزید کے بعد اس کا بیٹا معاویہ تین ماہ کے بعد خلافت سے دست کش ہو گیا۔ اکابر کو جمع کیا اور کہا کہ مجھے حکومت سے معذور سمجھو۔ میں چاہتا ہوں کہ سنت عمرؓ پر عمل کروں مگر آج ایسے چھ آدمی بھی نظر نہیں آتے اس لئے میں اب تمہیں ارباب شوریٰ مقرر کرتا ہوں جس کو چاہو خلیفہ مقرر کر لو۔

ادھر شوریٰ اس ادھیڑبن میں لگے ہوئے تھے، کہ کس کے ہاتھ میں عنان خلافت دیں، عبداللہ بن زبیر نے ارض حجاز میں، خراسان میں عبداللہ بن حازم نے کوفہ میں مختار ثقفی نے خود مختار حکومتیں قائم کیں، نافع بن ازرق امیر خوارج نے سر اٹھایا، اہل شام اور مصر نے مروان بن حکم کے ہاتھ پر بیعت کی، آپ حضرت عثمانؓ خلیفہ سوم کے چچا کے بیٹے تھے، اور خلافت امویہ میں مروان اول کے نام سے مشہور ہے چند سال تک ہنگامہ کا زلزلہ مختلف مقامات پر برپا رہا۔ بیشک بیعت معاویہ بن یزید کی ایک سیاسی غلطی کا خمیازہ تمام

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دین پناہ است حسین

ایسا نہیں۔ بلکہ جس چیز کو جتنا دبایا اور چھپایا جائے وہ اتنی ہی ابھرتی ہے۔ دوسرے قاتل ہمیشہ جرم کا انکار کرتا اور جرم کو چھپانے کی کوشش کرتا مگر مقتولین مظلوم ہوتے ہیں وہ واویلا کرتے ہیں۔

دنیائے اسلام کو بھگتنا پڑا، اور ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا، آخر بنو امیہ ہی کے حق میں برہان قاطع تلوار نے فیصلہ کر دیا۔

شہادت امام حسین کا واقعہ تمام مورخین نے لکھا ہے، لیکن ابن خلدون جو ایک محقق مورخ ہے خاموش ہے، اس نے اس واقعہ کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا، ہمارے زمانہ میں بعض محققین نے اس واقعہ کا سرے سے انکار کر دیا ہے، جو حضرات فلسفہ تاریخ سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ جس واقعہ کو غیر معمولی شہرت دی جائے اس کی تہہ میں سیاسی اغراض ہوتی ہیں، جو عوام سے پوشیدہ رکھی جاتی ہیں، اور ایسا واقعہ یا تو سرے سے جھوٹ کا طومار ہوتا ہے یا اس میں "زد پیمانہ آب است و یک چمچہ دروغ" لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ واقعہ رونما ہوا، یزید خاموشی سے حسین کو خروج کرتا نہیں دیکھ سکتا تھا اگر حسین انکار بیعت پر بھی اکتفا کرتے تو معاویہ کی طرح یزید بھی طرح دیتا، ہمارے زمانہ میں وہ جس لعنت و ملامت کا نشانہ بنا ہوا ہے، اس سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ خلافت سے دست بردار ہو جاتا، اس کے بیٹے نے یہی سیاسی غلطی کی اور دنیائے اسلام نے دیکھ لیا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ یزید کے پرستاروں نے ال کو جتن کئے مگر وہ دشمن آل

لیکن کیا وجہ ہے کہ شہادت حسین کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے اور شہادت عثمان کو نظر انداز کیا جاتا ہے اگر امام حسین حضرت علی کے بیٹے ہیں اور حضرت علی آنحضرت کے داماد ہیں تو کیا ذی النورین کو یہ فخر حاصل نہیں، حضرت علی آنحضرت کے چچا کے بیٹے ہیں مگر اس قرابت کا لحاظ کر بہ وجہ انتخاب خلافت ہوتی تو یہ ضرور کیا جاتا جو کبھی نہیں کیا گیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ

عروس ملک کسے در کنار گیر د چست
کہ بوسہ بر لب شمشیر آب دار زند

اس بہادر سپاہی نے اس کا تجربہ کیا، کامیاب نہ ہوا، مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔

چند تاریخی واقعات "خلافت عباسیہ" کے تحت اس موضوع کی مزید تشریح کے لئے بیان کئے جائیں گے۔

خلفائے بنی امیہ میں سے آٹھواں خلیفہ عمر بن عبد العزیز بن مروان اول عمر ثانی

(حاشیہ پر ہاتھ سے لکھا ہوا:) محمدؐ کا کلمہ پڑھنے والوں نے آل محمدؐ پر ظلم بھی کیا۔ اور پھر اسکو چھپانے کی کوشش جاری رکھی۔ مگر خون حسینؑ اصل میں مرگ یزید ہے۔ محمدؐ نبیؐ اور آج محمدؐ کے نور نظر۔ لاالہ در پیرا نہ کار پرورش۔ لقد لک (اقبال) در بیابان کربلا بار ہو رفت۔ نقش الا اللہ بر صحرا نوشت۔ سطر عنوان نجات ما نوشت۔ رمز قرآن از حسینؑ آموختیم۔ ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم۔ ما سوا اللہ را مسلمان بندہ نیست۔ پیش فرعونے سرش افگندہ نیست۔ [illegible]

سب سے پہلے معاویہ ہی نے حضرت علیؑ کو گالیاں نکلوائیں
سب وشتم جاری کر دیا [۸۲] اور یہ کام بد جاری رہا

بعد میں عمر بن عبدالعزیز نے آ کر بند کروا دیا

کے لقب سے مشہور ہے، کہ اس میں فاروق اعظم کے اوصاف پائے جاتے تھے خوا[رج] سے جنگ ایک عرصہ سے جاری تھی، افسران فوج کو لکھا کہ لڑائی بند کر دو، اور خوارج کے سرداروں کو کہو کہ اپنے چند علماء ہمارے پاس بھیجو، اگر ان کے دلائل وقیع ہوئے تو ہم تسلیم کر لیں گے۔ چنانچہ لڑائی بند ہو گئی، خوارج کی طرف سے عاصم اور چند دیگر اشخاص مناظرہ کے لئے عمر بن عبدالعزیز کے پاس آئے، یہ مناظرہ جو خلیفہ کے دربار میں ہوا نہ صرف خوارج کے عقائد پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ بنو امیہ پر لعنت ملامت کرنے والوں کا بھی معقول جواب ہے، عمر بن عبدالعزیز نے عاصم کو سوال کا حق پہلے دیا،

عاصم نے کہا کہ "آپ کے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ نے ہماری مشتعل طبائع کو سرد کر دیا ہے اور ابھی تک آپ کی امارت کے خلاف ہماری طرف سے کوئی کوشش ظہور میں نہیں آئی، لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے خلافت کا استحقاق کس طرح پیدا [کیا] لوگوں کی رضامندی سے یا بزور۔

عمر بن عبدالعزیز نے جواب دیا کہ نہ تو مجھے اس کی خواہش تھی اور نہ میں نے اسے بزور حاصل کیا۔ ایک شخص نے میرے حق میں وصیت کی اور کسی شخص نے میری بیعت سے انکار نہیں کیا چونکہ تمہارا عقیدہ یہی ہے کہ ہر ایک مومن مسلمان خلافت کا مستحق ہے، اور جس شخص کی خلافت پر مسلمانوں کا اتفاق ہو وہی خلیفہ برحق ہے، اس لئے میری خلافت پر تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے، مگر خلافت کے لئے عدل شرط ہے اگر میں حق کا مخالف ہوں، تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں،

عاصم نے کہا کہ "بیشک تم امیر عادل ہو اور عوام الناس نے تمہاری خلافت پر اتفاق بھی کیا، لیکن تمہارے رشتہ دار جن کے افعال اور حرکات سے تم نے مخالفت کی ہے اور انہیں ظلم سے تعبیر کرتے ہو اس لائق ہیں کہ تم ان سے بیزاری کا اظہار کرو۔ اور ان پر لعنت بھیجو کیونکہ تم ہدایت پر ہو اور وہ ضلالت پر قائم رہے۔

عمر نے جواب دیا کہ "افسوس خوارج کا مدعا تو صرف اللہ اور رسول کی خوشنودی حاصل کرنا ہے مگر تم شارع حقیقت سے دور جا پڑے ہو، اللہ تعالیٰ نے

ی پر لعن کرنا مشروع نہیں کیا، اور نہ رسول کریم کو لاعن مبعوث فرمایا، ابراہیم
یل اللہ نے کہا کہ "ومن عصانی فانک غفور الرحیم" اور اللہ تعالےٰ فرماتا
ہے کہ اولئک الذین ھدی اللہ فبھدٰھم اقتدہ میں نے ان کے اعمال کو مظالم سے
مورد تعبیر کیا ہے، پس اس قدر ان کی مذمت کافی ہے، اگر گنہگاروں پر لعنت واجب ہے
تم حق بجانب ہو کر فرعون پر لعنت کرو لیکن تم ایسا نہیں کرتے، اور وہ بدترین خلائق تھا
ں اپنے رشتہ داروں پر کس طرح لعنت کرسکتا ہوں وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے،
شک ان کے بعض اعمال ظلم تھے، مگر وہ کافر نہیں تھے، رسول اللہ نے لوگوں کو ہمارا
شریعت کی طرف دعوت دی، جو اس پر عمل کرے گا، اس سے وہ عمل قبول کیا جائے گا۔"
شخص کسی امر کا احداث کرے گا اس پر حد جاری کی جائے گی"

عاصم نے کہا کہ "یہ سب کچھ سہی، مگر رسول اللہ نے لوگوں کو توحید اور اقرار بانزل
لیہ کی بھی دعوت دی،

عمر نے جواب دیا کہ" وہ کب توحید کے منکر تھے، سب موحد ہی تھے، انہوں نے
کب کہا کہ سنت رسول اللہ پر عمل نہیں کریں گے بلکہ کرتے رہے، یہاں تک کہ ہو سکا ہے
لئے وہ کس طرح مورد طعن ولعن ہو سکتے ہیں،

عاصم نے کہا کہ "بہر حال تم ان کے افعال کو مظالم سمجھتے ہو اس لئے ان لوگوں سے
بیزاری ظاہر کرو۔ اور ان کے احکام کو رد کرو۔

عمر نے جواب دیا کہ تم ابوبکر اور عمر کو خلیفہ برحق یقین کرتے ہو، صدیق اکبر نے اہل ردت
سے جنگ کی اور ان کے عورتوں اور بچوں کو لونڈی غلام بنالیا، عمر نے فدیہ لے کر یا احسان
رکھ کر چھوڑ دیا، اور ابوبکر سے بیزاری ظاہر نہیں کی" اس کے بعد خلیفہ نے اور مثالیں پیش
کیں اور خود خوارج کے باہمی اختلافات پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ" تم ایک دوسرے
سے بیزاری ظاہر ہیں کرتے اور مجھے کہتے ہو کہ اپنے خاندان والوں سے تبرا کروں حالانکہ
دین ایک ہے۔ اللہ سے ڈرو اور مردود کو مقبول اور مقبول کو مردود نہ بناؤ۔ بیشک
رسول اللہ نے اس شخص کو امن دی جس نے کلمہ شہادت پڑھا۔ اور اس کا مال و خون حرام

فرمایا تم ان ہی کلمہ گویوں کو قتل کرتے ہو۔ اور غیر مذاہب والوں کو امن دیتے ہو۔ ان کے مال اور خون کو ناروا سمجھتے ہو۔

ابن خلدون نے یہ مباحثہ مفصل لکھا ہے اس کا اثر یہ ہوا کہ عاصم نے خوارج کے عقائد سے توبہ کی، اور پھر لوٹ کر اپنے رفقاء کے پاس نہیں گیا۔ اس واقعہ کے چند روز بعد عمر بن عبدالعزیز کا انتقال ہوگیا۔ اور خوارج سے پھر جنگ چھڑ گئی۔

ایک دفعہ عامل مصر نے لکھا کہ یہاں لوگ جوق در جوق اسلام قبول کر رہے ہیں، میرا خیال ہے کہ جزیہ سے بچنا چاہتے ہیں اگر حکم ہو تو ختنہ سے ان کا امتحان کر دوں۔ جواب میں لکھا کہ تم بخت اللہ تعالیٰ نے رسول کریم کو جزیہ وصول کرنے اور لوگوں کو مختون بنانے کے لئے مبعوث نہیں فرمایا، اگر تو نے کوئی ایسی ناشائستہ حرکت کی تو ایک غلام بھیجوں گا جو تیرے حواس خمسہ درست کر دے گا۔

بنو امیہ کی خلافت کے دور میں مساجد کی تعمیر شروع ہوئی، اگرچہ مساجد ضرورت سے زیادہ نہ تھیں اگر جو بھی تعمیر ہوئی وہ عربی فن عمارت کا نمونہ تھی "جامعہ دمشق" تو ایک زیارت گاہ تھی، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے خیال کیا کہ مسجد میں سونے اور چاندی کی زنجیریں اور دیگر اشیاء بے مصرف ہیں ان کو اتار کر بیت المال میں داخل کرنا چاہیئے، اتفاق سے قیصر روم کا ایک سفیر دمشق میں آیا دس ہمراہیوں کے ساتھ مسجد کو بھی دیکھنے گیا۔ صحن مسجد میں کھڑے ہو کر جب اپنے سامنے وہ دلکش نظارہ دیکھا جس کا ہم نے مذکور اپنی کتاب "دمشق" میں کیا۔ ہے تو اس پر حیرت طاری ہوگئی، اس کے بعد رنگ رو فق ہوگیا اور اپنے ہمراہیوں سے یونانی زبان میں کہا کہ ہمارا تو خیال تھا کہ عربوں کی اقامت شام میں چند روزہ ہے لیکن یہاں تو انہوں نے اپنے استقلال کے سامان جمع کر رکھے ہیں، خلیفہ کے چند آدمی بھی سفیر کے ہمراہ تھے جو یونانی زبان سے واقف تھے، خلیفہ کو سفیر کی گفتگو سے مطلع کیا تو کہا کہ بیشک یہ مسجد کفار کو غیظ میں لاتی ہے۔ اس کے بعد اپنا ارادہ ترک کر دیا!

اموی خلافت کے دور دورہ میں ان عاملوں کی مجاہدانہ سرگرمی کا اگر تذکرہ کیا جائے جو مختلف ممالک مشرقی و غربی میں متعین تھے تو ایک دفتر درکار ہے ان میں سے ایک حجاج بن یوسف

ثقفی کو ہم اس لئے منتخب کرتے ہیں کہ بقول شیخ سعدی اس کا ظلم حاتم کی سخاوت کی طرح مشہور ہے۔

حجاج بن یوسف ثقفی

ابتدا میں حجاج طائف میں معلم تھا، جو اس وقت معزز زندگا تھا، باپ کا نام یوسف تھا، اس وقت روح بن زنباع وزیر عبد الملک تھا، ایک دن عبد الملک نے وزیر سے کہا کہ عسکری نظام میں خرابی واقع ہو رہی ہے، اور سپاہیوں میں جذبہ اطاعت کا فقدان ہے۔ کیا تمہارے علم میں کوئی ایسا آدمی ہے جو اس خرابی کو دور کرے، وزیر نے کہا کہ حجاج بن یوسف اس وقت حجاج وزیر کی پولیس کا افسر تھا، اور اپنی قابلیت سے اس محکمہ کا انتظام خاطر خواہ کر رہا تھا۔ عبد الملک نے حجاج کو اس خدمت پر مامور کیا کہ خلیفہ اور وزیر کی محافظ فوج کا بھی انتظام مناسب کردے، ایک دن دیکھا کہ روانگی کا حکم تو مل چکا ہے مگر وزیر کے بے فکرے آدمی کچھ تو اکل و شرب میں اور کچھ خوش گپی میں مصروف ہیں پوچھا کہ ابھی تک تم نے تیاری سفر بھی نہیں کی، جواب گستاخانہ ملا اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا، انہوں نے چابکوں سے ان کو خوب پھٹکارا اور کچھ خیمے بھی جلا دیئے، اس کی شکایت وزیر کے پاس بھی ہوئی، وزیر نے خلیفہ سے لگا دی، خلیفہ نے وزیر سے کہا کہ آدمی منتظم معلوم ہوتا ہے اور تم ہی نے اس کی قابلیت انتظام کی تعریف کی تھی، اور اب شکایت کرتے ہو۔ اس لئے کہ تمہاری عزت نفس کو ٹھیس لگی ہے، طلبی ہوئی تو خلیفہ نے ذرا سختی سے پوچھا کہ یہ کیا ناشائستہ حرکت تم سے سرزد ہوئی کہ وزیر کے آدمیوں کو پیٹا اور ان کے خیمے بھی جلا دیئے، عرض کی کہ اے امیر المومنین میں کیا اور میری بساط کیا۔ حکم تو آپ ہی کا ہے میں ایک آلہ کار ہوں آپ ایک خیمہ کے عوض وزیر صاحب کو دو اور ایک غلام کی جگہ دو غلام دے سکتے ہیں، مگر آپ کے حکم کی تعمیل وقت پر نہ ہو تو ناقابل برداشت ہے، عبد الملک تو پہلے ہی سمجھ چکا تھا وزیر دم بخود ہو کر رہ گیا،

حجاز میں عبد اللہ بن زبیرؓ نے علم بغاوت بلند کیا، اور اگر کامیاب ہو جاتا تو بنو امیہ کی خلافت ختم ہو جاتی، عبد الملک نے اس مہم کے لئے حجاج کو منتخب کیا، اس نے سختی

کے موقعہ پر سختی اور نرمی کے موقعہ پر نرمی سے کام لیا۔ اس کا نتیجہ خاطر خواہ ہوا، ابن زبیرؓ کے دو لڑکے حمزہ اور حبیب بھی حجاج سے آملے، اور اکثر لوگوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا، عبداللہ بن زبیرؓ لڑتے ہوئے کام آئے اور حجاج کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا ۷۵ھ میں حجاج کا تقرر بہ حیثیت والیٔ عراق ہوا، کوفہ دارالولایت تھا، اور شورش و فساد کا مرکز اس کا انتظام ذرا ٹیڑھی کھیر تھی، رمضان کا مہینہ تھا، ان ایام میں یہ دستور تھا کہ خلیفہ اور والیان اور عامل ہی امامت کے فرائض انجام دیتے، جامع مسجد میں منبر پر خطبہ کے لئے کھڑا ہوا، عمیر بن ضیابی ہاتھ میں کنکر لئے بیٹھا تھا، اور کہتا تھا کہ اس پر اور اس کے بھیجنے والے پر لعنت، دیکھنا میں ابھی اس کی کیا گت بناتا ہوں" ایک رفیق نے کہا کہ جلدی نہ کرو۔ پہلے سُن تو لیں کیا کہتا ہے، حجاج نے تقریر شروع کی، اس کا یہ اثر ہوا کہ عمیر کے ہاتھ سے کنکر گرتے جاتے تھے اور دل اندر ہی اندر بیٹھا جاتا تھا، حجاج نے آخر میں کہا کہ اے اہلِ کوفہ میں تم میں سے اکثر آدمیوں کے تن بے سر دیکھ رہا ہوں آج رات جو شخص مہلب کے لشکر میں شامل نہ ہوگا، صبح سورج کو نہ دیکھے گا" امیر مہلب بن ابی صفرہ اس وقت خوارج سے لڑ رہا تھا، اور لوگ جی چرا رہے تھے، صبح ہونے نہ پائی کہ اہلِ کوفہ وہاں پہنچ گئے، چند روز میں اُنہوں نے شورشیوں کو خاک و خون میں ملا دیا۔

ہرات کا والی یزید بن امیر مہلب بن ابی صفرہ تھا، ۸۲ھ میں عبدالرحمٰن بن اشعث نے علمِ بغاوت بلند کیا، ہزیمت خوردہ خراسان کی طرف بھاگا، ہرات کے قریب قیام کیا یزید سر پر پہنچ گیا، چند سر برآوردہ آدمی اسیر ہوئے، حجاج کے روبرو پیش ہوئے تو سب کو قتل کیا، بنقام بن نعیم سے پوچھا کہ ابن اشعث کو تو ہوسِ ملک گیری تھی، تجھے کس بات کی آرزو تھی؟ جواب دیا کہ تیری جگہ حکومت عراق کی" عشی ہمدانی نے ایک قصیدہ میں اس اشعث کو حجاج کے خلاف جنگ کی ترغیب دی تھی اس کی باری آئی تو کہا کہ ذرا وہ قصیدہ پھر سے پڑھنا، کہ میں بھی دادِ سخن دوں، یہ تبدیل قافیہ شعر پڑھنے لگا، جب اس مصرع پر پہنچا کہ "بخ بخ للوالدۃ وللمولود" تو کہا، واللہ آج کے بعد تو کسی کو ہدف ملامت نہ بنائیگا۔ شعبی گرفتار ہو کر آئے، تو ان سے بھی کہا، کہ تم کچھ اپنی برأت کے متعلق کہنا چاہتے ہو۔

شعبی نے کہا کہ میں نے کبھی دانستہ جھوٹ نہیں بولا، ہم نے تمہارے خلاف لڑائی میں انتہائی کوشش کی اور نہ تو ہم زبردست فاجر تھے اور نہ متقی اور نیک دل، اللہ تعالیٰ نے تم کو ہم پر غلبہ دیا، اگر سزا دوگے تو ہماری خطا کی وجہ سے، اگر معاف کردگے تو اپنے حلم و کرم کے سبب، اور تم حق بجانب ہو،" حجاج نے کہا واللہ یہ شخص مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں اس معرکہ میں نہ تھا حالانکہ اس کی تلوار سے ہمارا خون ٹپکتا ہے۔"

شعبی کو عزت اور احترام سے رخصت کیا، ایک اور قیدی کی باری آئی، تو اس نے کہا کہ میں انصاف کا خواہاں ہوں، حجاج نے حیران ہو کر پوچھا کہ کس طرح! کہا کہ ایک دفعہ عبدالرحمٰن تمہاری نسبت نا ملائم الفاظ استعمال کر رہا تھا میں نے منع کیا، حجاج نے کہا کوئی شہادت موجود ہے اس نے ایک اور قیدی کی طرف اشارہ کیا، اس نے تصدیق کی، حجاج نے دونوں کو چھوڑ دیا، اس لئے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے۔ اور دوسرے نے بھی سچی گواہی دی،

حجاج کے ظلم و ستم کے بہت افسانے مشہور ہیں، اور ان میں کچھ افسانوی رنگ بھی بھر گیا ہے، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ حالات کا تقاضا ہی یہی کچھ تھا، اگرچہ اس نے ضرورت سے زیادہ سختی سے کام لیا، ۹۳ھ میں عمر بن عبدالعزیز مدینہ میں عامل تھے۔ جو بعد میں سریر آرائے خلافت ہوئے، ولید بن عبدالملک اس وقت خلیفہ تھا، عمر نے لکھا کہ حجاج کا ظلم حد سے بڑھ گیا ہے، ادھر حجاج نے بھی ایک عرضداشت بھیج دی کہ شورہ پشت عراق میں میری گرفت سے بچ جاتے ہیں اور مدینہ میں عمر کے ہاں پناہ لیتے ہیں، خلیفہ نے عمر بن عبدالعزیز کو حجاز کی امارت سے معزول کر دیا، محمد بن قاسم حجاج ہی کا برادر زادہ تھا جس نے وادی سندھ پر اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔

شجرۂ خاندانِ بنی عباس

عبد مناف

عبد شمس — ہاشم

ہاشم
عبد المطلب

عبد المطلب: ابوطالب — حمزہ — عباس — ابی لہب — عبداللہ

عبداللہ
حضرت محمد رسول اللہؐ

عباس
عبداللہ
علی

علی: عبداللہ — محمد — سلیمان

محمد: (۱) عبداللہ السفاح سنہ ۱۳۲ — (۲) منصور سنہ ۱۳۶ — موسیٰ

(۲) منصور
(۳) محمد المہدی سنہ ۱۵۸

موسیٰ
عیسیٰ (سپہ سالار افواج عباسیہ، ہارون نے مروا ڈالا)

(۳) محمد المہدی: (۴) ہادی سنہ ۱۶۹ — (۵) ہارون رشید سنہ ۱۷۰

- (۵) واثق سنہ ۲۲۷
- (۱۰) متوکل سنہ ۲۳۲
  - (۱۱) منتصر سنہ ۲۴۷
  - (۱۳) معتز
  - (۱۵) معتمد سنہ ۲۵۶
  - طلحہ (موفق)
    - (۱۶) معتضد سنہ ۲۷۹
      - (۱۷) مکتفی سنہ ۲۸۹
        - (۲۲) مستکفی سنہ ۳۳۳
      - (۱۸) مقتدر سنہ ۲۹۵
        - (۲۰) راضی سنہ ۳۲۲
        - (۲۱) متقی سنہ ۳۲۹
        - (۲۳) مطیع سنہ ۳۳۴
          - (۲۴) طائع سنہ ۳۶۳
        - اسحٰق
          - (۲۵) قادر سنہ ۳۸۱
            - (۲۶) قائم سنہ ۴۲۲
              - محمد
                - (۲۷) مقتدی سنہ ۴۶۷
                  - (۲۸) مستظہر سنہ ۴۸۷
                    - ابو بکر
                      - علی
                        - حسن
                          - حاکم (مصر میں خلافت قائم کی)
                    - (۲۹) مسترشد سنہ ۵۱۲
                      - (۳۰) راشد سنہ ۵۲۹
                    - (۳۱) مقتفی سنہ ۵۳۰
                      - (۳۲) مستنجد سنہ ۵۵۵
                        - (۳۳) مستضی سنہ ۵۶۶
                          - (۳۴) ناصر سنہ ۵۷۵
                            - (۳۵) ظاہر سنہ ۶۲۲
                              - (۳۶) مستنصر سنہ ۶۲۳
                                - (۳۷) مستعصم سنہ ۶۴۰
      - (۱۹) قاہر سنہ ۳۲۰
- (۱۲) مستعین سنہ ۲۴۸
- (۱۴) مہتدی سنہ ۲۵۵

خلافتِ عباسیہ

آیۂ استخلاف میں تین امور کا مذکور ہے، اول اسلام کا استقلال، دوم امن جس دور دورہ میں اشاعت اسلام ممکن ہے، اور مسلمان پسندیدہ زندگی بسر کر سکتے ہوں سوم بحالت امن اللہ کی عبادت بلا شرک، یہ تینوں باتیں بنو اُمیّہ کے دورِ خلافت میں ممکن تک مسلمانوں کو حاصل تھیں، خلافت کا مقصد یہی کچھ ہے۔

۱۳۲ھ مطابق ۷۵۰ء میں بنو اُمیّہ کی خلافت ایشیا میں ختم ہو گئی، اور ان کے جانشین بنو عباس ہوئے، اس انقلاب کے دور میں جو واقعات ظہور میں آئے، وہ ہر ایک قوم کی انقلابی تاریخ میں واقع ہوتے رہتے ہیں، مختصر یہ کہ دولتِ اموی کی بربادی کا باعث بنو ہاشم ہی تھے۔ ان کی کوشش شروع خلافتِ امویہ سے مسلسل جاری رہی، صرف تھوڑا عرصہ بظاہر خاموشی رہی، ابتدا میں یہ کوشش صرف سادات اور علوی خاندان نے جاری رکھی بنو عباس اگرچہ ان کے ہمدرد تھے مگر علانیہ کسی شورش یا بغاوت میں حصہ لینے سے کتراتے تھے۔

عبد اللہ علوی جو محمد بن حنیفہ کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے پوتے تھے، اس وقت جب کہ اموی حکومت رو بزوال تھی صاحب اثر بزرگ تھے، ان کے پیروؤں کی تعداد کثیر تھی خراسان اور ایران میں ان کے نقیب جا بجا خفیہ سازش کا جال پھیلا رہے تھے ۹۸ھ میں فوت ہو گئے، اولاد نرینہ نہ تھی، سادات میں کوئی صاحب اثر و ہمت شخص نہ تھا، اس لئے محمد بن علی کو جو حضرت عباسؓ عم رسول اللہ کے پڑپوتے تھے اپنا جانشین مقرر کر گئے، اب علوی

رسوخ بنو عباس میں منتقل ہو گیا، بنی فاطمہ کو یہ امر ناگوار تو گذرا، مگر مصلحت وقت یہی تھی کہ بنو عباس سے ملے رہیں، مشترکہ غرض اموی خلافت کا تختہ الٹنا تھا، بنو عباس بھی ان کو یہ تعیین دلاتے رہے کہ جو کچھ کر رہے ہیں انہی کے مفاد کے لئے کرتے ہیں۔

بنو ہاشم کی کامیابی کا سبب ان کے نقیب تھے، جو جا بجا ممالک اسلامیہ میں پھیلے ہوئے تھے، سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے ان ہی ایام میں احادیث کثرت سے وضع کی گئیں، انہی ایام میں نزول عیسٰی اور خروج مہدی کے بارے میں احادیث وضع ہوئیں، غالباً امام بخاری کو علم نہ تھا، ان کی صحیح میں مہدی کا مذکور نہیں نزول عیسٰے کے بارہ میں ایک حدیث ہے اور یہ بھی الحاقی معلوم ہوتی ہے۔ ہر ایک خاندان کا نقیب فصیح و بلیغ خطبوں میں احادیث موضوعہ بیان کرتا، کہ آنحضرت نے فرمایا کہ میرے بعد فتنہ کا زمانہ شروع ہو جائے گا (بخاری نے باب فتن علیحدہ باندھا ہے) فلاں خاندان میں اس حلیہ اور اس نام کے ایک شخص کا ظہور ہوگا، وہی امام، خلیفہ برحق ہے، نقیب اسی شخص کا خاندان اور حلیہ بتاتے جس کی طرف سے اس شائستہ خدمت پر مامور تھے، چنانچہ لوگ مہدی کے انتظار میں بیتاب تھے، اس کی تلاش ہر ایک جگہ تھی، ایسے مہدی انہیں بہت ملے ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے، بنو امیہ کے خلاف بغاوت کی، اور عموماً مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا کیونکہ ہر لڑائی میں مہدی کام آتا، اس کی جگہ دوسرا تلاش سے مل جاتا، اس کا نتیجہ اتنا ضرور ہوا کہ

ـہ امام بخاری نے جب احادیث جمع کیں تو ان کی تعداد کئی لاکھ تھیں، انتخاب کے بعد جامع صحیح لکھی اس میں کل ۷۲۷۵ احادیث ہیں، اگر مکررات نکال دی جائیں تو صرف ۲۷۶۱ رہ جاتی ہیں، اس زمانہ میں بیشمار احادیث دانستہ لوگوں نے وضع کیں، چودہ ہزار احادیث صرف ایک فرقہ زنادقہ نے وضع کیں، زندیق عبدالکریم وضاع جب گرفتار ہوا تو تسلیم کیا کہ چار ہزار احادیث اس اکیلے نے وضع کی ہیں، جن میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا، اور ملک کے طول و عرض میں شائع ہو چکی ہیں، ملا علی قاری موضوعات کبیر کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ واعظوں نے گرم بازاری کے لئے بیشمار احادیث وضع کیں حافظ زین الدین عراقی لکھتا ہے کہ بہت سے ثقات ایسے تھے جو نیک نیتی سے فضائل میں حدیثیں وضع کرتے، ان کی ثقاہت اور ورع اور زہد کی وجہ سے اکثر مقبول ہوئیں اور رواج پا گئیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ایسی تمام احادیث موضوعات قرار دی ہیں۔

خلافت اُمیہ کی بنیاد کمزور ہوگئی۔

۱۲۶ھ میں محمد بن علی کا انتقال ہوگیا، اور آپ کا بیٹا امام ابراہیم باپ کا جانشین ہوا آپ کا دستِ راست ابو مسلم خراسانی تھا۔ کہتے ہیں کہ حکیم بوزرجمہر کی اولاد سے تھا، امام صاحب نے اس کو اپنا نائب مقرر کر کے خراسان کی طرف بھیجا، اُس نے سینکڑوں نقیب ہر طرف پھیلا دیے، ۲۵ ماہ رمضان ۱۲۹ھ شب پنجشنبہ عام بغاوت کی تاریخ مقرر کی گئی تاریخ مقررہ پر سیاہ پوش (جو آل عباس کا امتیازی نشان تھا) سوار و پیادہ تاریکی شب کے پردہ میں اُٹھے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔

اس سازش کا حال خلیفہ وقت مروان اطار پر کھل چکا تھا، امام ابراہیم تو قید ہو کر قتل کیا گیا، مگر ابو العباس کوفہ میں جو شروع سے اموی خلافت کے خلاف سازشوں کا مرکز تھا خلیفہ مشتہر کیا گیا، اودھر ابو مسلم افواج اُمیہ کو پے در پے شکست دے کر ایران کی طرف بڑھ رہا تھا ۱۳۲ھ میں مروان نے شکست کھائی اور مصر کی طرف بھاگا، دریائے نیل کے کنارے بوزات البا سل پر قتل کیا گیا، اُس کے ساتھ خاندانِ اُمیہ کا چراغ گل ہوگیا۔

ابو العباس تاریخ کے صفحات پر "سفاح" (خونخوار) کے مہیب نام سے مشہور ہے یہ شخص پانچویں پشت میں حضرت عباس عم رسول اللہ سے ملتا ہے اس نے بنو اُمیہ کے خون سے ہاتھ خوب رنگے، خاص دمشق میں ستر سرکردہ بنی اُمیہ کو ضیافت کے بہانہ دعوت دی گئی لاٹھیوں اور گرزوں سے ان کے سر پاش پاش کئے، اور ان کی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر سب نے کھانا کھایا، اُن میں سے کسی کے سسکنے یا کراہنے کی آواز آتی تو خوب قہقہے لگاتے، اس کے بعد خاندان امویہ کا جو بھی سرکردہ آدمی جہاں ملا مارا گیا ایک شخص عبدالرحمٰن بچا، یہ خوبصورت نوجوان افریقہ کی طرف بھاگا، سرگرمی سے تعاقب کیا، لیکن قضاء قدر نے فیصلہ کر دیا تھا کہ یہ شخص ہسپانیہ میں پھر خلافت اُمیہ قائم کرے گا جس کی عظمت و شان کو عباسی رشک کی نگاہ سے دیکھیں گے مگر کچھ بگاڑ نہ سکیں گے

سفاح نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ بنو اُمیہ کا ایک بچہ بھی زندہ نہ رہے۔ خلفاء بنو اُمیہ معاویہ اور یزید اور عبدالملک اور ہشام کی قبریں اُکھڑوا کر اگر ایک ہڈی بھی ملی تو آگ میں

جلائی گئی۔ سفاح نے چار برس صرف خونریزی ہی میں بسر کیے، ۱۳۶ھ مطابق ۷۵۴ء چار ضد چیچک فوت ہوا، اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ مقرر ہوا،

خلافت عباسیہ کا آغاز دراصل المنصور عباسی سے ہوتا ہے، اس نے بغداد کی تعمیر کے ساتھ خلافت عباسیہ کا سنگ بنیاد دجلہ کے کنارے پر رکھا، اس کی کیفیت ہم نے اپنی کتاب "بغداد" میں مفصل بیان کی ہے، اس کے عہد میں محمد المہدی ہاشمی نے خروج کیا، مہدی کے بارہ میں وہ تمام احادیث اب بھی اپنی پوری قوت استدلال کے ساتھ صحاح میں اور بالخصوص شیعان علی کی کتابوں میں اب بھی موجود ہیں، جس کا فائدہ ہر ایک زمانہ میں مدعیان مہدویت اٹھاتے رہے، منصور کے سیاسی تدبر نے اپنے بیٹے کا نام پہلے ہی محمد المہدی تجویز کر رکھا تھا، منصور کے حقیقی بھائی موسیٰ کا بیٹا عیسیٰ اس وقت سپہ سالار افواج عباسیہ تھا، نزول عیسیٰ اور مہدی کی امامت کے بارے میں احادیث کی پیش گوئی کے پورا ہونے کا وقت اب آ گیا، جب عیسیٰ اور مہدی ایک اور ہاشمی مہدی کی سرکوبی کے لئے لشکر جرار کے ساتھ نکلے،

منصور نے پہلے ہاشمی مہدی کو ایک خط لکھا کہ اگر اطاعت کرو تو تم کو اور تمہارے کل خاندان اور تمہارے فرمانبردار نسل کو امن دیتا ہوں اور تمہاری اور ان کی حفاظت کا ذمہ دار ہوں ایک لاکھ درہم بطور وظیفہ بھی نذر ہے اور جہاں خواہش ہو میری طرف سے اجازت ہے

سے ہم بیان کر چکے ہیں کہ اہل ایران نے ہاشمیوں کا ساتھ دیا، تو ان کی سیاسی غرض کچھ اور تھی اور اس کی تکمیل کے لئے ▪ احادیث وضع کرتے رہے، چنانچہ مہدی کے بارے میں انہوں نے بھی احادیث وضع کیں، کہ وہ سلمان فارسی کی قوم سے ہوگا، یعنی ایرانی آسمان کے تارے بھی توڑ لائے گا، علم ثریا میں ہوگا تو وہاں سے بھی شری میں اتار لائے گا، حالانکہ خود سلمان کی شخصیت ایک ختفا معلوم الاسم مجہول الجسم ہے اس کی عمر اڑھائی سو سال سے چھ سو سال بیان کی جاتی ہے مولانا اختر نے اپنے ▪ "دل جویائے حق" کا مواد انہی بے حقیقت روایات سے جمع کیا۔ ابو مسلم خراسانی دراصل ایرانی سلطنت بحال کرنا چاہتا تھا، جب منصور پر اس کا حال کھلا تو قتل کروا دیا،

ہاشمی مہدی نے جواب دیا کہ "تم فرعون ہو اور تمہارے مطیع آلِ فرعون ہیں ہم بنی اسرائیل کے مشابہ ہیں، جن پر تم نے طرح طرح کے ظلم کئے، حالانکہ خلافت ہمارا حق ہے اور تم ہمارے ہی سبب اس کے مدعی بنے، اور تمہاری کامیابی ہمارے ہی باعث ہوئی، لوگوں نے سمجھا کہ تم ہماری امداد کر رہے ہو تمہارا ساتھ دیا، تم نے تقویت حاصل کر کے ہمارا حق غصب کر لیا، تم مطیع تھے اب مختار بن بیٹھے، ہمارا باپ علی وصی اور امام ہے کسی کا سلسلہ قرابت ایسا نہیں جیسا کہ ہمارا سابقیت اور فضل کا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں تم پر شرف دیا ہے اور برگزیدہ بنایا ہے نبیوں میں ہمارے والد محمد سب سے افضل ہیں، اور سلف میں علی جو سب سے پہلے اسلام لائے ازواج میں خدیجہ طاہرہ ہیں جنہوں نے سب سے اول قبلہ رو نماز پڑھی، اور لڑکیوں میں بہترین دختران رسول اللہ ہیں، اور ان میں فاطمہ سیدۃ النساء عالمین ہیں اور مولودین اسلام میں حسن و حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں، میں بہ اعتبار نسب بہترین بنی ہاشم ہوں، مجھ میں کسی عجمی کا میل نہیں اور نہ ہی میں کنیزک زادہ ہوں، اور نہ میرے سلسلہ نسب میں یہ عیب ہے، شروع سے میرے آباؤ اجداد و امہات ممتاز چلے آتے ہیں میں اس کا بیٹا ہوں، جس کا مرتبہ سب سے اعلیٰ و ارفع ہے، رسول اللہ میں اس کا فرزند ہوں جس کو دوزخ میں کمتر عذاب ہو گا (ابوطالب) میں اللہ تعالیٰ کو ضامن دے کر تمہیں امان دیتا ہوں بشرط اطاعت، اور میں تم سے زیادہ مستحق خلافت ہوں، اور عہد کو پورا کرنے والا ہوں، تم مجھ سے پہلے بھی لوگوں کو امان دے چکے ہو" ان لوگوں میں سے تم مجھے کس کی امان دیتے ہو، ابن ہبیرہ یا عبداللہ بن علی یا ابومسلم خراسانی کی،

منصور عباسی نے جواب الجواب لکھا کہ تمہارے فخر کا دارومدار صرف عورتوں کی قرابت پر ہے اور یہ سب اہلِ فریب باتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو چچاؤں، باپوں، عصبہ، ولیوں کی طرح نہیں بنایا، چچا کو باپ کے قائم مقام بنایا ہے، بلکہ کتاب اللہ میں وہ قریب ترین ماں پر مقدم ہے، اگر اللہ تعالیٰ عورتوں کی قرابت کا پاس کرتا تو آمنہ (مادر رسول اللہ) ان میں سے اقرب اور قریب تر اور بڑی حق والی ہوتی اور سب سے پہلے جنت میں داخل ہوتی، اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیئت سے ان لوگوں کو جو گزر گئے پیدا کیا، اور تم نے فاطمہ ام ابی طالب اور اس سے

پیدا ہونے کا ذکر کیا ہے، اس کی تو یہ حالت ہے کہ اس کا کوئی لڑکا اور لڑکی اسلام سے بہرہ ور نہیں ہوئی، اور اگر اللہ تعالیٰ کو مردوں میں سے کسی کو بوجہ قرابت رسول اللہؐ دائرہ اسلام میں داخل کرنا منظور ہوتا تو عبداللہ کو بیشک وہ دنیا میں اور آخرت میں بہتر تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دین میں جس کو چاہا داخل فرمایا، فرماتا ہے کہ انک لا تھدی من احببت و لکن اللہ یھدی من یشاء وھو اعلم بالمھتدین

جب اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو مبعوث فرمایا، اس وقت آپ کے چار چچا زندہ موجود تھے، جب آیہ کریمہ "انذر عشیرتک الاقربین" نازل فرمائی تو دو نے اسلام قبول کیا، (عباس و حمزہ) اور ان میں سے ایک میرا باپ عباس تھا اور دو (ابوطالب اور ابولہب) نے انکار کیا، ان میں سے ایک ابوطالب تمہارا باپ تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا سلسلہ ولایت آپ سے منقطع کر دیا، اور آنحضرتؐ اور ان میں کوئی تعلق عزیزداری اور ذمہ اور میراث قائم نہ کیا، تمہارا یہ زعم ہے اور تم خیر الاخیار (ابوطالب) کے بیٹے ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے میں کوئی صغیر نہیں ہوتا، اور شر میں کوئی بہتر نہیں ہوتا اور کسی مرد مومن کو زیب نہیں دیتا کہ کسی دوزخی کی اولاد ہونے پر فخر کرے، اور قریب ہے کہ تم خود دوزخ میں جاؤ گے ارشاد الٰہی ہے کہ "قریب تر زمانہ میں ظالم جان لیں گے کہ وہ کس انقلاب کی زد میں ہیں"؛

تم نے لکھا ہے کہ حسن عبدالمطلب سے دوہرا معاملہ قرابت رکھتے تھے اور تمہیں رسول اللہ سے دو طرفہ تعلق قرابت ہے، بیشک خیر الاولین و آخرین رسول اللہ ہیں، آپ کو ہاشم اور عبدالمطلب سے صرف ایک پدری تعلق تھا، اور تمہارا یہ زعم کہ تم بہترین بنو ہاشم ہو، اور یہ کہ تمہارے آباؤ اجداد و امہات ان میں زیادہ مشہور تھے، اور یہ کہ تم میں کنیزک کا لگاؤ نہیں ہے، میں دیکھتا ہوں کہ تم نے کل بنو ہاشم سے اپنے آپ کو مفتخر بنا دیا ہے، غور کرو تف ہے تم پر، کل اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دو گے، تم حد سے بڑھ گئے ہو، اور تم نے اس سے بڑھ کر اپنا فخر جتایا جو ذات اور صفات میں تم سے افضل تھا (ابراہیم ابن محمد رسول اللہ جو ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھا) اور بالخصوص تمہارے باپ کی اولاد میں سے کوئی افضل سوائے کنیزک زادوں کے نہیں، بعد وفات رسول اللہ تم میں علی بن حسین (امام زین العابدین) سے افضل

کوئی شخص پیدا نہیں ہوا اور کنیزک زادہ تھے، اور کچھ شک نہیں کہ ان کا مرتبہ تمہارے دادا حسن بن حسین سے بڑا ہے اور ان کے بعد تم میں سے محمد بن علی کی مثل کوئی نہیں ہوا اور ان کی دادی کنیزک تھیں، اور جعفر تم سے بہتر ہے۔ تمہارا دعوے کہ تم رسول اللہ کے بیٹے ہو قطعاً غلط ہے، اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ ماکان محمد ابا احد من رجالکم تم لوگ آپ کی لڑکی کے لڑکے ہو، اور بیشک یہ قرابت قریبہ ہے مگر اس کو میراث نہیں پہنچ سکتی، اور نہ یہہ ولایت کی وارث ہو سکتی ہے، اور نہ اس کو امامت جائز ہے تمہارے باپ علیؑ نے اس کی ہر طرح خواہش کی تھی، فاطمہ کو روز روشن نکالا، اور در پردہ ان کو بیمار کیا اور رات کے وقت دفن کر دیا، پاں ہم لوگوں نے سوائے ابوبکر اور ان کے بعد عمر کے سوا اور کسی کو منظور نہ کیا اسمیں مسلمانوں میں اختلاف نہیں کہ نانا اور ماموں اور خالہ مورث نہیں ہوتے جو تم نے علیؑ کے سابق الاسلام ہونے پر فخر کیا، اس کا جواب یہ ہے کہ رسول نے بوقت وفات ابوبکر کو امام بنایا بعد ازاں لوگ ایک کے بعد دوسرے کو امام بنانے گئے، اور علی کو منتخب نہ کیا، حالانکہ یہ بھی ان چھ بزرگوں میں سے تھے جن کو عمر نے نامزد کیا۔ آپ کو خلافت کے لائق نہ سمجھا، عبدالرحمٰن بن عوف نے عثمان کو ان پر مقدم کر دیا، طلحہ و زبیر آپ سے لڑے (جنگ جمل میں) اور سعد نے آپ کی بیعت سے انکار کر دیا اور معاویہ کی بیعت کر لی، تمہارے باپ نے خلافت کی تمنا کی اور لڑے (جنگ صفین) اور آپ سے آپ کے مصاحب علیحدہ ہو گئے اور حکمین (عمرو بن العاص اور ابو موسیٰ اشعری) مقرر کرنے سے پہلے ان کے ہوا خواہ (خوارج) آپ کے استحقاق میں شک و شبہ کرنے لگے، حکمین نے آپ کی معزولی پر اتفاق کر لیا پھر آپ کی شہادت کے بعد حسن خلیفہ ہوئے، امامت اور خلافت کو معاویہ کے ہاتھ کپڑوں اور روپوں کے عوض فروخت کر دیا اور اپنے ہوا خواہوں کو معاویہ کے سپرد کر دیا،

پس اگر تمہارا اس میں کوئی حق بھی تھا تو تمہارے باپ نے فروخت کر ڈالا۔ اور قیمت وصول کر لی، پھر تمہارے چچا حسین نے ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر خروج کیا۔ ان لوگوں نے انہیں قتل کیا، خرما کی ڈالیوں پر سولی دی آگ میں جلایا، شہر بدر کیا ہم نے

تمہارے خون کا بدلہ لیا۔ اور تمہیں ان کی املاک کا مالک بنایا۔ تمہارے باپ دادا کا نام بلند کیا اور فضیلت دی۔ کیا تم اس احسان کے ذریعے ہمیں معقول کرتے ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم لوگوں کی بزرگی جاہلیت میں حجاج کو پانی پلانے (سقایہ) اور ولایت زمزم پر منحصر تھی۔ تمہارے باپ علی نے اس استحقاق کے بارہ میں ہم سے جھگڑا کیا۔ عمر نے ہمارے حق میں فیصلہ دیا۔ آنحضرت کے بعد بنی عبدالمطلب میں سے کوئی شخص سوائے عباس باقی نہ تھا۔ اس لئے وراثت چچا کی طرف منتقل ہو گئی۔

اس مباحثہ میں حق خلافت فریقین قرابت آنحضرت قرار دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کی تردید بھی کرتے ہیں۔ جب اول تین خلفاء کا انتخاب اس استحقاق کو نظر انداز کرنے کے بعد ہوا۔ تو ظاہر ہے کہ اُمت نے یہ کوئی حق ہی تسلیم نہ کیا جب منقول اور معقول دلائل سے کام نہ چلا۔ تو برہان قاطع تلوار نے فیصلہ کر دیا۔ یہ محمد بن عبداللہ جو نفس الذکیہ سے موسوم تھے بڑے صاحب اثر تھے۔ بڑے بڑے پیشوایانِ دین یہاں تک کہ امام مالک نے فتوے دے دیا۔ کہ منصور نے جبراً بیعت کی ہے۔ خلافت نفس ذکیہ کا حق ہے۔ عیسٰے سپہ سالار افواج عباسیہ نے اُسے شکست فاش دی۔ اور محمد النفس الذکیہ میدان میں کام آئے۔ نفس ذکیہ کے بھائی ابراہیم نے بصرہ سے خروج کیا۔ عیسٰے نے اُسے بھی شکست دی۔ اور ابراہیم مارا گیا۔

"درعالم اضداد چہ اندیشۂ صلح است باخود نتواں ساخت اگر جنگ نہ کردے"

دور جانے کی ضرورت نہیں، جہانگیر نے اپنے باپ اکبر کے خلاف اور شاہجہان نے جہانگیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ سب سے بڑے عالم دیندار عالمگیر نے باپ اور بھائیوں کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا۔ تاریخی واقعات ہیں۔

محققین ان واقعات میں کچھ اور ہی مشاہدہ کرتے ہیں وہ دیکھتے کہ آخر غالب وہی آتا ہے۔ جس کے حق میں حالات سازگار ہوں۔ اور وہی حکومت کا اہل بھی ہوتا ہے۔ ان اوراق میں اقوام اسلامیہ کے عروج اور نزول کے حالات بہ تعلق خلافت قلم بند کئے گئے ہیں۔ اگرچہ قومیں بنتی اور بگڑتی رہیں لیکن اسلام

مسلسل ترقی کرتا آرہا ہے۔ وہ اسلام جو ناحد دین حق ہے۔ اگر یہ عربوں کی اختراع ہوتی تو ان کے ساتھ کبھی کا ختم ہوگیا ہوتا۔ جب اس اسلام کی طرف سے کسی قوم نے بے اعتنائی برتی۔ تو وہ خود مٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ قرآن میں پورا ہوتا رہا۔ کہ اگر تم اس کے مقصد کی تکمیل سے قاصر رہے تو اللہ تعالیٰ ایک اور قوم لائے گا۔ ایسی قومیں آتی رہیں اور آتی رہیں گی۔

اللہ کے فضل سے ہمیں پاکستان مل گیا ہے۔ ارباب حل وعقد کو یہ حقیقت ہمیشہ مدِ نظر رکھنی چاہیئے۔ کہ پاکستان کا قیام استحکام اسلام اور اس کی اشاعت سے وابستہ ہے۔ اور اگر اسے نظرانداز کر دیا تو وہ خود مٹ جائیں گے۔ تواریخ اسلام میں یہ حقیقت اتنی نمایاں ہے۔ کہ اس پر حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں لیکن باوجو انتباہ مسلمان قوموں نے پروا نہ کی۔ اور اپنا انجام دیکھ لیا۔ قتال فی سبیل اللہ جب حالات اس کے مقتضی ہوں فرض ہے۔ آنحضرت کا ارشاد ہے کہ جب بھی تم اسے ترک کرو گے ذلیل ہو جاؤ گے۔ اس ذلت کا احساس اگر مسلمانانِ پاکستان میں نہیں تو خدا حافظ۔

خلافت عباسیہ میں اگرچہ فتوحات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مگر جو کچھ اموی خلافت نے چھوڑا۔ اس وراثت کو بحال رکھا۔ اوّل آٹھ تاجدارانِ عباسیہ نے جن میں ہارون الرشید اور مامون الرشید اور معتصم باللہ بھی شامل ہیں۔ اسلام کی شان وشوکت کو ممکن عروج تک پہنچا دیا۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ خلافت عباسیہ اموی خلافت کی طرح خالص عربی حکومت نہ تھی۔ عباسیوں نے عربوں کا زور توڑنے کے لیے پارسیوں اور ترکوں کو ابھارا۔ اور عربوں کے مقابل کھڑا کر دیا۔ لیکن اگرچہ وہ خود اس سیاسی غلطی کی وجہ سے مٹ گئے۔ اسلام کو ضعف نہ پہنچا۔ بلکہ ترکوں نے اس کو اور تقویت دی۔

خلافت عباسیہ کی شان وشوکت اور جاہ وجلال کے حالات ہم نے اپنی کتاب "لیـ... میں قلم بند کئے ہیں۔ ان ایام میں علوم وحکمت کی طرف بحالت امن عام توجہ تھی اتنی ایام

ائمہ دین نے فقہ مدون کی۔ حکماء نے مختلف علوم پر جو کچھ لکھا وہ آج بھی مستند تسلیم کیا جاتا ہے۔

تمدنِ عرب پر مؤرخین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے فاضل لیبان کی کتاب کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔ ایک خاص بات جو قابل توجہ ہے یہ ہے کہ عربی فن عمارت کا حسن و شان ان کی مساجد ہی میں نظر آتا ہے یا آئمہ دین کی ان عمارات میں جو ان کے مرقد پر تعمیر ہوئیں۔ خلفاء عباسیہ کے قصر دجلہ کے کنارہ پر نو میل تک دنیوی نمود و شان کا نمونہ تھے۔ یہ سب نابود ہو گئے لیکن وہ عمارتیں جو دینی اغراض کے لئے تعمیر ہوئیں ہمیشہ آباد رہیں۔ اور ان میں سے اکثر تاحال موجود ہیں۔ یا ان کے آثار باقی ہیں۔ رسکن (Ruskin) نے صحیح لکھا ہے کہ اگر تم نے کسی قوم کی سیرت کا مطالعہ کرنا ہو تو اس قوم کی عمارتوں کو دیکھو! خلافت اسلامیہ کی ہر ایک دور میں یہ خصوصیت نمایاں رہی ہے۔ کہ وہ مسجدوں اور مقبروں کی عمارات میں اپنے دینی شغف کا اظہار کرتے۔ خلافتِ راشدہ اور امویہ کے دور دورہ میں ہر ایک خلیفہ اور عامل خود مساجد میں امامت کے فرائض بھی ادا کرتا رہا۔ لیکن جب مہمات ملکی نے ان کی توجہ جذب کر لی تو یہ فرض دوسروں کے سپرد کیا گیا۔ حضرت عمر اور حضرت علی مسجد ہی میں شہید ہوئے۔ خوارج نے دیکھا۔ کہ دنیاء اسلام میں ہٹر لونگ ان تین اشخاص امیر معاویہ حضرت علی اور عمرو بن العاص نے مچا رکھی ہے ان کا خاتمہ کر دو۔ اس کے بعد مسلمان جس کو چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں مسلمانوں نے کیا چاہنا تھا۔ وہ خود ہی انتخاب کرتے۔ صبح کی نماز کا وقت تھا۔ بیک وقت تینوں پر حملہ ہوا۔ امیر معاویہ دراز قد تھے۔ خنجر شانہ پر پڑا۔ تین ماہ کے بعد زخم مندمل ہو گیا۔ حضرت علی پست قد تھے۔ کنپٹی پر مہلک ضرب لگی، جانبر نہ ہو سکے۔ عمرو بن العاص ان ایام میں بیمار تھے۔ امام ایک اور شخص ناکردہ گناہ جامعہ مصر میں مارا گیا خلافت خود بخود امیر معاویہ کے قبضہ میں آ گئی۔

تاریخ بغداد میں جہاں ہم نے عام مساجد کا ذکر کیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان ایام میں مسلمان مساجد کی تعمیر کی غرض اچھی طرح سمجھتے تھے۔ ضرورت زائد کہیں مساجد کی تعمیر نہ کی۔ اور کہیں ایک مسجد کے قرب میں دوسری مسجد تعمیر نہ ہوئی۔ جو مسجد ضرورت کے تحت آئی۔ خلفاء عباسیہ کے عہد میں جامع مساجد ابتدا میں صرف دو تھیں۔ دجلہ نے بغداد کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کے بعد جب شہر کی آبادی دُور دُور تک پھیل گئی جس کی وسعت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ آج بغداد کے گرد و نواح میں جو شہر آباد ہیں ان ایام میں بغداد کے محلے تھے ایک تیسری جامع مسجد تعمیر ہوئی جس کا نام "مسجد براثہ" تھا۔ لیکن یہ بغداد کی مساجد مدینۃ المنصور اور رصافہ کی شان کو نہ پہنچی۔

خلافت اسلامیہ کے تذکرہ میں ایک بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ ابتدائی حکمران تو دار الخلافت سے باہر فوت ہوئے۔ اور انحطاط شروع ہوا تو سب خلفاء دار الخلافت میں ہی دفن ہوئے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تاجدار اتنی عیش و عشرت میں منہمک تھے۔ کہ مملکت کا انتظام و انصرام دوسروں کے حوالے کر دیا۔ اور کبھی دورہ پر نہ نکلے۔ اور اپنے ساتھ شوکتِ عباسیہ کو قبر میں لے گئے

آخری خلیفہ عباسی ۶۴۰ھ مطابق ۱۲۴۲ء مستعصم باللہ اپنے باپ المستنصر کی جگہ تختِ خلافت پر بیٹھا۔ یہ ایک سادہ لوح آدمی تھا۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ اس کے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے چار سو غلام زریں کمر اس کے حضور دست بستہ کھڑے رہتے۔ تخت کو عرشِ معلیٰ یقین کرتا قصر کو کعبہ کا نمونہ بنایا۔ آستانہ پر حجرِ اسود کے رنگ کا سیاہ پتھر رکھا تھا جس کو لوگ بوسہ دیتے۔ اطلس سیاہ کی آستین جبر دکہ سے لٹکتی رہتی۔ لوگ غلافِ کعبہ کی طرح آنکھوں سے لگاتے خلیفہ خود قصر سے باہر نکلنا کسرِ شان سمجھتا تھا۔ عذا کو کس نے آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وزیر مؤید الدین علقمی مختارِ کل تھا۔ خلیفہ تو خدا اور یہ شیطان۔ خلیفہ سے خدا کے حقوق میں سے ایک بھی ادا نہ ہو سکا۔ البتہ اُس نے شیطنت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ بات بات پر خلیفہ سے بگڑتا۔ آخر ایسی بگڑی کہ راندہ درگاہ ہوا غضب میں آ کر ہلاکو خان کو بغداد کا رستہ بتایا

۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء ماہِ محرم مطابق ہلاکو خاں نے مشرقی بغداد کے سامنے اپنا خیمہ ایستادہ کیا۔ محاصرہ شروع ہو گیا۔ تاتاری فوج زیادہ تر شہر کے

بائیں جانب "برج عجمی" اور "باب حلبہ" پر جھکی ہوئی تھی۔ فوج کا وہ حصہ جو تکریت پر دجلہ کو عبور کر آیا تھا۔ مستعصم کے لشکر کے مقابلہ میں آیا۔ اور شکست فاش دے کر دو حصوں میں بغداد کو محاصرہ میں لے لیا۔ محاصرین کی کوشش کو تقویت نمک حرام امراء بغداد کی دیواروں کے اندر سے دے رہے تھے۔ کرخ اور ان کے محلوں میں جو امام موسیٰ کے مقبرہ کے نواح میں واقع تھے۔ حضرات شیعہ آباد تھے۔ محاصرین سے اول خفیہ خط و کتابت کا سلسلہ قائم کیا پھر علانیہ ساتھ دیا۔

پچاس دن کے محاصرہ کے بعد ہلاکو خاں نے "برج عجمی" پر زور سے حملہ کیا اور مشرقی بغداد میں داخل ہو گیا۔ مستعصم اور دیگر لواحقین ایک قیدی کی حیثیت میں تاتاری لشکر میں لایا گیا۔ اُسے پھانسی دی گئی۔ اور لاش کی تشہیر خاطر خواہ ہوئی۔ چالیس دن تک بغداد میں قتل و غارت کا بازار گرم رہا۔ دار السلام بغداد جس کا آستانہ صدیوں سے بوسہ گاہ خلائق رہا۔ وہاں زبان شمشیر کے سوا کسی زبان آدم کو دم مارنے کی جگہ نہ تھی۔

بغداد میں چالیس دن تک ایک طرف آگ اور دوسری طرف آب شمشیر خاکستر و خون کا ہولناک منظر پیش کر رہے تھے۔ جامع مسجد سلطانی، مقبرہ موسیٰ الکاظم، خلفاء کے مقبرے جو "رصافہ" میں تھے۔ بازار اور عمارات سے آگ کے شعلے بلند تھے۔ آسمان دھواں دھار ہو رہا تھا۔ بازاروں اور گھروں میں مردوں اور عورتوں اور بچوں کی لاشیں بے گور و کفن پڑی تھیں اور اکثر جل رہی تھیں۔ مؤرخین کی رائے ہے کہ آٹھ لاکھ باشندگان بغداد تہ تیغ بے دریغ ہوئے۔ ہلاکو خاں نے یار اغیار کا امتیاز اٹھا دیا۔ حضرات شیعہ کے بھی وہی کچھ پیش آیا۔ جو وہ سنیوں کے واسطے چاہتے تھے۔ بلکہ سب سے پہلے "کاظمین" برباد ہوا۔ بغداد کا علمی خزانہ جل کر خاک ہو گیا۔ کئی دن دجلہ کا پانی ماتمی سیاہ لباس میں بہتا رہا۔

تاتاریوں کی ترکتازی کے بعد بغداد کا حلیہ بگڑ کر جو صورت رہ گئی اس کا نقشہ مؤلف "مراصد" نے کھینچا ہے۔ مولف "مراصد" کی نسبت تو معلوم نہیں کہ کون ہے "یاقوت حموی کی کتاب "معجم البلدان" کا خلاصہ ہے، مؤلف نے اس کی بھی تصحیح کی ہے اور

اپنے زمانہ کے تازہ حالات بھی لکھے ہیں۔ لکھتا ہے کہ اب مغربی بغداد میں چند محلے بے کسی کی حالت میں ایک دوسرے سے جدا پڑے ہیں۔ ان میں کرخ کچھ آباد ہے مشرقی بغداد تو بالکل ویرانہ ہے۔ بغداد کے تمام آدمی مارے گئے۔ اور کوئی نہ بچا جو اس کی گذشتہ خوبیوں کا تذکرہ لکھتا۔ یا اس کی تباہی کا رونا روتا۔ گرد و نواح سے لوگ آ آ کر آباد ہوئے۔ موجودہ آبادی گذشتہ سے مختلف ہے۔ اور بغداد کی صورت تو ایسی بدلی کہ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ وہی ہے جس کے شباب کا تذکرہ مؤرخین اور سیاح کرتے رہے۔ "گیا حسن خوباں دلخواہ کا۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

شیخ سعدیؒ مدرسہ نظامیہ کے وظیفہ خوار طالب علم رہ چکے ہیں۔ اس وقت زندہ تھے۔ بغداد اور خلفاء بغداد سے جو محبت تھی اس کا اظہار ایک مرثیہ میں کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

آسماں را حق بود گر خوں بگرید بر زمیں — بر زوالِ ملک مستعصم امیرالمومنین
ای محمدؐ گر قیامت می بر آری سر ز خاک — سر بر آور و ویں قیامت درمیانِ خلق بیں
نازنینانِ حرم را موجِ خونِ بے دریغ — ز آستاں بگذشت مارا خونِ دل از آستیں
ملکِ دنیا را چہ قیمت تا ایں است از خدا — گو نگہ دارد دمار ملک ایمان و یقیں

خلافتِ عباسیہ کے زوال

اور انتقالِ خلافت کے اسباب

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اموی خلافت خالص عرب حکومت تھی۔ اس کے خاتمہ پر تین طاقتوں میں زور آزمائی شروع ہو گئی۔ ایک ہاشمی فاطمی تھے۔ دوسرے ہاشمی عباسی اور تیسرے ایرانی۔ بساطِ سیاست پر بنو عباس نے حریف مہروں کو مات دی۔ عباسیہ کے بعد خلافت اور خاندانوں میں منتقل ہوتی رہی۔ اس انتقالِ خلافت کے حالات اور اسباب سمجھنے کے لئے چند واقعات جو خلافتِ عباسیہ کے دورِ دورہ میں رونما ہوتے پہلے اچھی طرح ذہن نشین ہونے چاہئیں۔ اس لئے کہ ان اوراق ان ہی خاندانوں کا تذکرہ آئے گا۔ جن کے قبضہ میں خلافت رہی۔

جب تک بنو اُمیّہ سے مقابلہ رہا۔ فاطمی اور عباسی اور ایرانی متحد رہے اموی خلافت کے خاتمہ پر تینوں کو اپنے اپنے مفاد نے اُبھارا۔ ہم پہلے ایرانی جدوجہد کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کا قائد ابو مُسلم خراسانی تھا۔ یہ شخص نوشیرواں کے وزیر حکیم بزرجمہر کی اولاد سے بیان کیا جاتا ہے۔

کسے را کہ بابا فلاطوں بود　　　　ازاں بانمیلے تنبر چوں بود

بنو ہاشم کے نام پہ اس نے ایران کے طول و عرض میں اموی خلافت کے خلاف بغاوت پھیلا دی اس کی سرگرمی کا مرکز خراسان تھا۔ وہ بنو اُمیہ کی فوج کو ایران کی حدود میں

پلے در پلے شکست دے رہا تھا۔ ادھر بنو ہاشم عرب کی حدود میں بنو امیہ کے مقابلہ میں شکست کھا رہے تھے۔ ابو مسلم اپنی سپاہ کے ساتھ آڑے آیا۔ فرات کے کنارے پر فیصلہ کن لڑائی میں اموی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ حالات جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں عباسیوں کے حق میں ایسے سازگار تھے کہ ابو مسلم کے سیاسی تدبّر نے یہ مناسب خیال کیا کہ عباسیوں کا ساتھ دے۔ اُسے اپنی طاقت پر پُورا بھروسہ تھا جو وہ خراسان میں جمع کر چکا تھا۔ جب ابوالعباس خلیفہ مقرّر ہوُا۔ تو ابو مسلم سے بہتر شخص ایرانی مقبوضات کا انتظام اور کون کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ خراسان کا عامل مقرر ہوُا۔

سفّاح کی حکومت ۱۳۲ھ سے ۱۳۶ھ تک رہی اس عرصہ میں سوائے خونریزی اور شجرہ بنو اُمیّہ کو بیخ و بن سے اکھیڑنے کے سوا اُس نے اور کچھ کام نہ کیا۔ مورخین اس کی خلافت اسی لئے تسلیم نہیں کرتے کہ اس نے بحیثیت خلیفہ کچھ کام نہ کیا۔ اور جو کیا وہ ایک بدنما داغ خلافت اسلامیہ کے دامن پر ہے۔ وہ اول خلیفہ عباسی اس کے بھائی ابوجعفر منصور کو سمجھتے ہیں۔ تو ابو مسلم کی سیاسی سرگرمی سے غافل تھا منصور۔ جب وہ بنو فاطمہ کے خرخشوں سے فارغ ہوُا۔ تو ابو مسلم کا زور توڑنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ یہ کچھ آسان کام نہ تھا وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ کھلے میدان میں جنگ میں شکست کھا جائے گا۔ اس لئے سیاسی چالیں چلا ابو مسلم کو شام کی امارت پیش کی، وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ تاڑ گیا۔ کہ خلیفہ کا اصل مقصد یہ ہے کہ خراسان میں اس کا اثر و رسوخ نہ رہے۔ اس لئے عذر کیا منصور نے کہا کہ شام بنی اُمیّہ کی خلافت کا مرکز تھا۔ اور وہاں ابھی تک اُن کی خلافت کے حامی موجود ہیں۔ اور یہ سب عرب ہیں میں کسی عربی پر خواہ وہ عباسی ہی کیوں نہ ہو۔ اعتبار نہیں کر سکتا جس کو ہوس خلافت آمادہ بغاوت کر سکتی ہے۔ وہ بنو اُمیہ کی امداد بھی بسہولت حاصل کر سکتا ہے۔

تمہارا خیال اور رائے بالکل صحیح اور صائب ہے اور تمہاری ضرورت خراسان میں بھی ہے۔ لیکن سردست شام کے حالات تمہاری توجہ کے محتاج ہیں۔ دمشق میں بیٹھ کر تم خراسان کا انتظام بھی کر سکتے ہو۔ خراسان میں اپنا کوئی۔۔۔

اس میں پہلے ولید کے زمانہ میں عثمان - عمر اور ابوبکر اور معاویہ کے حق میں احادیث وضع کی گئیں - اور بقول ابو الکلام آزاد بحوالہ "الہلال" اکتوبر 1913 - وہ جعلی احادیث آج بھی موجود ہیں جنکا فرق کرنا دشوار ہے اور کنزالاعمال میں ہے کہ معاویہ نے جعلی احادیث بنوانے پر تنخواہ دار ملازم رکھے ہوئے تھے!

ہوشیار نائب مقرر کرو۔ اور میرے پاس جلد پہنچو، کیونکہ چند ہدایات جو تمہارے سوا راز دارانہ بتاؤں گا، اُن سے کسی اور کان آشنا نہ ہوں، یہی تقاضا مصلحت وقت ہے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ وہ احادیث جو خروج مہدی کے بارے میں طول و عرض دنیاء اسلام میں شائع ہو چکی تھیں، اور محض سیاسی اختراع تھیں، یکساں ان کا اطلاق بنو فاطمہ، بنو عباس اور قوم سلمان فارسی پر ہوتا ہے، ابومسلم نے نبوت کا دعویٰ کیا یا نہیں، لیکن مؤرخین کی یہ رائے صحیح ہے کہ اہلِ خراسان اس کو نبی یقین کرتے تھے اور اس کے اشارے پر کٹ مرنے کو تیار تھے، لیکن ابومسلم منصور کے چکمہ میں آ گیا، اس نے یہ خیال کیا کہ خراسان تو میرا ہی ہے، شام بھی بسہولت میرے قبضہ میں آ جائے گا، پھر بھی اس نے اتنی احتیاط کی، کہ جانثاروں کی کافی جمعیت کے ساتھ دارالخلافت کا رُخ کیا، منصور نے خوب آؤ بھگت کی، روز و شب شاہانہ ضیافت پر خلیفہ جب بے تکلفی سے پیش آیا اور تنہائی میں راز دارانہ گفتگو کرنا ایسا سیاسی جادو تھا جو ابومسلم پر چل گیا، دارالخلافت میں خالد برمکی بھی موجود تھا، جو سفاح کے زمانہ سے وزیر مالیات تھا، ابومسلم بالکل مطمئن تھا جس وقت چاہتا خلیفہ کے پاس آتا جاتا، رخصت کی آخری تاریخ آ پہنچی، شاہانہ ضیافت پر ابومسلم کو مدعو کیا گیا، منصور کے اشارے پر چند حاضرین ابومسلم پر ٹوٹ پڑے اور غیر مسلح کیا گیا، اب لجاجت کے سوا اور کیا کر سکتا تھا، بار بار کہتا کہ "امیرالمومنین مجھے اپنے دشمنوں کے لئے زندہ رہنے دیجئے" مگر تلوار کی چند ضربات نے اس کا کام تمام کر دیا، جانباز جو ساتھ لایا تھا بے خبری میں مارے گئے، لیکن جب اس سانحہ کی اطلاع خراسانیوں کو ہوئی تو علم بغاوت بلند کیا۔

مسعودی کا بیان ہے کہ ابومسلم نے خراسان میں اپنا ایک مذہب رائج کیا تھا، متبعین "خرمی" کہلاتے، اور اس کو اپنا امام تسلیم کر لیا تھا یہ مذہب تمام خراسان اور مشرقی پہاڑوں میں پھیل چکا تھا، ان لوگوں نے کبھی ابومسلم کی موت پر یقین نہ کیا، ان کا عقیدہ ہے کہ وہ مصلحتاً غائب ہو گیا ہے اور سیاہ جھنڈیوں کے ساتھ جو اس نے بنو عباس کے نام پر اپنے متبعین کا امتیازی نشان مقرر کیا تھا پھر خروج کرے گا۔

چند احادیث بھی اس عقیدہ کی تائید میں ہیں، ابن الاثیر اور میر اخوند ابو مسلم کی نسبت لکھتے ہیں، کہ وہ مجوسی تھا اور اعتقاداً مجوسی ہی رہا۔ اگرچہ بظاہر لباس مسلمانی تھا۔ بغاوت تو فرو ہو گئی، واقعات اسی رائے کی تائید میں ہیں۔

منصور کی توجہ زیادہ تر ان لوگوں کے قلع قمع پر مبذول رہی، جن کی طرف اس کی خلافت کو خطرہ تھا، وہ ایک اور عظیم خطرہ سے بالکل غافل تھا، جس کی براہِ راست اسلام پر پڑتی تھی، ایرانی اپنے زرتشتی عقائد، احادیث موضوعہ کے الفاظ میں خاموشی سے شائع کر رہے تھے، ان کی سرگرمی کا مرکز کوفہ تھا، ان میں ایک فرقہ "راوندیہ" نے علانیہ منصور کو مظہر الٰہی کہنا شروع کیا، ابھی بغداد کی تعمیر شروع نہ ہوئی تھی، سفاح کو جب قتل و غارت سے فرصت ملی تو قصر ہاشمیہ میں قیام کرتا جو بعض مؤرخین کے مطابق پرانے ایرانی شہر "انبار" کے پہلو میں دریائے فرات کے مشرقی کنارہ پر ایک نہر کے متصل واقع ہے، اور بعض کی یہ رائے ہے کہ یہ قصر "حیرہ" اور کوفہ کے درمیان دریائے فرات کے غربی جانب واقع تھا، اور بعض روایات کے مطابق یہ قصر کوفہ کے قرب میں تھا، بہر حال اسے کوفہ کا قرب ضرور حاصل تھا، ایک دن یہ حضرات خلیفہ کی پرستش کے لئے قصر ہاشمیہ کے سامنے جمع ہوئے محافظین قصر نے روکا تو حملہ کر دیا، اب خلیفہ کو بھی اپنی جان کے لالے پڑ گئے، آڑے وقت میں ایک شخص "معن بن زیدہ" جو اپنی سخاوت کے باعث حاتم طائی سے کم مشہور نہ تھا، کام آیا، یہ بنی امیہ کے ہوا خواہوں میں سے تھا اور منصور اس سے بھی خائف تھا، جب اس نے سنا کہ خلیفہ بری طرح گھرا ہوا ہے تو کچھ جمعیت کے ساتھ جو سب اس کے بھائی عرب تھے عین اس وقت پہنچا جب راوندیہ محافظین کو قتل کر رہے تھے، ایک ہی حملہ میں راوندیہ کے پاؤں اکھڑ گئے، اور جدھر جس کا منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا، اب خلیفہ کی بھی آنکھیں کھلیں، کہ عرب جن کا زور وہ ایرانیوں پر نوازشات سے توڑ رہا تھا خواہ اموی خلافت کو کتنا پسند کرتے ہوں، قومی غیرت کے جذبات سے ان کے دل ابھی تک خالی نہ تھے، اس خدمت کے صلہ میں معن

لی "یمامہ" اور پھر سجستان کا عامل مقرر کیا، حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ کی پوجا پاٹ تو
انہ تھا وہ خلافتِ عباسیہ کو ختم کرنا چاہتے تھے، اور یہ ایک گہری سازش تھی۔ اگر
من وقت پر نہ پہنچتا، تو منصور کا کام تمام ہو چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ خلافتِ
عباسیہ بھی ختم ہو جاتی،

خراسان ہمیشہ خلافت عباسیہ کے پہلو میں خار کی طرح کھٹکتا رہا آئے دن بغاوت
سختی سے دبا دی جاتی، منصور کے عہد میں بظاہر یہ آگ بجھ گئی، مگر اندر ہی اندر سلگ
رہی تھی منصور کے جانشین محمد المہدی کے عہد میں ہاشم ابن حاکم نے جو تاریخ میں حکیم
مقنع کے نام سے مشہور ہے علم بغاوت بلند کیا یہ ہمیشہ نقاب اوڑھے رکھتا،
عقاید جو اس نے اپنے متبعین کے دماغ میں ٹھونسے وہی آریہ مذاہب کے ہیں بھگوان کے
اوتار ہر ایک زمانہ میں جنم لیتے رہے، ابو مسلم خراسانی کے بعد وہ "اوتار" بنے "اُس کے دیدار
کی تاب کوئی فرد بشر نہیں لا سکتا، دیگر عقائد مخرب اخلاق بیان کئے جاتے ہیں اس کے
متبعین کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی، مہدی کے لشکر کو پے در پے شکست بھی دی اس
کے متبعین کا خاص نشان سفید لباس تھا سیاہ لباس اب عباسیوں کا حصہ ہو چکا
تھا، اس لئے عرب ان کو "مبیض" یعنی سفید پوش کہتے ہیں، یہ بغاوت بھی بصد مشکل
فرو ہوئی تو "جرجان" میں جو بحیرہ ابیض کے مشرق میں واقع ہے ایک اور فرقہ نے سر
اٹھایا اس کو "محمرہ" کہتے ہیں، ان کا امتیازی نشان سرخ تھا، غالباً قزلباش ان ہی کی
یادگار ہیں، ان کے عقائد بھی مقنع سے ملتے جلتے ہیں، بغاوتیں تو فرو ہوتی رہیں مگر ان لوگوں
نے ایران اور عراق میں فرقہ بندی اور تفرقہ کا وہ زہریلا اثر پھیلا دیا کہ اگرچہ خلیفہ مہدی
نے ان کو جو "زندیق" کہلاتے تھے، چن چن کر قتل کیا۔ مگر زہر اپنا اثر کر چکا تھا،
۲۰۱ھ مطابق ۸۱۶ء میں "بابک خرمی" نے مازندران سے سر اٹھایا، اس نے اپنے
پیشروؤں سے بڑھ کر فراست کا ثبوت دیا اپنے ساتھ تھیوفیلس (Theophelus)
قیصر قسطنطنیہ کو ملایا اقرار یہ پایا کہ ادھر بابک علم بغاوت بلند کرے اُدھر دوسری طرف
قیصر شام پر دھاوا بول دے، بابک نے وہی خرمی مذہب جو ابو مسلم اختراع کر چکا

تھا بحال رکھا، اُس نے دُور اندیشی سے پہاڑی علاقہ میں دفاع کے تمام سامان مہیا کئے، اموں کے عہد میں خلافت اپنے منتہائے عروج پر تھی، لیکن جو بھی بابک کے مقابلہ کے لئے بھیجی گئی ناکام رہی، اموں خود قیصر قسطنطنیہ کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ ان تین خونریز لڑائیوں کے بعد قیصر نے صلح کی درخواست کی، بابک کی سرگرمی جاری رہی، اموں فوت ہوا تو معتصم باللہ تختِ خلافت پر بیٹھا، اب خلافت عباسیہ نے سمجھ لیا تھا۔ کہ ایرانیوں سے وفا کی امید نہیں اور یہ کہ ان کے ارادے کیا ہیں معتصم نے ترکوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا، ترکوں ایرانیوں میں دیرینہ دشمنی تھی، جس کو مصنف شاہنامہ فردوسی نے مفصل بیان کیا ہے، معتصم نے اپنے چیدہ فوجی ترک "افشین" کو مقابلہ کے لئے روانہ کیا اپے درپے شکست کے بعد بابک اور اس کا اہل وعیال ترک سردار نے گرفتار کرکے بغداد بھیج دیئے، خلیفہ نے قصور معاف کردیا، اور الطاف شاہانہ سے نوازا۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا تھا، بابک اور اس کا بھائی بھاگ کر "آرمینیہ" پہنچے۔ یہاں کے سردار نے گرفتار کرکے پھر "افشین" کے حوالے کردیئے، اُس نے پھر بغداد کی طرف بھیج دیئے۔ اب ان کے جُرم پہلے جرائم کے ساتھ اور سنگین ہوگیا تھا، بغداد کے کوچہ و بازار میں تشہیر کے بعد قتل کئے گئے۔

آل برامکہ

خلافت عباسیہ کے عہد میں مختلف خاندانوں کا اقتدار بحیثیت وزیر یا سرپرست خلافت رہا۔ ان میں سب سے اول خاندان برامکہ ہے، اموی خلافت روبزوال تھی، ولید ثانی (۱۲۵ھ تا ۱۲۶ھ) خلیفہ تھا، جعفر بن حکیم جاماس ابن لشتاسف آتش کدہ نوبہار کا متولی تھا، یہ آتش کدہ بلخ میں واقعہ تھا، فتح بلخ کے بعد جب آتش کدوں کی آگ سرد پڑ گئی، جعفر نے اسلام قبول کیا، دمشق میں آیا، ان ایام میں اہل قلم عجمی ہی تھے۔ علامہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ تمام مصنفین عجمی ہی گزرے ہیں، خلیفہ ولید نے کتابت کا عہدہ تفویض کیا، اس عہدہ سے وزارت تک پہنچ گیا حمداللہ مستوفی "گزیدہ" میں لکھتا ہے۔ کہ جعفر کا سلسلہ نسب گودرز وزیر افراسیاب کی بادشاہت سے ملتا ہے، اہل ایران تلے ہوئے تھے کہ عربی حکومت کا خاتمہ کرکے رہیں گے۔ ایسا معلوم

جاتا ہے کہ جعفر اسی نیت اور ارادہ سے دمشق میں آیا، ابومسلم خراسان میں اور جعفر دمشق میں اپنا کام نہایت فراست سے کرتے رہے، جعفر کی خدمات شائستہ کا صلہ سفاح نے یہ دیا کہ اُسے اپنا وزیر بنا لیا۔ یہ عہدہ آل برامکہ میں موروثی ہو گیا، منصور کا وزیر بھی یہی جعفر تھا اس کے بعد اس کا بیٹا یحییٰ اور اس کے بعد جعفر اور فضل ہارون الرشید کے زمانہ تک وزارت پر متمکن رہے، ملک کے طول و عرض میں آل برامکہ کی جاگیریں تھیں، ایک دفعہ ہارون الرشید دورہ پر نکلا، جہاں خیمہ ایستادہ ہوتا دریافت پر معلوم ہوتا کہ آل برامکہ کی جاگیر ہے، اس وقت آل برامکہ حل و عقد کے مالک ہو چکے تھے۔

بغداد کی تعمیر ہو رہی تھی، منصور نے خالد سے مشورہ کیا کہ میرا ارادہ ہے۔ کہ ایوان کسریٰ واقع مدائن گرا کر اس کا مصالحہ مدینۃ المنصور (بغداد) کے بعض قصر کی تعمیر میں استعمال کریں، خالد نے کہا" امیر المومنین ایوان کسریٰ اور ایسی ہی شاہان سلف کی عمارتیں عظمت اسلام کی یادگاریں، جو بھی انہیں دیکھتا ہے خیال کرتا ہے کہ کسی زبردست ہاتھ نے ان کی تعمیر کی ہے، اور اُن سے بڑھ کر طاقت والوں نے اس پر قبضہ کیا، علاوہ ازیں قصر ابیض جس کے انہدام کا ارادہ فرما رہے ہیں، حضرت علی ابن ابی طالب کا مصلیٰ ہے۔ آپ نے اس جگہ نماز پڑھی تھی۔"

منصور نے کہا کہ حضرت علی نے اکثر نمازیں کئی مقامات پر پڑھیں، "تو چاہتا ہے کہ تیرے آتش پرست بزرگوں کی یادگاریں نہ مٹ جائیں!" لیکن منصور "دوانیقی" تھا، کوڑی کوڑی کا حساب کرتا اور لیتا، جب مصالحہ کی ڈھلوائی وغیرہ کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کا معاملہ ہے، ارادہ ترک کر دیا،

جعفر نے کہا کہ" امیر المومنین اب جس طرح بھی ہو، قصر ضرور مسمار کرو۔ لوگ کہیں گے کہ خلیفہ کسریٰ کا ایک محل بھی نہ گرا سکا۔" منصور نے کہا کہ تو چاہتا ہے کہ خزانہ اسی کام پر خالی ہو جائے۔"

آل برامکہ نے دل کھول کر فیاضی سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، شعراء ان کے مدح میں قصیدہ خوانی کرتے، ابو نواس کے مشہور قصیدہ کا ایک شعر ہے۔ کہ

سلام علی الدنیا اذا ما فقدتم	اے برمک کی اولاد جب تم دنیا سے گم ہو جاؤ
بنی برمک من رائحین وغادی	تو دنیا کو سلام

ایک دفعہ خلیفہ کو ایک گمنام خط ملا، یہ منظوم خط ہم نے اپنی کتاب "بغداد" میں نقل کیا ہے۔ ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

خدا کی زمین کا جو امانت دار ہے	اور جو حل و عقد کا مالک ہے اُسے کہدو
کہ یحییٰ کا بیٹا جعفر تمہاری طرح مالک بن بیٹھا ہے	اور تجھ میں اور اس میں کوئی حد فاصل نہیں
تیرا کہنا اس کے حکم سے رد ہو جاتا ہے	لیکن اس کا حکم رد نہیں ہو سکتا
اُس نے ایک مکان بنوایا ہے	جس کی مثل فارس اور ہند میں کسی نے نہیں بنایا
موتی اور یاقوت اس کی کنکریاں ہیں	اور خاک عنبر اور لوبان ہے۔
ہم لوگوں کو یہ ڈر ہے کہ جب آپ کو زمین چھپا لے گی	تو وہ ملک کا وارث ہو جائے گا۔

ان اشعار میں جس مکان کی طرف اشارہ ہے جعفر نے دو کروڑ درہم کے صرف سے تعمیر کیا۔ جو بغداد کے ایک محلہ "شماسیہ" میں واقع تھا، برامکہ کے حالات ہم نے "بغداد" میں مفصل بیان کئے ہیں،

عبدالقاہر ابن طاہر البغدادی (متوفی ۴۲۹ھ) برامکہ کے زوال کا ایک سبب یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ جعفر بن یحییٰ برمکی نے خلیفہ ہارون الرشید کو یہ مشورہ دیا کہ "کعبہ" میں ایک مجمر رکھا جائے جس میں عود و سپند دن رات جلتا رہے، تا کہ اس کی خوشبو سے زائرین کا دماغ بھی مہک اُٹھے، خلیفہ بھانپ گیا کہ یہ زندیق چاہتا ہے۔ کہ کعبہ کو بھی آتشکدہ بنا دے،

خلفاء عباسیہ سب کنیزک زادہ تھے، ایک امین پسر ہارون الرشید زبیدہ کے بطن سے تھا، سوتیلے بھائی مامون اور اس میں ہارون الرشید نے سلطنت تقسیم کر دی تھی، دونوں بھائیوں میں لڑائی ہوئی تو امین مارا گیا مامون کا نکاح حسن بن سہل کی بیٹی بوران سے جس دھوم دھام سے ہوا، مورخین نے اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ ممکن ہے کہ آل برامکہ اپنے ارادے میں کامیاب ہو جاتے لیکن اول آٹھ خلفاء

عباسیہ مستعصم باللہ تک ایسے صاحب اقبال اور فراست تھے اکہ کام نہ بنا جب ہارون الرشید پر برامکہ کی ریشہ دوانیوں کا حال کھلا تو جعفر قتل ہوا۔ اس کے بھائی اور باپ یحییٰ قید خانہ میں سسک سسک کر مر گئے۔

مامون کے بعد اس کا بھائی معتصم خلیفہ ہوا، تو ترکوں کو فوج میں بھرتی کیا اور اس طرح ایرانیوں کا زور توڑ دیا، مگر یہ بھی ایسے خودسر واقع ہوئے تھے کہ بازاروں میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے اور لوگوں کو آزار دیتے، اہل بغداد اس قدر تنگ آئے کہ شورش برپا ہوئی، خلیفہ نے بغداد کی جگہ شہر "سرمن رائے" (جس نے دیکھا مسرور ہوا) آباد کیا اور اسی جگہ رہائش رکھی، اپنی وضع بھی ترکی بنا لی تھی، ترکی زبان میں گفتگو کرتا۔ اور لوگوں کو بھی ترکی بولنے پر مجبور کرتا، عرب کے مشہور شاعر دعبل خزاعی نے اس کی ہجو لکھی۔ اشعار ہم نے "بغداد" میں درج کر دیئے ہیں مفہوم یہ ہے کہ

"ملوک بنی عباس تو در اصل سات ہیں، اور سات کا عدد ہی کتاب اللہ میں استعمال ہوا ہے، آٹھ کا عدد نہیں اسلئے اصحاب کہف سات ہیں، البتہ ان کا کتا آٹھواں ہے مگر اس کتے اور آٹھویں عباسی خلیفہ میں یہ فرق ہے کہ وہ بے شک دُم (ذنب) رکھتا ہے لیکن ڈنگ (ذنب) نہیں مارتا۔ ذنب کے معنی گناہ بھی ہیں یعنی کتا گنہگار نہیں اور یہ گنہگار ہیں۔"

معتصم کی خلافت پر نام نہاد عربی خلافت کا خاتمہ ہو گیا، "خلافت ترکیہ" کے تحت ہم مزید حالات لکھیں گے۔ بنو فاطمہ کی جدوجہد اور استقلال خلافت کے حالات ہم علیحدہ دوسری فصل میں لکھیں گے۔

امامت ایک خاص بات جس کی طرف مورخین نے بالکل توجہ نہیں دی، بلکہ قابل ذکر نہیں سمجھی تاریخ خلافت اسلامیہ میں ہم اہم سمجھتے ہیں خلافت راشدہ میں مسلمانوں کی زیادہ تر توجہ جہاد فی سبیل اللہ کی طرف مبذول رہی۔ اور اموی خلافت میں بھی یہی کیفیت رہی ان ایام میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں صرف قرآن تھا، وہ اہل زبان تھے، اور اس کے مطالب اچھی طرح سمجھتے تھے، آج بڑے بڑے علماء اسلام بھی اس کا فہم نہیں رکھتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن کو قرآن ہی کی

روشنی میں دیکھتے۔ اس کے علاوہ قرآن سمجھنے میں بھی آسان ہے، اور یہ خود قرآن کا دعویٰ ہے
"لقد یسرنا القرآن للذکر تحقیق ہم نے قرآن سمجھنے کے لئے آسان بنایا
فهل من مدکر" (۲۷/۲) کیا کوئی نصیحت لینے والا ہے۔

خلافت عباسیہ کے دور دورہ میں چند قسم کی ذہنیت کے لوگ پیدا ہوگئے تھے جو زیادہ تر عجمی ہی تھے، ان میں سے ایک فقہا اور دوسرے عابد اور تیسرے دنیا دار
فقہا نے مدرسے کھول رکھے تھے، اور یہاں دینیات کا درس دیتے تھے۔ ان دینی مدرسوں کی ابتدا ابو فاطمہ نے کی، ہم بیان کر چکے ہیں کہ خلافت راشدہ اور اموی حکومت کے دور میں خلیفہ اور اس کے عامل خود ہی امامت کے فرائض بھی ادا کرتے، خلافت عباسیہ میں امامت کا عہدہ آئمہ دین کے سپرد ہوتا، امامت خلافت کا ایک جزو لاینفک سمجھا گیا تھا اور اب یہ ایک مسجد کے مُلا کے ہاتھ میں آگئی، اس میں کچھ شک نہیں کہ ابتدا میں امامت مشہور ہستیوں کے ہاتھ میں رہی، اور ان کا اثر و رسوخ بھی بہت تھا، خلافت اور امامت کی تاریخ ہر ایک قوم کی تاریخ ہے، یورپ میں پوپ امام ہی تھا، ہندوستان میں برہمن امام تھے، اور راجے چھتری، یہی کیفیت خلافت اور امامت کی تاریخ اسلام میں تھی۔ خلافت دنیوی حکومت تھی، تو امامت دینی حکومت، اور یہ ظاہر ہے کہ دنیوی حکومت تو جسموں پر اور دینی حکومت دلوں پر ہوتی ہے، اور جس حکومت کے قبضہ میں دل ہوں وہ آسانی سے دنیوی حکومت پر بھی قابض ہو جاتی ہے، ہر ایک قوم کی تاریخ میں یہ دو طاقتیں دینی حکومت (Church) اور دنیوی حکومت (State) برسر اقتدار رہی ہیں، لسان قرآن میں دینی حکومت کو "نبوت" سے تعبیر کیا گیا، جس کے خاتمہ کا اعلان خاتم النبیین" نے فرما دیا تھا، اور اس کی جگہ "شوریٰ" قائم کر دی گئی، جو دینی اور دنیوی امور کا انصرام کرتی رہی، خلافت عباسیہ میں یہ دینی حکومت پھر زندہ ہو گئی، اور اس پر جن کا قبضہ تھا وہ "امام" کہلائے، ایک جماعت ایسی بھی پیدا ہو گئی تھی، جنہوں نے مسیحی راہبوں کی طرح "زاویے" اور خانقاہیں (Monasteries) بنالیں اور یہ ان کے عبادت خانے تھے، ان کو عبادت سے شغف ضرور ہوگا لیکن ارکان اسلام

جو بالکل سادہ ہیں، ان پر "نوافل" کا اضافہ انہی لوگوں نے کیا، یہ اولیائے اللہ بعد میں صوفی کہلائے، ان کا احترام ہر ایک جگہ ہوتا، انسان طبعاً کثرت پسند واقع ہوا ہے خواہ اچھی ہو یا بری، عبادات میں شغف رہبانیت کی حد تک پہنچ گیے، ارشاد قرآن ہے کہ

ورھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبنھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا (۲۷/۲)

اور رہبانیت دین میں شاخسانہ انہوں نے نکالا ہم نے تو ان پر فرض نہیں کی تھی، فرض تو صرف اللہ کی رضا جوئی ہے، تو اس کو بھی نباہ نہ سکے۔

غلط فہمی سے لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ ان کی عبادت سے جتنا بھی زیادہ کریں خوش ہوتا ہے۔ "دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست"۔ یہ ایک فریب نفس ہے، ایسی عبادت میں حظِ نفس ہے، مسلمانوں میں عبادت ہندوستان کے تپسیوں اور مسیحی رہبانوں کی نفس کشی تک کبھی نہیں پہنچی، لیکن جتنا بھی اس میں غلو کیا گیا ہے اتنا ہی حقوق العباد تلف ہوئے، صلوٰۃ یعنی تعلق با خدا ایک خاص صورت عبادت کی ہے (Formality) اور ہر ایک نظام کی کچھ نہ کچھ صورت ضرور ہونی چاہیے، ارشاد قرآن ہے کہ

ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر، واللہ تعلم ما یصنعون (۲۱/۶)

صلوٰۃ بے حیائی اور نامعقول باتوں سے روکتی ہے اور البتہ اللہ کی بہت بڑی یاد ہے اور اللہ جانتا ہے جو تم اس میں صنعت سے کام لیتے ہو۔

عبادت الٰہی یہی ہے کہ ہر ایک بے حیائی سے خواہ چھپی ہو یا ظاہری انسان رکا رہے اور اللہ کو یاد رکھے، اس کی خاص صورت جماعتی زندگی میں وہی کچھ ہے، جو مسلمانوں میں رائج ہے، لیکن آنحضرتؐ کے عہد مبارک میں بھی اس سادہ چیز پر "نوافل" کی کثرت ہو رہی تھی، اس میں کچھ شک نہیں کہ آنحضرتؐ کو عبادت الٰہی میں خاص شغف تھا آپ کے اتباع میں صحابہ نے بھی یہی روش اختیار کی، "سورہ مزمل" میں اس سے منع فرمایا گیا اور آیت محولہ بالا میں اس کو "صنعت" سے تعبیر کیا گیا، اور تنبیہ کیا گیا کہ علم ان لن تحصوہ واللہ کو معلوم ہے کہ تم اسے ہرگز نہ نباہ سکو گے، اس لئے کہ تمہارا صرف یہ کام ہے،

بلکہ اور فرائض ہیں:۔

علم ان سیکون منکم مرضیٰ، و اخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ، و اخرون یقاتلون فی سبیل اللہ (۲۹)

(تم میں سے بیمار بھی ہوں گے، اور ملک میں تجارت کے کاروبار میں سفر کرتے ہوں گے اور دوسرے فی سبیل اللہ دشمنانِ دین سے جنگ میں مصروف ہوں گے)

اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کے اوقات کا اندازہ مقرر فرما دیا ہے اور ہر ایک وقت کا ایک خاص تقاضہ ہے، دن معاش اور رات آرام کے لئے ہے، البتہ رات کے وقت اٹھنا نفس سرکش پر گراں گزرتا ہے، اس لئے نفس کشی کے لئے مناسب ہے تو جس کو اس کی ضرورت ہو وہ شوق سے کر سکتا ہے، مگر اس کی حیثیت "نفل" سے بڑھ کر نہیں، "فرض" وہ ہے جسے ہر ایک شخص نباہ سکتا ہے۔

یہ ایک مستقل موضوع ہے اور ہم نے اپنے مقالات میں اس پر علیحدہ بحث کی ہے ان اوراق میں ہم جس موضوع پر بحث کر رہے ہیں، اس کے بارے میں اتنا اشارہ کافی ہے کہ مذہبی رسوم کی بھرمار نے اسلام کی فطری سادگی کو جس میں ایک کشش تھی صنعت انسانی میں بدل دیا، اور حقیقت محجوب ہو کر رہ گئی، یا تو "زنادقہ" نے مسلمانوں کو فرائض جہاد سے غافل کرنے کے لئے یا اسلام کے نادان "تپسیوں" نے ترغیب عبادت کے لئے ایسی احادیث کثرت سے وضع کیں، جن میں ایک ایک نفل کا ثواب ہزار شہداء کے اجر کے برابر قرار دیا،

خلافت کے تحت جس جنت کا وعدہ مومنین و صالحین سے کیا گیا تھا اور پورا ہو کر رہا، اس سے یہ شیطنت مسلمانوں کو بیدخل کر کے رہی، اور اب یہ ذہن نشین کیا گیا کہ دنیا "سجن المومنین" ہے یہاں فقر و فاقہ عاقبت کی دائمی نعمت کا ضامن ہے رسول کریم کی صحیح حدیث ہے کہ

لا یدع احد منکم الجہاد فانہ لا یدعہ قوم الا ضربھم اللہ بالذل۔

تم میں سے کوئی بھی جہاد فی سبیل اللہ سے غافل نہ رہو، کیونکہ جس قوم نے اس طرف سے غفلت برتی اور اسے ترک کیا اللہ نے اس پر ذلت مسلط کردی۔ اور یہ کہ تمہارا دین دنیا سے وابستہ ہے، جب تمہاری دُنیا خراب ہوگی دین بھی خراب ہو جائے گا۔

شب چو عقد نماز بربندم　　چہ خورد بامداد فرزندم

سچ ہے "پراگندہ روزی پراگندہ دل"۔ زاویہ نشین "خانقاہوں" کے "پیران جاہل اور شیخان گمراہ" کے لئے تو روزی کا سامان غیب سے ہوتا رہتا ہے ان کو عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے مل جاتے ہیں لیکن عامتہ المسلمین کہیں کے نہ رہے،

بنو فاطمہ نے ابتدا میں خلافت کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے اس قرابت کا احترام عام مسلمانوں کے دلوں میں بہت تھا جو ان کو آنحضرتؐ سے تھی، اور اسی بنا پر ان کا دعوے خلافت بھی مبنی تھا، ایرانیوں اور عباسیوں نے ان کو اپنا آلہ کار بنایا، جب عباسی بساط سیاست پر ان کو مات دے گئے، اور خلافت عباسیہ زور پکڑ گئی، تو یہ مایوس ہوگئے اس لئے انہیں اس کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ کہ دینی حکومت یعنی امامت پر قبضہ جمالیتے،

مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ اس کی ابتداء امام جعفر صادقؓ سے ہوئی جو ۱۴۸ھ مطابق ۷۶۵ء مدینہ میں فوت ہوئے، لیکن خوش قسمتی سے درس و تدریس دینیات کا سلسلہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے بیٹے اور جانشین موسیٰ الکاظم نے جاری رکھا اور دوازدہ امام جاری رکھتے رہے، علم جعفر آپ سے منسوب ہے، غالباً آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ دنیوی خلافت آپ کو نہیں پہنچے گی، اس لئے آپ سے یہ قول منسوب ہے کہ

"دنیوی حکومت ہمارے لئے نہیں ہے"

کوئی محقق مؤرخ آپ کی اعلیٰ سیاسی فراست کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خلفاء عباسیہ کے ابتدائی تاجدار بھی کچی گولیوں سے کھیلنا نہیں سیکھے تھے۔ امامت کی آڑ میں بنو فاطمہ کے کچھ اور عزائم ہوں یا نہ ہوں ان کو یقین تھا کہ دینی ڈھونگ کسی روز

رنگ لائے گا، اس لئے ان کے ساتھ جو کچھ سلوک کیا، اس کا داغ ان کے دامن پر اس سے زیادہ بدنما دھبہ ہے جو بنوامیہ نے ہاشمیوں سے اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے روا رکھا، لیکن بنو فاطمہ اپنی دعاوی سے کبھی دست بردار نہ ہوئے خلافت فاطمیہ کے تحت ہم ان کا تذکرہ کریں گے،

مجدّدیت انہی ایام میں تقیہانے یا "امامت" کے دعویداروں نے چند اصطلاحات "مجدد" اور "محدث" وغیرہ وضع کیں، ان کا مفہوم یہ ہے کہ ہر صدی کے بعد دین مردہ ہوتا رہے گا، اور ہر ایسا شخص جو دین کو پھر سے زندہ کرے گا یا اس کی تجدید کرے گا "مجدد" ہے، مجدد گو نبی نہیں مگر نبوت کے اقرب ہے، ان شاخسانوں نے اور احادیث در بارہ نزول عیسٰی و خروج مہدی نے ایام جاہلیت کی دینی حکومت کو پھر سے زندہ کر دیا،

خوارج ہم نے خوارج کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنی کتاب "دمشق" میں کیا ہے اور ان اوراق میں حضرت علی کی خلافت کے تذکرہ میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ پُرجوش ہواخواہان علی تھے، لیکن جب حکمین کا تقرر ہوا، تو یہ علیحدہ ہو گئے، اس جماعت میں صحابہ رسول کریم بھی تھے،

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت تک صحابہ کے ہاتھ قرآن تھا یا آنحضرت کی عملی زندگی کا نمونہ جو سنتِ رسول اللہ سے موسوم ہے، خوارج میں اکثر حافظ قرآن تھے اور وہ صرف قرآن کو زندۂ جاوید امام تقین کرتے تھے حضرت علیؓ پر ان کا یہ اعتراض تھا کہ لاحکم الا اللہ "یعنی جب یہ طے پا چکا تھا کہ قرآن کی رُو سے فیصلہ ہوگا، تو حکم قرآن ہے، ابوموسیٰ اور عمرو بن العاص کو حکم کیوں مقرر کیا گیا، حضرت علی نے سمجھا یا کہ دونوں قرآن کی رُو سے فیصلہ کریں گے تو یہ فیصلہ قرآن ہی کا ہوگا۔ بہرحال یہ لوگ نہ صرف حضرت علی کی جماعت سے علیحدہ ہو گئے، بلکہ امیر معاویہ اور حضرت علی کے خلاف برسرِ پیکار رہے، ان کی سرگرمی نے دونوں خلافتوں کو بہت نقصان پہنچایا۔

سید امیر علی اپنی "ہسٹری" میں لکھتے ہیں، کہ "بنو ہاشم کا دعوے قرابت رسول اللہ پر مبنی تھا، مگر خوارج کا عقیدہ یہ تھا کہ خلیفہ برحق وہی ہے جس کو عام جماعت مسلمین باتفاق کثرت رائے منتخب کرے"، اس لئے وہ اول دو خلفاء صدیق اکبر اور عمر کی خلافت کو تو تسلیم کرتے ہیں اور ان کے مداح بھی ہیں، لیکن باقی دو خلفاء اور خلفاء بنو امیہ کو تسلیم نہیں کرتے، خلافت عباسیہ تو ان کے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں رکھتی، ان لوگوں کے عقائد اس فرقہ سے بہت ملتے جلتے ہیں جن کو ہمارے زمانہ میں "وہابی" کہتے ہیں، جب خلافت عباسیہ زور پکڑتی تو یہ لوگ تتر بتر ہو کر شمالی افریقیہ کی طرف چلے گئے، اور وہاں اپنی سرگرمی جاری رکھی، خلفاء مصر اور خلافت فاطمیہ کے تحت ہم ان کے مزید حالات لکھیں گے،

نائب السلطنت

انتقال خلافت کے اسباب سمجھنے کے لئے خود خلفاء عباسیہ کی حکمت عملی کا فہم مقدم ہے، ہم بیان کر چکے ہیں کہ اموی خلافت خالص عربی حکومت تھی، اور تمام عرب ان کا پشت پناہ تھا، جب خلافت عباسیہ قائم ہو گئی تو اس کے سوا چارہ کار نہ تھا، کہ ایرانیوں کو عربوں کے مقابل لایا جائے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مغلیہ بادشاہ اکبر نے ہندوستان میں اپنے پیشرو پٹھانوں کا زور توڑنے کے لئے ہندو راجپوت راجاؤں کو ان کے سامنے کر دیا، اور حد ہے کہ راجہ بھگوان داس کابل میں نائب السلطنت رہا۔ اسی طرح عباسی خلفاء نے پارسیوں پر اعتماد کیا، آل برامکہ کے حالات میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں جعفر برمکی سفید و سیاہ کا مالک ہو چکا تھا، مالیات کا انتظام شروع سے ان کے ہاتھ میں تھا، خلیفہ کا روزینہ مقرر تھا، بعض اوقات ہارون الرشید کچھ مطالبہ کرتا تو ادھر سے انکار ہوتا، بعض مورخین نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ہارون الرشید کی بہن عباسہ سے جعفر برمکی کا نکاح بھی ہوا۔ لیکن علامہ ابن خلدون ان کا مضحکہ اڑاتا ہے اور لکھتا ہے کہ یہ مورخ تو نہیں فسانہ نویس ہیں، اور یہ فسانہ محض دروغ بے فروغ ہے۔ لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ برامکہ کے ہاتھ میں انتظام مملکت آ چکا تھا،

علامہ ابن خلدون لکھتا ہے کہ ان کا اثر و رسوخ غیر محدود تھا، لوگوں کو اپنا گرویدہ سخاوت سے کیا اگرچہ یہ بھی حلوائی کی دکان اور دادا جی کا فاتحہ تھی سلطنت کے تمام اعلیٰ عہدے اور منصب پر آل برامکہ قابض تھے یا وہ اشخاص جو ان کے ہوا خواہ تھے، اور جن کا انتخاب برمکی کرتے، وزارتِ عظمیٰ ان کی تھی اس لئے ہر ایک سر ان کے آستانہ پر جھکتا، اور وہی ہر ایک کی حاجت روائی کرتے، بہر حال خلیفہ کو خیر خواہوں نے یقین دلایا کہ برامکہ پھر سے ایرانی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، اس لئے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس نے ان کا خاتمہ کر دیا، لیکن پارسی اثر و رسوخ ان کے ساتھ کم نہ ہوا، خلیفہ معتصم نے اس کا زور توڑنے کے لئے ترکوں کی بھرتی شروع کر دی یہ لوگ "مملوک" کہلائے۔ ان کے علاوہ معتصم نے افریقیہ اور یمن سے بھی کرایہ کے ٹٹو بھرتی کئے جو "مغربی" کہلائے۔

معتصم کے بعد اس کا بیٹا واثق اور واثق کے بعد اس کا بھائی متوکل ان ہی ترکوں کی حسب مرضی تختِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ متوکل کو ان ہی ترکوں نے مار ڈالا اور اس کے بیٹے منتصر کو تخت پر بٹھا دیا، منتصر کے بعد معتصم کے ایک پوتے مستعین کو خلافت عطا کی معتصم کے بعد اس وقت تک دار الخلافت سامرہ میں تھا مستعین تو برائے نام خلیفہ تھا، اس ذلت سے بچنے کے لئے بغداد پرانے دار الخلافت میں اس امید پر آیا کہ عرب اور پارسی اس کی کچھ مدد کریں گے، اس کے عہد حکومت میں جہاں جہاں عامل تھے خود مختار تھے، لیکن خلافت کا احترام اس حد تک تھا کہ اپنے آپ کو نائب السلطنت ہی سمجھتے اور کہتے رہے۔

جب مامون رشید اور اس کے بھائی امین میں تنازعہ خلافت برپا ہوا تو طاہر نامی مامون کے فوجی افسر کے تحت ایرانیوں نے بغداد کا محاصرہ کیا اور امین مارا گیا، طاہر کو خراسان کی حکومت تفویض ہوئی، دار الحکومت نیشاپور قرار پایا، آل طاہر عرصہ تک بالاستقلال حکومت کرتے رہے، مستعین کو تختِ خلافت سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا گیا، اور ترکوں نے مستعز باللہ کو جو کہ معتصم کا دوسرا بیٹا تھا خلیفہ مقرر کیا

ہی کے عہدِ خلافت میں احمد بن طولون کو مصر کی نیابت تفویض ہوئی، اور یہ بھی آل طاہر کی طرح مصر کا خود مختار فرماں روا تھا، احمد بن طولون شام پر بھی چھا گیا اس کے بیٹے خمارویہ نے دمشق میں اپنا دارالسلطنت قائم کیا۔ اور مصر پر بھی حکومت کرتے رہے، خلفائے عباسیہ تو برائے نام خلیفہ تھے، رومیوں کے حملوں کا جواب بھی ترکی بہ ترکی یہی نائب السلطنت دیتے رہے،

خلفا مصر

جب چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے بغداد کو تباہ کیا۔ تو تاتاری ٹڈی دل عراق کو روندتا ہوا شام کی طرف بڑھا حلب میں پچاس ہزار مسلمان تہ تیغ بے دریغ ہوئے، اور دس ہزار عورتیں اور بچے لونڈی اور غلام بنائے گئے مغرب کی طرف رُخ کیا۔ شہر ناصرہ واقع فلسطین کے قریب عین جالوت "پر" سلطان بیبرس" جو ملک منصور والئے مصر کا سپہ سالار تھا، مقابلہ کے لئے آیا، منصور تو ابھی لڑکا تھا، وزیر سیف الدین نے اعیانِ دولت کو جمع کیا قرار پایا کہ تاتاریوں کا مقابلہ کرنا چاہیئے، اگر بیت المال میں ایک حبہ بھی نہ رہے تو عامۃ المسلمین سے امداد طلب کرنی چاہیئے، جب اس امر کا اعلان کیا گیا تو مسلمان جوق در جوق جو کچھ بھی میسّر تھا لے کر حاضر ہوئے، سردست اس کی ضرورت نہ تھی، سیف الدین ملقب ملک مظفر نے بیبرس کو لکھا کہ تاتاریوں کا مقابلہ کرو، اور وعدہ کیا کہ حلب کی حکومت تمہاری ہے بیبرس نے تاتاریوں کو شکست فاش دی اور حلب تک تعاقب کیا۔ اور اتنے تاتاری مارے گئے کہ پھر ان کے پاؤں کہیں نہ جمے، ملک مظفر اپنے وعدہ پر قائم نہ رہا۔ اس لئے بیبرس سے نہ بنی ملک مظفر مارا گیا، بیبرس نے خود ملک قاہر کا لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد ملک ظاہر کا لقب اپنایا، بغداد میں خلافت عباسیہ ختم ہو چکی تھی "المستنصر" بھاگ کر مصر میں آیا، بیبرس نے باطنوں ... بیعت کی اور سلطان کا خطاب بارگاہِ

سے بنی طولون سے خارویہ اور ابوالعساکر اور ابو موسیٰ ہارون اور ابوالمغازی سپالوی ہوئے آخرالذکر پر ۲۹۲ھ میں ان کی ولایت یا سلطنت کا خاتمہ ہو گیا،

خلافت سے عطا ہوا۔ المستنصر پہلا خلیفہ عباسیہ مصر ہے، پھر سے کھوئے ہوئے مقبوضات لینے کا ارادہ کیا، آخر تاتاریوں سے عراق میں مقابلہ ہوا، مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ خلیفہ کی لاش نہ ملی، مشہور یہ ہوا کہ روپوش ہو گئے، مصر میں المستنصر کے بعد حاکم بامر اللہ جو خلیفہ مسترشد کی اولاد سے تھا۔ خلیفہ ہوا۔ حاکم نے تاتاریوں سے پھر جنگ چھیڑ دی، اور ان کو پے در پے شکست دی، اکثر تاتاری امن کے خواستگار ہوئے۔ (اور) آغوش اسلام میں آ گئے، ۶۶۳ھ میں ہلاکو خاں ہلاک ہوا، اس کی اولاد میں سے قازان بن ارغون بن ابغا بن ہلاکو ۶۹۴ھ میں مسلمان ہو گیا/ یہ اسلام کی عظیم الشان فتح تھی۔ اور اللہ تعالےٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا، جو قرآن میں ہو چکا تھا، کہ اگر تم اس مقصد کی تکمیل سے قاصر رہے جس کے لئے تمہیں خلافت دی گئی ہے تو اللہ تعالےٰ ایک قوم کو لے آئے گا، جو تمہارے جیسے نہ ہوں گے۔

مصر میں بارہ خلفاء عباسیہ یکے بعد دیگرے ۹۰۸ھ تک تخت خلافت بیٹھے، محض برائے نام خلیفہ تھے، امور سلطنت سلاطین سرانجام دیتے تھے۔ جن کا تذکرہ ہم علیحدہ کریں گے۔ یہ جسے چاہتے خلیفہ بناتے جسے چاہتے معزول کرتے، جسے چاہتے قید و بند میں رکھتے اس لئے ان کا تذکرہ بے فائدہ ہے، آخری خلیفہ عباسیہ المستنجد باللہ کے انتقال کے بعد سلطان روم سلیم اول نے مصر پر قبضہ کر لیا، اور عنان خلافت سنبھال لی۔

اموی اور عباسی خلافت مشرق اور مغرب پر چھائی ہوئی تھی، جب پارہ پارہ ہو گئی تو خلافت کے تحت جو والیان تھے، خود مختار سلاطین بن گئے۔ سلاطین مشرق کے حالات ہم اس کتاب کے دوسرے باب میں لکھیں گے۔ چونکہ خلافت امویہ عباسیہ مشرق سے بیدخل ہو کر مغرب افریقہ اور ہسپانیہ میں منتقل ہو چکی تھی، اس لئے مناسب ہے کہ ان والیان کا تذکرہ جو خلفاء امویہ و عباسیہ کے عہد میں مغرب میں تھے اس مقام پر اس حد تک کیا جائے جو خلافت بنی فاطمہ سے وابستہ ہے۔ جس کے بعد خلافت قریش کے ہاتھ سے نکل گئی۔

آلِ اغلب

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں خلافتِ عباسیہ اگرچہ انتہائی عروج پر تھی مگر ولایت افریقہ کا انتظام خاطر خواہ نہ ہو سکا۔ بربری قبائل کی آئے دن کی شورش اور والیوں کے عزل و نصب نے خلافت کے خزانہ پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال رکھا تھا۔ ہرثمہ والی افریقہ تین سال کے بعد خود ہی مستعفی ہو گیا۔ اور خلیفہ کے ذہن نشین یہ امر کیا کہ اِس دُور دراز مملکت کے حصہ میں والی مصر سے انتظام نہیں ہو سکتا۔ یا تو شمالی افریقہ کو چند ولایات میں تقسیم کر دیا جائے جن کا براہِ راست تعلق دربارِ خلافت سے ہو یا کچھ اور بندوبست جو مناسب ہو کیا جائے۔ اس وقت ابراہیم ابن اغلب موجود تھا۔ اُس نے ہرثمہ کی تائید کرتے ہوئے کہا اگر امیرالمومنین افریقہ کی ولایت میرے سپرد کر دیں اور یہ عہدہ میری آل میں موروثی ہو تو میں سالانہ چالیس ہزار دینار دربار خلافت کی نذر کرتا رہوں گا۔ اس وقت ایک لاکھ دینار سالانہ کا بار خزانہ خلافت پر ہے۔ اس سے سبکدوش کر دوں گا۔ ہرثمہ کے مشورہ پر ہارون نے ابراہیم کی درخواست منظور کر لی بشرطیکہ یہ تھی کہ آلِ اغلب سے جو بھی والی ہو۔ وہ پہلے دربارِ خلافت سے باضابطہ سندِ ولایت حاصل کرے

مراقش تو خلیفہ ہادی کے عہد میں خلافت عباسیہ کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اور یہاں خلافت ادریسیہ قائم ہو چکی تھی اس کے حالات ہم خلافت بنی فاطمہ کے تحت لکھیں گے۔ ابراہیم نے اپنا دارالولایت قیروان کے قریب بنایا اور اس کا نام "عباسیہ" رکھا۔ ابراہیم کا عہدِ ولایت امن سے گذرا۔ یہ عرصہ سنہ ۱۸۴ھ/۸۰۰ء سے سنہ ۱۹۶ھ/۸۱۲ء تک خوشحالی کا رہا۔

شجرۂ نسب آلِ اغلب

اغلب

(۱) ابراہیم
سنہ ۱۸۴ھ
۸۰۱ء

(۲) زیادت اللہ اول
سنہ ۲۰۱ھ
۸۱۷ء

(۳) ابوعقال الاغلب
سنہ ۲۲۳ھ
۸۴۰ء

(۴) ابو العباس محمد
سنہ ۲۲۶ھ
۸۴۲ء

(۵) ابو ابراہیم احمد
سنہ ۲۴۲ھ
۸۷۱ء

(۶) ابو محمد زیادت اللہ ثانی
سنہ ۲۴۹ھ

(۷) ابو عبد اللہ محمد
سنہ ۲۵۰ھ

(۸) ابراہیم
سنہ ۲۶۱ھ
۸۷۴ء

(۹) ابو العباس عبد اللہ
سنہ ۲۸۹ھ
۹۰۲ء

(۱۰) ابو مضر زیادت اللہ ثالث

آلِ اغلب کے عہدِ ولایت کا مشہور واقعہ یہ ہے کہ جزیرہ صقلیہ (Sicily) پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ اور وہ روم دارالسلطنت اٹلی کی دیواروں تک بڑھتے اور پیچھے ہٹتے رہے۔ اس واقعہ کے اسباب مورخین یورپ یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک "بازنطینی" (Byzantine) نوجوان نے ایک نوجوان راہبہ سے تعلق پیدا کرلیا۔ شریعت عیسوی میں رہبانیت کی پہلی شرط تجرد ہے۔ نوجوان کا نام "فیمی" معرب ہے "افمیس" (Euphemius) کا۔ مگر اس واقعہ کا ابن اثیر ذکر نہیں کرتا۔ وہ اور ہی سبب بتاتا ہے۔ کہ ۲۱۲ھ میں قیصر قسطنطنیہ نے صقلیہ کا گورنر (Constantine) نامی کو مقرر کیا جو بہادر سپاہی تھا۔ اور طبقۂ اُمرا میں سے بھی تھا۔ اس کے تحت بحری بیڑہ بھی تھا۔ اور وہ افریقیہ کے ساحلی علاقہ پر حملے کرتا رہا۔ اور مسلمانوں کے جان و مال کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس سبب کا ذکر یورپ کے مورخین بھی کرتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ گورنر کے ماتحت فیمی تھا۔ جس نے یہ حرکت ناشائستہ مذکورہ کی۔ بادشاہ نے گورنر کو حکم دیا کہ اس کی زبان کاٹی جائے۔ فیمی بھاگ کر زیادت اللہ اغلب سے آملا۔ اور صقلیہ پر حملہ کی ترغیب دی۔ زیادت اللہ نے اسد بن فرات جو قیروان کا قاضی بھی تھا۔ بحری بیڑہ کے ساتھ صقلیہ کی طرف روانہ کیا۔ ابوالعباس محمد کے عہدِ ولایت میں مسلمانوں نے جزیرہ مالٹا (Malta) بھی لے لیا۔

ابوعبداللہ محمد (متوفی ۲۶۱ھ) کے عہدِ ولایت کے آخر تک آلِ اغلب کا غلبہ بحرالشام (بحیرہ روم) پر رہا۔ لیکن ابراہیم کے آخری دور میں بدنظمی رونما ہوئی۔ ابراہیم دیوانہ ہوگیا۔ اور اپنے بچوں کو مار ڈالا۔ خلیفہ معتضد عباسی نے اُسے برطرف کرکے اس کے بیٹے ابوالعباس کو جو اس وقت صقلیہ کا عامل تھا۔ ولایت دی اس کو اسی کے بیٹے ابومضر زیادت اللہ نے مروا ڈالا۔ اور اس پدرکش پر آلِ اغلب کی ولایت کا خاتمہ ہوگیا۔ اب خلافت بنی فاطمہ کے ہاتھ آگئی۔

دولتِ اخشیدیہ

خلفاء بنو فاطمہ اپنی خلافت کی حدود بڑھا رہے تھے مگر مصر ابھی تک خلفاء عباسیہ کے قبضہ میں تھا۔ اخشید محمد بن

طغج ترکی اور اس کی اولاد میں سنہ ۳۲۴ھ سے سنہ ۳۵۷ھ تک سلطنت مصر رہی۔ بنی فاطمہ نے اس کا بھی خاتمہ کر دیا اور مصر پر قبضہ جما لیا۔

دولتِ ایوبیہ اس خاندان کے ملوک کے حالات ہم علیحدہ "حروب الصلیبیہ" کے تحت لکھیں گے۔ اس خاندان نے بنو فاطمہ کی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اور پھر سے خلافتِ عباسیہ قائم کر دی۔

دولتِ ترکیہ مصریہ سنہ ۶۵۵ھ میں دولتِ ایوبیہ کے خاتمہ پر دولتِ ترکیہ کا آغاز ہوا۔ یہ بھی سنہ ۷۸۴ھ میں ختم ہو گئی۔

دولتِ چرکسیہ مصریہ ان سلاطین کا دورِ سلطنت سنہ ۷۹۱ھ سے سنہ ۹۲۲ھ تک رہا۔ ان کے خاتمہ کے ساتھ نام نہاد خلافت عباسیہ بھی ختم ہو گئی۔ اور ترکی سلطان سلیم (سلطان روم) نے خلافت سنبھال لی۔ اور مصر پر ترکی سلطان کے مقرر کردہ والی (پاشا) حکومت کرتے رہے۔ سلطان عبدالحمید خاں کے عہد میں محمد علی پاشا نے بغاوت کی۔ مصالحت اس پر ہوئی کہ حکومت مصر موروثی محمد علی پاشا کے خاندان میں رہے۔ لیکن حقِ سیادت سلطان کا رہے۔ یہ حق بھی نہ رہا۔ موجودہ خدیوِ مصر فاروق اسی خاندان سے ہے۔ لیکن مصر اور سوڈان عرصہ سے زیرِ اقتدار برطانوی حکومت ہے۔ جو عملاً نہر سویز پر قابض ہے۔

۴۔ نہر سویز کے موجودہ تنازعہ کے حالات اس کتاب کے تیسرے حصّہ میں ملاحظہ ہوں۔ برطانیہ بزورِ سویز اور سوڈان پر قبضہ رکھنا چاہتا ہے اگر مصر کی مدد عرب لیگ نے کی تو غالباً متوقع تیسری جنگ چھڑ جائے گی۔

خلافتِ بنو اُمیّہ
ہسپانیہ میں

ہشام اوّل سنہ ۱۰۵ھ میں دمشق میں اموی خلیفہ گذرا ہے جس نے اپنے بھائی یزید ثانی کی وفات کے بعد عنانِ خلافت سنبھالی۔ انیس برس نو ماہ اور نو دن کے بعد سنہ ۱۲۵ھ مطابق سنہ ۷۴۳ء فوت ہوا۔

ہشام بنو اُمیہ میں بڑا صاحب اقبال خلیفہ گذرا ہے۔ عباسی خلیفہ منصور بھی اس کے جاہ و جلال کا معترف تھا۔ اور اسے "فتی القوم" کے لقب سے یاد کرتا۔ اس کی وفات پر اموی خلافت تین براعظم ایشیا۔ افریقہ اور یورپ میں قائم ہو چکی تھی۔ یورپ میں تمام جزیرہ نما ہسپانیہ اور پرتگال اور جنوبی فرانس بحیرہ روم کسی وقت بحیرہ فنیقی تھا۔ اب بحیرۂ امویہ بن گیا۔ جزائر "مجورکا" (MAJORCA) اور مائی نورکا (MINORCA) اور آئی ویکا ([illegible]) کارسیکا" (CORSICA) اور سارڈینیا" (SARDANIA) اور قریطہ" (CRETE) روڈس" (RHODES) اور "قبرص" (CYPRUS) اور جزیرہ "صقلیہ" (CICELY) کا جنوبی حصہ اور اکثر یونانی جزائر پر خلافت امویہ قابض تھی۔ افریقہ میں تمام شمالی براعظم بحر اوقیانوس سے خاکنائے سویز (SUEZ) تک اور ایشیا میں جزیرہ نمائے سینا سے منگولیا تک چھائی ہوئی تھی۔

ہشام اوّل کے بعد اس کا برادر زادہ ولید ثانی ابن یزید ثانی تخت نشیں
اُس کا اپنا لڑکا معاویہ قانون وراثت کی رُو سے وارث نہ ہو سکا۔ اسی معاو
بیٹا عبدالرحمٰن اول ہے۔ جو سفاح کے خونریز ہاتھ سے بچ کر ہسپانیہ آیا او
آباد ہوا۔ اور خلافت امویہ کو سنہ ۱۸ھ مطابق سنہ ۱۰۲۷ء تک زندہ رکھا
ایشیا میں اُن کا دارالخلافت "دمشق" تھا۔ جس کی تاریخ ہم نے ۱۳۲۸
لکھی۔ اور سنہ ۱۳۲۹ھ مطابق سنہ ۱۹۱۱ء مطبع روز بازار سے شائع ہوئی۔ اس
اموی خلافت کا تذکرہ بہ تعلق "دمشق" ہی لکھا گیا ہے۔ ان اوراق میں بھی
بہ تعلق خلافت اسلامیہ ہی لکھا ہے۔ ہسپانیہ میں بھی یہی سلسلہ جاری رکھیں

شجرۂ خلفاء بنی امیّہ قرطبیہ

(١) عبدالرحمن اول (سنہ ١٣٨ھ / ٧٥٦ء)

(٢) ہشام اول (سنہ ١٧٢ھ / ٧٨٨ء)

(٣) حکم اول (سنہ ١٨٠ھ / ٧٩٦ء)

(٤) عبدالرحمن ثانی (سنہ ٢٠٦ھ / ٨٢٢ء)

(٥) محمد اول (سنہ ٢٣٨ھ / ٨٥٢ء)

(٦) منذر (سنہ ٢٧٣ھ / ٨٨٦ء) — (٧) عبداللہ (سنہ ٢٧٥ھ / ٨٨٨ء)

محمد

(٨) الخلیفہ الناصر عبدالرحمن ثالث (سنہ ٣٠٠ھ / ٩١٢ء)

(٩) حکم ثانی (سنہ ٣٥٠ھ / ٩٦١ء) — عبدالجبار — عبیداللہ

(١٠) ہشام ثانی (سنہ ٣٦٦ھ / ٩٧٦ء) — (١٢) سلیمان (سنہ ٤٠٠ھ / ١٠٠٩ء)

عبیداللہ — عبدالرحمن — (١٥) محمد ثالث (سنہ ٤١٤ھ / ١٠٢٣ء)

عبدالجبار — ہشام — عبدالملک

ہشام: المہدی ثانی (سنہ ٣٩٩ھ) — (١٤) عبدالرحمن خامس (سنہ ٤١٤ھ / ١٠٢٣ء)

عبدالملک: (١٣) عبدالرحمن رابع (سنہ ٤٠٨ھ) — محمد

محمد — (١٦) ہشام ثالث (سنہ ٤١٨ھ / ١٠٢٧ء)

ہسپانیہ میں اموی خلافت کب اور کس طرح قائم ہوئی؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں پھر سے خلافتِ راشدہ کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ فاروق اعظم کے عہدِ خلافت میں تمام ملک شام زیرِ نگین خلافت آگیا۔ تو رومیوں کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ شام کے شمالی علاقہ اور مصر کی طرف رجوع کرتے۔ اس وقت عیاض شام کے شمالی علاقہ میں سپہ سالار تھا۔ اس نے کوہ طور سے گذر کر سلیسیا اور اس کے دارالسلطنت طرسوس پر قبضہ کرلیا اور بحیرہ اسود تک بڑھتا گیا۔

مصر کی طرف سے اگرچہ وقتاً فوقتاً حملے ہوتے رہے۔ مگر حضرت عمر ابھی تک الحاقِ مصر کی اجازت نہ دیتے تھے۔ آخر عمرو بن العاص عاملِ فلسطین نے ذہن نشین کردیا۔ کہ مصر اور شام میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اگر مصر پر رومی قبضہ بدستور رہا۔ تو مسلمان شام میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتے۔ حضرت عمر نے اجازت دے دی۔

ایامِ جاہلیت یعنی آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر اہلِ مکّہ کے تجارتی قافلے مصر میں آتے جاتے تھے۔

عمرو بن العاص کو بھی ان ہی ایام میں مصر آنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اور وہ اس ملک کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ تین ہفتوں کی قلیل مدت میں اس نے رومیوں کو تمام ملک مصر چھوڑنے پر مجبور کردیا۔ جانب جنوب ایک طرف الی سینا کی حدود اور جانب غرب لیبیا تک مسلمان قابض ہوگئے۔ لیکن شمالی افریقہ میں رومی اثر در سوخ و اقتدار باقی تھا۔ عمرو بن العاص نے بارقہ تک خلافت میں شامل کر

ہم بیان کرچکے ہیں۔ کہ شمالی افریقہ میں جب کہ "روم" دارالسلطنت کی بنیاد بھی نہ پڑی تھی۔ قریہ حدقہ قارتیج فنیقی نو آبادی تھی اور تمام شمالی افریقہ پر ان ہی لوگوں کی بستیاں تھیں۔ یہ حجازی عرب تھے۔ مؤرخین یہ بھی کہتے ہیں کہ مختلف قرون میں عربی قبائل افریقہ کے سواحل پر آباد ہوتے رہے ہیں۔ جیسے بادشاہوں کے دور دورہ میں ایک حمیری قبیلہ شمالی افریقہ میں آباد تھا۔ اس کا بادشاہ "افریقی" سے موسوم ہے ۔ ۔ ۔ ان لوگوں میں وہ تمام اوصاف موجود تھے

قوم کی خصوصیت ہے۔ جفاکشی اور بہادری اور آزادی ان کا موروثی وصف تھا۔

حضرت عثمان ذوالنورین کے عہد خلافت میں تارتھیج (Carthage) کے قرب میں رومیوں سے مسلمانوں کی مٹھ بھیڑ ہوئی تو انہوں نے جزیہ دینا منظور کرلیا۔ اس لئے مسلمانوں کا لشکر واپس بارقہ پر آگیا، حضرت عثمان کی شہادت کے بعد مسلمانوں کی توجہ خلافت کے اندرونی معاملات نے جذب کرلی، اور رومیوں نے پھر سے بارقہ تک قبضہ جمالیا، امیر معاویہ کے عہد خلافت میں عقبہؓ سپہ سالار نے تمام شمالی افریقہ کو اموی خلافت میں شامل کرلیا، اور چھاؤنی کے لئے مقام منتخب کیا جو "قیروان" کے نام سے موسوم ہوا، یہ واقعہ سنہ ۵۰ھ کا ہے، "مراکو" جس کو عربی مؤرخین "المغرب" سے موسوم کرتے تھے، ابھی تک رومی حکومت کے تحت تھا، اقوام "بربر" کی مدد سے وہ حملہ آور ہوتے رہے، آخر سنہ ۵۸ھ میں عقبہ نے اس کو بھی مسخر کرلیا، اور یہ نامور صحابی سنہ ۶۵ھ میں ایک بربری بغاوت فرو کرتے وقت میدان جنگ میں شہید ہوا۔

عقبہ کی شہادت کے بعد بربری اقوام کی بغاوت جاری رہی سنہ ۶۹ھ میں خلیفہ عبدالملک نے طہیر ابن قیس کو بارقہ کی حکومت سپرد کی، یہ بھی کام آئے سنہ ۷۷ھ میں خلیفہ نے حسین ابن نعمان کو چالیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ روانہ کیا، تارتھیج بندرگاہ تھا اور بلند دیواروں سے گھرا ہوا تھا، اس میں اکثر رومی اور بربری عیسائی مدافعت کے لئے موجود تھے، طویل مدافعت کے بعد حسین نے بندرگاہ لے لیا، یہ لوگ یہاں سے جزیرہ صقلیہ (Sicily) اور ہسپانیہ میں چلے گئے، ابھی تازہ فتح کا نشہ مسلمانوں کے دماغ میں تھا، کہ ایک بحری بیڑہ جس میں قسطنطنیہ کے سپاہی اور قوم گاتھ (Goths) کے جوانمرد تھے بندرگاہ میں داخل ہوگیا۔ حسین کو قیروان کی طرف لوٹنا پڑا،

امیر معاویہ کے عہد خلافت میں بھی مسلمانوں نے بحری کشتیوں کی اہمیت کا اندازہ کرلیا تھا، ان کے پاس بھی مضبوط بحری بیڑہ تھا، عبدالملک نے سمندر اور خشکی کے راستے کمک روانہ کی، مقابلہ ہوا۔ تو حریف کا بیڑا قسطنطنیہ کی طرف لوٹ گیا اب قیصری لشکر شمالی افریقہ میں نہ رہا۔

ابھی مسلمانوں نے اطمینان کا سانس نہ لیا تھا۔ کہ بربری اقوام نے پھر ایک دفعہ حملہ کر دیا، اس وقت وہ ابھی منظم ہو چکی تھیں، ان کی ملکہ ایک عورت تھی جس کا نام "رہینہ" تھا۔ لیکن مورخین اسلام اس کو "کاہنہ" کے لقب سے یاد کرتے ہیں ان کے جھنڈے کے نیچے مراکو کی قوم مور اور پہاڑی بربری قبائل اور صحرا کی سرحد پر اور قومیں جمع ہو گئیں، یہ لوگ اس کو دیوی سمجھ کر اس کے اشارہ پر کٹ مرنے کے لئے تیار تھے یہ عورت بڑی دلیر تھی، سپہ سالاری کے فرائض خود انجام دیتی اس نے لوگوں کے ذہن نشین یہ بات کر دی، کہ عربوں کو ہمارے ملک کی دولت کی طمع کھینچ کر لا رہی ہے، اس لئے مناسب ہے کہ تمام درخت کاٹ دیئے جائیں، زر و جواہرات مدفون کئے جائیں، عمارتیں گرا دی جائیں۔ اس کا حکم قضا و قدر کا حکم تھا، اس کی تعمیل خاطر خواہ ہوئی، غرض طرابلس تک تمام علاقہ ایک ویرانہ بن گیا۔ جو صدہا سال سے آباد تھا۔ پہاڑی لوگ تو پہلے ہی قلاش تھے، اور صحرائی ویرانوں میں رہائش رکھنا جانتے تھے۔ شہری لوگوں نے جب اپنی جائداد کو تباہ ہوتے دیکھا، تو در پردہ مسلمانوں سے ساز باز شروع کر دی، گھمسان کی لڑائی ہوئی، کاہنہ ماری گئی۔ اور اس کے لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے۔

کچھ عرصہ بعد حسین دل شکستہ ہو کر فوت ہوا، عبدالعزیز بن مروان عبدالملک کا بھائی اس وقت والی مصر تھا، اس نے اسے معزول کر کے موسیٰ بن نصیر کو اس کی جگہ مقرر کیا، موسیٰ کی عمر اس وقت ساٹھ برس کی تھی، اس کے تین بیٹے عبدالعزیز مروان اور عبدالعلا اس کے دست و بازو تھے، خود موسیٰ دلیر سپاہی اور مدبر تھا سپاہ میں ہر دلعزیز تھا، بے تکلف ہر ایک سے باتیں کرتا اور ان کا دل بڑھاتا۔ بربری قبائل کی دو پناہ گاہیں تھیں، ایک پہاڑ جس کا سلسلہ ساحل کے متوازی چلا گیا، اور اطلس کا سلسلہ کوہ، دوسرا صحرا جہاں تعاقب غیر ممکن تھا، موسیٰ کے بیٹوں نے بربریوں کو پہاڑیوں سے بیدخل کر دیا لڑائی سے جو بچے صحرا میں پناہ گزین ہوئے۔ موسیٰ نے غنیمت کا اکثر مال عبدالعزیز والئے مصر کو بھیج دیا، عبدالملک حسین

کی معزولی پر سخت خفا ہوا، اور اپنے بھائی کو لکھا کہ تم نے سخت سیاسی غلطی کی کہ ایک وفا شعار تجربہ کار سپاہی کو معزول کیا،
مال غنیمت اور موسیٰ کی فتوحات سے عبد الملک کا غصہ ٹھنڈا ہوا، اسیران جنگ جاہل مطلق تھے، موسیٰ نے اُن میں تعلیم کا انتظام کیا، اور جو بھی ذرا ہوشیار اور تیز فہم امتحان میں کامیاب ہوتا، اس کو آزاد کرتا، اِس کا اثر باقی اسیران جنگ پر خاطر خواہ ہوا، اب موسیٰ کے لشکر میں تمام مسلمان بربر بھی شامل ہو گئے۔
موسیٰ کی فتوحات نے شام اور مصر اور عرب کے مجاہدین میں ایک تحریک پیدا کر دی وہ رضا کارانہ اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے، ان کے علاوہ موسیٰ نے غیر مسلم اقوام مسیحی۔ یہود اور بت پرستوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا یہود کی تعداد زیادہ تھی، یہ سب جزیہ کی ادائگی سے بچ گئے، یہود اہل عرب سے وضع وقطع اور آداب شریعت سے ملتے جلتے تھے، بربری قبائل اصل میں عرب ہی تھے۔ جو حمیری اور سبائی تھے، اور اپنی بعض روایات کو ابھی تک نہ بھولے تھے، موسیٰ نے اُن میں قومی رشتہ کی یاد تازہ کی تو وہ بہت جلد اپنی وحشت بھول گئے، اور بطیب خاطر مسلمان ہو گئے۔
اس لشکر جرار کے ساتھ موسیٰ کا حوصلہ بڑھ گیا،
موسیٰ کو اچھی طرح معلوم تھا، کہ جب تک ایک مضبوط بحری بیڑہ اس کے پاس نہ ہوگا۔ رومی بحری حملوں سے شمالی افریقیہ کے مقبوضات محفوظ نہیں ہیں، شام اور مصر کی بندرگاہوں میں بحری کشتیاں موجود تھیں، اس نے ۸۲ھ مطابق ۷۰۳ء "طونس" کی بندرگاہ بھی تعمیر کی اور بحری بیڑہ بھی تیار کر لیا، امیر مصر عبد العزیز نے بھی ایک بیڑہ بھیج دیا، جس کا افسر عطا ابن رفیع تھا، موسم موافق نہ تھا۔ مگر عطا نے موسیٰ کے مشورہ کے خلاف جزائر بحیرہ روم کا رُخ کیا، ایک جزیرہ پر جس کو "لینوسا" کہتے ہیں، قبضہ بھی کیا، اس کو مورخین عرب "سلسلہ" سے موسوم کرتے ہیں، واپسی پر یہ بیڑہ باد مخالف کے تھپیڑوں سے ساحل افریقیہ کے پہاڑوں سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا موسیٰ نے اپنے بیٹے عبد العزیز کو سواروں کے ساتھ مدد کے لئے روانہ کیا۔ جو ملاح یا جہاز بچ گئے

وہ بندرگاہ "طیونس" میں لائے گئے، اور ان کی مرمت کی گئی ۸۵ھ میں موسیٰ نے ایک بحری مہم تیار کی، ایک ہزار شریف اور جنگجو آدمیوں کا انتخاب کیا، اس لئے اس کو "محاربۃ الامرا" کہتے ہیں، اس بیڑہ کو اپنے بیٹے عبد العلا کے ماتحت جزیرہ صقیلہ کی طرف روانہ کیا، یہ مہم کامیاب رہی، اسی اثنا میں عبد الملک کا انتقال ہو گیا، اور ۸۶ھ میں اس کا بیٹا ولید جانشین ہوا، ولید کی عمر اس وقت اڑتیس سال تھی، قد لمبا، جسیم اور سانولی رنگت تھی، اور چہرہ پر چیچک کے داغ بھی تھے، اس پر بھی وجیہہ تھا۔ بنو امیہ اور عباسیہ کا کیا مذکور ہے، تاریخ کے صفحات پر آج تک کسی بادشاہ میں اس کا نظیر نہیں ملتا۔ اسی کے عہد میں محمد بن قاسم بن محمد بن ابی بکر ساکن طائف نے جو حجاج والئے عراق کے ماتحت تھا، وادی سندھ کو حدود خلافت میں لے لیا، مناسب مقام پر ان واقعات کا ذکر کیا جائے گا۔

موسیٰ کے بیٹے عبد العلا نے جزائر صقلیہ کے جنوبی حصہ اور سارڈینیا جس کو "سردانیہ" لکھتے ہیں، پر بحری بیڑہ کے ساتھ حملہ کیا، دوسرا بیٹا عبد العزیز "جبل اطلس" کے انتہائی مغرب تک پہنچ گیا، رفتہ رفتہ خلافت اسلامیہ تمام المغرب پر راس تن "بحر اوقیانوس" تک چھا گئی۔ صرف ایک قطعہ باقی رہ گیا جس کو "تیوطہ" عربی مؤرخین اور یورپی (Ceuta) کہتے ہیں: یہ گاتھ کے بادشاہ "راڈرک" (Roderick) کی طرف سے کاؤنٹ جولین (Count Julian) کے ماتحت تھا جس کی حکومت میں بحیرہ روم کے غربی جزائر بھی شامل تھے، کہتے ہیں کہ "جولین" بادشاہ سے اپنی دختر کا بدلہ لینا چاہتا تھا جس کی عصمت دری بادشاہ کر چکا تھا، اس لئے موسیٰ کو ہسپانیہ پر حملہ کی ترغیب دی۔ اور وعدہ کیا کہ خود بھی ہر ممکن مدد دے گا، اس کے علاوہ راڈرک کی چیرہ دستی سے رعایا بھی نالاں تھی امراء تو محلات میں داد عیش دے رہے تھے۔ کاشتکاری غلاموں کے ہاتھ میں تھی جو مویشیوں کی سی زندگی بسر کر رہے تھے، یہود کثرت سے ہسپانیہ میں آباد تھے۔ ان پر مسیحی پادری انتہائی ظلم کر رہے تھے، انہوں نے بغاوت بھی کی مگر کامیاب نہ ہوئے ادھر موسیٰ کے تحت رعایا خوشحال اور بالخصوص یہود مرفہ الحال تھے، اور اپنے ہسپانوی یہودیوں کی

کے دور میں ہسپانیہ

ال زار کی خبریں سنکر بے قرار تھے، موسیٰ کو ہم
ر موسیٰ بڑا محتاط آدمی تھا، اس نے اپنے ماتحت طار
چھ سپاہ کے ساتھ کونٹ جولین کی رہنمائی میں ان
ن کے گوش گزار کاؤنٹ اور یہودی کر چکے تھے، کہ
کے کنارے پر اترا اور کچھ غارت گری کی۔ اور مال غنیم
لی کہ اگر ہسپانیہ پر حملہ کیا جائے تو بسہولیت مسخر ہو سکتا ہے۔

موسیٰ نے خلیفہ ولید سے اجازت طلب کی، خلیفہ ولید نے یہ معاملہ شوریٰ میں پیش کیا۔ علماء اسلام نے کہا کہ آنحضرت کی ایک حدیث ہے کہ "دین اسلام کا اجراء انتہائی مغرب تک ہوگا" خلیفہ ولید اس شرف کے حصول کے لئے بیقرار ہوگیا۔ اور موسیٰ کو پورا اختیار دے دیا کہ جہاد فی سبیل اللہ میں جان و مال سے دریغ نہ کرنا،

۹۲ھ مطابق ۷۱۱ء طارق تیس ہزار کی جمعیت سے اس جگہ اترا جو آج تک اس کے کارنامہ اور نام کی یاد میں جبل الطارق کے نام سے موسوم ہے۔ پہلا کام طارق نے یہ کیا کہ اپنے جہازوں کو آگ لگا دی، اور سپاہ کی مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اب یہی میدان یہی چوگان ہے۔ جان بچا کر تم واپس نہیں ہو سکتے، آگے بڑھو۔ مارا یا مرے، راڈرک لاؤ لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے آیا اور مارا گیا، اس عرصہ میں موسیٰ نے اور کمک روانہ کی، طارق نے دارالسلطنت قرطبہ (Cordova) پر قبضہ کرلیا، یہ واقعہ ۹۲ھ مطابق ۷۱۱ء کا ہے، طارق نے اپنی فوج کو چار حصوں میں تقسیم کرکے ہسپانیہ کے چاروں طرف پھیلا دیا، شہر کے بعد شہر یا بندر یا بذریعہ صلح مسخر ہوتا گیا، اس اثناء میں خود موسیٰ بھی ہسپانیہ میں آگیا، اس کے ساتھ رسول کریمؐ کے اصحاب کی اولادیں سے واجب الاحترام اکثر لوگ بھی تھے، دو سال کے عرصہ میں تمام ہسپانیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔ مسیحی پادری تو روم میں پناہ گزین ہوئے، پرتگال بھی چند سال بعد فتوحات میں شامل ہوگیا، طارق کو انتظام مملکت کے لئے پیچھے چھوڑ کر خود موسیٰ فرانس کی طرف بڑھا۔ موسیٰ کا ارادہ تھا کہ تمام یورپ پر خلافت اسلامیہ کا تسلط جما دے۔ مگر تقدیر

شخص گھر میں داخل ہونا چاہتا تو دہلیز پر قدم رکھتے ہی ٹخنوں تک کیچڑ میں آ رہتا
اس وقت خلفاء کے اصطبل جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کے بادشاہوں کے محلات
بدرجہا بہتر تھے۔ امراء و وزراء کے قصروں کی شان واقع ہسپانیہ کون بتا سکتا ہے

تاریخ اس واقعہ کا اعادہ ہمیشہ کرتی رہتی ہے کہ جب کوئی سلطنت ختم ہوتی
تو اس کے ختم کرنے والے اس سلطنت کے امراء وزراء و والی اور عامل ہوتے ہیں جب
ایک جسم کے اعضاء دماغ کی حکومت تسلیم نہ کریں تو تمام نظام حیات درہم برہم
ہو جاتا ہے جب سلطنت کی اندرونی تقسیم کے بعد طوائف الملوکی ہو تو اس سلطنت
کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور تھوڑے عرصہ بعد طوائف الملوکی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اموی خلافت اسلامیہ کے اختتام پر طوائف الملوکی ۴۱۸ھ مطابق ۱۰۳۱ء
سے ۶۱۱ھ مطابق ۱۲۳۰ء دو سو سال رہی، یہ طوائف الملوک اس عرصہ میں آپس میں
لڑتے بھڑتے رہے آخر چار طوائف الملوک رہ گئے، ان میں سے محمد بن عباد سویلی
(Sevilla) کا یحییٰ (بنو ذوالنون) تولیدو (Toledo) کا مستعین (بنو حمود)
سارا گوسہ (Saragossa) عمر ملقب بالمتوکل کا پرتگال پر قبضہ تھا، اگر یہ خود سر
بادشاہ اسی پر قناعت کرتے اور متحد رہتے تو ہسپانیہ میں مسلمان وہ روز بد نہ دیکھتے
جس کی کیفیت مورخین نے مفصل لکھی ہے۔

بحر الشام (بحیرہ روم) کے چند جزائر پر مجاہد بن عبد اللہ العامری ملقب
ابو الجیوش قابض تھا، اس کے پاس ایک مضبوط بحری بیڑہ تھا، اور فرانس اور اطالیہ
کے ساحلوں پر عموماً لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم رکھتا، مورخین یورپ ڈوزی (Dozy)
وغیرہ اس کو ان ایام کا سب سے بڑا بحری قزاق کہتے ہیں،

یہ طوائف الملوک آخر اموی خلافت کے فیض یافتہ تھے، ان کے دور دورہ میں
علم و حکمت کی اشاعت بھی ویسی بلکہ بڑھ چڑھ کر ہوتی رہی، ان میں سے بعض خود بھی
بلند پایہ ادیب اور خطیب تھے۔ محمد بن عباد ملقب ابو القاسم سویلی میں قاضی القضاۃ
تھا پھر سلطنت پر قابض ہو گیا، اس کی اولاد میں آخری بادشاہ سویلی معتمد شاعر بھی

منظفر بن افتاس نے ایک تاریخ "کتاب المظفری" پچاس جلدوں میں لکھی، یہ "بدجوز" (Badajoz) کا بادشاہ تھا،

ان طوائف الملوک میں سے "بنو حمود" قابل ذکر ہیں۔ اس لئے کہ ان کے مورث اعلیٰ ادریس کا ذکر ہم مناسب مقام پر کریں گے۔ جو مراکو کا بادشاہ تھا، حمود ابن میمون ابن احمد ابن علی ابن عبیداللہ ابن عمر ابن ادریس افریقہ سے بھاگ کر ہسپانیہ میں آیا، اموی خلیفہ ہشام ثانی نے اُسے فوج کا ایک افسر مقرر کر دیا، اس کی اولاد میں سے یحییٰ بن علی بن حمود اور قاسم بن حمود نے سویلی پر حکومت ۴۱۴ھ مطابق ۱۰۲۳ء تک کی۔

یہ طوائف الملوک نہ صرف باہمی جنگ و جدل میں مصروف تھے بلکہ ایک دوسرے کی بیخ کنی کے لئے مسیحی ہمسایہ بادشاہوں کی امداد کے بھی طالب ہوئے ۱۰۵۵ء میں فرڈی ننڈ اول (Ferdenand I) نے اچانک حملہ کر دیا، اور بعض اہم مقامات سے ان کو بے دخل کر دیا، معتضد شاہ سویلی نے اطاعت اور باجگذاری پر خلاصی حاصل کی۔ معتضد ۱۰۶۸ء میں فوت ہوا، اس کا بیٹا معتمد جانشین ہوا، فرڈی ننڈ مرگیا تو اس کا بیٹا الفنسو ششم (Alfanso VI) نے یورپ کے مختلف ممالک سے سپاہی بھرتی کرنے شروع کئے، اور ایک لشکر جرار کے ساتھ ان طوائف الملوک پر چڑھ آیا، بنو ذوالنون کو نیچا دکھایا اور ٹولیڈو لے لیا، عالم یاس میں مسلمانوں کی نگاہیں سمندر پار افریقہ میں کسی کی تلاش میں پھرنے لگیں، یوسف تاشفین کی خدمت میں علماء کا ایک وفد حاضر ہوا۔ اور ہسپانیہ میں آنے کی دعوت دی، اس نامور شخص کے حالات بالاختصار ہم بیان کرتے ہیں،

مرابطین گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں حاجی یحییٰ بن ابراہیم جو مکہ معظمہ میں تحصیل علم الہیات اور شریعت کر چکا تھا اور اس کا دوست اور استاد عبداللہ بن یٰسین دونو مراکو میں وارد ہوئے، غرض یہ تھی کہ جاہل مسلمانوں کو علم دین کی تعلیم بھی دیں اور عیش پرست امراء کو راہ راست پر لائیں،

اس مقام پر مناسب ہے کہ ہم ایک خاص بات جو تاریخ اسلام میں نمایاں ہے، بیان کریں۔ اقوام عالم کی قومیت نسلی اور لسانی اور الوانی امتیازات پر قائم ہے۔ لیکن مسلمانوں میں یہ امتیاز نہیں۔ خواہ وہ کسی ملک یا قوم سے ہوں۔ ان میں واحد رشتہ اخوتِ اسلام ہے۔

قرآن میں بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ قبائل اور شعوب کی تقسیم انسانی فطری ہے۔ اللہ کے ہاں معیارِ عزت صرف تقوٰی ہے۔ اس لئے ہر ایک شخص متقی مسلمانوں میں بھی واجب الاحترام سمجھا جاتا ہے، تقوٰی کا حال تو اللہ کو معلوم ہے لیکن بقول شیخ سعدیؒ

ہر کرا جامہ پارسا بینی ۔۔۔ پارسادان و نیک مرد انگار

تاریخ اسلام میں اکثر اہلِ ہوا و ہوس جب بھی جامہ پارسائی پہن کر سامنے آئے۔ ایک کثیر جماعت کے قائد بن گئے، اور اگر حالات سازگار ہوئے تو تخت و تاج کے مالک بھی ہو گئے، تاریخ اسلام میں یہ بات خاص ہے جس کی نظیر کسی اور جماعت میں نہیں ملتی، دوسری قوموں میں راہب اور سادھو اور تپسوی ضرور واجب الاحترام ہیں اور ترکِ دنیا سے زیادہ سے زیادہ دنیا کماتے ہیں، لیکن شاہی کے درجہ پر فائز المرام ہو، یا کم از کم اپنی اپنی حکومت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر جمانا چکنی چپڑی اور ابلہ فریب باتوں سے اور اس سہولت سے صرف مسلمان میں دیکھا گیا ہے

"زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند ۔۔۔ حق را بسجودے و نبی را بدرودے"

اسی قماش کے یہ لوگ عبداللہ اور یحیٰی تھے، ایسے لوگ عموماً بے روزگار ہوتے ہیں ان کا روزگار صرف دین فروشی ہوتا ہے۔ ان دونوں میں گہرا ربط تھا، اس لئے "مرابطین" کہلائے لیکن سید امیر علی اپنی "ہسٹری" میں لکھتے ہیں کہ الفاظ "مرابط" اور "مربوط" اور "رابط" اور "ربط" سب ایک ہی لفظ کے مشتقات ہیں، اور "مرابط" جو ان حضرات کا لقب ہے جمع "مربوط" ہے، اور "الجیریا" میں یہ لفظ بہ معنی مقدس شخصیت عام استعمال ہوتا ہے۔ بہر حال عبداللہ اور اس کے دوست علم دین کے عالم بھی تھے اور بظاہر تقدس

کے آثار بھی ان میں پائے جاتے تھے،

عبداللہ بسہولت مراکو کا بادشاہ ہوگیا، اس کے بعد ابوبکر اس کا خلیفہ ہوا، اس کے چچا کے لڑکے یوسف تاشقین نے سلطنت کو اور وسعت دی خلیفہ بغداد نے امیرالمومنین کا لقب اور سند امارت عطا فرمائی، ان ایام میں عقیدہ تھا، کہ خلافت کا حق صرف اہل قریش کا ہے، اس لئے جب تک دربار خلافت عباسیہ سے جو اس گئے گزرے زمانہ میں بھی دینی حکومت کے مالک تھے سند امارت حاصل نہ ہو کوئی شخص اپنے آپ کو عنداللہ وعندالناس نہ امیر سمجھتا تھا اور نہ ہو سکتا تھا، سلطان محمود غزنوی کو "امین الملت یمین الدولہ" کا خطاب ملا مغلیہ شاہنشاہوں کو اکبر سے لے کر شاہجہان تک تو دین سے چنداں واسطہ نہ تھا لیکن شہنشاہ غازی دین پناہ عالمگیر کو یہ سند حاصل کئے بغیر چین نہ آیا،

امیرالمسلمین یوسف تاشقین نے سعادت دارین حاصل کرنے کے لئے مومن بھائیوں کی مدد کے لئے تیاری کی اور ۴۸۶ھ میں آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے "الفنسو" کی فوج سے "باداجوز" کے قریب گرم جوشی سے ملاقات کی، اور شکست فاش دی۔ اب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور تھوڑے عرصہ میں یوسف نے ہسپانیہ پر تسلط جما لیا، اب برادران مہربان طوائف الملوک کی باری آئی، ان کو بھی اپنا زیر بار کر لیا، یوسف کی اولاد میں سلطنت ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء تک رہی، آخری بادشاہ ابو اسحاق بن تاشقین بن علی بن یوسف چند روز ہی حکومت کرنے پایا تھا کہ ایک اور حریف افریقہ میں نمودار ہوا، اس نے مرابطین کی امارت کا خاتمہ کر دیا،

فرقہ مہدیہ

حضرت علیؓ کی اولاد جو حضرت فاطمہ کے بطن سے تھی بنی فاطمہ اور دیگر ازواج کی اولاد علوی کہلائی، ایک شخص علوی محمد بن عبداللہ بن تومرت مغربی افریقہ کے شہر سوس کا باشندہ تھا، جوانی میں تحصیل علم کا شوق اسے اکثر علمائے اسلام کی صحبت میں لے گیا، امام محمد الغزالی وغیرہ سے علم دین سیکھا اور فارغ التحصیل ہو کر وطن کی طرف مراجعت کی، عیش پرست علماء کے خلاف

وعظ کرتا رہا۔ اور اُن جہلا کے خلاف جو اولیاء اللہ کی قبور کا بھی احترام کرتے ہیں ایک تحریک شروع کی جس نے اس کے متبعین کو "موحدین" کے امتیازی لقب سے سرفراز کیا۔ اس کے عقائد ہمارے زمانہ کے فرقہ وہابیہ یا اہل حدیث سے بہت ملتے جلتے ہیں یہ شخص احادیث کا بہت بڑا عالم تھا، اسے خوب سوجھی، دعوئے کیا کہ احادیث میں جس مہدی کے ظہور کے متعلق پیش گوئی ہے وہ میں ہوں، مہدی کا انتظار تو ہمیشہ رہا ہے مدعیان مہدویت پہلے بھی ہوئے اور بعد میں بھی، اور غالباً یہ سلسلہ تاجہاں باقی ہست جاری رہے گا۔

بربری اقوام کا ہجوم اس کے گرد ہوگیا، اس کا پہلا مقابلہ "مرابطین" سے ہوا جب تک علی یوسف زندہ رہا کامیاب نہ ہوا، اس کی وفات کے بعد اس نے مرابطین کی حکومت کا خاتمہ کر دیا، اور خود مراقش پر قابض ہوگیا معلوم ہوتا ہے یہ خواہ غلطی خوردہ ہو مگر نیت نیک تھی، اس نے ایک متمول تاجر کے لڑکے عبد المومن نامی کو سپہ سالار اور جانشین نامزد کیا، ادھر مسلمانوں میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک رہی تھی، ادھر ہسپانیہ میں مسیحی بادشاہوں کی بن آئی، الفنسو ہفتم بھی اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا، اور ہسپانیہ کے مسلمانوں کو پھر اسی مصیبت کا سامنا ہوا۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا، اب مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ اور عبد المومن سے مومن بھائیوں کی مدد کی درخواست کی، ۵۵۱ھ مطابق ۱۱۵۷ء عبد المومن نے بحری اور خشکی کے راستوں سے فوج بھیجی اور نہ صرف مسیحی لشکر کو شکست فاش دی بلکہ مرابطین کے عاملوں کو بھی برطرف کر دیا، جو اب خود مختار امیر بن بیٹھے تھے اور ان کی جگہ اپنے بیٹوں کو والی مقرر کیا، اور لقب "امیر المومنین" بھی اختیار کیا،

ان ایام میں شہر "مہدیہ" پہ فرانسیسیوں کا قبضہ تھا، یہ شہر جس کو عبید اللہ المہدی نے ۳۰۳ھ میں تعمیر کیا تھا، بنو فاطمہ کا دار الخلافت رہا۔ اس کا ذکر ہم خلافت بنو فاطمہ کے تحت کریں گے، عبد المومن نے فرنگیوں کو یہاں سے نکال دیا، اور خود قابض ہوگیا۔ اس کی حکومت بارقہ سے بحر اوقیانوس تک تھی کہ ۱۱۶۳ء میں اس کا انتقال ہوگیا ہسپانیہ میں

عبدالمومن کے بعد اس کا بیٹا ابو محمد عبداللہ تختِ خلافت پر بیٹھا مگر امراء نے نالائق سمجھ کر معزول کیا، اور اس کے بھائی ابو یوسف یعقوب کو ہسپانیہ کی حکومت پیش کی، الفنسو ہنم نے تمام یورپ سے لشکر فراہم کیا، اور اندلس پر دھاوا بول دیا، یعقوب افریقہ سے اُٹھا اور قرطبہ کے شمال میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ ایک خونریز جنگ کے بعد جس میں یورپ کے ایک لاکھ چھیالیس ہزار جوان کھیت رہے مسلمانوں کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی، الفنسو ٹولیڈو میں محصور ہوگیا۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ جب محصورین کے پاس سامان رسد ختم ہوگیا تو الفنسو کی والدہ اس کی بیٹیوں کو ساتھ لئے باچشم پُرآب یعقوب کے پاس آئی اور رحم کی درخواست کی یعقوب نے محاصرہ اُٹھا دیا، اور اس کی والدہ اور لڑکیوں کو زیورات اور جواہرات دے کر رخصت کیا،

ایسے واقعات تاریخ اسلام میں بہت دفعہ رونما ہوئے اگر ان کا مقابلہ ان سفاکانہ غارت گری اور بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کے قتل عام سے کیا جائے جو غیر مسلم اقوام خصوصاً مسیحی بادشاہوں نے فتح وظفر کے نشہ میں روا رکھا تو ہر ایک محقق مؤرخ یہی کہے گا کہ اسلام کی عظیم الشان فتح ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اس کا دامن نہیں چھوڑا۔ اگرچہ اُن کو ایک عظیم الشان سلطنت سے دست بردار ہونا پڑا۔ کفار مکہ نے جو کچھ سلوک آنحضرت اور آپ کے اصحاب سے کیا اس کی پاداش میں ان کی توقع کے خلاف آنحضرت نے اُن کا جرم فتح مکہ پر معاف کر دیا، مسلمان اس سنتِ رسول اللہ پر ہمیشہ عمل کرتے رہے، یعقوب سلطان صلاح الدین ایوبی کا ہمعصر تھا، جس کا ذکر "حروب صلیبیہ" کے ماتحت کیا جائے گا،

گبن لکھتا ہے کہ جب اہلِ صلیب نے یروشلم بجبر دتہر لے لیا، اور مسیحی دیندار بادشاہ شہر میں داخل ہوا۔ تو اس کا گھوڑا گھٹنوں تک خون میں ڈوبا ہوا تھا، امن پسند شہریوں کی بے گور وکفن لاشوں کا انبار لگا ہوا تھا ان کو روندتا ہوا گوڈ فری (Godfrey) سلامتی کے شہزادہ حضرت مسیح کے مقبرہ کی زیارت کے لئے آیا۔

صلاح الدین کو جب ان حالات کی اطلاع ہوئی تو آنکھوں میں خون اتر آیا قسم کھائی کہ میں بھی عیسائیوں کے ساتھ یہی کچھ سلوک کرنگا، لیکن جب یروشلم میں داخل ہوا تو ایک عیسائی بڑھیا عورت گھوڑے کی ٹانگ سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے رحم کی التجا کی، اور آنکھیں جو کچھ عرصہ پہلے خون آلود تھیں اب پُر آب ہو گئیں۔ سلطان نے اعلان کر دیا کہ مسیحی کی جان ومال کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ آج ہم وہ عظمت کھو چکے ہیں جو خلافت کے تحت ہمیں حاصل تھی، اور مسیحی یورپ اور امریکہ کو اسلام وہ خطرہ نظر آتا ہے جس سے ان کو ایام جاہلیت میں دوچار ہونا پڑا۔ اس لئے ہر ممکن کوشش ان کا سیاسی تدبر کرتا رہا اور کر رہا ہے کہ مسلمان اسلام سے بیگانہ ہوں، ان کو اس میں کافی کامیابی بھی ہوئی ہے، لیکن بحیثیت مسلمان ہی نہیں بلکہ بلحاظ مورخ ہم یقین کرتے ہیں کہ وہ وقت دور نہیں کہ اسلام ان کو اسی طرح مسخر کرے گا جس طرح ہلاکو کے پوتے کو کیا۔ اس موضوع پر ہم کتاب کے اخیر میں مزید بحث کریں گے۔

یعقوب کے عہد خلافت میں علم وحکمت کی اشاعت اتنی عام ہوئی کہ جو مسیحی طالب علم یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر جاتے اپنے ہم وطنوں کو اس جہالت کی تاریکی نکالنے کی کوشش کرتے جس میں پوپ اور اس کے پادریوں نے دھکیل رکھا تھا۔ اور نکلنے کی اجازت نہ دیتے تھے، مسیحی پادری یہ سمجھتے تھے کہ اہل اسلام نے ہسپانیہ میں الحاد کے مدرسے کھول رکھے ہیں۔ "لوتھر" جس کو بارگاہ تقدس مآب پوپ سے "سگ محمد" کا خطاب عطا ہوا۔ اس مارٹن لوتھر (Martin Luther) سے عرصہ پیشتر اصلاح (Reformation) کا سنگ بنیاد پڑ چکا تھا۔

قاضی ابن رشد اور ابن ماجہ وغیرہم جیسے بلند پایہ حکماء اسی دور موحدین میں گذرے ہیں۔ تاریخ فلسفہ ڈاکٹر فریڈرک ریوبرگ (جلد اول صفحہ ۴۰۵، ۴۱۷) میں حکماء اسلام اور ان کی کتب کا اگرچہ تذکرہ مختصر ہے مگر کافی ہے، علامہ ابن الندیم کی کتاب الفہرست میں جن کتابوں کے نام لکھے ہیں ان میں سے اکثر مسیحی تعصب نے نذر آتش کر دیں، جو بچیں وہ یورپ کے مختلف ممالک کے مشہور کتب خانوں میں ملیں گی۔ بعض کا ترجمہ بھی

چکا ہے۔ چودھویں صدی کے آغاز میں اطالیہ کا شمالی حصّہ بالخصوص پیڈوا (Padua) اور وینس (Venice) یورپ کے علمی مرکز تھے، مارسلیس فینس (Maraetius Facenuo) لکھتا ہے کہ:

"تمام دنیا یا تو ابن رشد کی مقلد ہے یا اسکندر کی (Alexcandra Aphrodisias) دونوں عیسائیت کی بیخ کنی کر رہے ہیں"!

لیکن سترھویں صدی کے اختتام تک ابن رشد کے فلسفہ کو وہ غلبہ حاصل رہا پیڈوا کے مدرسوں میں اسکندری فلسفہ کو کوئی پوچھنے والا نہ رہا، اور تمام معقول پسند حضرات (Rationalists) کی یہی کوشش رہی کہ عیسائیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے، علم و حکمت مسیحی تعصب سے آزاد تو ہو چکے تھے مگر سیاسی مصلحت نے ابھی تک مسیحیت کے نام کو برقرار رکھا ہے،

۱۱۹۹ء میں یعقوب کا انتقال ہوگیا، عبدالرحمٰن ثالث الناصر الدین الدباپ کا جانشین ہوا، یعقوب کی وفات پر پھر مسیحی دنیا میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا، پوپ انوسنٹ ثالث (Innocent III) نے فتویٰ جہاد (Crusade) صادر کیا۔ ٹولیڈو کا اسقفِ اعظم (Rodenegues) اس مقدس مذہبی جنگ کا روح رواں تھا فرانس اور اٹلی اور جرمنی سے ایک سیلاب امڈ کر اندلس میں آگیا، حسب معمول قتل و غارت کا بازار گرم رہا مسلمانوں نے شکست کھائی، اور الناصر بھاگ کر مراکو میں آگیا۔ جہاں ۱۲۱۴ء میں مرگیا، اس کا بیٹا یوسف المستنصر باللہ جانشین ہوا، اس کا انتقال بھی ۱۲۲۳ء میں ہوگیا، اس کی جگہ سید ابو محمد عبدالوحید نے عنانِ حکومت سنبھالی تمام امراء موحدین اپنے آپ کو "سید" کہتے، یورپ کی زبانوں میں لفظ "Cid" یہی ہے جس کا مفہوم آخر میں اتنا بدل گیا، کہ ڈاکو کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

عبدالوحید ایک سازش کا شکار ہوا، تو یعقوب کا ایک بیٹا العادل تخت نشین ہوا ۱۲۲۷ء میں بغاوت برپا ہوئی اور العادل مارا گیا، اس کا بھائی "ادریس" خلیفہ ہوا جس نے لقب "المامون" اختیار کیا ۱۲۲۸ء میں وہ افریقہ کا دورہ کر رہا تھا۔ اس کی

عدم موجودگی میں محمد ابن یوسف ابن ہود نے حکومت غصب کر لی، اور موحدین حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

"خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود"

ابن ہود کے علاوہ اور بھی امیر اندلس کے مختلف حصوں میں خود مختار حکمران تھے، ان میں محمد بن یوسف ملقب ابن الاحمر نے قرطبہ کے نواح میں اپنا دارالخلافت قائم کر لیا، دو سو سال اس کے خاندان نے عربی تہذیب و تمدن و علم و حکمت کو زندہ رکھا۔ اس دور دورہ میں ابن خلدون غرناطہ میں رہائش رکھتا تھا، اس کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ "الاحمر" قبیلہ خزرج سے تھا، جو آنحضرت کے زمانہ میں اپنے حریف قبیلہ "اوس" کے ساتھ سر بر آوردہ تھا، یہ لوگ سعد بن عبادہ کی اولاد سے تھے۔ اور اپنے آپ کو انصاری کہتے، اموی خلافت کے دور دورہ میں یہ لوگ "بنو نصر" کہلاتے ہسپانیہ میں رہائش اختیار کر چکے تھے، اور اعلیٰ منصب پر بھی ممتاز تھے۔

ابن ہود اور ابن الاحمر دو حریف سلطان تھے، ابن الاحمر نے فرڈی ننڈ ثالث (Furdinand III) سے مدد کی درخواست کی، ادھر ابن ہود نے بھی یہی التجا کی اور تیس قصر پیش کش کئے، ابن الاحمر غالب آیا اور غرناطہ کو اپنا دارالحکومت بنا کر "الغالب باللہ" اپنا لقب اختیار کیا۔

یہی وہ شخص ہے جس نے "الحمرا" تعمیر کیا، اسی بادشاہ فرڈی ننڈ سے کئی دفعہ معرکہ آرائی ہوئی، اور الاحمر کامیاب رہا، ۱۲۰۲ء میں تیس سال شاندار حکومت کے بعد فوت ہوا، اس کا بیٹا جانشین ہوا، ۱۳۰۷ء میں اس کے بھائی نصر نے اسے معزول کر کے خود تخت و تاج پر قبضہ کر لیا، اسے بھی ابو الولید ابن فرح بن اسمٰعیل نے برطرف کر دیا، اسمٰعیل الاحمر کا بھائی تھا، ۱۳۱۹ء میں ایک لشکر جرار قسطلان (Castile) کے بادشاہ فرڈی ننڈ نے غرناطہ کو مسخر کرنے کے لئے روانہ کیا، اس لشکر میں اہل صلیب پچیس ۲۵ شہزادوں نے شمولیت کی، انگلینڈ کا ایک شہزادہ بھی اپنی فوج کے ساتھ شامل ہوا، بادشاہ کا لڑکا پیڈرو (Pedro) سپہ سالار تھا۔ سب بہادری

لڑے مگر میدان میں کھیت رہے،

۱۳۲۵ء میں اسمٰعیل اور اس کا بیٹا اور جانشین ۱۳۳۳ء اور اس کا بھائی ابوالحجاج یوسف ۱۳۵۴ء میں یکے بعد دیگرے سازشیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ یوسف کا بیٹا محمد الغنی باللہ تخت نشین ہوا، اس کا وزیر ابن الخطیب تھا جس کی کتاب "تاریخ دولتہ النصریہ" مشہور ہے۔ یہ ابن خلدون کا ہمعصر تھا۔

ہم واقعات سے جو زیادہ تر بادشاہوں کے ردّ وبدل اور اندرونی بغاوت اور مسیحی شاہ فرانس کے متواتر حملوں پر مشتمل ہیں طول دینا نہیں چاہتے، ابوعبداللہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کا آخری بادشاہ ہے، افواج کا سپہ سالار موسیٰ نامی تھا، جب "فرڈی نند" نے فوج کشی کی تو موسیٰ نے مسلمانوں کو بہت اُبھارا، مگر یہ وہ مسلمان نہ تھے جو اسی کے ہمنام کے تحت پہلی دفعہ ہسپانیہ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دورِ خلافت میں داخل ہوئے تھے، فرڈی نند نے غرناطہ لے لیا، فلپ ثالث کے عہد تک مسلمانوں کا نام ونشان ہسپانیہ میں نہ رہا۔ یہ یا تو مسیحی مذہب قبول کرنے پر مجبور ہوئے یا جلا وطن ہوئے۔ خود یورپ کے مورخین جو کچھ ظلم وستم مسیحی حکمرانوں نے مسلمانوں پر ڈھایا بیان کرتے ہوئے ان پر لعنت بھیج رہے ہیں۔

خلافت بنی فاطمہؓ

شجرہ نسب خاندانِ ادریسیہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

- حسن اول
  - حسن مثنیٰ
    - عبداللہ
      - محمد النفس الذکیہ
      - ابراہیم
      - (۱) ادریس (د سنہ ۱۷۵ھ ۷۸۵ء)
        - (۲) ادریس ثانی المعروف اصغر (د سنہ ۱۹۵ھ)
          - (۳) محمد (د سنہ ۲۱۳ھ)
            - (۴) علی (د سنہ ۲۲۱ھ)
            - (۵) یحییٰ اول (د سنہ ۲۳۴ھ)
              - (۶) یحییٰ ثانی (د سنہ ۲۶۲ھ)
            - عمر
              - عبیداللہ
                - (۷) علی
                  - احمد
                    - میموں
                      - حمود (ہسپانیہ میں سلطنت قائم کی)
            - قاسم
              - (۸) یحییٰ ثالث (د سنہ ۳۰۹ھ)
- حسین

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں بنی فاطمہ میں سے محمد النفس الذکیہ اور آپ کے بھائی ابراہیم نے ارض حجاز اور بصرہ سے خروج کیا دونوں لڑائی میں کام آئے، اس کے بعد بنو فاطمہ پر کڑی نگرانی شروع ہو گئی۔ خلیفہ ہادی بن مہدی بن منصور کے عہد میں مدینہ میں کچھ شورش برپا ہوئی اس میں بھی بعض فاطمی قتل ہوئے، محمد النفس الذکیہ کا ایک بھائی ادریس بھاگ کر مراکو میں پناہ گزین ہوا۔ یہ ملک خلافت عباسیہ سے باہر تھا، یہاں بربری اقوام آباد تھیں۔ انہی کی مدد سے اس نے خاندان ادریسیہ میں خلافت قائم کرلی، شہر "فیض" اسی کا بسایا ہوا ہے، جس کو عرب "فاس" کہتے ہیں۔ اور اسی مقام کو اس نے دارالخلافت قرار دیا۔ اس کے عہد خلافت میں "فیض" میں اکثر علماء دین گزرے ہیں، اس کے بعد اس کا بیٹا ادریس ثانی جانشین ہوا۔ اس کی والدہ اور وزیر غالب اس کی بلوغت تک سلطنت کا کام خوش اسلوبی سے چلاتے رہے،

بالغ ہوا تو سلطنت کو وسعت دی دولت عباسیہ سوس سے پرے ہٹ گئی، اور یہاں تک ملک یحییٰ کے قبضہ میں آگیا، یحییٰ کے بعد اس کا بیٹا محمد خلیفہ ہوا۔ محمد اس کے بعد اس کا بیٹا علی جو نو سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اور تیرہ سال کی حکومت کے بعد لاولد مر گیا، اس کا جانشین اس کا بھائی یحییٰ بن محمد ہوا۔ شہر "فیض" کہ عہد ۴) ان ایام میں بہت پھیل گیا، اور سلطنت کی حدود بھی ہر طرف بڑھ گئیں، اس کا جانشین اس کا بیٹا یحییٰ ثانی ہوا۔ رعایا اس کی خود سری سے تنگ آ گئی تو شورش برپا کی، یحییٰ بھاگ کر ہسپانیہ میں چلا گیا، اور وہاں مر گیا، اس کے بعد علی بن عمر خلیفہ ہوا، خارجیوں نے اسے بھی ہسپانیہ کی راہ دکھائی، اس کے بعد یحییٰ ثالث بن قاسم نے عنانِ خلافت سنبھالی مگر ایک اور حریف طاقت نے خلافت ادریسیہ کا خاتمہ کر دیا یہ بھی بنی فاطمہ تھے، تخت و تاج سے محروم ہو کر اس نے زندگی کے ایام مہدیہ میں بسر کئے اور ۳۱۲ھ میں مر گیا،

خلافت بنی فاطمہؓ

شجرۂ نسب خاندانِ خلفاء اسماعیلیہ

ہاشم

|

عبدالمطلب

|

ابوطالب

|

علی رضؓ (سنہ ۳۵ھ / ۶۵۶ء)

حسن رضؓ (سنہ ۴۰ھ / ۶۶۰ء) — حسین رضؓ (سنہ ۵۰ھ / ۶۷۰ء)

حسین رضؓ

|

علی (زین العابدینؒ) (سنہ ۴۰ھ / ۶۶۹ء)

|

محمد الباقرؒ (سنہ ۹۴ھ / ۷۱۲ء)

اسمٰعیل رح
|
محمد المکتوم
|
جعفر مصدق
|
عبد الحبیب
|
(۱) عبید اللہ المہدی (د ۲۹۷ھ / ۹۰۹ء)
|
(۲) القائم ابو القاسم (د ۳۲۲ھ / ۹۳۴ء)
|
(۳) المنصور (د ۳۳۴ھ / ۹۴۵ء)
|
(۴) المعز الدین اللہ (د ۳۴۱ھ / ۹۵۲ء)
|
(۵) العزیز باللہ (د ۳۶۵ھ / ۹۷۵ء)
|
(۶) الحاکم بامر اللہ (د ۳۸۶ھ / ۹۹۶ء)
|
(۷) الظاہر لاعزاز دین اللہ (د ۴۱۱ھ / ۱۰۲۱ء)
|
(۸) المستنصر باللہ (د ۴۲۷ھ / ۱۰۳۵ء)

- (۹) المستعلی باللہ (د ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء)
  - (۱۰) الآمر باحکام اللہ (د ۴۹۵ھ / ۱۱۰۱ء)
- ابو القاسم احمد
  - (۱۱) الحافظ الدین اللہ (د ۵۲۴ھ / ۱۱۳۰ء)
    - (۱۲) الظافر بامر اللہ (د ۵۴۴ھ / ۱۱۴۹ء)
      - (۱۳) الفائز بنصر اللہ (د ۵۴۹ھ / ۱۱۵۴ء)
    - یوسف
      - (۱۴) العاضد الدین اللہ (د ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء)

موسیٰ کاظم (د ۱۸۳ھ / ۷۹۵ء)
|
علی رضا رح (د ۱۵۵ھ / ۷۹۹ء)
|
محمد تقی رح (د ۲۰۳ھ / ۸۱۸ء)
|
علی نقی رح (د ۲۲۰ھ / ۸۳۵ء)
|
حسن عسکری رح (د ۲۵۴ھ / ۸۶۸ء)
|
محمد المہدی (د ۲۶۰ھ / ۸۷۳ء)

ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب منصور عباسی کے مقابلہ میں محمد النفس الذکیہ اور آپ کے بھائی ابراہیم مارے گئے، اور بنو ہاشم دنیوی خلافت سے مایوس ہو کر دست بردار ہوگئے تو دینی خلافت جس کو "امامت" سے موسوم کیا گیا، ایسا منصب تھا جس پر کسی کا اجارہ نہ تھا، اس لئے یہی غنیمت سمجھی۔ حضرت امام جعفر صادق ۸۳ھ میں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابوبکر صدیق اکبر تھی ۱۴۸ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا، اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ آپ کے سات بیٹے اور تین لڑکیاں تھیں، ان میں سے اسمٰعیل اور موسیٰ کاظم کا تعلق خلافت اسلامیہ سے ہے۔ اسمٰعیل سب سے بڑا بیٹا تھا، جو امام جعفر صادق کی زندگی میں فوت ہو گیا، امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے بعد آپ کے متبعین میں دربارہ خلافتِ امامت اختلاف پیدا ہو گیا یہی لوگ بعد میں شیعان علی کہلائے، ایک فریق امامؑ کے بڑے لڑکے اسمٰعیل کے بیٹے محمد کے حق میں تھا، اور دوسرا موسیٰ کاظم کا طرفدار تھا، اور ان کی اکثریت غالب آئی یہی لوگ شیعہ اثنا عشری کہلائے، دوسرا فریق جو محمد بن اسمٰعیل کے حق میں تھا اپنے دعوے سے دست بردار نہ ہوا، وہ اپنے اماموں کو عبیداللہ المہدی تک "مکتوم" کے لقب سے مخاطب کرتے رہے، یعنی اس وقت تک ان کے ظہور کا وقت نہ آیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اثنا عشری اپنے بارھویں امام "محمد المہدی" کو "امام غائب" کہتے ہیں۔

روایت ہے کہ آپ کی عمر پانچ سال کی تھی، کہ امام حسن العسکری (عسکر دوسرا نام سر من رایا مخفف سامرا کا ہے) ۲۶۰ھ میں فوت ہوگئے، محمد المہدی سامرا کی ایک غار میں جا چھپے، ان ایام میں عباسی خلیفہ معتمد علی اللہ تھا، ابن خلدون لکھتا ہے کہ آج تک اثنا عشری (چودھویں صدی عیسوی تک) اس غار کے منہ پر جمع ہوتے ہیں اور امام غائب کو دعوتِ خروج دیتے ہیں۔ عقیدہ خروج مہدی مسلمانوں کے دل و دماغ پر اتنا قابض ہو چکا ہے، کہ تاریخ خلافت اسلامیہ میں کئی مہدی کچھ کامیاب اور کچھ ناکامیاب ہوئے مگر انتظار اس کا باقی ہے۔

عبیداللہ المہدی پہلا شخص ہے جس نے خلافت بنو فاطمہ جو اسماعلیہ کے نام سے

مشہور ہے، افریقہ میں قائم کی،

المہدی کے حسب نسب کے بارہ میں عباسی خلفاء مصر میں القاہر اور اس کے خواہوں نے یہ مشہور کیا کہ یہ شخص بنی فاطمہ سے ہی نہیں لیکن مقریزی ابن اثیر العذاری، ابن خلدون جیسے مورخین نے واضح کیا ہے کہ یہ عباسیوں کا ڈھونگ ہے اس حسب نسب صحیح ہے،

اسماعیلی فرقہ کے عقاید پر بھی دینی نقطہ نگاہ سے بحث آئمہ دین کرتے رہے اور کر رہے ہیں، لیکن ہم اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اور بحث بھی کر چکے ہیں کہ وہی سیاسی لیڈر مسلمانوں میں کامیاب ہو سکتا ہے جو جامہ پارسائی پہن کر سامنے آئے، خواہ وہ فاسق ہی کیوں نہ ہو، اور ایک برسر اقتدار شخص مردود ہو سکتا ہے اگر اس کے خلاف فسق و کفر کا ڈھونگ کھڑا کیا جائے، خواہ کتنا ہی متقی کیوں نہ ہو، یہ سیاسی حربہ بنو عباس، بنو امیہ اور بنو فاطمہ اسماعیلیہ کے خلاف استعمال ہوتا رہا اور اس کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا کہ آج تاریخی واقعات تسلیم کئے گئے ہیں،

سید امیر علی اپنی "ہسٹری" میں لکھتا ہے کہ اسماعیلیوں نے کچھ عرصہ بعد اپنے عقائد میں ایرانی حکیم "مانی" کے عقائد داخل کر لئے اور یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ان کا یہ عقیدہ کہ ایمان بلا عمل ہی نجات کے لئے کافی ہے اور یہ کہ آیات قرآن کا جیسا ظاہر ہے ویسا باطن بھی ہے، اور باطن اصل حقیقت ہے مانی کا مضمون سرقہ کیا ہوا ہے۔ اس لئے ان کو "باطنیہ" بھی کہتے ہیں، محمد الحبیب بن جعفر صادق بن محمد المکتوم بن اسمٰعیل کے سیاسی تدبر کا تقاضا تھا کہ اس نے اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل کے لئے وہی روش اختیار کی جو عباسی اموی خلافت کے خلاف اختیار کر چکے تھے، اس وقت اس کی رہائش حمص واقع شام میں تھی، اس نے اپنے "داعی" یمن اور یمامہ اور بحرین اور سندھ اور ہند اور مصر تمام شمالی افریقہ میں پھیلا دیئے تھے، ان میں سے ایک ابو عبداللہ حسین کسی وقت بصرہ میں محتسب تھا، اور پھر شیعہ کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ شخص قبائل بربر میں اپنا کام کرتا رہا۔ لوگ اس کے تقدس پر فریفتہ ہو گئے، گوشہ خلوت میں مجاہدہ

اور ریاضتِ شاقہ نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرلیا، اس وقت آل اغلب افریقیہ میں صاحبِ حکومت تھے، کوشش تو بہت کی کہ یہ فتنہ دب جائے، مگر کامیاب نہ ہوئے آخری اغلبی حکمران زیادت اللہ ثانی لڑا، مگر شکست کھا کر طرابلس میں آیا اور پھر یہاں سے ایشیا میں، جہاں بمقام "رقہ" ۲۹۶ھ مطابق ۹۰۸ء میں فوت ہوا،

ابو عبداللہ کو بربریوں میں کبھی کامیابی نہ ہوتی، اگر وہ اپنے تقویٰ اور طہارت کا ڈھنڈورا نہ پیٹتا۔ وہ تو خود بہت منکسر المزاج تھا "مریداں می پرانند"۔ اسی طرح دوسرے "داعی" جن کا سابقہ ایرانیوں اور ہندیوں سے پڑا، ایک اور ہی رنگ کے لباس میں ظاہر ہوئے، خلافتِ عباسیہ کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں کہ ابو جعفر منصور کو شروع خلافت میں فرقہ "راوندیہ" کے ہاتھ سے جان بچانی مشکل ہو گئی تھی۔ یہ شیعان بنو ہاشم بادشاہ پرست منصور کی پوجا پاٹ کرنے کے لئے آئے، آریہ نسل ہمیشہ شخصیت پرست رہی ہے اور اپنے راجوں اور بادشاہوں کو اوتار اور دیوتا اور "نہ کلنگ" (بے عیب معصوم یقین کرتی رہی، یونان اور روم میں ہر ایک حکمران اپنا سلسلہ نسب کسی نہ کسی آسمانی دیوتا سے ملاتا رہا۔ ہندوستان میں چندر اور سورج بنسی تھے، ان لوگوں کی ذہنیت کا لحاظ رکھتے ہوئے بنو فاطمہ کے داعی اپنے اماموں کو بھی الوہیت کا درجہ دیتے ہیں یہ ناگزیر امر تھا ورنہ کامیابی ممکن نہ تھی،

مسیح کے بعد حواریانِ مسیح تو گوشۂ گمنامی میں بیٹھے رہے اگر سینٹ پال (مقدس پولوس) جو نہ حواری تھا اور حواریوں کی صحبت کا فیض یافتہ تھا، یونانیوں اور رومیوں میں اشاعتِ مسیحی میں اس لئے کامیاب ہوا، کہ ان لوگوں کی پست ذہنیت مسیح پر اسی صورت میں ایمان لا سکتی تھی جیسا کہ مقدس پولوس نے مسیح کو پیش کیا، اور اکثر مسیح کی الوہیت پر ایمان لائے، اور یہ مذہب اب یورپ اور امریکہ تمام مسیحی دنیا میں رائج ہے۔ مقدس یوحنا حواری اپنے مکتوب دوم میں لکھتا ہے۔ کہ

"ہمارے ہاں دجال کی آمد کی پیش گوئی ہے وہ یہی شخص ہے جو مسیح کو بشر نہیں کہتا"!

فاضل رینان اپنی کتاب "سینٹ پال" میں لکھتا ہے کہ مقدس یوحنا کا اشارہ پولوس ہی کی طرف ہے، اور مسیحیت (christianity) کا امتیازی نام بھی اسی کی اختراع ہے، بہرحال یہ دجالی مذہب آج مسیحی دنیا کا ہے، اور اس دجالیت میں ہمارے زمانہ میں برطانیہ کا بہت بڑا حصہ ہے، حروب صلیبیہ کے ماتحت مزید تشریح کی جائے گی،

الغرض نو مسلم مجوسیوں اور ہندوؤں میں "داعیوں" نے اپنے اماموں کو دیوتا اور اوتار کی صورت میں پیش کیا، ظاہر ہے کہ یہ سب سیاسی ڈھونگ تھا اسلام سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں،

ابو عبداللہ داعی کے حالات قلم بند کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے اس مقام پر حسن بن صباح کا تذکرہ کیا جائے، جو خلافت بنو فاطمہ سے وابستہ ہو گیا تھا، تاکہ اسماعیلی مذہبی عقائد واضح تر ہو جائیں،

پانچویں صدی ہجری مطابق گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں تین طالب علم مدرسہ نیشاپور میں ہم درس تھے، ان میں سے ایک عمر خیام اور دوسرا حسن باشندہ رے اور تیسرا نظام الملک طوسی تھا، استاد امام موفق ان کی ذہانت کی اکثر تعریف کرتا اور کہا کرتا کہ تم تینوں کسی وقت دنیا میں بڑا کام کرو گے، ان تینوں میں خلوص و محبت بھی تھی، ایک دفعہ ان تینوں نے یہ عہد کیا کہ ہم میں سے جو بھی پہلے دنیوی ثروت حاصل کرے باقی دو کو اس میں شریک کرلے، جب نظام الملک سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان کا وزیر ہو گیا تو عمر خیام کو دعوت شرکت دی، مگر عمر کچھ دنیوی جاہ و جلال کا دلدادہ نہ تھا۔ یہ فلسفی اور ادیب ریاضی اور علم ہیئت میں ان ایام میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا الپ ارسلان کے بعد جب جلال الدین ملک شاہ نے عنانِ حکومت سنبھالی تو عمر خیام نے تقویم کی تصحیح کی، جو "زیج جلالی" کہلاتی ہے، عمر خیام ادیب بھی تھا، اس کی رباعیات کا جواب نہیں، ان کا ترجمہ اردو اور یورپ کی مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ملک الشعراء خاقانی اس کا بھتیجا تھا۔

نظام الملک کو حسن بن صباح کا خیال ضرور تھا. مگر طالب علمی کے زمانے میں اس کی عادات سے واقف تھا، اس لئے کچھ خالفت بھی تھا، علاوہ ازیں حسن شیعہ اور نظام الملک سنی. دونوں کے عقائد میں فرق تھا، اگر یہ صرف مذہبی عقائد کا فرق ہوتا تو کچھ بات نہ تھی اختلاف رائے ہوا ہی کرتا ہے، مگر شیعہ عقاید کی بنا سیاسیات پر تھی حسن کا باپ متعصب شیعہ تھا. چونکہ ابومسلم رازی حاکم رے سنی تھا. اس لئے اپنی نسبت بدظنی دور کرنے کے لئے حسن کو نیشاپور کے مدرسہ میں بھیج دیا، خواجہ نظام الملک سنی شافعی تھا کبھی کبھی دونوں میں مذہبی بحث بھی ہوتی مگر تفرقہ تھا. اتفاق سے نظام الملک اور حسن نیشاپور میں دوچار ہوگئے. حسن نے سخت ملامت کی. اور کہا کہ تو "ینقضون عہد اللہ" کے تحت آتا ہے. خواجہ نے عذر معذرت سے ٹھنڈا کیا اور سلطان سے بھی ملاقات ہوگئی. حسن نے تھوڑے عرصہ میں سلطان کے دل میں گھر کرلیا، اب اس فکر میں منصوبہ بندی کرنے لگا کہ خواجہ کی جگہ وزارت کا منصب مل جائے. مگر خواجہ اس کے حالات سے غافل نہ تھا، بظاہر اس کی خاطر مدارت کرتا رہا. مگر سمجھتا تھا. کہ کسی دن "رنگ لائے گی گلہری" چنانچہ ایسا ہی ہوا، دوراندیش وزیر نے جب دیکھا کہ حسن اس کی بیخ کنی کے درپے ہے. تو سلطان کو تمام پوست کنندہ حالات بتا دیئے. حسن ذلیل ہوکر دربار شاہی سے راندہ گیا نیشاپور میں آیا اور ایک دوست کے ہاں قیام کیا، جو کچھ وہ منصوبہ بندی کرچکا تھا اس کی تکمیل کے لئے ایسے آدمیوں کی ضرورت تھی جو دست و بازو ہوں، اس لئے باتوں باتوں میں دوست کو کہا کہ اگر مجھے سات آدمی مل جائیں تو میں اس سلجوقی بادشاہ کا تختہ الٹ دوں،

اُس وقت سلجوقی سلطنت منتہائے عروج پر تھی، دوست نے خیال کیا کہ حسن کا دماغ پھر گیا ہے، حسن سے کچھ کہنا فضول بات تھی، ایک جراح بلا لایا، جب حسن کو دوست کی حماقت معلوم ہوئی تو بہت برافروختہ ہوا، اور کہا کہ تمہارے جیسے احمقوں نے سلجوقی حکومت محکم بنا رکھی ہے، اب دوست کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے. اگر ان باغیانہ خیالات کی بھنک حاکم نیشاپور کے کانوں تک پہنچ گئی تو وہ کہیں کا نہ رہا. اس

جس طرح ہوا، حسن سے پیچھا چھڑایا۔

حسن نے ادھر دنیائے اسلام پر نظر دوڑائی، خلافت بنو فاطمہ قائم ہو چکی تھی، مگر رو بہ زوال تھی، اس نے اپنے آپ کو اس سے وابستہ کرلیا، اور دربار خلافت سے سند "داعی" حاصل کرلی، مگر حسن کا سیاسی منصوبہ کچھ اور ہی تھا، اسے کامیابی کا راز معلوم ہی تھا، عالم دین بھی تھا، درویشانہ وضع اختیار کی، سیاسی سرگرمی کا مرکز "ماژندران" منتخب کیا، جہاں پہلے بابک خرمی نے علم بغاوت خلافت عباسیہ کے خلاف بلند کیا تھا، اور ابھی تک خرمی مذہب جس کا بانی ابومسلم خراسانی تھا موجود تھا، اسماعیلی باطنی رفیق اس کو بہت مل گئے، جو اس کے زہد و ورع اور تقدیس کا ڈھنڈورا ہر جگہ پیٹتے رہے خلفاء فاطمیہ نے مسلمانوں کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل کرنے کے لئے ایک تو "داعی" مقرر کئے جو "باطنیہ" علم و عقائد کے مستند استاد تھے، ان کا کام اسی کی نشر و اشاعت تھی جو اس حد تک صیغہ راز میں رکھی جاتی، کہ یہ علم سینہ بسینہ ہی منتقل ہوتا رہا۔

دوسرے درجہ میں طرفداران خلافت "رفیق" (Fellow) سے موسوم تھے حسن نے دیکھا کہ جس منصوبہ کی تکمیل اسے مد نظر ہے، وہ محض داعیان اور رفقاء سے سرانجام نہیں ہو سکتا۔ اس نے اس پر "فدائی" کا اضافہ کر دیا، حسن نے جس سیاسی مذہب یا فرقہ کی بنا ڈالی اس کو مورخین "حشاشین" سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی لفظ یورپ کی زبانوں میں (Assassin) ہے جس کا مفہوم سفاک قاتل ہے جو کسی اور کے مفاد کے لئے قتل کا مرتکب ہوتا ہے، "حشیش" عربی میں اور بھنگ ہندی عام بوٹی ہے۔ جو ہمارے پنجاب میں سکھوں کی پسندیدہ شربت ہے، اس کو "مدق الخیال" اور "فلک سیر" بھی اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے نشہ کی ترنگ میں انسان وہ جلوے عالم خیال میں دیکھتا ہے۔ جو بہ قائمی ہوش و حواس نظر نہیں آتے، اور نہ روئے زمین پر موجود ہیں، اس لئے یہ سب آسمانی امور غیب ہیں،

حسن کو بھنگ کے خواص کا راز کب اور کیسے معلوم ہوا، یہ بھی صیغہ راز میں ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ وادی سندھ میں اسماعیلی داعی اور رفیق پھیلے ہوئے تھے،

یہاں جوگیوں کو یہ گھاس چرتے دیکھا اُن کی وساطت سے حسن کو بھی اس کو علم ہوا اس نے اس سے خوب کام لیا نشہ کے عالم میں فدائیوں کے ذہن پر یہ بات نقش کی جاتی کہ حسن بن صباح تمام کرہ ارض کا مالک ہے اور "خلیفۃ اللہ" ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل بلا چون وچرا اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ ان لوگوں کی مدد سے حسن کو نمایاں کامیابی ہوئی

حسن تو ایک درویش آدمی تھا۔ ماژندران کے ایک پہاڑ میں گوشۂ خلوت بنا رکھا تھا۔ یہاں شب وروز اس کا شغل عبادت الٰہی تھا۔ ویسے بھی یہ محفوظ جگہ تھی۔ گرد "فدائی" بھی پہرہ دیتے تھے۔ آپ گردونواح میں "شیخ الجبل" کے نام سے مشہور تھے اور جب مرید آپ کی نسبت گفتگو کرتے تو صرف "سیدنا" (ہمارا آقا یا سردار) کہتے یہ لفظ "سیدنا" اور "مولانا" اب بھی زبان زد مسلمانان عالم ہے۔ ماژندران کے پہاڑ میں ایک قلعۃ الموت " (آشیانۂ عقاب) تھا۔ خوش عقیدہ قلعہ دار کئی دفعہ شیخ الجبل کو دعوت دے چکا تھا کہ قلعہ میں رہائش اختیار فرمائیں۔ تاکہ وہ بھی فیض صحبت سے مستفیض ہو مگر شیخ صاحب انکار کرتے رہے۔ آخر اس کے اصرار پر قلعہ میں آئے۔ اور قابض ہو گئے یہ قلعہ سر ہوا۔ تو شیخ الجبل نے فدائیوں کو ہر طرف پھیلا دیا۔ اُنہوں نے تمام ملک میں دہشت پھیلا دی۔ یہ ہر ایک لباس میں ملک کے طول و عرض میں پھر رہے تھے ایک فہرست ان لوگوں کی مرتب کی گئی تھی، جو "شیخ الجبل" کے دشمن تھے۔ یہ سب اکابر سلطنت تھے اور شاید ہی کوئی خوش قسمت ہو جس کا نام اس فہرست میں درج نہ ہو یا حشیشین کے خنجر آب دار سے بچا ہو۔ سلطان ملک شاہ مارا گیا، نظام الملک کو زہر دیا گیا خلیفہ مسترشد باللہ عباسی سر بازار مارا گیا۔ اس کا بیٹا راشد باپ کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ خیمہ میں سویا ہوا تھا اور یہاں عین غفلت میں مارا گیا۔ غرض حسن بن صباح کو فدائیوں کے ذریعہ نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ کئی پہاڑی قلعے کچھ لڑ بھڑ کر اور کچھ فریب اور دغا سے اس کے قبضہ میں آ گئے۔

ہماری رائے میں حسن بن صباح اور اس کے اعمال ناشائستہ کو خلافت فاطمیہ سے منسوب کرنا مورخین کی غلطی ہے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ حسن اپنی علیحدہ مستقل

سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ اور اس کے فدائی خلافت فاطمیہ کے اسبابِ زوال میں سے ایک بڑا سبب ہیں، دنیائے اسلام میں جو دہشت ان لوگوں نے پھیلائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کا قلع قمع کرنے کے لئے سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔

۵۱۸ھ میں حسن بن صباح کی پُر آشوب زندگی کا ملک الموت نے قلعہ الموت میں خاتمہ کر دیا، دنیائے اسلام نے بھی کچھ اطمینان کا سانس لیا، حسن کے جانشین مذہباً اور عملاً اسی کے نقشِ قدم پر چلے مگر وہ بات نصیب نہ ہوئی۔

شجرہ نسب

صباح

(۱) حسن

(۲) کیا بزرگ اُمید (۵۱۸ھ)

(۳) محمد

(۴) حسن

(۵) محمد (۵۶۱ھ)

(۶) جلال الدین

(۷) علاء الدین

(۸) رکن الدین خورشاہ (۵۶۳ھ)

امام فخرالدین رازی محمد بن حسن پانچویں امیر کے عہدِ امارت میں "رے" میں درس دیا کرتے اور اثنائے درس میں ان ملحدوں* کی خوب خبر لیتے، فدائی ان کے پیچھے لگ گئے آپ جان بچا کر غیاث الدین غوری کے ہاں چلے گئے، کچھ اطمینان ہوا۔ تو خوارزم شاہ کے زیر عاطفت زندگی بسر کی لیکن کچھ ایسے خائف تھے کہ پھر حشاشین کو بالکل بھول گئے اور بھولے سے بھی ان کا ذکر خیر زبان پر نہ آتا، وہ بھی اتنا ہی چاہتے تھے، اس لئے امام صاحب کی طرف پھر نگاہِ التفات نہ ہوئی۔

جلال الدین نے اپنے آباؤ اجداد کے الحاد سے علانیہ توبہ کی۔ اور اس کی اطلاع اپنے آقائی خلفاء مصر کو بھی دی۔ اس لئے یہ جلال الدین نو مسلم مشہور ہوا۔ اس کی والدہ اور اس نے حج بھی کیا، خلیفہ بغداد نے عزت افزائی بھی کی، ۶۵۳ھ میں ہلاکو خاں نے اس خاندان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔

---

* حسن بن صباح نے ایک کتاب بنام "فصول چہارگانہ" فارسی زبان میں لکھی۔ امام رازی نے اس کی تردید کی۔ "فصول چہارگانہ" اب دستیاب نہیں ہوتی، البتہ امام صاحب کے مقالات میں اقتباسات محفوظ ہیں۔ اس کتاب کی پہلی فصل میں ضرورت امام پر بحث ہے اس لئے کہ محض عقل سے کام نہیں چلتا۔ امام معلم صادق ہونا چاہیئے۔

دوسری فصل میں معلم یا امام کی شناخت پر بحث ہے، تیسری فصل میں معلم کی تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔ چوتھی فصل میں اپنے مذہب کی صداقت اور دیگر مذاہب اہل حدیث اور اہل تشیع کا ابطال کیا گیا ہے۔ شہرستانی نے اپنی کتاب "ملل و نحل" میں اس کا تذکرہ لکھا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ ایران اور ہندوستان میں اسماعیلی داعی اپنے اماموں کو خلیفۃ اللہ مظہر الوہیت ہی بتاتے، یہ ڈھونگ جلال الدین اکبر نے بھی رچایا، اس کو اورنگزیب عالمگیر "جد اکفر" کہتا ہے۔ بساط سیاست کے کھلاڑی ہر ایک بھروپ میں جو بھی مناسب ہو ظاہر ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے۔ جب تک دنیا میں احمق ہیں اور عوام کالا نعام کی ذہنیت بھی پست ہے ان کو اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے اور کم دبیش کامیاب ہوتے رہے اور ہوتے رہیں گے۔

"انکاری غیر باش تصدیق ایں است — واکرد بدل دلیل توفیق ایں است
"تبعیت خلق از حقت غافل کرد — ترک تقلید گیر تحقیق ایں است

ابوعبداللہ داعی نے اغلبی مقبوضات پر قبضہ جمالیا، اس کے زہد واتقا نے لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا، اس لئے رائے عامہ بنو فاطمہ کے حق میں ہو گئی۔ اور اب بے صبری سے اس امام مکتوم یا غائب کا انتظار ہونے لگا۔ جس کی دعوت ابوعبداللہ دے رہا تھا، عبیداللہ بن محمد الحبیب بھی اشارہ کا منتظر تھا، ابوعبداللہ کی دعوت پر اسی کے بیٹے اور خاص مصاحبین کے ہمراہ افریقہ میں تاجر کے لباس میں نازل ہوا۔ لیکن عباسیوں نے بھی اڑتی سی خبر سن لی، اور والیوں کے نام عبداللہ کا حلیہ لکھ کر احکام صادر کر دیئے، کہ جو بھی اس حلیہ کا آدمی ملے گرفتار کیا جائے۔ عبیداللہ گرفتار بھی ہوا۔ مگر ابوعبداللہ کی مدد سے رہائی بھی پائی۔

اغلبی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا، ابوعبداللہ نے عبیداللہ کا جلوس نکالا، آگے آگے آپ تھا، جذبات امڈ کر آنکھوں میں آرہے رونا جاتا تھا اور ہر ایک آواز میں کہتا جاتا تھا۔ کہ " اچھی طرح دیکھ لو یہی تمہارا آقا ہے"! عبیداللہ کی خلافت اغلبی مقبوضات پر بالاستقلال قائم ہو گئی۔ بحر الشام کے جزائر اور جزیرہ صقلیہ پر بھی اس کی حکومت تسلیم کی گئی، عبیداللہ نے جس قابلیت اور سرگرمی سے امور خلافت کو سلجھانا شروع کیا۔ اس نے ابوعبداللہ اور اس کے بھائی ابوالعباس کی تمام توقعات پر پانی پھیر دیا، وہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ جس طرح خلفاء عباسیہ نام ہی کے ہیں، اسی طرح عبیداللہ کو بھی ہونا چاہئے

اور وہ خود سلطان ہیں، جب عبید اللہ پر یہ راز کھلا۔ تو ان کی خدمات فنا کرنے کے خیال سے ہر ممکن کوشش کی کہ راہ راست پر آجائیں لیکن ان کے دماغ میں ہوائی سلطنت سمائی ہوئی تھی۔ عبید اللہ کے قتل کا منصوبہ باندھا۔ عبید اللہ کو علم ہوا تو دونوں کو قتل کروا دیا۔ ان کا بھی وہی انجام ہوا جو منصور کے ہاتھ سے ابو مسلم خراسانی کا ہوا تھا۔

یہ بادشاہ گر ۲۹۸ھ / ۹۱۱ء میں کیفر کردار کو پہنچے تو عبید اللہ کی توجہ تمام شمالی افریقہ کی تسخیر کی طرف لگ گئی۔ ہر ایک خلافت نئے دار الخلافت کی بنیاد ڈالتی رہی، "مہدیہ" سمندر کے کنارے پر منتخب ہوا، ۳۰۹ھ میں اس نے خلافت ادریسیہ کا خاتمہ کر دیا مگر مصر مسخر نہ ہو سکا، مراکش لینے کے بعد اس کی للچائی ہوئی نظریں ہسپانیہ کی طرف اٹھتی رہیں۔ لیکن اس کا خواب پریشان ہو کر رہ گیا، چوبیس برس حکومت کی آخر ۳۲۲ھ میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر رحلت کر گیا۔

ابوالقاسم محمد نزار القائم بامر اللہ باپ کا جانشین ہوا، شمالی افریقہ جہاں اسماعیلی خلافت تھی، ساحلی علاقہ ہے۔ اطالیہ کے بحری قزاق اس کی بندرگاہوں کو اکثر تاراج کرتے رہتے، اس لئے القائم کی تمام تر توجہ اٹلی کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کیا اور جنوا (Genoa) اور لمبارڈی (Lombardy) کے ایک حصہ پر قبضہ جما لیا، اگر ایک بغاوت کو فرو کرنے کے لئے اسے اپنے ہی گھر کی خبر نہ لینی پڑتی تو کچھ شک نہیں کہ تمام اطالیہ پر اس کا قبضہ ہو جاتا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خوارج کو جب اموی اور عباسی خلافت میں عرب میں پناہ نہ ملی تو ان میں اکثر شمالی افریقہ میں آ بسے۔ اور یہاں بھی وقتاً فوقتاً شورش برپا کرتے رہے، قائم کے عہد خلافت میں ایک شخص خارجی ابو یزید مخلد نامی مدرس تھا۔ قبائل بربر میں وعظ کا سلسلہ شروع کیا، اور کافی جمعیت فراہم کر لی، اور ہسپانیہ کے خلیفہ ناصر کو دعوت دی، کہ اسماعیلی ملحدوں کو بیدخل کر کے افریقہ کی سلطنت سنبھال لو۔ اور خود "شیخ المسلمین" کا لقب اختیار کیا، پہاڑی جنگجو قبائل کے ساتھ اتر آیا اور شہر کے بعد شہر فتح کرتا ہوا دار السلطنت "مہدیہ" کا محاصرہ ڈال دیا، یہی ایک شہر اسماعیلیوں

کے پاس رہ گیا تھا، ابویزید نے بہت کوشش کی مگر شہر مسخر نہ ہوا مجبوراً ابویزید نے ناکہ بندی کی سوجھی، اس اثنا میں قائم کا انتقال ۳۳۵ھ ۹۴۶ء میں ہوگیا، ابوطاہر اسمٰعیل المنصور بامر اللہ باپ کا جانشین ہوا، اور فتح اسماعیلی علم پر لہرائی، ابویزید پسپا ہوتا ہوا جبل سلات میں پناہ گزین ہوا۔ مگر گرفتار ہو کر مارا گیا، اس بغاوت کا فائدہ اموی خلیفہ الناصر نے اٹھایا، اس نے مراقش پر قبضہ جما لیا، اور تمام ادریسی مقبوضات اس کے زیر نگیں آگئے۔

۳۳۹ھ ۹۵۰ء میں منصور نے ابوالقاسم حسن بن علی بن ابی الحسین الکلبی کو صقلیہ کا والی مقرر کیا، یہ منصب اس کے خاندان میں ایک سو اسی برس رہا۔ خلافت کے زوال پر کونٹ روجرد (Roger) کے تحت نارمن قوم نے پھر سے قبضہ کر لیا،

منصور کا جانشین اس کا بیٹا ابوتمیم معد المعز لدین اللہ ہوا۔ اس کی فوج کے سپہ سالار ابوالحسن جوہر بن عبداللہ نے جو صقلیہ کا رہنے والا تھا مراقش پر قبضہ کر لیا، اموی خلیفہ الناصر مسیحی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا۔ اب دو حریف خلافتوں میں دشمنی پیدا ہوگئی، اور ان کی طاقت جو یورپ کی تسخیر پر صرف ہونی چاہیے تھی، باہمی خانہ جنگی سے کمزور ہوگئی، اور مسیحی یورپ کو سر اٹھانے کا موقعہ مل گیا،

۳۵۸ھ ۹۶۸ء میں جوہر "فسطاط"[۱] میں بلا مقابلہ داخل ہوگیا اور پھر رفتہ رفتہ تمام مصر پر قابض ہوگیا، اس کے بعد قاہرہ میں دار الخلافت منتقل ہوگیا، ۱۵ ماہ رمضان ۳۶۲ھ ۹۷۲ء میں تخت زریں پر بیٹھ کر اس نے مصر اور شام اور حجاز کے وفود کو باریابی کی اجازت دی اور نذریں قبول کیں،

معز کے بعد اس کا بیٹا ابوالمنصور نزار العزیز باللہ جانشین ہوا، اس کے عہد خلافت میں اس کے نام کا خطبہ نہ صرف حجاز میں بلکہ یمن اور موصل اور حلب اور

---

[۱] "فسطاط" ملک مصر میں مسلمانوں کی پہلی چھاؤنی اور پہلا شہر ہے۔ ۲۰ھ میں عمرو بن العاص نے فتح مصر کے بعد یہاں پڑاؤ کیا، اب اس کا محل وقوع مصر کہنہ اور قاہرہ کے درمیان سمجھنا چاہیے۔ اس

حمص وغیرہم مقامات پر بھی پڑھا جاتا تھا۔ اور بحر اوقیانوس دریاء فرات تک اس خاندان
کی حکومت تھی۔ عرب کا بھی اکثر حصہ زیر اقتدار تھا۔

بربری قبائل میں خوارج کا اثر ورسوخ یا کم از کم ان کے عقائد زیادہ تر ان کو فتنہ
کے نام پر مشتعل کرتے رہتے۔ اس لئے عزیز نے وہی روش اختیار کی جو اس کے پیشرو
خلفاء عباسیہ اختیار کر چکے تھے۔ ترکوں اور دیالمی ایرانیوں کو بھرتی کرنا شروع کیا تاکہ
بربری قوت کا جواب ہو۔ عزیز ۳۸۶ھ میں فوت ہوا۔ اور اس کے ساتھ دولت بنی فاطمہ
کی شان وشکوہ بھی ماند پڑ گئی۔ اس کا جانشین اس کا بیٹا ابو علی منصور الحاکم بامر اللہ
ہوا۔ یہ شخص بعض اوقات دیوانگی کی حالت میں آپے سے باہر ہو جاتا۔ اکثر اکابر کو اسی حا
میں قتل کرایا۔

ابن خلدون لکھتا ہے کہ اس کی عادت تھی کہ رات کے وقت المقطم کی پہاڑی کی
طرف نکل جاتا۔ یا تو اختر شماری کرتا یا خلوت میں عبادت۔ ایک رات حسب معمول وہ دو
کے ساتھ نکلا اور پھر واپس نہ آیا۔ تلاش پر پہاڑی چوٹی پر قریب ہی ایک چشمہ پر اس گدھے
جس پر سوار تھا ملا۔ اس کے چاروں پاؤں کٹے ہوئے تھے۔ اور الحاکم کا لبادہ جس پر خنجر
کے نشان تھے چشمہ میں ملا۔ مگر لاش باوجود تلاش نہ ملی۔

کے آثار قدیمہ میں سے "جامعہ عمروؓ" اور المقطم تک اور قاہرہ کے گرد کھنڈر ہیں۔ یہ مقام وہ ہے
جہاں صحابہؓ "قلعہ بابل" کو مسخر کرنے کے لئے مصر کہنہ میں آئے اور "دیرۃ النصاریٰ" یا دیر مار جرجس
کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد عمرو بن العاص اسکندریہ کی تسخیر کے لئے بڑھنے والے تھے۔ تو
حکم دیا کہ میرا خیمہ اکھاڑا جائے۔ اس میں ایک کبوتر کا آشیانہ نظر آیا۔ اس میں کبوتر کے بچے
بھی تھے۔ آپ نے کہا کہ مت اکھاڑو۔ ایک محترم کی وجہ سے اس کی حرمت واجب ہے اور قبطی
کو حکم دیا کہ جانوروں کی حفاظت کرنا۔ اور خود مع سپاہ اسکندریہ کا رُخ کیا۔ اسکندریہ میں دارالولا
تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ مگر فاروق اعظمؓ نے کہا کہ میرے اور تمہارے درمیان دریا حائل نہ ہو۔ ناچار فسطاط پر چھا
ڈال دی۔ اس کی رونق بصرہ اور کوفہ سے بڑھ گئی۔

حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ عقائد جس کی وجہ سے فرقہ اسماعلیہ بدنام ہؤا۔ سی حاکم کی اختراع ہے، یہ اپنے آپ کو مظہر الوہیت منوانا چاہتا تھا۔ اس کے متبعین یقین کرتے ہیں کہ وہ زندہ ہے اور پھر واپس آ جائے گا۔

"باز آمدن مسیح و مہدی ایں جا … از تجربہ بمزاج اہیال ودد است"

دنیا بہ اُمید قائم۔ یہی وہ مذہب ہے جو "لبنان" میں "الدرزیہ" یا دروزی لوگوں میں اب بھی رائج ہے۔

حاکم کے بعد ابو ہاشم علی الظاہر لاعزاز دین اللہ جانشین ہؤا۔ اس کے عہد میں شام کا اکثر حصہ فاطمی خلافت سے علیحدہ ہو گیا، ایک عرب امیر صالح بن مراسس "حلب" دبا بیٹھا۔

ظاہر کے بعد اس کا بیٹا ابو تمیم معد المستنصر باللہ جانشین ہؤا۔ ۴۴۲ھ میں حجاز میں اس کے نام کا خطبہ موقوف ہؤا، پانچ برس بعد شرف الدولہ نے جو سیف الدولہ کی اولاد سے تھا جس کو اس کے دادا المعز نے افریقہ کا والی مقرر کیا تھا اس کے نام کی جگہ عباسی خلیفہ القائم کے نام کا خطبہ پڑھا۔ مغربی ایشیا میں طغرل اور اس کے جانشین الپ ارسلان نے فاطمی حکومت کا خاتمہ کر دیا، اور اُن کو مصر کی طرف دھکیل دیا۔ اس بدنظمی کے زمانہ میں جو خانہ جنگی نے پیدا کر رکھی تھی مسیحی دنیا میں بیت المقدس لینے کی تحریک زور پکڑ گئی۔ اس کا تذکرہ جنگ ہائے صلیبیہ میں کریں گے اس کے بعد مصر میں چند بے حقیقت خلفاء فاطمیہ ہوئے آخری خلیفہ العاضد ۵۶۷ھ/۱۱۷۱ء میں مرگیا اور اس کے ساتھ یہ خلافت بھی ختم ہو گئی۔ اگرچہ اسماعیلی خلافت بنو فاطمہ ختم ہو گئی مگر باطنیہ فرقہ ختم نہیں ہؤا۔ اور نہ امامت اسماعلیہ ختم ہوئی ہمارے زمانہ میں ہز ہائی نس سر آغا خاں موجود ہیں۔

قرامطہ بنو فاطمہ کے زوال کا بہت بڑا سبب خود ان کے "داعی" تھے، خلفاء بنی فاطمہ تو یہ سمجھتے رہے کہ یہ داعی (Propagandists) ان کی دعوت "Propaganda" لوگوں کو دے رہے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر داعی اپنی ڈیڑھ اینٹ

کی مسجد علیحدہ بنانا چاہتے تھے، یہ کئی قسم کے لوگ تھے، ان میں سے ایرانی نژاد تو بلا شبہ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، اپنی پر اچین شان و شوکت و عظمت و تہذیب و تمدن اور مذہب پھر سے رائج کرنا چاہتے تھے، اور غیر ایرانی جب دیکھتے کہ ان کے گرد کافی جمعیت فراہم ہو چکی ہے تو ان کے حواس بجا نہ رہتے۔

چہ خوش است اگر بود آں قدر ہوس بلندی نظرت کہ بر آں مکاں چو قدم نہی خم گردشے نخورد مسرت

ان اہل غرض و ہوا و ہوس نے بنو ہاشم اور بالخصوص بنو فاطمہ سے اپنے آپ کو اس لئے وابستہ کر رکھا تھا، کہ اس عقیدت کا جو عوام الناس کو آل رسولؐ اور اولاد علیؓ سے تھی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ ان میں سے ایک داعی ابو عبداللہ کے حالات ہم لکھ چکے ہیں، اس نے مذہب میں رخنہ اندازی نہیں کی۔ لیکن توقعات جو اُس نے باندھ رکھی تھیں پوری ہوتی نظر نہ آئیں تو بگڑ بیٹھا، آخر مارا گیا،

ایک اور داعی جس نے دنیائے اسلام میں کچھ عرصہ غلغلہ برپا رکھا۔ "قرمط" کے لقب سے مشہور ہے، اس کا نام "ہمدان" تھا، عبدالقاہر البغدادی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتا ہے کہ وہ لنگڑا کر چلتا تھا یا اس لئے کہ اس کی تحریر سیدھی سطر میں نہ تھی لیکن اور مورخین نے کچھ اور وجوہ بھی بیان کئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بنو فاطمہ کے داعی یا خود بنو فاطمہ "تدلیس" سے کام لیتے رہے، اور اس لئے "باطنیہ" سے موسوم ہوئے، اس لئے ہمدان کو قرمط سے یاد کرتے ہیں، بہر حال ابتداء میں "ہمدان" سواد کوفہ میں کاشت کار تھا، اس تقدس مآب نے اکثر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ کوفہ ویسے بھی وہ سرزمین ہے، جس میں تخم سازش و شورش ہمیشہ بار ور رہا۔ قرامطہ نے اپنے عقائد باطلہ کا بیج ہر طرف بکھیر دیا،

اس وقت خفیہ سازشوں کا جال بچھا ہوا تھا، اب اتنی تقویت حاصل ہو گئی کہ ان کے قائد ابو سعید جنبالی نے عراق میں اُدھم مچا دیا، عباسی خلیفہ معتضد کی فوج کو شکست پر شکست دے کر شام میں تاخت و تاراج شروع کی، ۳۰۱ھ / ۹۰۳ء میں ابو سعید کو کسی نے قتل کر دیا، اس کے بیٹے اور جانشین ابو طاہر نے وہ تمام کام کیا جو باپ ادھورا

چھوڑ گیا تھا، ۳۱۷ھ میں یک لخت مکہ معظمہ پر یورش کی، حجاج کو تہ تیغ کیا، اور "حجر اسود" اکھاڑ کر لے گئے، اس وقت عبید اللہ المہدی قیروان میں بنو فاطمہ کی خلافت قائم کر چکا تھا، جب اُسے ان حالات کا علم ہوا، تو ابو الطاہر کو سخت زجر و توبیخ کی اور لکھا کہ دنیائے اسلام ہمیں مطعون کر رہی ہے، اور ہم پر کفر و الحاد کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اس کی تمام تر ذمہ داری تم پر اور تمہارے افعال قبیحہ پر ہے۔ حجر اسود فوراً بحفاظت تمام مکہ معظمہ پہنچا دو۔ چنانچہ حجر اسود شیخ نیشاپور ابو اسحاق ابراہیم بن محمد بن یحییٰ مقدسی کی تحویل میں کوفہ سے مکہ میں آیا، اور پھر کعبہ میں نصب کیا گیا، حجر اسود اکھاڑتے وقت چند ٹکڑے ہو گیا تھا، یہی ٹکڑے اب جوڑ کر نصب کئے گئے ہیں اور اب بھی اُسی حالت میں ہیں، لیکن قرامطہ کے خلاف تمام دنیائے اسلام اُٹھ کھڑی ہوئی اور ان کا قلع قمع خاطر خواہ ہو گیا،

خواہ دولت بنو فاطمہ کا دامن ان عقائد باطلہ کے داغ سے ابتدا میں پاک ہو، لیکن اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ آخر سیاسیات یا ایرانی داعیوں کے عزائم کے زیر اثر مجوسی مذہب کے زیر اثر آ گئے، ابتدا میں یہ ضرور تھا، کہ بنو فاطمہ کے سیاسی اراسے پردۂ اخفا میں رہیں، لیکن داعیان خلافت فاطمیہ کے لئے یہ امر بھی ناگزیر تھا کہ دعوت دین کی آڑ لیں۔ اور یہ بدعت تو خلافت عباسیہ نے جاری رکھی تھی بے شمار احادیث وضع کیں، لیکن ان کا پول کھلتا گیا، بنو فاطمہ کے داعیوں سے یہ تو نہیں ہو سکتا تھا، کہ قرآن میں تحریف لفظی کریں، لیکن تحریف معنوی کی گنجائش نکال ہی لی، ظاہری الفاظ آیات کا مفہوم تو واضح ہے، قرآنی آیات میں ہر ایک لفظ، سوائے چند الفاظ اکثر آیات میں استعمال ہوا ہے، اور خود قرآن احسن تفسیر ہے، لیکن بنو فاطمہ کے دور میں ہر ایک لفظ اور ہر ایک آیت کے حقیقی معنی "بطن قرآن" قرار دیا گیا ہے، ان کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآنی الفاظ اور آیات استعارہ کے رنگ میں استعمال ہوتی ہیں،

عبد القاہر بغدادی نے "باطنیہ" کے عقاید اور تحریف معنوی پر کافی بحث کی ہے مثلاً قرآن (پ ۱۴) کی آیت (۹۸) ہے۔ "واعبد ربک حتی یاتیک الیقین" ہے۔

باطنیہ اس کا مفہوم یہ بیان کرتے ہیں کہ

"اپنے رب (امام وقت) کی خدمت میں کمربستہ رہ یہاں تک کہ تجھے مرتبہ حق الیقین حاصل ہو"۔

حق الیقین سے مراد وہ اسرار دین ہیں جو امام وقت پر منکشف ہوتے ہیں اور اپنے خاص الخاص مریدوں کو تلقین کرتا ہے، ہمارے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ:۔

"اپنے پروردگار (اللہ تعالٰی) کی عبادت مرتے دم تک کرو"۔

یقین کا مفہوم اس آیت میں "موت" ہے، جیسا کہ ۲۹/۲ کی آیات میں ہے۔ کیونکہ موت ہی ایک ایسا واقعہ ہے جو یقینی ہے، یا یہ کہ اگر انسان موت کو یاد رکھے جو یقینی امر ہے تو دل و جان سے عبادت الٰہی کرے گا، جس سے ملاقات کرنے والا ہے۔

اشتراکیت بنو فاطمہ کی کامیابی کا بہت بڑا سبب اشتراکیت Communism ہے۔ داعیان بنو فاطمہ کا اثر عوام پر جو ادنٰی طبقہ کے لوگ ہیں زیادہ تر ہوا۔ مزدوری پیشہ لوگ تو محنت مشقت سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ لیکن ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی کا اکثر حصہ وہ لوگ لہو و لعب میں اڑاتے ہیں۔ جو اصلی طبقہ امراء کا ہے۔ "اشتراکیت" کوئی نیا نظریہ بنو فاطمہ کا نہ تھا، قباد ایرانی بادشاہ کے عہد میں "مزدک" اور اس سے پیشتر "مانی" بھی اس کے حامی تھے معاشیات میں اشتراکیت تو خود قرآن کی تلقین بھی ہے۔ لیکن اگر نظریہ اشتراکیت کو منطقی نتیجہ تک لایا جائے تو صرف معاشیات میں محدود نہیں رہتی مزدک کا مذہب یہ تھا کہ مرد و زن بھی اس حد تک آزاد ہوں کہ نکاح کی قید سے بھی گلو خلاصی ہو، آریہ نسل کی ذہنیت کی افتاد ہی فلسفیانہ ہے۔ ہندوستان میں کسی نامعلوم زمانہ میں یہ مذہب اس کے طول و عرض میں رائج تھا جس کو "وام مارگ" (الٹا مذہب) کہتے ہیں، اور اب بھی "شیوجی" کی پوجا عام ہے جس کا مذکور ویدوں میں نہیں، یونان میں "بکیس" ہندوستانی شیوجی ہے۔ "ہولی" ہندوستان اور یونان میں ایک ہی رنگ میں منائی جاتی ہے تو شی بدمستی کی حد تک ابھرا یک بے حیائی کی

ارتکاب کھلے بندوں کیا جاتا۔ فنون لطیفہ (Fine Arts) دام مارگیروں کے ہاتھ میں خطرناک آلات کار تھے، اور سچ پوچھو تو آج بھی ہیں، اگرچہ اس پر تہذیب کا ملمع ہے، تھیٹر وغیرہ میں ایک کشش عوام کے لئے ہے، مجلس وعظ میں وہ بات کہاں جو "سینما" اور راگ رنگ کی محفل میں ہوتی ہے۔ مجالس وعظ میں پلّے سے پیسے خرچ کرنا نہیں پڑتے۔ لیکن مہذب الفاظ میں "تفریح" کے لئے انسان بے دریغ روپیہ لٹاتا ہے۔

اس میں کچھ کلام نہیں کہ داعیان بنو فاطمہ جو پھر سے زرتشتی اور مانوی اور مزدکی نظریہ اشتراکیت رائج کرنا چاہتے تھے اس الحاد کے ذمہ دار ہیں جو خلفاء بنو فاطمہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ "سیاست نامہ" میں ان تمام امور کو وضاحت سے قلم بند کیا گیا ہے۔ طبری اور ابن جوزی "تلبیس ابلیس" میں اور غزالی نے واضح کیا ہے کہ مزدوری پیشہ لوگوں کے لئے عقائد بنو فاطمہ میں خاص کشش تھی۔

خرمیہ

خلافت عباسیہ کے تحت ہم نے ابو مسلم خراسانی اور بابک خرمی کے حالات میں مذہب خرمیّہ کا ذکر کیا ہے۔ "مزدک" کی بیوہ کا نام "خرما" تھا۔ اور یہ مذہب اسی کے نام سے منسوب ہے۔ ایران میں شیعہ مذہب عام ہے اس لئے یہ ضرب المثل کہ "مزدک شیعی ہو گیا" بے معنی نہیں۔

اس میں کلام نہیں کہ مزدکیہ یا خرمیّہ مذہب قرامطہ کا تھا، چونکہ یہ لوگ بنو فاطمہ کے داعی تھے اس لئے مورخین یہ یقین کرنے میں حق بجانب تھے کہ کفر و الحاد کی ترویج نام نہاد بنو فاطمہ کرتے، حالانکہ بنو فاطمہ کا دعوئے خلافت ہی بے بنیاد ثابت ہوتا ہے اگر وہ نظریہ اشتراکیت کے حامی ہوتے اس لئے بعض مورخین نے "عبید اللہ المہدی" کے نسب سے انکار کر دیا، اور لکھا کہ اسمٰعیل بن جعفر صادق کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی یہ صحیح نہیں، بلکہ بنو فاطمہ اپنے نادان دوستوں کی وجہ سے بدنام ہوئے اور خلافت بھی کھو بیٹھے۔

بعض مورخین کی یہ رائے ہے کہ جب خلفاء بنو فاطمہ نے دیکھا کہ عامۃ المسلمین

بلحاظ عقائد ان کے خلاف ہیں تو "تقیہ" کی آڑ لی اجو شیعہ لوگوں میں جزو مذہب ہے
اسمٰعیل المنصور تیسرا خلیفہ فاطمیہ ہے اس نے تلافی مافات یہ کی کہ اکثر داعیوں
کو جلا وطن کیا اور اعلان کیا کہ جو شخص کفر و الحاد کی باتیں کرے اسے قتل کردو۔ اور علم
حدیث و فقہ کی عزت افزائی کی اور ان کی باتیں توجہ سے سنتا۔ مورخین کی یہ
رائے ہے - یہ سب سیاسی ڈھونگ تھا، لیکن اس کے خلاف منصور کے عمل کو دیکھا جائے
تو اس کی نیت کا بھی پتہ ملتا ہے کہ نیک ہی تھی،

تصوّف سب سے زیادہ جس چیز نے مسلمانوں کے عقیدہ توحید میں رخنہ اندازی
کی وہ "تصوف" ہے، ہم نے "علم تصوف" پر علیحدہ کتاب لکھی ہے
اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ ابتداء میں یہ لوگ جو بعد میں صوفی "کہلائے زاہد اور
عابد ہی تھے، اور ان ایام میں جب کہ ایرانی اپنی کھوئی ہوئی عظمت بحال کرنا چاہتے
تھے - اور قریشی عرب اموی اور بنو ہاشم خلافت اور امامت کی گتھی سلجھا رہے تھے
اور ہر ایک فریق نے اپنا امتیازی نشان مقرر کر رکھا تھا، صوفیوں کا لباس "صوف" تھا
اور عوام کے دلوں میں ان کا احترام ایسا ہی تھا جیسا عیسائیوں میں راہبوں اور ہندؤں
میں سادھوؤں" کا، اس لباس میں عوام کالانعام کو آسانی سے گمراہ کیا جا سکتا ہے۔
حافظ لکھتا ہے کہ

صوفی نہاد دام و سر حقہ باز کرد — بنیاد مکر با فلک حقہ باز کرد
ای دل بیا کہ ما بہ پناہ خدا رویم — زآنچہ آستین کوتہ و دست دراز کرد

سعدی کہتا ہے کہ

زنہار ازاں قوم نہ باشی کہ فریبند — حق را بسجودے و نبی را بدرودے

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر ایک "داعی" اسی لباس میں ظاہر ہوتا رہا، اور جب لوگوں کو
اپنا گرویدہ کر لیتا تو سادہ لوح مریدوں کے یہ ذہن نشین کیا جاتا کہ

بمی سجادہ رنگیں کن گر پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

اور راز داری یا تقیہ پہ زور دیا جاتا ہے۔

دانی کہ چنگ و عود چہ تقریر می کنند ۔۔۔ پنہاں خورید بادہ کہ تکفیر می کنند

جب مرید "طریقت" کے تمام مراحل طے کر لیتا ہے تو "معرفت" کے نکات بیان ہوتے اور اُسے کامل "زندیق" بنا دیا جاتا۔

یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کے لئے اشتراکیت اور کفر و الحاد میں ایک بے پناہ کشش ہوتی ہے۔ اشتراکیت میں اس لئے کہ وہ بغیر اہلیت اُس سطح پر آنا چاہتے ہیں، جہاں وہ اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ کفر و الحاد میں اس لئے کہ اس میں آزادی کے ساتھ حظ نفس بھی ہے، نفس انسانی زیادہ تر گناہ کی طرف ہی مائل ہوتا ہے اہل علم و حکمت تو ضبطِ نفس سے اور اعتدال سے کام لیتے ہیں، لیکن عوام بے لگام ہوتے ہیں اور جب ایک دفعہ یہ حقیقت ذہن نشین ہو جائے، کہ تمام قوانین محض نظام معاشرت کے لئے وضع ہوتے ہیں اور آخرت میں اس بارہ میں کوئی باز پرس نہ ہوگی تو وہ کون سا جرم اور کون سا گناہ صغیرہ و کبیرہ ہے۔ جس کے ارتکاب کی ان سے توقع نہ ہو۔ ہمارے زمانہ میں شیخان جاہل اور پیرانِ گمراہ بھی وہی قرمطی اور باطنی ہیں۔ اور تعجب ہے کہ اچھے لکھے پڑھے بھی ان کے دامِ تزویر میں پھنس جاتے ہیں، اس کی بھی ایک وجہ ہے جس کی تشریح علم النفس سے ہوتی ہے وہ ایک علیحدہ مستقل موضوع ہے، "عالمِ خیال یا مثال" میں جو کچھ وہ جلوے دیکھتے ہیں اور ریاضتِ شاقہ سے جو دل و دماغ پر اثر ہوتا ہے وہ بقول مرزا عبد القادر بیدل

"اگر ہوش است باید فہمید کہ غیر از اشیائے محسوسہ معینہ ہر چہ در خیال پرتو اندازد وہمہ سودا ست، و خلاف قاعدہ، آنچہ در نظر تشکل یابد ہمہ صفرا۔"

خلقے ست دریں جنوں سرائے نیرنگ ۔۔۔ زندانیِ اختراع چندیں فرہنگ

من بندۂ آں کہ در ادب گاہِ ثبات ۔۔۔ جوشِ مجنوں نسازد سیری رنگ

حسن بن منصور حلاج نے دعوئے "انا الحق" کیا تو الحاکم خلیفہ فاطمی کو بھی دیوانہ یا مجذوب سمجھا گیا، کہ وہ بھی مدعی الوہیت تھا۔ حلاج اور اس میں فرق یہ تھا کہ "او ادعوں و ایں داعوں نیست"۔ حاکم بامر اللہ فرعون کی طرح صاحب حکومت و اختیار تھا۔ اس لئے اس کا دعویٰ نے

بھی تسلیم کیا گیا اگرچہ تینوں کا حشر ایک جیسا ہوا۔

جیسے ہم آج "فری میسن" (Free Mason) کہتے ہیں اسی طرح یا اس کے لگ بھگ خلفاء فاطمیہ نے "دارالحکمت" کی بنا ڈالی تھی، پیروں کی خانقاہیں بھی اسی نمونہ پر اب بھی تعمیر ہوتی ہیں، سید امیر علی لکھتا ہے کہ قاہرہ کا دارالحکمت ایک نمونہ ہے جس پر مسیحی دنیا میں "لوج" (Lodge) بعد ازاں بنے، "رازداری" ان کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ "جامعہ الازھر" خلفاء فاطمیہ کی یادگار اب بھی قاہرہ میں ان کی علم دوستی کی شہادت دے رہی ہے۔

اگرچہ بنو فاطمہ کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے، وہ کم و بیش وہی باتیں ہیں جن کی تہ میں مخالف فریق کی سیاسی اغراض کارفرما ہیں، لیکن اس میں کچھ کلام نہیں کہ بنو فاطمہ کا وہی سیاسی عقیدہ تھا جو عام شیعہ حضرات کا ہے۔ کہ حضرت علیؓ ہی خلافت کے مستحق تھے، اور پہلے تین خلفاء نے حق خلافت غصب کیا، اور یہ کہ بوجہ قرابت جو حضرت علی کو آنحضرتؐ سے ہے اور اولادِ علی کو علی سے ہے خلافت کا حق انہیں پہنچتا ہے۔

اس موضوع پر عباسی خلیفہ منصور اور نفس ذکیہ میں جو مجادلہ ہوا ہم ذکر کر چکے ہیں۔

عبیداللہ المہدی کے دورانِ حکومت میں تو مصلحتاً اس عقیدہ کو زیر بحث نہیں لایا گیا لیکن بیٹے ابوالقاسم قائم بامر اللہ سے سخت سیاسی غلطی ہوئی اور اس عقیدہ کو بزور حکومت منوانے کی کوشش کی اور "سب صحابہؓ" کی طرح علانیہ ڈالی عوام بھڑک اُٹھے۔

ابویزید جس کے حالات ہم لکھ چکے ہیں خارجی تھا اور خوارج کا عقیدہ یہ ہے کہ پہلے دو خلفاء، ابوبکر صدیق اور عمر فاروق خلیفہ برحق ہیں باقی سب غاصب اور ان کو حضرت عثمان و حضرت علی سے بلحاظ عقیدت وہی نسبت ہے جو شیعان علی کو اول تین خلفاء راشدین سے۔ ابویزید کے ساتھ عوام جو اکثر اہلِ سنت والجماعت تھے اس لئے ہوگئے کہ ان سے یہ توقع تھی کہ وہ پھر سے سنت رسول اللہؐ کو زندہ کرے گا، اور "سب صحابہؓ" جو شیعوں کے سیاسی مذہب کا جزو ہیں، ابویزید مخلد کے اتباع کا محرک زیادہ تر ہوا۔

اس تلخ تجربہ کے بعد خلفاء بنو فاطمیہ نے "تقیہ" اختیار کیا اور جو کام علانیہ نہ کر سکے

خفیہ مجالس میں خاطر خواہ ہو رہا تھا کہ داعیان بنو فاطمہ کے جوش عقیدت نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا، ان کے حریف بنو عباس کا دعوئے خلافت اسی وراثت پر مبنی تھا جس پر فائق حق شفع بنو فاطمہ پیش کر رہے تھے، مگر بلحاظ سیاسی تدبر بنو عباس کا پلہ بھاری رہا اور عوام نے آخر ان ہی کی طرف رجوع کیا، اور تمام سلاطین انہی سے سند حکومت حاصل کرتے رہے اس لئے کہ اب یہ عقیدہ پختہ ہو چکا تھا، کہ خلافت کا حق صرف قریش کو ہے، میری ذاتی رائے تو یہی ہے، کہ حدیث "الائمہ من القریش" سیاسیات نے وضع کی اور اس وقت وضع ہوئی جب بنو ہاشم دنیوی خلافت سے مایوس ہو کر "امامت" پر قانع ہو گئے، اور پھر اسی کی آڑ میں دنیوی خلافت جو اصل نصب العین تھا حاصل کر لی، اہل بیت کے پرستاروں کا ابھی تک یہی عقیدہ ہے مگر غصب شدہ خلافت کسی مستحق کو نہ دی اور نہ دینے کے لئے تیار ہیں۔

خلافت قریشیہ بالکل ختم نہیں ہوئی ریاست دنیوی اور سیادت دینی آج تک موجود ہے اور ہم اس کا حال اپنے زمانہ کے سلاطین اسلام کی ذیل میں کریں گے۔



دیگر مطبوعات ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

انگریزی :-

کتاب	آنے	روپے
۱۔ اسلامک آئیڈیالوجی (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی)	۸	۸
۲۔ فنڈمینٹل ہیومن رائٹس (مصنفہ " " ")	۸	۰
۳۔ دی فیلسی آف مارکسزم (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی)	۱۲	۰

اُردو :-

کتاب	آنے	روپے
۴۔ عقائد و اعمال (مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی)	۱۲	۰
۵۔ اسلام میں حریت، مساوات، اخوت (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر)	۰	۱
۶۔ اسلام اور حقوق انسانی (مصنفہ " " ")	۴	۱
۷۔ اسلام کا معاشی نظریہ (مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی)	۸	۱
۸۔ دینِ فطرت (مصنفہ " " ")	۸	۱
۹۔ اسلام کی بنیادی حقیقتیں (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم و دیگر رفقائے ادارہ)	۸	۲
۱۰۔ اسلام کا نظریۂ تعلیم (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین)	۰	۱

زیرِ طبع کتابیں

۱۔ اصول فقہ اسلامی اور حدود اللہ و تعزیرات

۲۔ اسلام کا نظریۂ اخلاق

۳۔ علم تصوف

۴۔ مقام سنت

۵۔ مسئلہ اجتہاد

۶۔ تہذیب و تمدن اسلامی

۷۔ قرآن و علم جدید

۸۔ خلافتِ اسلامیہ حصہ اول، دوم، سوم

۹۔ اکونامکس آف اسلام

۱۰۔ اسلام و کامیونزم

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

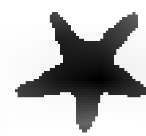
(پاکستان)

(اتحاد پریس پل روڈ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین پرنٹر چھپی)

خلافتِ اسلامیہ

(حصہ دوم)

خواجہ عباد اللہ اختر
(رفیقِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ)



مطبوعاتِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ لاہور
(پاکستان)

۱۹۵۱ء

دیگر مطبوعات ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ لاہور

انگریزی

۱۔ اسلامک آئیڈیالوجی (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی)

۲۔ فنڈمنٹل ہیومن رائیٹس (مصنفہ " " ")

۳۔ دی فیلیسی آف مارکسزم (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی۔ ایچ ڈی)

اردو

۴۔ عقائد و اعمال (مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی)

۵۔ اسلام میں حریت، مساوات، اخوت (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر)

۶۔ اسلام اور حقوق انسانی (مصنفہ " ")

۷۔ اسلام کا معاشی نظریہ (مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی)

۸۔ دینِ فطرت (مصنفہ " ")

۹۔ اسلام کی بنیادی حقیقتیں (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم و دیگر رفقائے ادارہ)

۱۰۔ اسلام کا نظریہ تعلیم (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

زیرِ طبع کتابیں

۱۔ اصول فقہ اسلامی اور حدود اللہ و تعزیرات

۲۔ اسلام کا نظریہ اخلاق

۳۔ علمِ تصوف

۴۔ مقامِ سنّت

۵۔ مسئلہ اجتہاد

۶۔ تہذیب و تمدن اسلامی

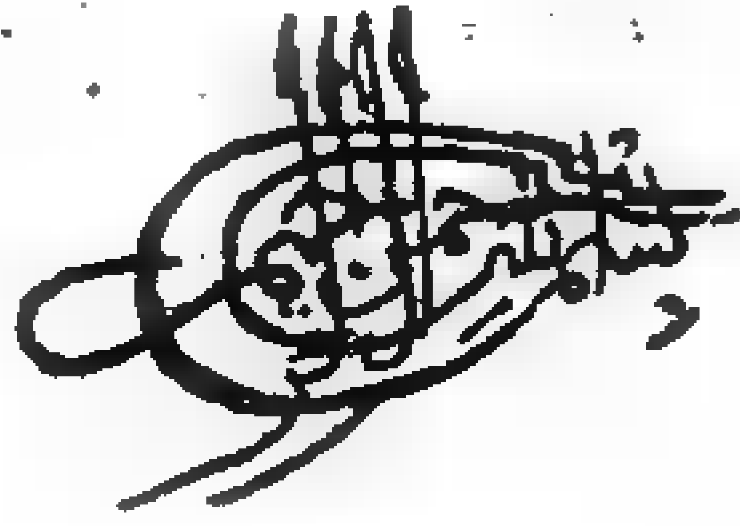
۷۔ قرآن و علم جدید

۸۔ خلافتِ اسلامیہ حصہ اول، دوم

۹۔ اکونامکس آف اسلام

۱۰۔ اسلام و کامیونزم

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور
(پاکستان)



خلافت اور سلطنت

اس کتاب کے حصہ اول میں ہم نے خلافت کے تحت لکھا ہے کہ خلافت کا اول منشاء
دین ہے اور مسلمانوں میں جو بھی صاحب حکومت، اس مقصد کو پورا کرتا رہا مستحق
اسے خلیفہ کے نام سے موسوم کیا جائے، لیکن اسے ایک عقیدہ کا کرشمہ کہو یا حقیقت
ل قریش میں سے خلفاء راشدین، بنی امیہ، اور بنو عباسیہ اور بنو فاطمیہ ہی خلیفہ
ئے، اگرچہ حریف قبائل ان کی خلافت تسلیم نہیں کرتے تھے، مگر دنیائے اسلام نے تسلیم
جب قریش کی حکومت کچھ خانہ جنگی اور کچھ نا اہلیت اور کچھ غیر قریش مسلم اقوام کے عروج
سبب ختم ہوگئی، تو ان کے بعد غیر قریش "سلاطین" ہی کہلائے۔ ان کو بھی ایک عقیدہ کی
جہ بخشے ہو چکا تھا، اس بات کا احساس تھا کہ ان کو حق حکومت اس وقت تک حاصل
ں ہو سکتا جب تک خلفاء عباسیہ ان کو سندِ سلطانی عطا نہ فرمائیں، چنانچہ یہ سلاطین
سلطانی حاصل کرتے رہے، اگرچہ ان کی حیثیت اب خانقاہ کے پیروں کی سی رہ گئی
جو اپنے مریدوں کو خرقۂ خلافت عطا کرتے ہیں، خلافت کا اقتدار اب صرف اشارہ گیا
لہ دنیائے اسلام میں نماز جمعہ کے خطبوں میں ان کا نام سلطان وقت کے نام کے ساتھ
جاتا تھا۔

حرمین شریفین مکہ معظمہ اور بیت المقدس حرمین ہیں جہاں جنگ و جدل ممنوع ہے

اس لئے کہ فاروق اعظمؓ کے عہدِ خلافت میں جب اسلامی لشکر نے شہر "قدس" کو محاصرہ میں لے لیا تو حیران تھے کہ کیا کریں، بطریق یروشلم کو بھی معلوم تھا کہ شہر کا احترام مانع خونریزی ہے اس لئے وہ مسلمانوں کی بے بسی کا فائدہ اٹھاتا رہا، مگر جب دیکھا کہ فائدہ دیرپا نہیں تو مسلمانوں کی پیش کردہ شرائط صلح منظور کرتے ہوئے اس شرط کا اضافہ کیا کہ خلیفہ خود اس کی تصدیق میں روبرو کرے، مجبوراً حضرت عمرؓ کو بھی یہاں آنا پڑا، یہ سب کارروائی اس لئے کرنی پڑی کہ یہ حرم تھا، لیکن زمانہ گذرتا گیا، اور خود مسیحیوں نے حرم کا احترام اٹھا دیا اور "حروب صلیبیہ" میں اس کی حرمت برقرار نہ رکھی، مسلمانوں نے یہ بھی بھلا دیا کہ یہ "حرم" ہے اس کی جگہ مدینہ منورہ نے لے لی، اب مسلمانوں کا عام عقیدہ ہے کہ "حرمین" صرف مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہیں اور یہ کہ خلیفہ وقت پر ان کی حفاظت اور احترام فرض ہے، جو والہانہ محبت مسلمانوں کو روضۂ اقدس سے ہے اس کا تقاضہ یہی کچھ ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ "حرمین" سے مراد شہر قدس اور مکہ معظمہ ہی ہے،

استحقاقِ خلافت کے لئے یہ بھی ضروری ہوا کہ خلیفہ وہی ہے جس کی سرپرستی میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ ہوں، اس لئے غیر قریش مسلم حکمرانوں میں سے جس کو بھی ہوسِ خلافت ہوئی وہ ارض حجاز پر قبضہ کے لئے جدوجہد کرتا رہا، خاندان صفویہ نے انتہائی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے، اور نہ کبھی خلافت کا دعوےٰ کیا، بعض مورخین نے انہیں "سادات" لکھا ہے تاریخی زمانہ میں عرب میں رہتے ہوئے بنو ہاشم نے کبھی اس کو اپنا امتیازی لقب مقرر نہیں کیا، جب کہ خلافت ان کے ہاتھ سے نکل گئی، "اشراف" ہی کہلائے، جن کو ہم "حسنی سادات" کہتے ہیں وہ اہلِ حجاز کی "اصطلاح" میں "الاشرف" سے موسوم ہیں، ہمارے زمانہ میں بھی "حسین" شریف مکہ اسی حیثیت سے کہتے رہے، صدیوں سے یہ لوگ کعبۃ اللہ اور روضہ مطہرہ کے متولی چلے آتے ہیں، اور ان کی حکومت عملاً حرمین شریفین پر بھی رہی، اسی قبیلہ کا ہر فرد "شریف" کہلاتا ہے خواہ وہ صاحب حکومت نہ بھی ہو، ان کی تعداد تیس ہزار کے قریب ہے، اور ان کا نسب "شریف ابو نمی" (متوفی سنہ ۹۹۲ھ) سے جا ملتا ہے،

صفوی خاندان کے سلاطین کے تین نام نمایاں ہیں، اسمٰعیل اور عباس اور طہماسپ

بھی بار بار ثانی اور ثالث ہیں، ایک نام سلیمان کا اضافہ نہ کیا جائے ۔ تو اس خاندان کے نام ختم ہوجاتے ہیں، کوئی عرب بنو فاطمہ کا کیا مذکور ہے، اگبری نام طہماسپ پسند نہیں کریگا۔

سلطان سلیم سلطان روم وشام نے ارض حجاز پر قبضہ کے بعد دعویٰ خلافت کیا، یہ دعوے اس کے مقبوضہ ممالک ہی میں تسلیم کیا گیا، اس کے جانشین سلطان کو بھی ہندوستان کے مسلمانوں نے خلیفہ تسلیم کرلیا، اس لئے کہ اس جگہ انگریزی حکومت قائم ہو چکی تھی، خطبہ میں کسی خلیفہ کا نام ضرور ہونا چاہیئے، اس خلافت کا دور ہمارے زمانہ میں ختم ہوا، اب صرف آنحضرت اور خلفاء راشدین اور امامین شہیدین کا نام ہی رہ گیا،

جب تک خلافت قریش میں رہی، اس کی حکومت مرکزی تھی، خلفاء عباسیہ وقتاً فوقتاً سلاطین کے نام فرمان جاری کرتے رہے، کہ غیر مسلم حملہ آوروں کا مقابلہ کرو، چنانچہ سلجوقی اور ایوبی حکمران تعمیل کرتے رہے، اگرچہ خود خلافت عباسیہ ان حکمرانوں کی سرپرستی میں تھی،

ہم نے اس کتاب کا نام خلافت اسلامیہ رکھا ہے، یہ نام اس کتاب کے حصہ اول کے مناسب تو ہے کیونکہ اس میں صرف خلافتِ قریش کا مذکور ہے، دوسرے حصہ کا نام "سلطنتِ اسلامیہ" موزوں تھا، کیونکہ ان میں صرف "سلاطین" کا حال لکھا گیا ہے مگر جو کچھ ہم خلافت کا مفہوم سمجھتے ہیں، اس کا یہی تقاضا ہے کہ نام کتاب "خلافت اسلامیہ" ہی صحیح ہے سلاطین اگرچہ خود مختار بادشاہ تھے۔ مگر مرکزی حکومت یا خلافت عباسیہ کا تنا احترام ضرور ملحوظ رکھتے، کہ جو کچھ فرمان صادر ہوتا تعمیل کرتے آج ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اتحاد بین المسلمین ہو، اور وہ سلاطین یا جمہوریہ جو مختلف ممالک اسلام پر حکمران ہے ایک مؤتمر حسب ارشاد قرآن قائم کریں، جس میں مختلف ممالک اسلامیہ کے نمائندے ایک مرکزی مقام مدینہ منورہ یا ایسے ہی کسی مقام پر (ما سوائے مکہ معظمہ) ایک ادارہ قائم کریں جو اُن کے داخلی تنازعات کا فیصلہ عدل وقسط سے کرے اور ساتھ ہی خارجی معاملات کا انصرام اس کے ہاتھ میں ہو۔

ان ایام میں جس کی تاریخ ہم لکھ رہے ہیں، اس کا ایک دھندلا سا نقشہ کھنچ چکا ہے مگر اس کا صحیح تصور اس زمانہ کے ذہن میں نہ تھا، اس کتاب کے آخر میں ہم اس موضوع پر بحث کریں گے

اس کتاب کے حصہ اول میں ہم نے خلافت راشدہ اور امیہ اور عباسیہ اور فاطمہ ہی کا ذکر کیا ہے، ضمناً چند سلاطین کا نام بھی آگیا۔ چونکہ ان میں سے بعض نے عظیم الشان سلطنت قائم کی، اس لئے ہم نے یہی مناسب خیال کیا، کہ ان کا ذکر خیر علیحدہ کیا جائے

اس کے علاوہ ہمیں اس بات کا بھی خیال تھا کہ واقعات خلافت اس طرح سلسلہ وار بیان کئے جائیں، کہ پڑھنے والوں کی توجہ میں پریشانی واقع نہ ہو۔ اور حافظہ میں بلا دقت محفوظ ہوتے چلے جائیں،

حصہ اول کے مطالعہ کے بعد قارئین پر چند امور واضح ہو گئے ہوں گے، کہ ایران کی تسخیر کے بعد جس نے اسلام قبول کر لیا، مسلمانوں کا مقابلہ، مقاتلہ اہل یورپ سے مسلسل رہا اور ابھی جاری ہے، مسلمانوں نے ہسپانیہ اور جزائر بحر الشام پر قبضہ کر لیا، اور جب یہاں سے بیدخل ہوئے تو یہ سلسلہ جنگ پہلے حروب الصلیبیہ کی صورت میں شمالی افریقہ اور ارض شام میں جاری رہا۔ اب مذہب کا نام نہیں لیکن قومی مفاد کے لئے ہوس ملک گیری تو ہے، ارشاد قرآن ہے کہ

قل للمخلفين من الاعراب ستدعون الى قوم اولى باس شديد تقاتلونهم او يسلمون فان تطيعوا يوتكم الله اجرا حسنا

(پارہ ۲۶، رکوع ۱۰)

ان گنواروں کو پیچھے بیٹھ رہنے کہو کہ (تم میری زندگی میں میرے ساتھ تو کسی غزوہ میں شامل نہیں ہو سکتے البتہ) قریب تر زمانہ میں تم کو ایک سخت جنگجو قوم کے مقابلہ میں (خلیفہ وقت) دعوت دی جائے گی، تم ان سے لڑتے رہو گے یا وہ مطیع ہو جائیں گے اور اگر تم نے اطاعت (خلیفہ وقت) کی، تو اللہ تم کو نیک اجر عطا فرمائے گا،

اس آیت کا شانِ نزول ان ہی آیات کی پہلی آیتوں میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت جب اپنے ایک خواب کی بنا پر کہ مسلمان مکہ میں امن سے داخل ہو رہے ہیں، اصحاب کے ساتھ مکہ کی طرف سے نکلے تو بعض اعراب نے یہ عذر کیا کہ ان کے گھران کی عدم موجودگی میں خطرے

یں رہیں گے اس لئے اجازت حاصل کر لی اور آنحضرت کا ساتھ نہ دیا، جب آنحضرتؐ مکہ سے مع الخیر لوٹے اور یہود کی سرکوبی کے لئے خیبر کی مہم تیار ہوئی، تو یہ اعراب بھی آموجود ہوئے ان کو کہا گیا، کہ تم ہمارے ساتھ نہیں جا سکتے" البتہ میرے بعد تم کو ایک جنگ جو قوم کے مقابلہ کے لئے بلایا جائے گا، چونکہ اس آیت میں لفظ "یسلمون" استعمال ہوا ہے اس لئے مفسرین نے اس قوم سے اشارہ اہل فارس سمجھا، اور سب مسلمان ہو گئے، لیکن سورہ بنی اسرائیل میں بھی الفاظ "اولی باس شدید" (۵/۱۷) رومیوں کے واسطے استعمال ہوئے ہیں اور واقعات بھی اس کی تائید میں ہیں، کہ آیت محولہ میں "اولی باس شدید" سے مسیحی ہی مراد ہیں آخر ان لوگوں نے اسلام قبول کرنا ہے۔

دوسرا امر جو حصہ اول کے مطالعہ کے بعد واضح ہوا ہوگا یہ ہے کہ خلافت اہل عرب کے ہاتھ سے نکل کر غیر عرب مسلم اقوام کے قبضہ میں آگئی، ارشاد قرآن ہے

وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم (۳۸/۴۷)

اور اگر تم پھر جاؤ تو اللہ تمہاری جگہ ایک اور اور قوم بدل کر لائے گا، اور وہ تمہارے جیسے نہ ہوں گے

یہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی، بنو امیہ اور ہاشمیہ کی خلافت کے آخری ایام میں عمال صریحاً احکام قرآن کے خلاف تھے، منشاء خلافت پورا نہ کر سکے، ہوس اقتدار نے ہر ایک قبیلہ کو خانہ جنگی پر آمادہ کیا، بنو ہاشم بنو امیہ کی بیخ کنی کے درپے رہے، آخر دونوں تباہ ہو گئے، اور غیر قوم مسلط ہو گئی، ان غیر عرب مسلمان اقوام کا حال ہم اس حصہ میں بیان کرتے ہیں۔

خلافت عباسیہ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں کہ عربوں کے مقابل خلفاء نے ایرانیوں کو ابھارا، اور جب یہ زیادہ زور پکڑ گئے، تو معتصم باللہ آٹھویں خلیفہ نے ترکوں کو لا کھڑا کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب تو کمزور ہوتے گئے، اور ایرانی اور ترک زور پکڑتے گئے، خلافت عباسیہ کے زوال پر دنیائے اسلام میں طوائف الملوکی کی صورت پیدا ہو گئی تھی، والی اور عامل جہاں جہاں تھے، خود مختار تھے، مگر خلافت کا احترام اتنا ضرور تھا

کہ برائے نام اسی کے تحت تھے۔ ان میں آئے دن خانہ جنگی بھی ہوتی، اور خاتمہ بھی جلدی ہوجاتا۔ ان کا مذکور بے فائدہ ہے، البتہ جس خاندان نے کچھ آثار چھوڑے ہیں بہ تعلق خلافت ہم اس کے حالات بیان کریں گے، اس کے علاوہ وہ بھی قابل ذکر ہیں جو وحدت ملت میں رخنہ انداز ہوئے۔

آل بویہ

آل بویہ کو سلاطین دیالمہ بھی کہتے ہیں، دیلم وہ مقام ہے جس کو گیلان یا جیلان کہتے ہیں، ان سلاطین کا حسب نسب بعض مورخین نے یزدجرد بن شہریار اور بعض نے بہرام گور سے ملایا ہے، جب کوئی شخص خواہ نیچ ذات کا ہو کسی اعلیٰ مرتبہ پر پہنچتا ہے تو کسی نہ کسی بادشاہ سے اس کا رشتہ جوڑ دیا جاتا ہے ہندی اور رومی، اور یونانی مشاہیر کسی نہ کسی آسمانی دیوتا کی اولاد تھے، سیاسی غرض تو صرف اتنی ہے کہ عوام کالانعام کے دلوں پر عظمت کا سکہ جا دیا جائے۔ شخصیت پرستی کی ابتدا اسی میں ہے، بہرحال یہ لوگ ایرانی نژاد تھے۔ لیکن اس میں بھی کلام نہیں کہ دیلم کے رؤسا تھے۔

شجرہ نسب

ابوشجاع بویہ

(۱) احمد معزالدولہ سنہ ۳۴۱ھ ۹۵۲ء
(۲) بختیار عزالدولہ سنہ ۳۵۶ھ

حسن رکن الدولہ
(۳) عضدالدولہ سنہ ۳۵۷ھ
(۴) صمصام الدولہ سنہ ۳۷۳ھ ۹۸۲ء
(۵) شرف الدولہ سنہ ۳۷۹ھ ۹۸۹ء
ابونصر بہاءالدولہ

علی عمادالدولہ

یہ خاندان نہ صرف بغداد میں خلافت پر چھا گیا بلکہ دنیائے اسلام کے اکثر حصہ پر قبض ہو گیا، اس خاندان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ شیعہ مذہب جس کا جزو "تبرا صحابہ" ہے، ان ہی کے دور ودرہ میں رائج ہوا، اس وقت تک سیاسی اغراض کے تقاضہ کے تحت اموی بنو ہاشم کو اور بنو ہاشم بنو امیہ کو برا کہتے رہے اور جب اموی خلافت کا خاتمہ ہوا تو بنو ہاشم باہم دست و گریباں ہوئے، عباسیوں نے اولادِ علیؓ سے وہ سلوک کیا جو بنو امیہ نے بھی روا نہ رکھا تھا، ۳۵۱ھ میں معز الدولہ کے حکم سے تمام مساجد بغداد کے دروازوں پر امیر معاویہ اور خلفاء بنو امیہ اور صحابہ کبار پر لعن آویزاں کیا گیا، بغداد میں ہیجان پیدا ہو گیا، خلیفہ تو بے بس تھا، وزیر محمد بن مہدی کے تدبر نے ہنگامہ فرو کیا، معز الدولہ نے اتنا مان لیا، کہ "تبرا" کی فہرست سے امیر معاویہ کا نام خارج کیا جائے، ۳۵۲ھ دسویں ماہِ محرم کو یومِ کربلا منایا گیا، عورتیں ماتم کرتی ہوئی بغداد کے بازاروں میں جلوس کی صورت میں نکلیں دسویں ذوالحجہ کو عید غدیر منائی گئی،

معز الدولہ کو یہ شبہ ہوا کہ خلیفہ مستکفی اسے برطرف کرنا چاہتا ہے، اس لئے خلیفہ ہی کو پیش دستی کر کے معزول کر دیا اور آنکھیں نکلوا دیں، اور اس کی جگہ مطیع باللہ کو تختِ خلافت پر بٹھا دیا، آل بویہ نے مسلمانوں میں شیعہ سنی کی تفریق پیدا کی، یہ خلیج صفوی خاندان نے وسیع تر کر دی۔

۳۵۶ھ میں معز الدولہ مر گیا، اس کا بیٹا بختیار جانشین ہوا، خلافت کی طرف سے امیر الامرا کا خطاب عطا ہوا، لیکن تھوڑے عرصہ بعد عضد الدولہ نے اسے برطرف کر کے خلافت کو اپنی سرپرستی میں لے لیا، اس کو تاج الملت کے خطاب سے نوازا گیا، ۳۷۲ھ میں یہ راہی ملکِ عدم ہوا، تو اس کا بیٹا صمصام الدولہ جانشین ہوا، اور شمس الملت خطاب ملا، مگر برادر نامہربان شرف الدولہ نے برطرف کیا، چار سال شرف الدولہ نے بھی سلطنت کی، ۳۷۹ھ میں مر گیا، تو اس کا بیٹا بہاء الدولہ ضیاء الملت جانشین ہوا، اور اس پر آل بویہ کا چراغ گل ہو گیا،

اس میں کچھ شک نہیں کہ آل بویہ کا نصب العین یہ تھا کہ عباسیوں سے عنان

خلافت چھین کر خود مطلق العنان بادشاہ بن بیٹھیں، عضد الدولہ آل بویہ میں اولو العزم سلطان تھا، اپنی بیٹی خلیفہ الطائع کے عقد میں دے دی۔ اور خلیفہ کی لڑکی سے خود شادی کی، غرض محض سیاسی تھی، کہ اس تعلق کی وجہ سے خلافت اس کی اولاد میں منتقل ہو جائے مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ" سلطان کا لقب یا خطاب خلفاء عباسیہ کی اختراع ہے۔ اس کا مفہوم زیادہ سے زیادہ نائب السلطنت تھا۔ شرف الدولہ نے خلیفہ طائع پر زور دیا کہ اس کو خطاب شہنشاہ عطا کیا جائے مگر خلیفہ نے نہ مانا، شرف الدولہ کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے بہاؤ الدولہ نے خلیفہ طائع کو برطرف کر کے اُس کے بھائی ابو العباس احمد القادر باللہ کو خلافت کا خلعت پہنایا اگرچہ آل بویہ کا خاتمہ ہو گیا۔ مگر ایک صدی تک اُن کا طوطی بولتا رہا، خلیفہ کے نام کے ساتھ سکہ پر اس کا نام کندہ ہوتا، خطبہ میں ان کا نام لیا جاتا، ان ایام خلافت میں مشاہیر اسلام پیدا ہوئے، کہ جب تک دنیا ان کا نام زندہ رہے گا۔

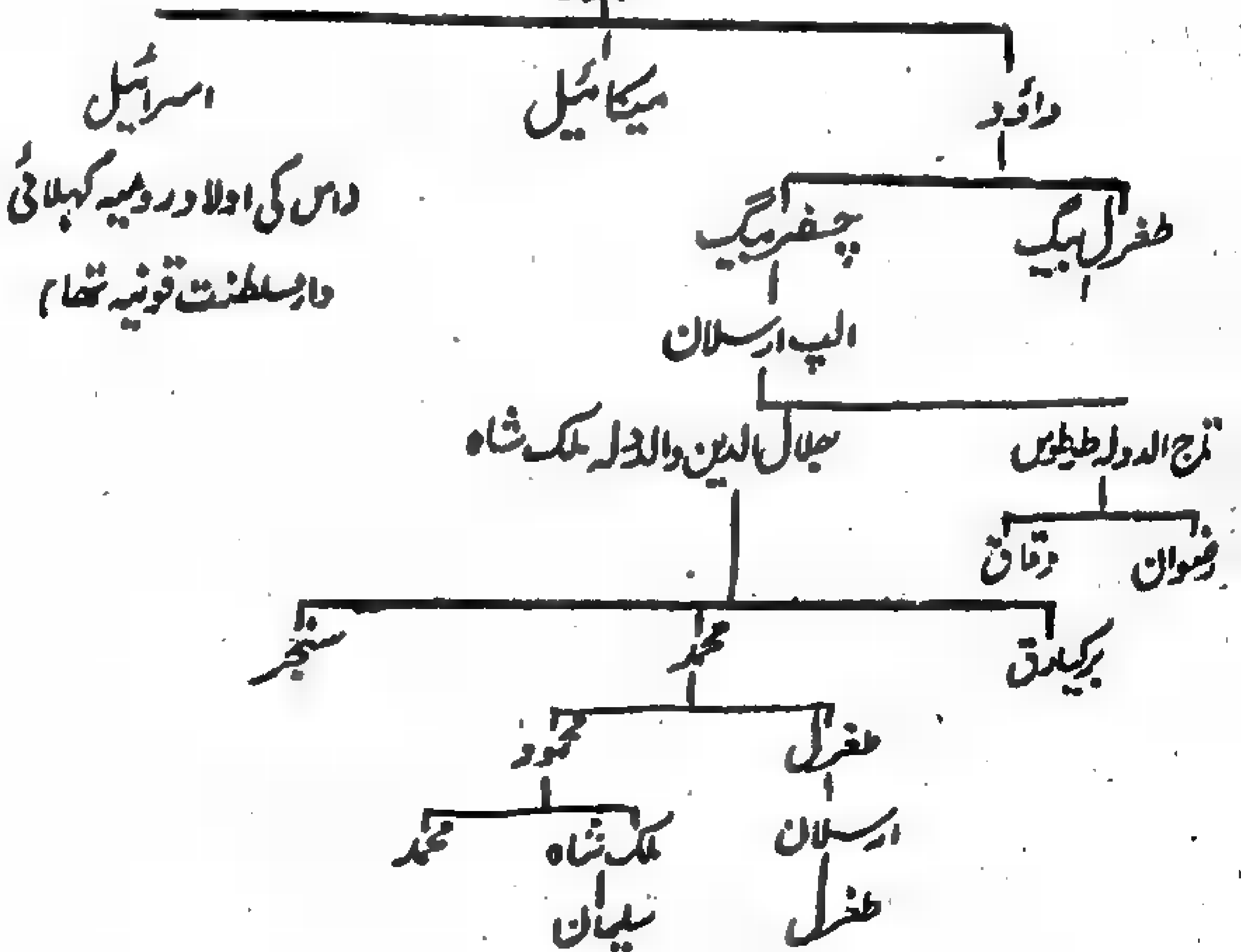
ان میں سے، ابو نصر فارابی فلسفی، متنبی شاعر، ابو الفرح صاحب کتاب الاغانی ابو القاسم، التنوخی، الدینوری خلیفہ مطیع باللہ کے عہد میں گذرے ہیں۔ طائع کے عہد میں ابو الوفا نے علم مثلث میں قابل قدر دریافت کی، خلفاء عباسیہ کے دور دورہ میں ہر ایک خلیفہ کے عہد میں علوم و حکمت کی خاص خاص شاخ کی طرف طبائع زیادہ مائل رہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر ایک عہد میں طبائع کا رجحان کس طرف تھا، ہارون اور مامون کے عہد میں ہر ایک زبان کی علمی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا، خلیفہ معتمد علی اللہ کے عہد میں امام بخاری، امام مسلم، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ محدثین تھے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے محدثین کی طویل فہرست اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں دی ہے، حضرت ابراہیم ادھم مشہور صوفی بزرگ بھی اسی عہد میں تھے۔ معتضد کو علم ہیئت سے خاص لگاؤ تھا، اسحٰق بن حنین فلکی علم نجوم کا بڑا ماہر تھا، اس نے تقویم معتضدی مرتب کی۔ ابو ریحان بیرونی جو خود بھی علم ہیئت کا ماہر ہے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ مقتدر باللہ کی توجہ علم کی طرف نہ تھی، حسب بیان مسعودی وہ حالات مملکت سے بے خبر تھا، لیکن اس کے عہد

ہیں بلگیریا کا بادشاہ سنہ ۳۱۰ھ میں حلقہ بگوش اسلام ہوا، علماء وفضلاء کی ایک جماعت بھی اسی کی استدعا پر بلگیریا میں خلیفہ نے بغرض اشاعت بھیج دی۔ علامہ ابوجعفر بن جریر طبری نے اپنی تاریخ اسی عہد میں مکمل کی۔ مفسرینِ قرآن بھی اسی عہد میں چوٹی کے تھے۔ امام ابراہیم نے تفسیر دمشقی، شیخ ابوالحسن نے "احکام قرآن"، شیخ محمد نے "اعجاز القرآن"، امام ابوبکر نے تفسیر ابن المنذر، شیخ قاسم معتزلی تفسیر کبھی لکھی۔ عبداللہ بن معتز غالب باللہ خود علم خطابت وشعر وادب میں کامل تھا اور صاحب تصانیف وتالیف بھی ہے،

دولتِ سلجوقیہ

مناسب تو یہ تھا کہ پہلے دولتِ غزنویہ کے حالات لکھے جاتے جس کے زوال پر سلجوقیہ کو عروج ہوا۔ لیکن غزنویہ کا تعلق ہمارے ہندوستان سے گہرا ہے۔ اس لئے سلسلہ قائم رکھنے کے لئے ہم سلاطین سلجوقیہ کے حالات لکھتے ہیں جس کا تعلق عراق وشام وایران سے ہے،

شجرہ نسب



سلجوق اصل میں ترک ہیں، ترک اور مغل ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں ترکستان کے بادشاہ کے دربار میں ایک شخص سلجوق نامی تھا کسی وجہ سے خفا ہو کر نواحی سمرقند میں چلا آیا یہاں مسلمانوں کے اخلاق اور اعلیٰ طرز معاشرت کا اتنا اثر ہوا کہ بہ طیب خاطر اسلام قبول کیا، یہ علاقہ ابھی تک ترک بادشاہ کا باج گذار تھا ایک دفعہ شاہ ترکستان کے آدمی خراج لینے کے لئے آئے، تو سلجوق نے مزاحمت کی اور مسلمانوں کو کہا کہ حیف ہو کہ تم کافروں کو خراج دیتے ہو، مسلمانوں نے شاہ کے آدمیوں کو شہر بدر کر دیا۔ سلجوق کا اعزاز ہر ایک شخص کرنے لگا، ابراہیم سامانی جس کے حالات ہم علیحدہ لکھیں گے۔ سلجوق کی کا ایک خان کے خلاف خواستگار ہوا۔

فتح کے بعد سلجوق کا نام اور روشن ہو گیا، اس کا ایک بیٹا میکائیل ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے دو پوتے (دیکھو شجرہ نسب) اولو العزم بہادر نکلے، اس وقت ایلک خان نگین حاکم ماوراء النہر تھا جس کو سلجوق نے بپاس خاطر سامانی بادشاہ ابراہیم شکست دی تھی، ترکستان کے سلاطین ہمسایہ تھے، سب سلجوق کی روز افزوں طاقت کے سامنے دب گئے، اس کے دو پوتے طغرل بیگ اور جیفر بیگ کامل اتحاد اور اخلاص اور محبت سے رہے۔ اس وقت عربوں کے ہاتھ سے دنیوی شان و شوکت نکل چکی تھی، اور اگر خاندان سلجوق نہ اٹھتا، تو وہ خواب جو ابو مسلم خراسانی اور برامکہ وغیرہ دیکھ رہے تھے شرمندۂ تعبیر ہو جاتا اور پھر سے ایرانی حکومت قائم ہو جاتی، اور یقیناً زرتشتی یا مزدکی یا مانوی مذہب اسلام کی جگہ لے لیتا، اس وقت آل سلجوق نے نہ صرف آل بویہ کا خاتمہ عراق و ایران میں کیا۔ بلکہ رومی شاہان قسطنطنیہ کی پیش قدمی کو بھی روک دیا، اور شورش جو بنو فاطمہ کے ایک داعی بساسیری نے بغداد میں مچا رکھی تھی، طغرل بیگ نے دبا دی، آل بویہ متعصب شیعہ تھے اور آل سلجوق متعصب سنی۔

تاریخ واقعات میں اس حقیقت کا اعادہ کرتی رہتی ہے کہ جب کوئی قوم اٹھتی ہے تو وہ صرف اہل سیف ہوتی ہے خلافت راشدہ اور امویہ اس کی واضح مثال ہیں خلافت عباسیہ کا زوال مامون رشید کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جب اہل قلم حضرات

نے اہلِ سیف کی جگہ لے لی، اس دماغی تعیش کا مظاہرہ محفلِ عیش ونشاط میں ہوتا۔
ایک شاعر نے عباسی خلیفہ کو متنبہ کیا

مبلغ امیر المومنین رسالۃً من ناصحٍ لک لا یرید خداعًا

ایک ناصح کی طرف سے جو فریب کے ارادہ سے نہیں بلکہ بہ نظر خیر خواہی
جو کچھ عرض کرتا ہے، امیر المومنین کی خدمت میں اس کا پیغام گوش گزار کردو۔

بضع انفساۃ بالف الف کامل وتبیت مساوات الجنود جیاعًا

ایک حسین عورت کامل دس لاکھ درہم کا سرمایہ حاصل کرلیتی ہے اور لشکر کے
سرداروں کا یہ حال ہے کہ دن بھر فاقہ کے بعد بھوکے سو رہتے ہیں۔

لولا بی حفص اقول مقالتی وابث ما ابثثتکم لارتاعًا

اگر میں یہی بات ابی حفص (عمرؓ) کو کہتا جو تم سے کہہ رہا ہوں۔ تو وہ
کانپ اٹھتا۔

الپ ارسلان آل سلجوق میں طغرل بیگ اور الپ ارسلان اور ملک شاہ بلند پایہ سلاطین گزرے ہیں، ہم بیان کرآئے ہیں کہ خلافت بنو امیہ کے بعد فتوحات اور اس کے ساتھ اشاعت اسلام کی سرعتِ رفتار دھیمی پڑ گئی، بنو عباس اور بنو فاطمہ کا دورِ حکومت یا تو خانہ جنگی یا والیوں کی بغاوت فرو کرنے میں ختم ہوگیا، قیصر قسطنطنیہ ان حالات سے بے خبر نہ تھا، بار بار شام پر فوج کشی کرتا رہا، اب جب کہ خلفاء بے حقیقت ہوکر رہ گئے، تو قیصر نے پھر شام پر حملہ کردیا، اس کے مشہور سرداران فورج "نسی فورس" اور "زیمیس" اور "باسل" نے انطاکیہ تک یونانی شہنشاہیت کو وسعت دی تھی، آرمینیہ کے مشرق تک پھیلی ہوئی تھی، ایشیا کا یہ حصہ البتہ خیر تھا کہ اس کی واپسی کے لئے طغرل بیگ نے انتہائی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہوئی، اس کا برادر زادہ الپ ارسلان ان تمام لڑائیوں میں ہمراہ تھا۔ اس کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ قیصر کی پیش قدمی رک گئی، ۴۵۵ھ میں اس بہادر سلجوقی کا انتقال ہوگیا، تو خلیفہ بغداد قائم بامر اللہ نے مسند سلطانی الپ ارسلان کو عطا فرمائی، طغرل کی وفات پر باغیوں نے پھر سر اٹھایا، پانچ سال کے عرصہ میں الپ ارسلان

نے پھر سے امن وسکون پیدا کر دیا، یہ وقت ایسا نازک تھا، کہ اگر رومی امور سلطنت کا نظام خانہ جنگی سے درہم برہم نہ ہوگیا ہوتا، تو قیصر بسہولت تمام شام پر قابض ہو جاتا سنہ ۱۰۶۸ء میں قیصر "رومانس دیوجانس" نے حملہ کر دیا، قیصر اصل میں ایک سپاہی تھا، بہادری کے جوہر میدان جنگ میں دکھا چکا تھا، وہ نہ صرف لوگوں میں ہر دلعزیز تھا، بلکہ رفتہ رفتہ ملکہ "ایڈوسیہ" کے دل پر بھی قابو پالیا، اور شادی کے بعد شاہ ہوگیا،

الپ ارسلان اور قیصر دیوجانس برابر کی چوٹ تھے، لیکن بعض باتوں میں قیصر کو فوقیت حاصل تھی، گبن لکھتا ہے کہ قیصر کے ہمراہ بیشمار سامان حرب اور قواعد دان فوج کے علاوہ "فرجیہ" اور "کیپدوسیہ" کے رضاکار بھی تھے۔ لیکن اس کی طاقت یورپ کے معاونین اور "مقدونیہ" کی فوج اور "بلگیریا" کا لشکر اور "مالدیویہ" کی جفاکش سپاہ تھی فرانسیسی اور نارمن امداد اس کے علاوہ تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام یورپ ایک طوفان کی صورت میں برپا ہوگیا ہے، رومانس اس سیلاب عظیم کے ساتھ امڈا چلا آرہا تھا، اور جو کچھ راستہ میں پڑا خس وخاشاک کی طرح بہہ گیا،

خلیفہ بغداد تو ایک آہ سرد کھینچ کر رہ گیا، لیکن الپ ارسلان شیر کی طرح غراتا ہوا مقابلہ میں آیا، گبن لکھتا ہے کہ شہنشاہ رومانس کو حب الوطنی یا غرور نے ابھارا جو اس قدر جاہ وحشمت اور عسکری قوت کے بل بوتے پر عموماً انسانی دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے جس کا مالک اس وقت قیصر تھا، اسلامی ممالک پر جو کسی وقت رومی قبضہ میں تھے۔ لشکر کشی کی، اس کی اولوالعزمی نے سپاہ کا دل بڑھایا، رومیوں کی امیدیں بندھ گئیں اور دشمن کے قلب پر خوف طاری ہوگیا،

الپ ارسلان کے ہمراہ صرف چالیس ہزار سوار وپیادہ جمعیت تھی، اور حریف کے ہمرکاب ایک لاکھ سوار اور یورپ کے رضاکاروں کی تعداد اس کے علاوہ تھی، جس کا تانتا بندھا ہوا تھا، یہ تعداد گبن نے لکھی ہے اس جنگ کی کیفیت ہم اسی مؤرخ کے الفاظ میں بیان کرتے ہیں،

"ارض روم" اور "وان" کے درمیان دونوں فوجوں کے ہراول کی مڈبھیڑ

ہو گئی۔ رومی ہراول بسر کرو گی مشہور جرنیل "باسلیس" جوش و خروش سے حملہ آور ہؤا۔ مگر جوابی حملہ سے پاؤں اُکھڑ گئے ، اور باسلیس زندہ گرفتار ہؤا۔
الپ ارسلان نے (بقول گبن) جس جوانمردی کا ثبوت دیا وہ ایک قابل قدر مثال فاتحین کے لئے اور بالخصوص مسیحیوں کے لئے ہے ، جو فتح کے نشہ میں نہ تو بچوں اور نہ عورتوں اور نہ اپاہج بوڑھوں پر رحم کرنا جانتے ہیں ، الپ ارسلان نے نہ صرف شکست خوردہ سپاہ کا تعاقب ہی نہ کیا بلکہ اسیران جنگ کو زادِ راہ دے کر چھوڑ دیا "
اس فتح و شکست کا اثر فریقین پر کچھ نہ ہؤا ، قیصر بذاتِ خود میدان جنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ الپ ارسلان نے انتظار میں اُسی جگہ خیمے ایستادہ کر دیئے ، لیکن الپ ارسلان حریف کی جنگی قوت اپنی کمزوری کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، گبن لکھتا ہے کہ الپ ارسلان نے شہنشاہ کو صلح کا پیغام بھیجا جس کی شرائط رومیوں کے حق میں مفید تھیں ، اب قیصر کو یقین ہو گیا۔ کہ حریف جنگ سے پہلو بچا رہا ہے ، اور جان بچانا چاہتا ہے۔ جواب میں نہائیت ناشائستہ الفاظ استعمال کئے ، اور آخر میں یہ لکھا۔ کہ

"اگر تم ایسے ہی ہمدرد بنی نوع انسان ہو اور بندگان خدا کا خون بہانا پسند نہیں کرتے ، تو چپکے سے ہٹ جاؤ ، اپنا دار الحکومت اور شاہی قصر (رَے) ہمارے حوالے کر دو۔ تاکہ تمہارے قول کا ثبوت فعل سے ہو"

الپ ارسلان کو جب یہ جواب ملا تو آب دیدہ ہو گیا ، فرشِ خاک پر اللہ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اپنی برأیت کا اظہار کیا ، اور اسلام کی فتح و نصرت کے لئے دعا مانگی پھر افسران کو جمع کیا ، اور کہا۔ کہ

"میری آخری وصیت سن لو ، میں تمہاری زندگی کو موت پر ترجیح دیتا ہوں۔ جو بھی جانا چاہے میں بخوشی خاطر اجازت دیتا ہوں "

سب نے یک زبان ہو کر کہا :-

"نہیں ہرگز نہیں ، ہم اس جگہ ثوابِ شہادت کے لئے آئے ہیں۔ بزدل ہے ،

کافر ہے جو میدان جنگ میں پیٹھ دکھلائے"۔

الپ ارسلان نے اُسی وقت اپنا ترکش پھینک دیا، اور نیام سے تلوار نکال کر نیام اور تاج بھی پھینک دیا، اور کہا کہ

"میدان جنگ ہی میرا مدفن ہوگا"

سَر پر کفن باندھ لیا، افسران فوج نے بھی تقلید کی، گبن لکھتا ہے کہ اگرچہ سلطان نے تیر ترکش پھینک دیئے۔ لیکن اس کی امید ترک قادر اندازوں ہی سے وابستہ تھیں دوسرے دن جب فوج کو بصورت ہلال حریف کے مقابل کیا یہ تیر انداز اول صفوں میں تھے قیصر نے اپنا لشکر مربّع صورت میں آراستہ کیا، قیصر قلب لشکر میں اور الپ ارسلان چیدہ سواروں کے ساتھ عقب لشکر میں رہا۔

موسم گرما تھا۔ آفتاب طلوع ہو رہا تھا کہ بازار کارزار گرم ہوگیا۔ قیصر اس جوش وخروش سے بڑھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک فیصلہ کن دست بدست لڑائی پہ تُلا ہُوا ہے لیکن ترکی تیر اولوں کی طرح برس رہے تھے، جتنی قیصری سپاہ بڑھتی اتنی ہی ترکی فوج پیچھے ہٹتی اور رومیوں کو تیروں کی زد سے باہر نہ ہونے دیا، سورج سَر پر آیا اور ڈھلنے لگا، قیصر نے مناسب خیال کیا کہ کچھ دیر آرام کرلے، اور پیٹ کی آگ بھی بُجھالے۔

گبن لکھتا ہے کہ ہوشیار اور مستعد دشمن کے مقابلہ میں آرام طلبی کا انجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے، جب رومی علم قلب لشکر سے عقب کی طرف حرکت میں آیا، رومی لشکر میں ہلچل مچ گئی، اور بدحواسی کے عالم میں ان کی صفیں جو مربع صورت میں تھیں، ٹوٹ گئیں الپ ارسلان یہ موقعہ کب ہاتھ سے جانے دیتا، ہلالی صفوں نے اس سرعت سے تیر برسائے کہ پریشان حال رومیوں کے سروں پہ بادل سا چھا گیا، اس کے ساتھ ہی الپ ارسلان نے اپنی محافظ فوج کے ساتھ زور سے حملہ کیا، رومی جمعیت کا شیرازہ بکھر گیا، قیصر ابھی کیمپ میں نہ پہنچا تھا۔ کہ اسلامی ہلال کے دونوں بازو رومی سپاہ کے عقب میں آملے، اور دشمن کو ہر طرف سے نرغہ میں لے لیا۔

"رومانس کو اپنی غلطی کا علم ہُوا تو فوراً لوٹا، میدانِ جنگ کا نقشہ بدل چکا تھا

اس پر بھی مایوس نہ ہوا شمشیر بکف شام تک لڑتا رہا۔ اس کے بہادر سپاہیوں کی لاشیں میدان کارزار میں پڑی تھیں، اور اس کے گرد پیش جوانانِ دم زخمی ہو کر گر رہے تھے۔ اب "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کا معاملہ تھا۔ آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ قیصر لوہے میں غرق تھا، گھوڑا لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی قیصر بھی زمین پر آ رہا۔ اٹھا تو ترک سپاہیوں کی حراست میں تھا۔ اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ

لڑائی کا خاتمہ ہو گیا، اس عظیم الشان فتح کا سہرا الپ ارسلان کے سر پر باندھا گیا، اب اسیرانِ جنگ کے ساتھ شہنشاہ بھی سلطان کے حضور میں پیش ہوا۔ گبن لکھتا ہے کہ اس مسلمان "ہیرو" نے جس اخلاقِ حسنہ کا مظاہرہ کیا، اس کی مثال مسیحیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ تخت سے اتر آیا، اور قیصر سے مصافحہ کیا، اور اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا اور کہا کہ:

"دشمنی کی حد لڑائی کے خاتمہ تک ہوتی ہے، تم میرے عزیز مہمان ہو۔"

سات دن تک میدانِ جنگ میں جشنِ شاہانہ منایا گیا۔ الپ ارسلان شاہی قیدی کے پاس دو دفعہ روزانہ آتا، مل کر کھانا کھاتے، اور کبھی ایک حرف بھی گذشتہ فتح و شکست کا زبان پر نہ لایا کہ شاہی مہمان اپنی ذلت محسوس نہ کرے۔ آٹھویں روز باتوں باتوں میں جنگ کا ذکر چھیڑ دیا، اور پوچھا کہ اس شکست کے بعد اب تمہیں کس سلوک کی امید ہے۔ شہنشاہ نے بے ساختہ دلیرانہ جواب دیا کہ

"اگر تم ظالم ہو۔ تو مجھے قتل کر دو گے اور مغرور ہو تو مدت العمر قید میں رکھو گے اور اگر دور اندیشی اور فیاضی سے کام لیا تو فدیہ لے کر آزاد کر دو گے۔"

سلطان نے کہا کہ "اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو کیا سلوک کرتے۔"

جواب دیا کہ "سزائے تازیانہ تجویز کرتا۔"

گبن لکھتا ہے کہ یہ ناشائستہ جواب اگر دور اندیشی کے مقتضی نہ تھا تو احسان فراموشی تو ضرور ہے۔ سلطان نے کہا کہ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ میں مسلمان ہوں۔ قرآن ظلم و غرور کی

سخت مذمت فرماتا ہے، اور دشمن سے جب وہ شکست خوردہ ہو احسان کی تلقین کرتا ہے/ میں تمہارا مجوزہ سلوک تم سے نہیں کرتا ہمارے ہاں صلح و صفائی جنگ و جدل سے بہتر ہے صلح ہو گئی، شرائط صلح نرم تھیں، دس لاکھ فدیہ اور ساٹھ ہزار سالانہ خراج اور اسیران جنگ کا مبادلہ،

قیصر کچھ ایسا گرویدہ ہوا کہ اپنی بیٹی الپ ارسلان کے بیٹے کے عقد نکاح میں دے دی
"خلق کن خلق کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش"

مسیحی دنیا کو قیصر کی یہ حرکت ناگوار گزری، پادریوں نے بھڑکایا جب قیصر میدان جنگ سے واپس قسطنطنیہ کی طرف جا رہا تھا، تو معلوم ہوا کہ رعایا نے اسے معزول کر دیا ہے سلطان کو بھی اس کی اطلاع ہوئی اور مدد کے لئے تیار ہو گیا لیکن سپاہ نے رومانس کو پکڑ کر آنکھیں نکال دیں اور پھر قتل کر دیا،

اب ایشیا کوچک سلطان کے قبضہ میں آ چکا تھا، آئندہ رومی حملوں کا سدِ باب اس طرح کیا کہ سلیمان بن قتلمش بن اسرائیل بن سلجوق کو یہاں کا والی مقرر کیا،
(دیکھو شجرہ نسب سلجوق صفحہ ۱۱۱ پر)

اس سلجوقی شاخ کا دارالسلطنت "قونیہ" (Iconium) تھا، علاؤ الدین کیقباد اول مولانا جلال الدین رومی صاحب مثنوی معنوی کے حلقۂ ارادت میں داخل تھا، غیاث الدین کیخسرو ثانی دوبارہ ۶۳۴ھ مطابق ۱۲۳۶ء میں کیقباد اول کے بعد تخت پر بیٹھا انھوں نے حروب الصلیبیہ میں نمایاں حصّہ لیا۔

الپ ارسلان تسخیر ترکستان میں مشغول تھا، فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، یوسف نامی ایک باغی جب اسیر ہوکر آیا تو سلطان نے اُسے سخت ملامت کی، اُس نے کہا کہ اگر میں پکڑا ہوا نہ ہوتا تو تجھے تیری بدکلامی کا مزہ چکھا دیتا، سلطان نے حکم دیا کہ بند کھول دو، یوسف کو ہتھیار بھی دیئے گئے، وہ سلطان پر حملہ کے لئے بڑھا، درباریوں کی تلواریں درمیان میں حائل ہوگئیں، سلطان نے پھر حکم دیا کہ اسے بڑھنے دو، خود تیر کمان میں رکھ کر چاہتا تھا کہ زد کرے۔ تخت سے پاؤں پھسلا۔ نیچے آرہا، یوسف نے خنجر سینہ میں گھونپ دیا، وہ تو خود وہیں مارا گیا، سلطان الپ ارسلان بھی جانبر نہ ہوسکا، اپنے بیٹے ملک شاہ کو چند کلمات جو موعظۂ حسنہ تھے وصیت کئے اور واصل بحق ہوا،

ملک شاہ کا وزیر خواجہ نظام الملک طوسی تھا، شاہ اور وزیر کے کارناموں کے لئے علیحدہ دفتر چاہیئے، اسی کے عہد کے اخیر میں حسن بن صباح اور اس کے فدائیوں نے چیرہ دستی شروع کی، ۴۹۱ھ میں نظام الملک ایک فدائی کے ہاتھ سے شہید ہوئے اس کے تین بیٹے موید الملک۔ فخر الملک، اعز الملک ملک شاہ کے جانشین سلطانوں کے وزیر رہے ملک شاہ کی وفات پر سلجوقی جاہ و جلال بھی ختم ہوگیا۔ سلجوقی دعویداران سلطنت میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، جس کا فائدہ حسن بن صباح اور اس کے فدائیوں نے خوب اٹھایا اور مازندران اور خراسان کے بعض قلعوں پر قابض ہوگئے۔

سلجوقی شہنشاہیت کے تین طبقات ہیں۔ ایک سلجوقیہ خراسانیہ اس کا مورث اعلیٰ داؤد بن سلجوق تھا، دوسری رومیہ جس کا آغاز سلیمان بن قتلمش بن اسرائیل بن سلجوق تھا (دیکھیے شجرہ نسب) تیسرا طبقہ کرمانیہ ولایت کرمان پر حکمران رہا۔ اس کا اول تاجدار قادر بن جعفر بن میکائیل بن سلجوق ہے، اس سلطنت کا ذکر ہم نے اس لئے علیحدہ نہیں کیا کہ اس کا

شجرۂ نسب سلاطین رومیّہ

- سلجوق
  - داؤد
    - طغرل بیگ
    - چغری بیگ
      - الپ ارسلان
  - اسرائیل
    - قلتمش
      - (۱) سلیمان ۴۷۰ھ / ۱۰۷۷ء
        - (۲) دانشمند ۴۷۹ھ / ۱۰۸۶ء
        - (۳) قلیج ارسلان داؤد ۴۸۵ھ / ۱۰۹۲ء
          - (۴) ملک شاہ ۵۰۰ھ / ۱۱۰۷ء
          - (۵) مسعود ۵۱۰ھ / ۱۱۱۶ء
            - (۶) قلیج ارسلان ثانی ۵۵۱ھ / ۱۱۵۶ء
              - (۸) غیاث الدین کیخسرو اول ۵۸۸ھ / ۱۱۹۲ء
              - (۹) رکن الدین سلیمان ثانی ۵۹۷ھ
  - میکائیل

(۷) قطب الدین ملک شاہ ثانی — سنہ ۵۸۴ھ / ۱۱۸۸ء

(۱۱) — سنہ ۶۰۱ھ / ۱۲۰۴ء

(۱۰) عزالدین قلیج ارسلان ثالث — سنہ ۶۰۰ھ / ۱۲۰۳ء

(۱۲) عزالدین کیکاؤس اول — سنہ ۶۰۷ھ / ۱۲۱۰ء

(۱۳) علاء الدین کیقباد اول — سنہ ۶۱۶ھ / ۱۲۱۹ء

(۱۴) غیاث الدین کیخسرو ثانی — سنہ ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء

(۱۵) عزالدین کیکاؤس ثانی — سنہ ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء

(۱۶) رکن الدین قلیج ارسلان رابع — سنہ ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء

(۱۷) غیاث الدین کیخسرو ثالث — سنہ ۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء

(۱۸) غیاث الدین مسعود ثانی — سنہ ۶۸۲ھ / ۱۲۸۳ء

(۱۹) علاء الدین کیقباد ثانی — سنہ ۶۹۶ھ / ۱۲۹۶ء

؎ سلجوق کا شجرہ نسب مورخین افراسیاب سے ملاتے ہیں۔

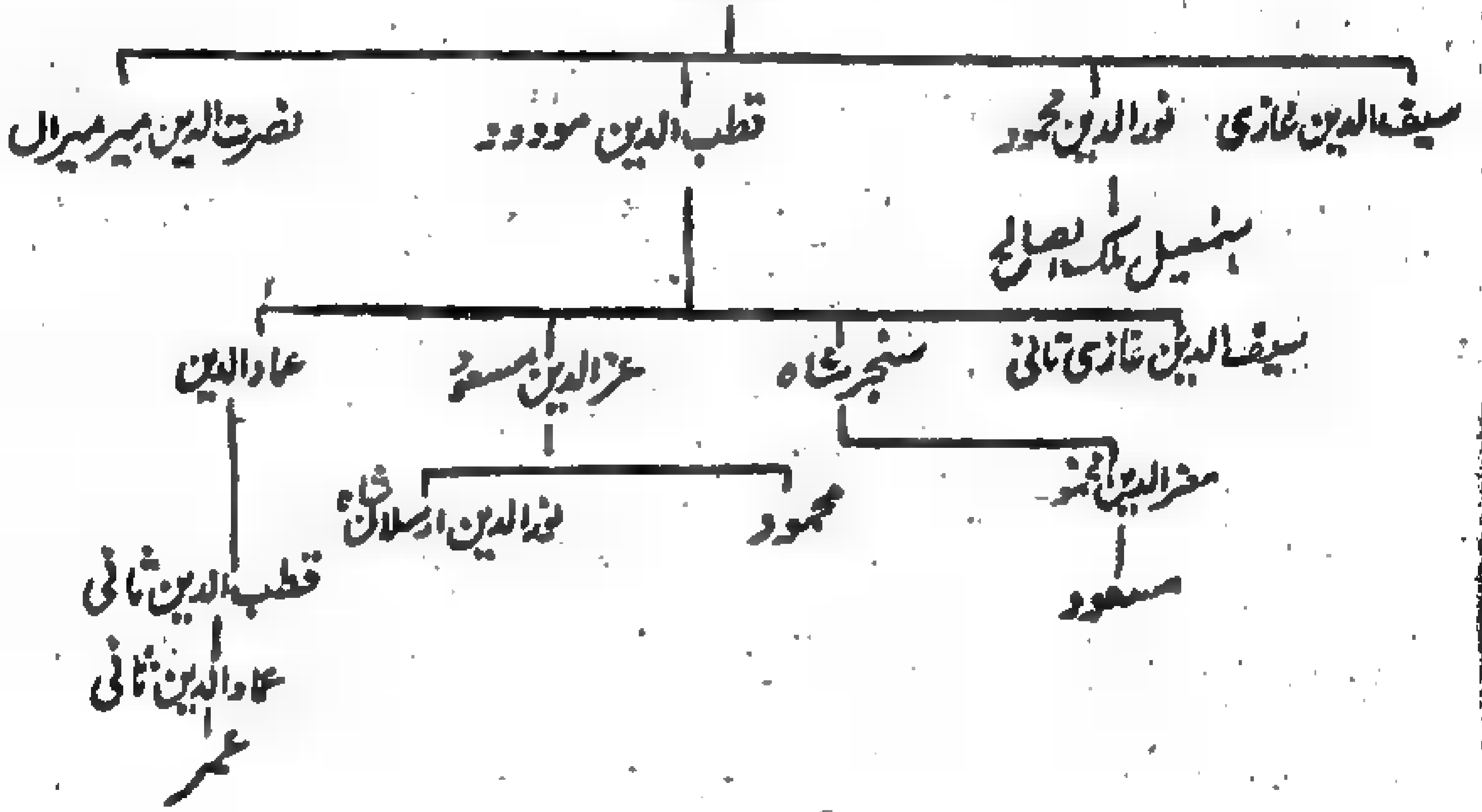
قیام سلطنت خراسانیہ ہی سے تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ خراسانیہ ہی زبردست شہنشاہیت تھی اس کے چار تاجدار بڑے نامی دگرامی گزرے ہیں، طغرل بیگ، الپ ارسلان اور ملک شاہ کے حالات جہاں تک ان کا تعلق خلافت اسلامیہ سے ہے ہم بیان کر چکے ہیں، بغرض تکمیل چوتھے تاجدار سلطان سنجر بن ملک شاہ کے حالات بھی اسی مقام پر لکھتے ہیں،

سنہ ۴۷۹ھ میں ملک شاہ کا قیام سنجر میں تھا، اسی مقام پر اس کے ہاں لڑکا پیدا ہوا، نام سلطان سنجر رکھا، ملک شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹے برکیارق اور محمد اس کے جانشین ہوئے، ان کے تحت بیس برس تک حاکم خراسان رہا، اس کی باری آئی تو محمود بن محمد آکر بیٹھا لڑائی ہوئی تو محمود جھک گیا، سنجر نے قصور معاف کر دیا اور عراق کی حکومت بھی دی سلطان محمود شاہ غزنوی کی اولاد میں بہرام شاہ سلطان غزنی بھی سنجر کا بھانجا تھا۔

غوری نے اس پر چڑھائی کی تو سنجر کی مدد سے سام کو شکست ہوئی۔ اور وہ مارا گیا، لیکن اس کی واپسی پر سام کے بھائی علاء الدین جہاں سوز نے بغرض انتقام پھر لشکر کشی کی، اور بہرام کو بھاگتے ہی بنی، علاؤ الدین نے سلاطین غزنویہ کی تمام قبریں اکھڑوا کر ہڈیاں جلادیں صرف سلطان محمود کا کچھ ایسا ہی احترام تھا کہ اس کے روضہ کو نہ چھیڑا، اس لئے اس کا لقب جہاں سوز ہوا، بہرام اپنے ماموں سنجر کے پاس آیا، سنجر نے علاؤ الدین کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔ لیکن بعد ازاں غور کا تخت اس کو دے کر ہدایت کی کہ آئندہ صلح و آشتی سے رہے۔ سنجر کے آخری ایام غم و الم میں گزرے، ایک ترکمانی قبیلہ "غز" نے بغاوت کی، لڑائی میں سنجر گرفتار ہو گیا، ترکمانوں نے مرو اور دار السلطنت نیشاپور میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا اور چار سال کی قید و بند کے بعد جب سنجر قید سے بھاگ کر نیشاپور آیا تو یہاں ہر طرف کھنڈروں کے ڈھیر ہی نظر آئے دل شکستہ ہو کر مر گیا، اس کے برادر زادہ طغرل نے کچھ ہاتھ پاؤں مارے، مگر امراء دربار ہی مخالفت پر آمادہ آئے۔ اور ایک امیر نے اسے قتل کر کے سلطنت خود سنبھال لی، اور سلطنت سلجوقیہ خراسانیہ کا خاتمہ ۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء میں ہو گیا،

تخت خلافت پر ابوالعباس المستظہر باللہ تھا، داعیان بنو فاطمیہ نے دہشت پھیلا رکھی تھی، اس کا فائدہ اہل صلیب نے اٹھایا، رومیوں کو تلخ تجربہ کے بعد اتنا حوصلہ نہ ہوا،

شجرہ نسب آتابک موصل و شام



سه "آتابک": سلاطین سلجوق کا دستور تھا کہ اپنے مقبوضہ ولایات پر اپنے خاندان کے شہزادوں کا تقرر کرتے جنکو ملک کہتے اور ہر ایک ملک کا ایک "اتالیق" بھی مقرر کرتے۔ یہ اتالیق ان کا کوئی تجربہ کار فوجی افسر ہوتا۔ اسکو "آتابک" کہتے۔ ترکی زبان میں "آتا" یعنی "بزرگ یا باپ" ہیں، اس طرح ایک پدری رشتہ اتابک اور شہزادہ میں ہو جاتا۔ "بک" یا "بیگ" کے معنی سردار۔ اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شہزادوں کی بیوہ والدہ سے آتابک نکاح کرتے یا اپنی دختر

کہ ان حالات کا فائدہ اٹھاتے۔ مگر مسیحی پوپ اور پادریوں نے صلیب کے نام پر لوگوں کو جمع کیا۔ عباسی اور فاطمی خلافت میں خانہ جنگی تھی۔ عباسی زوال پر تھے۔ ۴۶۵ھ میں ارض فلسطین بنو فاطمہ کے قبضہ میں آگیا۔ بنو عباس کے تحت بھی مسیحی امن سے بسر کر رہے تھے۔ کامل مذہبی آزادی تھی۔ ان کی خانقاہوں اور چرچ کا پورا احترام کیا جاتا۔ زائرین بے تکلف یورپ سے آتے جاتے۔ یروشلم اگر مسیحی مقدس سمجھتے تھے، تو مسلمان بھی شہر قدس میں اعتقاد اور عملاً یقین کرتے ہیں، اور مکہ معظمہ اور اس کو "حرمین" سے موسوم کرتے ہیں، یعنی ان مقامات میں جنگ و جدل ممنوع ہے۔ خلفاء بنو فاطمہ نے تو اور بھی مراعات مسیحی تاجروں کو دے رکھی تھیں، لیکن مسیحی دنیا کی آنکھ میں یہ کانٹا کھٹکتا رہا کہ مسیحی مقدس مقام مسلمان کفار (Infidels) کے قبضہ میں ہو۔

پیشتر اس کے کہ ہم حروب صلیبیہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں، ان حالات کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جس کا علم اہل یورپ کو تھا، اور جس نے دنیائے اسلام بالخصوص ارض شام و فلسطین کو خانہ جنگی کا اکھاڑہ بنا رکھا تھا۔ اس وقت پانچ طاقتیں ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھیں، ایک خلافت بنو فاطمہ۔ دوسری عربی قبائل کے سردار تیسری طوائف الملوکی ترکی امراء کی، چوتھے سلجوقی سلطان، پانچویں غیر سلجوقی ترکی قبائل

نور الدین زنگی

ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں فوج کا افسر اعلیٰ "آق سنقر" نامی تھا۔ اس کی خدمات شائستہ اور آخر سلطان برکیاروق (دیکھو شجرہ نسب سلجوقیہ) کے زمانہ میں قتل ہونا ایسا نہ تھا کہ بلا معاوضہ جاتا، سلطان برکیاروق نے اس کے بیٹے عماد الدین کو اپنی فرزندی میں لیا۔ تعلیم و تربیت شاہانہ ہوئی اس نے حکومت سلجوقیہ میں وہ تمام ممالک پھر سے شامل کرلئے، جو خانہ جنگی میں ہاتھ سے نکل گئے تھے، ساٹھ سال کی عمر میں لڑتے ہوئے کام آیا۔ عماد الدین نے نجم الدین ایوب کو جس کا سلسلہ نسب "راودی"

شہزادوں کو نکاح میں دیتے، اس طرح اتابک بھی سیاہ و سفید کے مالک ہوتے، مگر وہ ہمیشہ اپنے آقا زادوں کو آقا ہی سمجھتے رہے ہر ایک اتابک سپہ سالار بھی ہوتا۔

"کردوں" سے ملتا ہے"۔ بعلبک کا" عامل مقرر کیا، اس خاندان کے حالات آگے چل کر بیان کئے جائیں گے۔

عماد الدین کے چار بیٹے تھے، نور الدین اور سیف الدین اور قطب الدین اور میر میراں ناصر الدین، نور الدین کے حصّہ میں حلب اور سیف الدین کے حصّہ میں موصل آیا۔ سیف الدین کی وفات کے بعد اس کا بھائی قطب الدین اس کا جانشین ہوا، چوتھا ناصر الدین تھا۔ نور الدین اور سیف الدین کے درمیان معاہدہ ہوا کہ ملک شام پر نور الدین اور عراق پہ سیف الدین کی حکومت رہے، ملک شام کا اکثر حصہ بنو فاطمہ کے قبضہ میں تھا، اس وقت بغداد میں خلیفہ عباسی المتقی لامر اللہ تھا، اُسی کے حکم سے نور الدین نے فاطمی حکومت شام میں ختم کردی، اور پھر مصر کی طرف رُخ کیا۔ اور اس کا اکثر حصہ لے لیا، فاطمیوں کی حکومت قاہرہ میں محدود ہو کر رہ گئی، خلیفہ عباسی نے خطاب "ملک العادل" عطا فرمایا، یہ بھی آخر خانہ جنگی ہی تھی، اس کا فائدہ اہل صلیب نے اُٹھایا، اور دمشق پر حملہ آور ہوئے۔

اب ہم مسلسل حروب الصلیبیہ کا تذکرہ لکھتے ہیں، جس میں عماد الدینؒ اس کی دالہ اور ایوبی خاندان نے وہ نام پیدا کیا کہ خالد بن ولید اور دیگر صحابہ کی مجاہدانہ سعی کی یاد تازہ کردی،

تنازعہ "یروشلم" کی وجہ سے پیدا ہوا، اور وہ بھی اس لئے کہ اس میں مدفن عیسٰی ابن مریم مسیح ہے جہاں آپ صرف تین دن مدفون رہے، مسیحی مسلمانوں کو بے دین کہتے ہیں اس لئے کہ ان کو ان کے مقدس مقام پر بے دینوں کا قبضہ گوارا نہ تھا، مسٹر جے ڈبلیو ڈوسن منٹ (J. W. Dowson -) اپنی کتاب شام و مصر (Syria and Egypt) میں اپنی تحقیق اور دیگر علماء ڈاکٹر "فشر بانڈ" اور "وان ڈی ولڈی" اور "ادلوتھنیرمن" اور "رابن سن" کی رائے کی بنا پر لکھتے ہیں کہ مقبرہ مسیح جہاں مسیح کے نام پر تجارت کرنے والے پادری بتاتے ہیں واقع نہیں ہے اور نہ یہ دینی حکمران لوگوں کو اصل مقام صلیب کا پتہ لگنے دیں گے،"
اگرچہ مسیحی مذہب کی رُو سے مذہبی جنگ ممنوع ہے، لیکن عوام الناس کے مذہبی جذبات کو بھڑکانے کا اس سے زیادہ مُوثر حربہ بھی نہ تھا۔ مصر قسطنطنیہ اور مسلمانوں میں مسلسل لڑائیاں

ہیں مگر ان پر مذہبی رنگ نہ تھا، اور کسی تاجدار یورپ کو کبھی اس قسم کا مذہبی جنون نہیں ہوا جو بالآخر ایک فرانسیسی راہب پیٹر نامی کے سر پر سوار ہوا،

ہم مورخین یورپ کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ شخص نہائت کریہہ منظر، پست قامت اور بد قماش تھا، ابتداء میں ترک دنیا کا شوق اس لئے چرایا کہ اس سے دنیا زیادہ ملتی ہے بے حمیت نے جورو اور بچوں کو سختی میں چھوڑ دیا، اس نامعقول زندگی سے تنگ آ کر جو خلوت خانوں میں بسر کرنی پڑی پھر ایک دفعہ دنیا کی ہوا کھانے کی سوجھی، بحیثیت زائر بیت المقدس میں وارد ہوا۔ اس وقت مسیحی دنیا میں مسلمانوں کے مفروضہ مظالم کی افواہیں گردش میں تھیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ جو شخص ٹیکس ادا نہ کرتا یا ادائیگی کے قابل نہ ہوتا اس سے بیرحمانہ سلوک کیا جاتا، خود عیسائی مورخین لکھتے ہیں کہ ٹیکس تو خفیف رقم تھی، جو ہر شخص بسہولیت ادا کر سکتا مگر حالت یہ تھی کہ اکثر زائرین بیک بینی و دو گوش گھر سے چل پڑتے۔ زاد راہ کا کیا مذکور بدن پر کپڑے بھی کافی نہ ہوتے، تو ہم پرست عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ جس قدر تکلیف سفر میں ہو اُسی قدر ثواب ہے،

اس بے سروسامانی کی حالت میں یورپ کے طول و عرض سے زائرین کا تانتا بندھا رہتا، نہ صرف اسلامی حکومت بلکہ آسٹریا اور قسطنطنیہ کے تاجداروں نے بھی ان قلاش زائرین کی گداگری اور بعض اوقات جرائم کا انسداد کرنا چاہا۔ مگر اسلامی حکومت زیادہ بدنام ہوئی، کیونکہ آسٹریا وغیرہ تو صرف گذرگاہ تھے، اور بیت المقدس میں ان کا قیام مہینوں رہتا، اس لئے کہ یروشلم اور اس کے گرد و نواح میں متبرک مقامات بے شمار تھے غرض یہ تھی کہ کوئی جگہ زیارت سے رہ نہ جائے، بعض لوگ تو اسی جگہ موت کا انتظار کرتے۔ جو ہے کہ وہ کرتہ جو داخلہ کے وقت ان کے بدن پر ہوتا۔ اگر کفن کا کام دیتا تو آسمانی بادشاہت میں داخلہ کا یقینی ذریعہ تھا،

حضرت "پیٹر" تو ابتدا ہی سے ادھار کھائے بیٹھے تھے، اگر ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہ ہوا۔ تو کوئی تعجب کی بات نہیں، یروشلم کے بطریق سے ملا، اور کہا کہ ستم ہے۔ وہ پہاڑی جہاں خداوند مسیح مصلوب ہوئے اور وہ غار جہاں تین دن آرام فرمایا اور وہ جو

جس پر خداوند ایک پہر لٹکتے رہے سب دینوں کے قبضہ میں ہو۔ اور تم دیکھ رہے ہو تمہاری غیرت دینی کو کیا ہو گیا"۔

بطریق رونے لگا اور کہا کہ "افسوس قیصر قسطنطنیہ کمزور ہے اور کچھ بنائے نہیں بنتا"۔

پیٹر نے کہا کہ مطمئن رہیں میں یورپ کی تمام قوموں کو اس نیک کام پر آمادہ کروں گا، جو قیصر نہیں کر سکتا۔

بیت المقدس سے لوٹا، تو سب سے پہلے پوپ "اربن ثانی" کی قدم بوسی کا فخر حاصل کیا، گبن لکھتا ہے کہ پوپ نے اسے رسول کے مرتبہ تک پہنچا دیا، اور اس کی غیرت دینی اور الوالعزمی کو سراہا، اور ایک عام مجلس میں تائید کا وعدہ کیا اور تمام یورپ میں مفروضہ مظالم سے آگاہ کرنے کے لئے پیٹر کو مامور کیا، پیٹر یورپ کے تمام شہروں میں گدھے پر سوار ہو کر پھرتا رہا۔ اس طرح ایک سرے سے دوسرے تک آگ لگا دی۔ گرجے، بازار اور گلیوں میں جہاں بھی موقعہ ملتا، وہ بیت المقدس کے عیسائیوں اور زائرین کی بےبسی اور مصیبت کا رونا روتا اور لوگوں کو رلاتا، اگرچہ پیٹر مادر زاد جاہل تھا، لیکن فصاحت و بلاغت کا کام آہوں اشکبار آنکھوں اور چیخنے چلانے سے لیتا۔ دلائل و براہان کی جگہ خداوند مسیح اور آپ کی والدہ محترمہ، حواریوں کا تذکرہ کرتا، جن کو وہ اکثر خواب میں دیکھا کرتا تھا، اور ان سے بالمشافہ ہمکلام ہوتا اور سچ تو یہ ہے کہ جو کچھ کامیابی اُسے اس فصاحت سے ہوئی اس پر نہائت بلند پایہ فصیح مقرر بھی رشک کرتا، وہ سامعین کے دلوں کو پُرجوش جذبات سے بھر دیتا،

مسیحی دنیا بے صبری سے پوپ کے فتوے کا انتظار کر رہی تھی، آخر یہ بھی صادر ہؤا، پلینشیا" اور "کلرمونٹ" میں دو دفعہ عظیم الشان اجتماع ہؤا۔ یورپ کے تاجداروں کے پاس رعایا ہی سپاہ تھی، مستقل فوج کا انتظام نہ تھا، چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے نواب خود مختار تھے، جو اکثر باہم دست و گریبان رہتے یہ نظام جاگیرداری (Feudal System) عام تھا۔ پوپ کے فتوے نے باہمی جنگ و جدل حرام قرار دیا، ہر ایک نواب کو یہ ڈر تھا

کی اس کی عدم موجودگی میں ہمسایہ نواب اس کی جاگیر پر قابض نہ ہو جائے، عوام کو اس مقدس جنگ پر آمادہ اور برانگیختہ کرنے کے لئے یہ سبز باغ دکھایا گیا کہ جو بھی اس میں شامل ہوگا۔ وہ مرتبہ حاصل کرے گا جو رہبان تمام عمر مجاہدہ اور ریاضت سے بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ ہر ایک قیدی خواہ کسی سنگین جرم کا مرتکب ہو۔ فوراً رہائی حاصل کر سکتا ہے ہر ایک مقروض جو سرخ صلیب کا نشان سینہ پر لگاتا تو قرض کے بارِ گراں سے سبکدوش ہو جاتا۔

الغرض ہر ایک امر خواہ وہ مذہباً یا اخلاقاً کیسا ہی مذموم یا ممنوع ہوتا صلیب کی خاطر جائز قرار دیا گیا، مقدس پوپ کا فتوے صحیفہ آسمانی یقین کیا جاتا، آسمانی بادشاہت کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں تھیں، گناہوں کے بخشنے کا اختیار کامل اُسے حاصل تھا، پوپ کے فتوے پر ہزارہا بدمعاش، عیاش، اوباش، قلاش اس جنگ میں شریک ہوئے، ہر طرف سے یہی صدا آئی۔ کہ

"خدا کی یہی مرضی ہے، کہ مقدس مقامات کو لے دینیوں کے قبضہ میں نہ رہنے دیا جائے"

یورپ کے آٹھ شہزادے اس مقدس جنگ میں شریک ہوئے ان میں سے صرف ایک "گوڈفرے" (Godfrey) کے ہمرکاب صرف دس ہزار سوار اور اسی ہزار پیدل فوج تھی، یورپ کے مختلف مقامات سے دو لاکھ زن و مرد صرف مذہبی جوش میں پیٹر کے علم کے نیچے جمع ہو گئے، اس غیر آئینی ہجوم کا سپہ سالار خود پیٹر تھا، اور اس کا دست راست ایک شخص "والٹر قلاش" (Walter the Penniless) تھا۔ مختلف راستوں سے سب کا اجتماع قسطنطنیہ پر قرار پا چکا تھا، پیٹر اس طوفان بے تمیزی کے ساتھ سب سے پہلے روانہ ہوا۔ راستہ میں فاحشہ عورتوں اور بدمعاش مردوں نے کھلے بندوں بے حیائی کا حق ادا کیا، بیشتر کثرت ان ہی لوگوں کی تھی۔ سب سے پہلے بیچارے یہودیوں کی جان و مال پر ہاتھ صاف کیا۔

یہ طوفان بے تمیزی آبنائے باسفورس کو عبور کر گیا اور اہل اسلام کی حدود سلطنت میں

داخل ہُوا، سلجوقی سلطان قلیج ارسلان بن سلیمان بن قلمتش (دیکھو شجرہ نسب) "قونیہ" میں لشکر کا انتظار کر رہا تھا، نہایت گرم جوشی سے استقبال کے لئے بڑھا، بیٹیر یہ سمجھا ہُوا تھا کہ مقابلہ بلا جد و جہد وہ بیت المقدس پر قابض ہو جائے گا، جب سلجوقی سپاہ کی شکل دیکھی تو چپکے سے کھسک گیا، وانسر قلاش مجاہدین صلیب کے ساتھ مقابلہ میں آیا، جو کچھ حشر ان لوگوں کا میدان جنگ میں ہُوا، اس کی دل خراش داستان ہڈیوں کے ڈھیروں اور کاسہ ہائے سر نے اُن شہزادگان عالی تبار کو سنائی جو اُن کے نقشِ قدم پر اس جگہ آئے اس وقت ان کے ہمرکاب ساٹھ لاکھ کی جمعیت تھی، اگرچہ ان کا مقابلہ مختلف مقامات پر نہائت سختی سے کیا گیا، مگر یہ سیلاب یروشلم کی طرف بڑھتا ہی گیا،

بیت المقدس بجبر و قہر مسخر ہو گیا۔ شہر قدس میں داخل ہو کر جو کچھ ظلم و ستم ان لوگوں نے ناکردہ گناہ یہودیوں اور مسلمانوں پر ڈھایا، خود یورپ کے مورخین نے خون کے حرفوں میں لکھا ہے، ہر طرف چیخ و پکار پر یہ سنگ دل ہنس رہے تھے، عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کی لاشیں بے گور و کفن ایک انبار تھا جو ہر طرف پڑا ہُوا تھا، بچوں کو ماؤں کی چھاتیوں سے بزور جدا کیا جاتا، زمین پر ٹپک کر کچل دیا جاتا، اگر کوئی شخص یا خاندان گھروں میں پناہ لیتا تو اُسے آگ لگا دی جاتی، لوگ شہر پناہ کی بلند دیواروں سے کود کود کر مرنا زیادہ پسند کرتے، بہ نسبت اس کے ان سفاک بے رحم مسیحیوں کے ہاتھ پڑتے، اس تباہی اور بربادی کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک عیسائی مورخ لکھتا ہے کہ مسجد عمر کے نزدیک عیسائی سواروں کے گھوڑے خون میں گھٹنوں تک ڈوبے ہوئے تھے، اس خوفناک نظارہ کو دیکھتا ہُوا "گوڈفرے" حضرت مسیح کے کے فرضی روضے میں ننگے سر اور ننگے پاؤں داخل ہُوا اور یروشلم کا پہلا بادشاہ منتخب کیا گیا،

اس وقت دنیائے اسلام خانہ جنگی میں مصروف تھی متفقہ طاقت کے ساتھ اس حال میں مقابلہ کی کوئی صورت نہ تھی، عباسی خلیفہ بغداد المقتدی کی حکومت بغداد کی چار دیواری میں محدود تھی، مگر خلافت کا احترام باقی تھا، خلیفہ بغداد کو اطلاع ہوئی،

کہ ستر ہزار نہتے مسلمان شہید ہوئے، جن میں اکثر علماء اور زاہد اور عابد بزرگ تھے زیارت
گاہوں کو مسمار کیا گیا، یہودیوں کو ایک معبد میں جمع کر کے آگ لگا دی۔ لوگ شام سے
بھاگ کر بغداد میں آئے اور ایسی ہی متوحش خبریں سناتے، شعراء نے دل خراش مرثیے
اور شہر آشوب لکھے، خلیفہ نے ایک قاصد سلطان برکیارق رکن الدولہ والدین کے پاس
بھیجا، وہ اس وقت اپنے بھائی محمد بن ملک شاہ سے لڑ رہا تھا، دونوں کو کہلا بھیجا کہ خدا
کے واسطے خانہ جنگی کو کسی اور وقت پر اٹھا رکھو، تمہارا دشمن سر پر آ رہا ہے تم دونوں
کی لڑائی کا فیصلہ کر دے گا، بھائیوں میں صلح ہو گئی عسقلان پر مسلمانوں کا مقابلہ
عیسائیوں سے ہوا، اگرچہ کامیابی ہوئی مگر یروشلم عیسائیوں کے قبضہ میں رہا
اس طرح حرب صلیب کا خاتمہ ہوا۔

حرب صلیب دوم

عماد الدین زنگی کے حالات ہم دولت سلجوقیہ کے تحت بیان کر چکے ہیں، سلطان محمود بن محمد بن ملک شاہ نے اسے
ولایت ایران کا شحنہ مقرر کیا تھا، پھر ۵۲۱ھ میں اس کو ولایت موصل کے ساتھ منصب
امارت بھی مل گیا، غالباً سب سے پہلے "اتابک" کا لقب وزیر نظام الملک طوسی کو شاہ
نے دیا تھا، دستور یہ تھا کہ سلجوقی شہزادے مختلف صوبوں کے حاکموں کے پاس بغرض
تعلیم و تربیت بھیجے جاتے، ان ہی میں سے ایک عماد الدین اتابک یا اتالیق تھا۔

ابتدائی "الحروب الصلیبیہ" کے حالات حمزہ بن اسد المعروف ابو یعلی التمیمی الملقب
ابن القلانسی نے اپنی تاریخ دمشق میں جو ہلال بن المحسن الصابی کی تاریخ کا تتمہ ہے
کمال الدین نے ہمعصر مورخ حمدان بن عبد الرحیم (متوفی ۵۴۰ھ) کی تاریخ "سیر الافرنج"
کے حوالہ سے اپنی تاریخ حلب میں قلم بند کئے ہیں، ابن اثیر نے انہی مورخین کا حوالہ
دیا ہے، لیکن ہم ان "حروب" کے حالات یورپ کے مورخین کے تواریخ سے لئے ہیں اس
کہ وہ اہل صلیب کے حالات سے بہتر واقف تھے۔ جو کچھ شام اور مصر میں اس وقت
مسلمانوں کی حالت تھی، اس کا علم یورپ کے مورخین کو مسلمان ہمعصر مورخین سے
بہتر نہیں ہو سکتا،

دوسری صلیبی لڑائی سے پیشتر جو کچھ شام بالخصوص دمشق اور حلب کی حالت تھی یہاں لڑائی کا زیادہ زور رہا۔ القلانسی نے اپنے روزنامچہ میں درج کیا ہے یہ اس وقت دمشق میں موجود تھا، ظہیر الدین اتابک والئی دمشق تھا۔ سنہ ۵۲۰ھ مطابق سنہ ۱۱۲۶ء کا واقعہ ہے کہ ایک شخص بہرام نامی جو فرقہ باطنیہ کا "داعی" تھا، خاموشی سے لوگوں کو دعوت اس فرقہ کی دے رہا تھا، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ شہر بشہر اور قریہ بہ قریہ پھرتا رہا۔ اور حکومت وقت کو اس کی خفیہ سرگرمی کا کچھ علم نہ ہوا۔ البتہ وزیر ابو علی طاہر بن سعد المزدقانی بے خبر نہ تھا، مگر اُسے معلوم تھا کہ یہ "فدائی" بدبلا ہیں اگر اس نے مخالفت کی تو جان کی خیر نہیں اس لئے نہ صرف اغماض سے کام لیا بلکہ در پردہ کچھ مدد بھی کرتا رہا۔ جب بہرام نے جہلا کے طبقہ میں جن کی ہمیشہ اکثریت ہوتی ہے اکافی اثر و رسوخ پیدا کر لیا، تو اسی وزیر بے تدبیر نے اتابک ظہیر الدین کو کہہ سن کر دمشق کا سرحدی قلعہ "بانیاس" (جو اسی نام کی نہر پر واقع تھا) دلوا دیا، بہانہ یہ تھا کہ وہ فرنگیوں کا مقابلہ اپنے جانثاروں کے ساتھ کرتا رہے گا، لیکن اہل اسلام اہل سنت والجماعت کو فرقہ باطنیہ کے حالات کا علم تھا۔ یہ علانیہ رعائت ایک ایسے فرقہ کے ساتھ جس کو وہ ملحد سمجھتے تھے سخت تشویش کا موجب ہوئی۔ مگر فدائیان قلعہ الموت کی دہشت اتنی پھیلی ہوئی تھی، کہ بڑے بڑے علماء بھی دم بخود ہو کر رہ گئے۔

سنہ ۵۲۱ھ / ۱۱۲۷ء میں امیر سیف الدین السنقر والئے حلب جامعہ حلب میں ایک باطنی فدائی کے ہاتھ سے مارا گیا، اس کا بیٹا مسعود جانشین ہوا، باپ کا بدلہ اتابک ظہیر الدین اور اس کے وزیر سے لینا چاہتا تھا، لیکن اجل نے آن لیا، اور اس کے لشکر کے اکثر آدمی اتابک سے آملے، اتابک عماد الدین زنگی نے اسی سال حلب کو مسخر کر لیا، اتابک ظہیر الدین سخت بیمار تھا، جانبر نہ ہو سکا، اس کا بیٹا امیر تاج الملوک جانشین ہوا، وزارت پر ابو علی طاہر بحال رہا، بہرام باطنی اپنی قوت بڑھا رہا تھا اور وزیر بدستور اس کی مدد کر رہا تھا۔ تاج الملوک بے خبر نہ تھا، لیکن مناسب موقعہ کا منتظر تھا، بہرام نے "وادی التیم" کے ایک سردار برق بن جندل کو مروا دیا، اس کے قبیلہ کے لوگ بھڑک اُٹھے، برق کے بھائی ضحاک نے

اپنے خاندان اور قبیلہ کے آدمیوں کو اکٹھا کیا، اور سب نے قسم کھائی کہ جب تک بہرام سے قصاص نہ لیں گے آرام سے نہ بیٹھیں گے، اور حریف قبائل نے بھی ان کا ساتھ دیا، یہ لشکر اب بانیاس کی طرف بڑھا۔ بہرام بھی اپنے فدائیوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے نکلا، رات ایک مقام پر پڑاؤ کیا، اچانک برق کے بھائی نے شبخون مارا اور ان کو اتنی مہلت بھی نہ دی کہ ہتھیار سنبھال سکیں، بہرام مارا گیا، لیکن بہرام کی جگہ ایک اور شخص سمٰعیل ایرانی کھڑا ہوگیا، اور فدائی اس کے گرد جمع ہوگئے، وزیر بدستور اس کی پشت بھی ٹھونکتا رہا۔ تاج الملوک نے سمجھ لیا کہ سب شرارت اسی نمک حرام وزیر کی ہے، اس لئے ارادہ کرلیا کہ پہلے اس کا کام تمام کرنا چاہیئے،

چنانچہ ۱۷ رمضان ۵۲۳ھ مطابق ۱۱۲۹ء کو وزیر حسب معمول اتابک کے پاس دیگر امراء کے ساتھ آیا، جب رخصت ہونے لگا تو تاج الملوک کے محافظ فوج کے ایک سردار نے اس کے سر پر کاری ضربات لگائیں، وزیر وہیں ڈھیر ہوگیا، اس کا سر قلم کیا گیا، جسد ناپاک شہر کے باہر مزبلہ پر پھینکا گیا، اب باطنیوں کی باری آئی عوام بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور جہاں کوئی باطنی ملا مارا گیا، اور بعض سربرآوردہ باطنی گرفتار ہوئے، ان میں سے ایک شادی نامی تھا جو ابوطاہر بانی فرقہ قرمطہ کا شاگرد رشید تھا ان سب کو پھانسی دی گئی، تاج الملوک اور اس کے امراء کو یہ بھی ڈر تھا کہ قلعہ الموت سے فدائی آکر ان پر غفلت میں وار نہ کردیں، اس لئے ہر ممکن احتیاط سے کام لیا،

اسمٰعیل بانیاس قلعہ میں بند تھا۔ اب اس نے بھی سمجھ لیا کہ اتابک کی فوج سے مقابلہ کامیابی سے نہیں ہوسکتا، اس لئے فرنگیوں کو دعوت دی کہ قلعہ بانیاس جو دمشق کی کنجی ہے، حوالے کرنے پر تیار ہوں، فرنگیوں سے پہلے بھی باطنیوں کی ساز باز تھی چنانچہ وہ آئے اور اسمٰعیل نے قلعہ ان کے حوالے کردیا، اور خود ان ہی میں رہائش اختیار کی لیکن ۵۲۴ھ کے شروع میں عارضہ اسہال سے مرگیا، تاج الملوک نے اہل صلیب کو بانیاس سے بے دخل کردیا، مگر اتنی طاقت نہ تھی کہ یروشلم پر بڑھتا،

۵۷۱ھ میں مجاہدین صلیب نے حلب کا محاصرہ کیا، اہل حلب نے نہایت مردانگی سے

مقابلہ کیا، مگر اہلِ صلیب کو برابر کمک پہنچ رہی تھی اور حلب کی تسخیر کوئی دن کی بات تھی، مایوسی کے عالم میں عماد الدین زنگی کو جو اس وقت موصل میں تھا، مدد کے لئے لکھا عماد الدین زنگی کو جو اس وقت موصل میں تھا، مدد کے لئے لکھا، عماد الدین وقت پر پہنچا، اور اہل صلیب نے محاصرہ اٹھا دیا، عماد الدین ان کے تعاقب میں تھا، شہر کے بعد شہر اور قلعہ کے بعد قلعہ فتح کرتا ہوا مجاہدین صلیب کو تین خونریز لڑائیوں میں شکست فاش دی، یہ لوگ یروشلم کی طرف ہٹ رہے تھے، عماد الدین کو معلوم تھا کہ یروشلم پر قبضہ کچھ آسان بات نہیں، اگر دمشق ہاتھ آجائے۔ تو عیسائیوں کو شام سے بے دخل کرنا سہل ہو جائے گا۔ ۵۳۲ھ میں "البقاع" واقع دمشق میں اُترا، اور والی دمشق جمال الدین محمد کو کہلا بھیجا۔ کہ دمشق کے عوض شام کا کوئی شہر لے لو۔ جمال الدین نے انکار کیا، اور لوگوں کو زنگی کے خلاف اُبھارا کہ ایک غیر شخص دمشق پر قابض ہونا چاہتا ہے، عماد الدین مایوس ہو کر لوٹنا چاہتا تھا کہ مقام "داریا" پر اہل دمشق نے ہلّہ بول دیا، ناچار لڑنا پڑا، جلال الدین شکست خوردہ دمشق میں پناہ گزین ہوا، عماد الدین نے پھر کہلا بھیجا کہ دمشق کے عوض بعلبک، حمص وغیرہ جو بھی شہر پسند ہو لے لو، تو اب بھی صلح و آشتی کا دروازہ کھلا ہے، اور یہ بھی کہا کہ جب میں اہل صلیب سے نپٹ لوں گا، تو پھر دمشق تمہارا ہے، جلال الدین نے انکار کیا،

خوش قسمتی سے اس ضدی شخص کا انتقال ہو گیا، اس کا بیٹا مجیر الدین آبق جانشین ہوا۔ اس بے حمیت نے مجاہدین صلیب کو اپنی امداد کے لئے دعوت دی، وہ اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، بانیاس واقع دمشق کا محاصرہ کیا، اس پر عماد الدین کا قبضہ پہلے ہی ہو چکا تھا، اب زنگی عجب گو مگو میں تھا، اہلِ صلیب کے مقابلہ کے لئے آیا، اس کا رُعب اتنا ان لوگوں کے دلوں پر چھایا ہوا تھا کہ محاصرہ اٹھا دیا،

اہلِ صلیب نے بھی سمجھ لیا تھا، کہ زنگی کا مقابلہ مشکل ہے، اس لئے والیان یورپ کو امداد کے لئے طلب کیا، عماد الدین جس طرف رُخ کرتا فتح و نصرت اس کے ہمرکاب تھی۔ ۵۳۹ھ میں اس نے "اڈیسہ" (Edessa) جس کو عرب مورخین "رہا" کہتے ہیں مسخر کر لیا۔ ابن اثیر اس فتح کو "فتح الفتوح" کہتا ہے، جو کچھ ظلم و ستم اب تک اور بالخصوص انطاکیہ

اور یروشلم میں اہلِ صلیب کر چکے تھے، اس کا قصاص زنگی لینا چاہتا تھا، لیکن جب شہر مسخر ہو گیا تو صرف وہی لوگ مارے گئے جو مقابلہ میں آئے، یا وہ پیشوایان دین مسیحی جو لوگوں کو صلیب کے نام پر بھڑکا رہے تھے باقی مرد، زن دیکھے جو اس کے ہاتھ پڑے احسان رکھ کر چھوڑ دیئے، بلکہ ان کا مال و متاع بھی ان کے حوالے کر دیا، زنگی یہاں نہ ٹھہرا۔ عیسائی لوگ اس کا نام سن کر بھاگ رہے تھے، اب اس کے سوا چارہ نہ تھا، کہ زنگی کے چند غلاموں کو کانٹھ جو کام تلوار سے نہ ہو سکا بزور زر نکالا، زنگی نے قلعہ جعبر کا محاصرہ ڈالا ہوا تھا، رات خیمہ میں سویا ہوا تھا، کہ غلاموں نے شہید کر دیا، اس طرح اپنے زمانہ کا بہترین مسلمان ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء میں شہید ہوا،

سلطان شہید کے بعد اس کے چاروں بیٹوں غازی سیف الدین والی موصل اور نورالدین محمود والی حلب اور قطب الدین مودود اور نصرت الدین امیر میران پر اس ذمہ داری کا بوجھ آ پڑا۔ جو باپ ورثت میں چھوڑ گیا، سیف الدین سب سے بڑا بیٹا تھا اور نورالدین اس سے چھوٹا، دونوں اکثر معرکوں میں باپ کے ہمراہ رہے، نورالدین نہ صرف سپاہی ہی تھا، بلکہ اس کو مختلف علوم میں کافی دستگاہ بھی تھی، فقہ کا بہت بڑا عالم تھا، اس نے احادیث نبویہ کا ایک انتخاب بھی مرتب کیا، جو عدل و انصاف زکوٰۃ و خیرات اور تقویٰ کے بارے میں تھا، اس مجموعہ کا نام "فخر النوری" رکھا۔ اور یہی اس کا دستور العمل مدت العمر رہا۔ گبن لکھتا ہے، کہ بادشاہوں کی خوشامد ان کی زندگی میں تو ہر ایک شخص کرتا ہی ہے مگر وصف وہ ہے جو اُن کے مرنے کے بعد ان کے دشمن بھی بیان کریں۔ ان اعلیٰ اوصاف کا مالک نورالدین تھا،

نورالدین ابھی حلب کی حکومت سنبھالنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ اڈیسہ کے عیسائیوں نے فرانسیسی اہلِ صلیب کی مدد سے جوسلین (Joscelin) کے ماتحت بھی عام بغاوت کر دی، اور عمادالدین مرحوم کے قلعہ دار کو مکر و فریب سے گرفتار کر کے قتل کر دیا، اور مسلم سپاہیوں اور شہر کے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا، کس قدر بد اخلاق اور احسان فراموش یہ قوم ہے، نورالدین فوراً آ پہنچا، اب یہ لوگ کسی رعایت کے مستحق نہ تھے

ویلین اور اس کے ساتھی سب تہہ تیغ ہوئے، آرمینیہ کے عیسائی جو اس بغاوت کے
شریک تھے جلاوطن ہوئے،

ان واقعات کا اثر اور بیت المقدس سے اہلِ صلیب کی دعوت کے ساتھ حرب صلیب دوم کا آغاز ہوا،

سینٹ برنارڈ (St. Bernard of Clairvaux) نے ایک پیٹر کی جگہ حرب صلیب کی تحریک کی، مقدس برنارڈ کا احترام ہر ایک مسیحی کے دل میں تھا ۱۱۴۷ء میں کانراڈ ثالث (Conrad III) شہنشاہ جرمن اور لوئیس ہفتم شاہ فرانس (Louis VII) اس مقدس جنگ میں شریک ہوئے،

یورپ کے مؤرخین لکھتے ہیں کہ نو لاکھ کی جمعیت ان کے ہمرکاب تھی، لوئیس کے ہمراہ اس کی زوجہ محترمہ بھی تھی، جو بعد میں ہنری دوم شاہ انگلستان کے عقد ثانی میں آئی۔ اس کا اثر عورتوں پر یہ ہوا کہ وہ بھی کثیر تعداد میں شامل ہو گئیں، یہ سب تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھیں، اس کا نتیجہ سوائے بے حیائی کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ داد عیش دیتے ہوئے اہلِ صلیب شام کی طرف بڑھے، ان کی افواج قاہرہ کا جو کچھ حشر سلجوقیوں کی چابک دستی سے ہوا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب لوئیس ہفتم انطاکیہ میں داخل ہوا تو اس کے ہمراہ جرمن لشکر کا چوتھائی حصہ باقی رہ گیا تھا، انطاکیہ اس وقت "ریمونڈ" (Raymond of Poictiers) کے قبضہ میں تھا،

مورخین یورپ لکھتے ہیں کہ انطاکیہ اس وقت رنڈیوں کا چکلہ تھا، یہاں نوابوں کی ازواج کھلے بندوں بے حیائی کا ارتکاب کر رہی تھیں۔ ان میں قابل ذکر کونٹس آف ٹلاوس (Countess of Toulouse) اور کونٹس آف بلوس (Countess of Blois) اور سائبل آف فلنڈرس (Sybelle of Flanders) موریٹیل (Morrile) تلقوری (Ducha[redacted] of Bouillon) اور ان کے علاوہ بیسیوں لیڈیز جو دولت و ثروت اور حسن و جمال میں شہرہ آفاق تھیں بے لگام اہلِ صلیب کو دعوتِ صحبت دے رہی تھیں۔ ملکہ الینور (Queen Eleanor) جس کا عم مکرم ریمونڈ حاکم انطاکیہ تھا اپنے جسم کو اس

کا ثواب کے لئے وقف کر رکھا تھا،

اہلِ صلیب جب انطاکیہ میں تر و تازہ دم ہو گئے، تو دشمن کی طرف بڑھے جو پہلے ہی محاصرہ میں آچکا تھا، دمشق پر مجیر الدین آبق کی حکومت تھی، یہ واقعہ ۵۴۳ھ کا ہے محصورین وقتاً فوقتاً باہر نکل کر مقابلہ کرتے رہے، ہر ایک شخص شوقِ شہادت میں شمشیر بکف لڑتا اور پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیتا، حجتہ الدین ابو الحجاج یوسف ایک بوڑھا زاہد اور عابد بزرگ تھا، اس کا ایک دوست جو تقوی میں مشہور تھا، عبدالرحمٰن اطلول بھی اس کے ساتھ تھا، معین الدین آنر وزیر مجیر الدین نے ان کو کہا کہ آپ معذور ہیں، دشمنانِ دین کے لئے ہم کافی ہیں، آپ شہر میں واپس جائیں، جواب دیا کہ

ان اللہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ یقاتلون فی سبیل اللہ فیقتلون ویقتلون وعداً علیہ حقاً فی التوراۃ والانجیل والقرآن ومن اوفی بعھدہ من اللہ۔ (۱۱/۳)۔

دونوں لڑتے ہوئے شہید ہوئے، مسلمان پسپا ہو کر شہر میں داخل ہو گئے،

کونراڈ نے "میدان الاخضر" میں خیمہ ایستادہ کیا، وزیر معین الدین سیف الدین غازی کو دمشق کے حالات سے آگاہ کر چکا تھا، اہلِ صلیب نے اب دمشق کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر رکھی تھی، اہل شہر زندگی سے مایوس ہو چکے تھے، ان کو معلوم تھا کہ اہلِ صلیب نہ عورتوں اور نہ بچوں اور بوڑھوں پر رحم کرنا چاہتے ہیں، عین اس وقت سیف الدین غازی اور اس کا بھائی نور الدین اہلِ صلیب کے سر پر بلائے ناگہانی کی طرح پہنچ گئے، اہلِ صلیب نے لڑنے مرنے کے بغیر محاصرہ اٹھا لیا، اگرچہ دمشق اہلِ صلیب کی سفاکی سے بچ گیا، مگر اکثر علماء اور عابد اور زاہد اور شہسوار کام آئے، ۵۴۴ھ میں معین الدین اور سیف الدین غازی کا انتقال ہو گیا،

اہلِ صلیب تو تیزی سے پسپا ہوتے ہوئے یروشلم کی طرف لوٹے کانراڈ اور لوئس نے یورپ میں واپسی ہی میں خیر دیکھی، اس طرح دوسری حربِ صلیب کا خاتمہ ہو گیا،

نور الدین نے اب ہر طرف سے اہلِ صلیب کو دبانا شروع کر دیا، دمشق میں اپنا عسکری مرکز قائم کرنے کے بعد اس نے فرنگیوں کو شہروں اور قلعوں سے بے دخل کرنا شروع کر دیا، خلیفہ بغداد

نے الملک العادل کا خطاب عطا فرمایا، اہلِ صلیب کے پاس یروشلم اور گرد و نواح کا علاقہ تھا، ان کی توجہ کا مرکز اب مصر ہوا، خلفائے فاطمیہ کا آخری خلیفہ العضد لدین اللہ تو بے حقیقت تھا وزیر "شاور" سیاہ و سفید کا مالک تھا، اس کا ایک حریف اس پر غالب آرہا تھا، دمشق میں آیا اور نورالدین سے مدد کی درخواست کی، نورالدین نے اپنے چچا کے بیٹے اسدالدین شیر کوہ کو کچھ فوج کے ساتھ وزیر کی مدد کے لئے روانہ کردیا، جس نے پھر سے اُسے مسند وزارت پر بٹھادیا، لیکن اب اس غدار قوم وملت نے شیرکوہ کی طرف سے آنکھیں پھیرلیں۔ اور اہلِ صلیب سے سازباز شروع کردی، شیرکوہ کو حکم دیا کہ مصر سے نکل جاؤ، اہلِ صلیب کے ساتھ شیرکوہ کا مقابلہ اس مقام پر ہوا جہاں نیل کی انتہائی مشرقی شاخ ہے، جس کو یونانی وہ دوسہ میں "بلوزیم" کہتے تھے، اور اب "بلبیس" سے موسوم ہے، شیرکوہ کے پاس گنتی کے سپاہی تھے، کچھ عرصہ جم کر لڑا، مگر پھر سپاہی ہوتے ہوتے مصر کی حدود سے نکل گیا،

۵۵۹ھ میں نورالدین پر یونانیوں اور فرنگیوں کی متحدہ فوج نے حملہ کردیا، "حریم" کی دیواروں کے نیچے خونریز جنگ ہوئی، اہلِ صلیب نے شکست فاش کھائی، اور ان کے بڑے بڑے سردار بوہمنڈ سپر ریمنڈ حاکم الطاکیہ اور جوسلین ثالث اور یونانی سردار ڈیوک کلامر اسیر ہوئے،

۵۶۲ھ میں شیرکوہ پھر مصر میں داخل ہوا، وزیر غدار نے پھر اہلِ صلیب کو مدد کے لئے بلایا، اس وقت اموری (Amaury) یروشلم کا حاکم تھا، اس دعوت کو بخوشی خاطر اس لئے بھی منظور کرلیا کہ مصر پر قابض ہو کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد استوار کی جاسکتی ہے اگرچہ شیرکوہ کے ساتھ صرف ایک ہزار سوار تھے مگر سپاہیانہ نقل وحرکت اس طریقہ سے کی کہ ایک یورپی مورخ میچنڈز (Michand) لکھتا ہے کہ وہ فن حرب میں کامل دستگاہ رکھتا تھا، اس نے اہلِ صلیب اور مصری غداروں کو بھی شکست فاش دی، کہ اسکندریہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا، ایک معاہدہ کے ذریعہ اموری نے اپنی افواج مصر سے واپس بلالیں، اور عہد کیا کہ آئندہ مصر کے معاملات میں دخل نہ دوں گا، پچاس ہزار زر سرخ ادا کرکے صبح کا بھولا ہوا ارضِ شام کو لوٹ گیا، شیرکوہ بھی فتح کا شادیانہ بجاتا ہوا واپس چلا گیا،

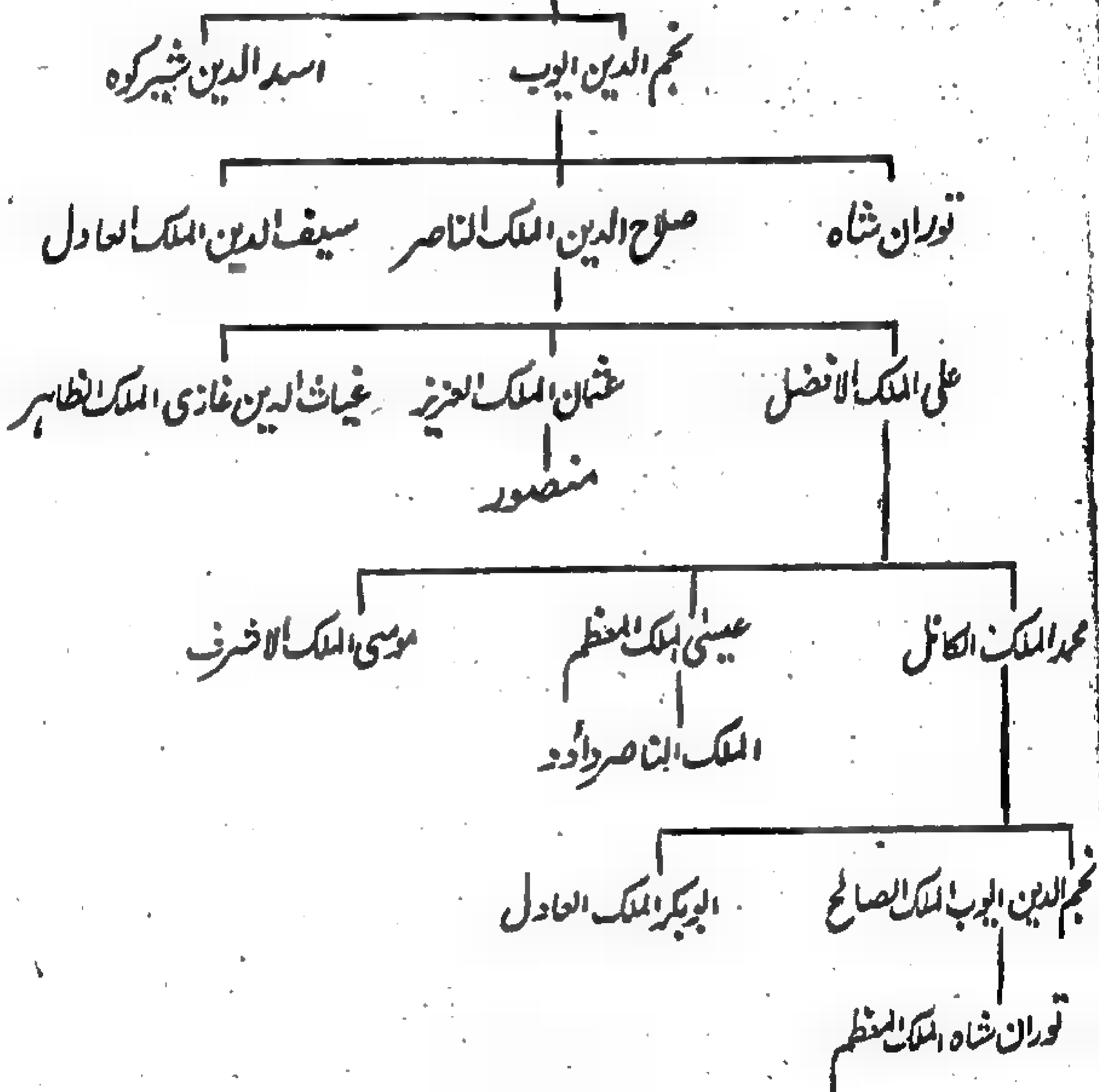
اہلِ صلیب کچھ قاہرہ میں رہ گئے تھے، جب میدان خالی پایا، تو غدار وزیر کی سازش سے لوگوں کو ستانا شروع کیا، اور پھر لوٹ گھسوٹ مچا دی، خلیفہ مصر نے عاجز ہو کر نورالدین سے مدد کی درخواست کی، پھر شیر کوہ مصر میں داخل ہوا، اہلِ صلیب نام سن کر ایسے بدحواس ہوئے کہ مال ومتاع چھوڑ کر بھاگ گئے،

چونکہ غدار وزیر بھی اس سازش کا سرغنہ تھا، اس لئے خلیفہ کے حکم سے سربازار قتل کیا گیا، اور خلیفہ نے شیر کوہ کو اپنا وزیر اور امیر الجیوش یعنی سپہ سالار مقرر کیا۔ دو ماہ بعد ۵۶۴ھ مطابق ۱۱۶۹ء میں شیر کوہ کا انتقال ہو گیا، اور اس کا جانشین اس کا بھتیجا صلاح الدین پسر نجم الدین ایوبی وزیر ہوا، اور خطاب الملک الناصر ملا،

اگرچہ بظاہر صلاح الدین خلیفہ مصر کا وزیر تھا، مگر درحل اپنے آپ کو نورالدین کا نائب السلطنت ہی سمجھتا تھا، اور آخر دم تک زنگی کے خاندان سے وفاشعاری اس کا شیوہ رہا، فاطمی خلیفہ مصر المعتضد لدین اللہ بستر مرگ پر تھا، صلاح الدین حنفی المذہب تھا، مناسب خیال کیا کہ پھر سے خلافتِ عباسیہ قائم کی جائے چنانچہ آخری خلیفہ مصر کی وفات پر اس نے ۵۶۷ھ میں اس کا اعلان کر دیا، اور اس وقت سے صلاح الدین عملاً مصر کا سلطان ہو گیا،

(شجرہ نسب اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

شجرہ نسب


شادی
نجم الدین ایوب
اسد الدین شیرکوہ
توران شاہ
صلاح الدین الملک الناصر
سیف الدین الملک العادل
علی الملک الافضل
عثمان الملک العزیز
غیاث الدین غازی الملک الظاہر
منصور
محمد الملک الکامل
عیسیٰ الملک المعظم
موسیٰ الملک الاشرف
الملک الناصر داؤد
نجم الدین ایوب الملک الصالح
ابوبکر الملک العادل
توران شاہ الملک المعظم

سنہ ۵۶۹ھ ۱۱۷۴ء میں صلاح الدین نے اپنے آقا نورالدین زنگی کی اجازت سے اپنے بھائی تورانشاہ کو تسخیر یمن پر مامور کیا، اسی سال زنگی کا انتقال ہوگیا، اب صلاح الدین کی حکومت تمام مصر اور "لوبیا" کے ایک حصہ اور ارض حجاز پر بالاستقلال قائم ہوگئی،

نورالدین کی وفات پر اس کا بیٹا گیارہ سال کا تھا، وہی دمشق میں باپ کا جانشین ہوا، صلاح الدین نے تعزیت نامہ لکھا، تحائف بھیجے اور یقین دلایا، کہ ہمیشہ اس کا وفادار رہے گا، لیکن ملک الصالح پسر نورالدین کے حاشیہ نشین امراء میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا، کہ وہی امیر الامراء ہو، ان کی سازشوں نے نظام سلطنت میں ابتری پھیلا دی، صلاح الدین نے ایک مکتوب میں ملک الصالح کو متنبہ کیا کہ لکھا کہ اگر یہی حال رہا تو مجبوراً خود آ کر وفادارانہ خدمت بجا لاؤں گا، اس کا جواب سلطان کے نام پر امراء نے ایسا دیا کہ صلاح الدین دانت پیس کر رہ گیا،

اہل صلیب اس موقعہ کو کب ہاتھ سے جانے دیتے، دمشق کی طرف بڑھے، اس وقت امیر گمشتگین سلطان اور سلطنت پر چھایا ہوا تھا۔ اہل صلیب کے مقابلہ کی تاب نہ تھی ملک الصالح کے ساتھ حلب میں پناہ گزین ہوا، اور اہل صلیب کو منہ مانگی رقم دے کر پیچھا چھڑایا، صلاح الدین غضب میں آگیا اور سات ہزار سوار کے ساتھ یلغار کرتا ہوا آیا اور دمشق پر قابض ہوگیا، یہاں سے پھر ایک دفعہ نوجوان اتابک ملک الصالح کو مودبانہ عریضہ لکھا کہ میں دمشق میں کسی ذاتی مفاد کے لئے نہیں آیا، دولت و ملک آپ کا ہے اور میں وہی دیرینہ خادم ہوں، آپ کو خود غرض امراء نے لڑکا سمجھ رکھا ہے، اور آپ ان کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں، آپ یہاں تشریف لائیں، امور سلطنت جب خاطر خواہ اچھی حالت پر آئیں گے تو میں واپس مصر میں چلا جاؤں گا۔

اس کا جواب امراء نے یہ دیا کہ تم غاصب نمک حرام ہو، اب صلاح الدین بھی سمجھ گیا کہ یہ سب شرارت امراء کی ہے، اس لئے مناسب خیال کیا۔ کہ خود اتابک سے ملے۔ اور نشیب و فراز زمانہ سے آگاہ کرے، جب صلاح الدین حلب کے نزدیک پہنچا، امراء نے لوگوں کو نورالدین زنگی کا احسان یاد دلایا اور صلاح الدین کے خلاف بھڑکایا، سب مسلح اٹھ کھڑے

ہوئے۔ صلاح الدین نے پھر قاصد روانہ کیا اور لکھا کہ اللہ شاہد ہے کہ میں یہاں لڑنے کے لئے نہیں آیا، لیکن جب تمہاری یہی مرضی ہے تو یوں ہی سہی، ان لوگوں نے کیا لڑنا تھا منہ کی کھائی۔ کمشتگین اتابک ملک الصالح کو لے کر قلعہ بند ہوگیا، اب اور کچھ چارہ کار نہ تھا، "حشاشین" سے ساز باز کی، کہ صلاح الدین کو ٹھکانے لگا دیں، ان کا قاتلانہ حملہ کامیاب نہ ہوا۔ غدار امیر نے اہلِ صلیب سے مدد کی درخواست کی، اور ساتھ ہی اتابک سیف الدین غازی ثانی اتابک موصل کو لکھا کہ اپنے چچیرے بھائی کی مدد کرو۔

اہلِ صلیب کب چوکنے والے تھے، "ایمیسیہ" کو محاصرہ میں لے لیا، لیکن صلاح الدین کی آمد پر محاصرہ اٹھا کر بھاگ گئے، صلاح الدین نے پھر ایک عریضہ اتابک کی خدمت میں لکھا، کہ "حما" اور "ایمیسیہ" اور بعلبک اس شرط پر دیتا ہوں، کہ دمشق میرے قبضہ میں بحیثیت نائب السلطنت رہنے دو۔

حقیقت یہ ہے کہ دمشق شام کی کلید تھا، صلاح الدین یہ چاہتا تھا کہ اہل صلیب کو شام سے بالکل بے دخل کر دے، اور یہ ممکن نہ تھا، کہ جب تک وہ دمشق کو اپنی مجاہدانہ سرگرمی کا مرکز نہ بناتا، یہ مشورہ اور مطالبہ بھی مسترد کیا گیا، سیف الدین غازی ثانی بھی، اتابک ملک الصالح کی مدد کو آ گیا، حلب کی دیواروں کے نیچے لڑائی ہوئی، تو اب صلح کی بات ملک الصالح نے شروع کر دی، نورالدین زنگی کی ایک بیٹی جو ابھی بچی ہی تھی صلاح الدین کے پاس آئی، صلاح الدین انتہائی احترام سے پیش آیا، جواہرات نذر کئے اور ولایت حلب ملک الصالح کے حق میں واگذار کر دی، لیکن دمشق پر خود قابض رہا۔ اس واقعہ کے بعد ملک الصالح کا نام خطبہ سے شام، حجاز و مصر میں خارج ہوگیا، اور خلیفہ عباسی نے سلطان کا خلعت باضابطہ صلاح الدین کو عطا فرمایا،

صلاح الدین کی نظر اہلِ صلیب پر تھی اس لئے یہ ضرور تھا، کہ دنیائے اسلام بھی اس طرح متحد ہو، جس طرح مسیحی یورپ متفقہ طاقت سے متواتر اسلامی ملک پر حملہ آور رہا ہے نورالدین زنگی کی اولاد کو بیش قرار جاگیریں دے کر راضی کر لیا۔ قونیہ میں سلجوقی سلاطین کو بھی اپنے ساتھ گانٹھا اور آرمینیہ کے سرداروں سے بھی رابطہ اتحاد قائم کیا، یہ معاہدہ

ہوا کہ ضرورت ہوئی تو سب مل کر اہلِ صلیب کے خلاف صلاح الدین کی مدد کریں گے۔

ادھر اہلِ صلیب کی قوتِ عسکری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یورپ سے نائٹ اور دیگر نامورری کے لئے اور تلاش مال وزر کے واسطے اور مذہبی دیوانے بیدینوں کے خلاف بے حساب تعداد میں آرہے تھے، سواحل شام پر ان کا اجتماع ہو رہا تھا، اس وقت فلسطین کی ملکہ سائبل تھی، کئی خاوندوں کے بعد گائے (Guy de Lusignan) کو منتخب کیا اور اسی کے سر پر تاج رکھ دیا، صلاح الدین کی اہلِ صلیب سے جھڑپیں بھی ہوتی رہیں اور معاہدہ صلح بھی ہوتا رہا، مگر خود یورپ کے مؤرخین معترف ہیں کہ مسلمان سلطان تو ہمیشہ پابند شرائط رہا، اہلِ صلیب ہی جب ذرا حالات سازگار ہوتے تو توڑ دیتے، اہلِ صلیب میں بھی طوائف الملوکی تھی، لیکن حربِ صلیب میں سب متحد اور متفق تھے۔

۱۱۸۶ء میں اہلِ صلیب نے معاہدہ کے خلاف ایک تجارتی قافلہ جو بحیرہ مردار کے قریب "قارق" سے گذر رہا تھا، اور قافلہ کے لوگوں کو قتل کیا، یہ رجنالد (Reginald) قارق کا حکمران تھا، صلاح الدین نے شاہ یروشلم کو لکھا، کہ نقصان جان و مال کا معاوضہ ادا کرو۔ اور قارق کا محاصرہ کر لیا، اور اپنے بڑے بیٹے ملک الافضل کو کچھ فوج دے کر "جلیل" پر متعین کر دیا، تاکہ ادھر سے صلیبی حملہ آور نہ ہوں اب اہلِ صلیب بھی متحدہ طاقت کے ساتھ صلاح الدین کے مقابلہ کے لئے بڑھے۔ ملک افضل سے مڈبھیڑ ہوئی صلاح الدین بھی اپنے بیٹے کی مدد کے لئے آگیا، دونوں لشکر جھیل "طبریہ" کے قریب ایک پہاڑی "حطین" کے دامن میں آمنے سامنے ہوئے،

۲۵ ربیع الثانی ۵۸۳ھ مطابق ۳ جولائی ۱۱۸۷ء یہ لڑائی جو "جنگ طبریہ" کے نام سے موسوم ہے مسلمانوں کے حق میں فیصلہ ہوئی، اہلِ صلیب کے سردار کچھ تو میدان جنگ میں کام آئے، کچھ اسیر ہوئے کچھ راہِ فرار اختیار کر گئے، سلطان نے اب سلسلہ فتوحات شروع کر دیا۔ شہر کے بعد شہر اور قلعہ کے بعد قلعہ مسخر ہوتا گیا، عکہ اور عسقلان، وہ بڑے آباجگاہ اہلِ صلیب کے تھے، سلطان نے لے لئے، اب صرف ان کے پاس سواحل شام کے شہروں میں سے "طائر" اور "طرابلس" رہ گئے۔

سلطان درحصل یروشلم کو لینا چاہتا تھا، یہاں اہلِ صلیب کی سپاہ ساٹھ ہزار سے زیادہ تھی۔ شہر قدس کے قریب پہنچ کر اس نے سرداران صلیب کو پیغام بھیجا کہ تم جانتے ہو کہ مسلمان اس شہر کو حرم سمجھتے ہیں اور یہاں جنگ و جدل حرام ہے، مناسب ہے کہ شہر بلا خون ریزی کے میرے حوالے کردو، میں اس کے عوض تمہیں مال و زر اور رہائش کے لئے اراضیات جہاں چاہو، دینے کے لئے تیار ہوں"

اہلِ صلیب نے انکار کر دیا، صلاح الدین نے پھر متنبہ کیا کہ

"جب تم نے یروشلم پر قبضہ کیا، جو کچھ انسانیت سوز مظالم تم نے کئے ہیں کا بدلہ خاطر خواہ لیا جائے گا، اگر اب بھی تم نے میری پیشکش منظور نہ کی"

سلطان نے یروشلم کو محاصرہ میں لے لیا، چند روز کے بعد اہل صلیب کے حواس ٹھکانے ہو گئے اور خود ہی صلح کا پیغام دیا، سلطان نے نرم شرائط پر صلح منظور کرلی، یونانی اور شامی مسیحی سلطان کی عملداری میں جہاں چاہیں شہری حقوق کے ساتھ بطور امن پسند رعیت رہیں، فرنگی اور اطالوی جو ارض فلسطین میں بطور رعیت رہنا چاہتے تھے۔ سلطان نے اجازت نامہ لکھ دیا، تمام حارمین چالیس دن کے اندر اندر سلطان کی حفاظت میں طائر یا ٹریپولی کی طرف چلے جائیں، بشرطیکہ ہر ایک مرد دس شامی دینار اور عورت پانچ اور بچہ ایک دینار فدیہ ادا کریں، اور اگر نہ کر سکیں تو تا ادائیگی اسیری میں ہیں لیکن یہ شرط محض کاغذی تھی، سلطان نے خود دس ہزار آدمیوں کا زر فدیہ اپنی جیب سے ادا کیا، اس کے بھائی سیف الدین نے سات ہزار کو اسی طرح آزاد کرایا، اور کئی ہزار یوں ہی رہا کئے گئے، پادری اور عوام اپنا مال و متاع جتنا بھی لے جا سکے، اٹھا کر لے گئے سلطان نے دیکھا کہ بعض اشخاص اپنے ضعیف والدین اور بچوں کو کندھوں پہ اٹھائے لے جا رہے ہیں، دل بھر آیا اور انہیں زادِ راہ بھی دیا اور سواری کے لئے خچریں بھی مہیا کر دیں، ملکہ سائمیبل اور کثیر تعداد ازدواج شرفا اپنے بچوں کو گود میں لئے آہ وزاری کرتی ہوئی نکلیں سلطان یہ دل ہلا دینے والا نظارہ دیکھ رہا تھا، ان میں سے بعض نے سلطان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

"تم دیکھ رہے ہو کہ ہم کس حالت میں تمہارے ملک سے ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں، لیکن راستہ میں ہماری اور ہمارے بچوں کی خبرگیری کون کرے گا، ہمارے مرد ہمارے ساتھ کر دو، جو تمہاری قید میں ہیں"

صلاح الدین نے ان کو بھی زادِ راہ دیا، اور نائل کو اپنے بیٹے اور عورتوں کو خاوند واپس دیئے اور نائٹ ہاسپٹلرز (Knight Hospitallers) ان کی حفاظت کے لئے ساتھ کر دیئے،

"ملز" (Millns) لکھتا ہے کہ اکثر مسیحی جو یروشلم سے نکلے اس امید پر کہ انطاکیہ میں مسیحی سردار بوہمنڈ (Bohemand) ہے یہاں آئے، مگر بوہمنڈ نے مہمان نوازی اس طرح کی کہ جو کچھ ان کے پاس تھا لوٹ لیا، یہاں سے افسردہ دل ہو کر وہ مسلمانوں کے شہروں سے گزرتے رہے، جہاں کہیں جاتے، ان کی ضروریات مسلمان فراخ دلی سے پوری کرتے، اپنے ہم مذہب بھائیوں کی بدسلوکی سے بددل ہو کر بعض نے اسلام قبول کر لیا اور اکثر شام میں آوارہ پھرتے رہے، ان میں سے ایک عورت نے اپنے شیرخوار بچہ کو سمندر میں پھینک دیا، اور اکثر مرد و زن سمندر میں اپنے مسیحی برادران نامہربان کو لعنت کرتے ہوئے کود پڑے،

جب تک تمام اہلِ صلیب شہر قدس سے نہ نکل گئے، سلطان نے اپنی فوج کے کسی سپاہی کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی اور نہ خود داخل ہوا، حرم کا احترام واجب تھا۔ ۲۷ رجب ۵۸۳ھ بروز جمعہ سلطان اکابر یروشلم کے ساتھ جو فتح کی مبارکباد دینے کے لئے آئے تھے، شہر میں داخل ہوا، کہتے ہیں کہ شاعر تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں، سلطان نے جب بماہ صفر ۵۷۹ھ حلب فتح کیا تو ایک شاعر نے مدحیہ قصیدہ پیش کیا جس کا ایک شعر ہے

"و فتح حلب بالسیف فی صفر — مبشر الفتوح القدس فی رجب"

(شمشیر سے ماہِ صفر میں حلب کی فتح بشارت فتح شہر قدس ماہِ رجب میں دے رہی ہے)

علامہ جلال الدین سیوطی لکھتا ہے کہ "ابن برجان" فتح بیت المقدس سے پیشتر وفات

چکا تھا، آیہ "الم غلبت الروم" کی تفسیر بحساب ابجدیہ کی ۵۸۳ھ تک بیت المقدس عیسائیوں کے قبضہ میں رہے گا، اس کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے گا"

صلاح الدین اہلِ صلیب کو شام اور فلسطین سے بالکل بے دخل کرنا چاہتا تھا، طائر کو محاصرہ میں لے لیا، اس جگہ مارکوئیس کانراڈ (Conrad Marquis of Montferrat) حکمران تھا۔ سلطان نے نہایت نرم شرائطِ صلح پیش کیں، انکار کیا، سلطان نے مصلحتاً محاصرہ اٹھا دیا، اور ساحل شام کے دوسرے شہروں کی طرف متوجہ ہوا، جو یکے بعد دیگرے فتح ہوتے گئے جہاں اب تک فرنگی قابض تھے، سلطان نے "گائی" (Guy de Lusignan) کو اس اقرار صلح پر چھوڑ دیا کہ وہ بلا توقف یورپ میں واپس چلا جائے گا، مگر پولوس رسول نے جس وجالیت کا سبق اپنے مریدوں کو پڑھایا تھا وہ اُسے ہی از بر یاد تھا آزادی کی ہوا کھانے کے بعد اُس نے اِدھر اُدھر سے پراگندہ اہلِ صلیب کو ایک جگہ جمع کیا اور یورپ سے نو وارد بھی اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئے۔ ان کے ساتھ اس نے "عکہ" کو محاصرہ میں لے لیا۔ یہ وہ تاریخی مقام ہے، جہاں اب یورپ، اور افریقہ اور ایشیا تین براعظموں نے آئندہ دو سال کے لئے اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر جنگ کا مرکز بنایا،

حرب صلیب سوم

پوپ گریگری ہشتم نے اس حرب کا اعلان کیا۔ اور شاہ انگلستان اور فرانس اور جرمنی نے اس میں حصہ لیا۔

"فلپ آگسٹس شاہ فرانس (Philip Augustus) اور رچرڈ شیر دل (Richard Coeur de Lion) اپنی اپنی سپاہ کے ساتھ "عکہ" پر اترے، صلاح الدین کی یہ رائے تھی، کہ ان کو راستہ میں ہی روکا جائے تا کہ وہ اہلِ صلیب سے عکہ میں اکٹھے نہ ہوں، مگر امراء نے مشورہ اس کے خلاف دیا، اس لئے سلطان کو "عکہ" میں ان کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرنا پڑا، اگرچہ سلطان کی اپنی رائے ہی صائب تھی،

جب سلطان مقابلہ میں آیا۔ تو دیکھا کہ اہلِ صلیب عکہ سے ساحل بحر تک ایک فولادی دیوار کی طرح حائل ہیں، سلطان نے عکہ کے ایک پہاڑی "تل کیسان" پر اپنا فوجی مرکز قائم کیا۔ عیسائیوں کو کمک سمندر کے راستے اور مسلمانوں کو خشکی کے راستے موصل اور دیار بکر اور سنجار اور حاران سے

پہنچ رہی تھی، ماہِ شعبان ۵۸۵ھ مطابق ۱۱۸۹ء کے شروع میں صلاح الدین نے حملہ کر دیا، تقی الدین سلطان کے بھتیجے نے اس زور سے حملہ کیا، کہ اہلِ صلیب کی صفیں ٹوٹ گئیں ابن اثیر لکھتا ہے کہ اگر یہ حملہ رات تک جاری رہتا، تو جنگ کا خاتمہ ہو جاتا۔ مگر وہ تھک گئے اور کام ادھورا چھوڑ کر دوسرے روز پھر تازہ حملے کی تیاری کرنے لگے، عکہ سے عیسائی اس جنگ کے بعد بے دخل ہو چکے تھے، اس لڑائی کا ایک نتیجہ یہ ہوا، کہ سلطانی فوج کا الحاق اہلِ شہر سے ہو گیا۔ لیکن لاشوں کے تعفن سے دیا پھوٹ پڑی، اور خود سلطان بھی اس میں مبتلا ہو گیا، اس لئے مجبوراً ایک اور مقام کی طرف ہٹنا پڑا، اہلِ صلیب نے پھر محاصرہ ڈال دیا، اہلِ عکہ نے صلح کا پیغام دیا، صلح تو ہو گئی، مگر مسیحی سپاہیوں نے عورتوں اور بچوں تک سب کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا، عکہ کی لڑائیوں میں اہلِ صلیب بھی ساٹھ ہزار کام آئے،

رچرڈ نے اب عسقلان کا رُخ کیا، صلاح الدین نے عسقلان کا قلعہ اور دیوار خود مسمار کر دی اور رچرڈ کے مقابلہ پر ڈٹ گیا، رچرڈ نے بھی سمجھ لیا کہ یہ مذہبی لڑائیاں عبث ہیں، اس لئے صلح کا پیغام دیا، اس میں ایک شرط جو الگی یروشلم بھی تھی یہہ شرط بھی یاد رکھنی چاہئیے کہ جب بھی اہلِ صلیب کے ساتھ مسلمانوں کی گفت و شنید ہوئی یہ مطالبہ بھی ہوتا رہا کہ وہ چوبی صلیب جس پر خداوندِ مسیح لٹکائے گئے تھے عیسائیوں کے حوالے کی جائے، چوبی صلیب کہاں سے آتی مگر ان لوگوں کو یقین تھا کہ مسلمانوں کے قبضہ میں ہے،

صلاح الدین نے یروشلم کی واپسی سے صاف انکار کر دیا، آخر یہ طے پایا کہ رچرڈ کی بہن کا عقد نکاح سلطان کے بھائی سیف الدین ملک العادل سے ہو، اور دونوں کو یروشلم کی حکومت دی جائے اور دونوں کی اولاد ہی ارضِ فلسطین پر حکمران رہے، اور جو شہر ساحل شام پر واقع ہیں رچرڈ جہیز میں اپنی بہن کو دے گا، رچرڈ کی بہن صقلیہ کے بادشاہ کی بیوہ تھی صلاح الدین نے تو یہ شرط منظور کر لی، مگر پادریوں نے طوفانِ مخالفت برپا کر دیا کہ مسیحی عورت ایک بے دین کے حبالۂ نکاح میں ہرگز نہیں دی جا سکتی،

رچرڈ نے یہ امر آسان سمجھا کہ درخواست کی کہ ملک العادل مسیحی مذہب قبول کرے اُدھر سے انکار ہوا،

رچرڈ کا دل لڑائی سے اچاٹ ہوگیا تھا، اور اس کو اپنے گھر کا بھی خیال تھا، مگر "کانراڈ" لڑائی پر تُلا ہوا تھا، اور رچرڈ کے خلاف پادریوں کی وساطت سے لوگوں کو اُبھار رہا تھا۔ ان ہیمر (Van Hammer) نے اپنی تاریخ حشاشین (Assassins) میں ثابت کیا ہے کہ رچرڈ کے ایما پر دو فدائیوں نے کانراڈ کا کام تمام ۱۱۹۲ء میں کردیا، رچرڈ نے اب صلاح الدین کو لکھا کہ مجھے یقین ہے کہ تم بندگان خدا کا خون ناحق میری طرح پسند نہیں کرتے، میں نے وہ علاقہ جو میرے قبضہ میں ہے کونٹ ہنری (Henry of Champagne) کو دے دیا ہے، میں اس کو آپ کی حفاظت میں دیتا ہوں، وہ ہر ایک مہم میں آپ کے ہمرکاب رہے گا، میں صرف یروشلم میں چرچ کی استدعا کرتا ہوں،

سلطان نے اُمراء سے مشورہ کے بعد صلح کی شرائط منظور کرلیں، رچرڈ اس کے بعد انگلستان کی طرف لوٹا۔

فریڈرک شاہ جرمنی کے ساتھ بیشمار جمعیت تھی وہ ساحل پر اُترا، ترکمانی سپاہیوں نے اسے بہت پریشان کیا، اس کے دائیں بائیں چھاپے مارتے رہے، مگر آخر وہ بالائی سلیشیا میں پہنچ گیا، سلطان نے یعقوب المنصور شاہ مراقش کو مدد کے لئے لکھا، مگر وہ ٹال گیا، خوش قسمتی سے شہنشاہ سلیشیا کے قریب دریا سلاف میں ڈوب گیا، اس پر اس کی فوج میں بدنظمی اور پھوٹ پیدا ہوگئی، اکثر تو وطن کو لوٹ گئے، تھوڑی سی جمعیت اس کے بیٹے کے تحت انطاکیہ سے ہوتی ہوئی فلسطین میں داخل ہوگئی، اور یہاں سے ایک جہاز میں سوار ہوکر وطن کو لوٹی۔ مگر جہاز رستہ میں تباہ ہوگیا، اور اکثر غرق ہوگئے، یہ واقعہ ۱۱۹۰-۹۱ء کا ہے، اس طرح تیسری صلیبی جنگ کا خاتمہ ہوگیا، ۲۷ ماہ صفر ۵۸۹ھ میں غازی سلطان صلاح الدین کا بھی دمشق میں انتقال ہوگیا تمام دنیا اسلام ماتم کدہ بن گیا،

سلطان کے بیٹوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی، سیف الدین الملک العادل نے اسے ختم کردیا، اور خود شام اور الجزیرہ (عراق) اور شام اور عرب کا مالک ہوگیا، اسی کا نام خطبہ میں پڑھا جاتا، اور اسی کا سکہ رائج ہوا،

حرب صلیب چہارم سلطان صلاح الدین کی وفات سے دو سال پیشتر پاپائے روم

کانسٹائن ثالث (Catastine III) نے پھر سے آتشِ صلیب مشتعل کی، لیکن اہل صلیب کا جوش و خروش تیسری صلیبی لڑائی کے بعد ٹھنڈا پڑ چکا تھا،

ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ یورپ کی تمام متحدہ طاقت بیروت پر اُٹھی، الملک العادل یلغار کرتا ہوا آیا پہلے یافہ لیا، اہل صلیب نے "طبنین" کا محاصرہ ڈالا ہوا تھا، ان کی سرکوبی کی، اور ہر ایک مقام پر ان کو شکست دی، اور ان ہی کی استدعا پر تین سال کے لئے صلح کا عہد باندھا گیا، یہ لوگ شروع سے اخیر تک رنگ رلیاں ہی مچاتے رہے سنہ ۱۲۰۰ء میں اس جنگ کا بھی خاتمہ ہو گیا،

حرب صلیب پنجم

مجاہدین صلیب ساحل شام پر بحر شام کے رستہ آ کر اُترتے لیکن اکثر بہ رستہ قسطنطنیہ آتے، شاہان آسٹریا اور قسطنطنیہ کی یہی کوشش رہتی کہ یہ طوفان بے تمیزی جتنی جلدی ہو گزر جائے،

پوپ انوسنٹ ثالث (Innocent III) نے پانچویں صلیبی لڑائی کا آغاز کر کے شہریاران یورپ کو لکھا کہ اس کارِ خیر میں خود بھی شامل ہوں، اور عام مصارف کے لئے روپیہ بھی فراخ دلی سے تقدس مآب کے حوالے کریں، رچرڈ شیر دل کو تیسری لڑائی کے تلخ تجربہ کے بعد اس میں کچھ دینی یا دنیوی فائدہ نظر نہ آیا، پوپ کے ایلچیوں کو ٹکا سا جواب دیا. مگر یورپ کے دیگر شہزادگان گرم و سرد زمانہ چشیدہ نہ تھے، وہ پوپ کی آواز پر اُٹھے یورپ کے مورخین لکھتے ہیں، کہ پوپ کو طمع مال و زر تھا، اس کی بلا سے اہل صلیب پر کیسی گذری ہے،

یہ مہم جب قسطنطنیہ کی حدود میں داخل ہوئی، تو معزول شدہ مقید قیصر اسحاق انجلیس (Isaac Angelus) کا بیٹا الیکسس (Alexius) ان کے پاس آیا، اور اپنی داستانِ غم سنائی۔ کہ چچا نے تخت و تاج غصب کر کے میرے باپ کی آنکھیں نکلوا دیں اور قید خانہ میں ڈال رکھا ہے، اگر میری مدد کرو تو اس کا اجر کفار سے جنگ سے بھی بڑھ کر ملے گا اور میں زر و مال سے تمہاری خدمت کے لئے حاضر ہوں، اہل صلیب نے شہر پر ہلہ بول دیا قسطنطنیہ کا ایک چوتھائی حصہ جل کر راکھ ہو گیا، بدقسمتی سے ان کو اس جگہ ایک مسجد

ی نظر آئی،

میر معاویہؓ کے عہد میں جب صحابہ اور تابعین نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا، حضرت ایوب انصاری
ر دیگر صحابہ و تابعین بھی اسی کی دیواروں کے قریب شہید ہوئے، حضرت ایوب انصاری کی
بر بھی اسی جگہ تھی، اور غالباً قریب ہی ایک مسجد بھی تھی، جہاں مسلمان تاجر اور زائرین نماز
ہتے، مسلمانوں کی لڑائیاں رومیوں سے مسلسل ہوتی رہیں، اور جب بھی صلح کا معاہدہ ہوتا۔ تو
یک شرط یہ بھی ہوتی۔ کہ اس مسجد کی حفاظت قیصر کے ذمہ ایسی ہی ہے جیسی مسلمانوں
کے ذمہ نصاریٰ کے کنیسا اور دیگر متبرک مقامات بالخصوص مقبرہ مسیحؑ کی،

اہلِ تثلیث کو اتنی تاب کہاں تھی۔ کہ "روما" کے بعد قسطنطنیہ میں جو یورپ میں سب سے
ڑا مسیحی شہر تھا، دیکھیں کہ اس جگہ خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی اجازت مسلمانوں کو
ہے۔ جن کے ساتھ ان کا جنگ تھا، اس نے بھی جلتی پر تیل کا کام دیا، مسجد اور مقبرہ تو مسمار
یا۔ مگر اس آگ نے اٹھے روز برابر کئی کنیسے اور متبرک خانقاہیں بلکہ کنیسا سینٹ صوفیہ (St.
Sophia) کی بھی خاطر خواہ بے حرمتی کی، زرنگار پردے پھاڑ دیئے، کہ ان میں سے کچھ
سونے کی مقدار ہاتھ آئے گی، صنعت کی وہ یادگاریں جو اس کنیسہ کے حسن کو نمایاں کر رہی
تھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیں، اس میں مسیحؑ اور والدہ مسیحؑ اور آئمہ دین مسیحؑ کی تصویریں بھی تھیں
جو سنہری و روپہلی چوکھٹوں میں جڑی ہوئی تھیں، اہل صلیب شہر کے علاوہ قرب و جوار کے
دیہات میں بھی جا گھسے، اور جو بھی سامنے آیا، مارا گیا، غرض لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم رہا، خچریں
مال و متاع سے لدی ہوئی اہلِ صلیب ہانکتے ہوئے لے جا رہے تھے،

یہ صلیبی لڑائی خود صلیب اور اہلِ صلیب کے خلاف تھی اور اسی جگہ ختم ہو گئی،

رسیدہ بود بلائے و لے بخیر گذشت!

حربِ صلیب ششم

پوپ انوسنٹ ثالث کو تو صلیبی لڑائیوں میں فائدہ ہی فائدہ دکھائی دیتا تھا، اس نے چھٹی لڑائی کا اعلان ۱۲۰۶ء میں کیا، اور
اس دفعہ اس شد و مد سے سعادت دارین اور دنیوی برکات کا نقشہ کھینچا، کہ عورتیں اور لڑکے
اور بوڑھے، اپاہج، جذامی بھی اس میں ذوق و شوق سے شامل ہوئے، ہنگری کا بادشاہ، اور آسٹریا

اور "بویریا" (Bavaria) کے نواب ڈیوک (Duke) اور زیرین جرمنی کے رؤسا اور امراء کی متحدہ طاقت نے دو لاکھ کی جمعیت فراہم کرلی، جو پہلے سواحل شام پر اُترے، یہاں قتل و غارت کے بعد ان کی توجہ مصر کی طرف مبذول کی، یہاں دمیاط کو محاصرہ میں لے لیا۔

الملک العادل کو پتہ چلا، تو شمال شام سے تیزی کے ساتھ مصر کی حفاظت کے لئے بڑھا، دمشق کے قریب پہنچا ہی تھا۔ کہ اس کا انتقال ہوگیا، اس کے بیٹوں نے سلطنت باہم تقسیم کرلی، ابوالمعالی ناصرالدین الملک الکامل کے حصہ میں مصر آیا۔ شرف الدین عیسیٰ الملک المعظم کے پاس ملک شام کا اکثر حصّہ اور موسیٰ مظفرالدین الملک الاشرف کے ہاتھ ولایت حلب آئی۔

اٹھارہ ماہ کے محاصرہ کے بعد اہلِ صلیب نے دمیاط" لے لیا، یہاں ستّر ہزار کی آبادی تھی، قتل عام کے بعد جو اہلِ صلیب کی امتیازی عادت ہوچکی تھی، صرف تین ہزار بچے، اس کے بعد وہ القاہرہ کی طرف بڑھے، اگرچہ ملک الکامل کو بھائیوں کی طرف سے کمک پہنچ گئی تھی، مگر اس نے دُور اندیشی سے سمجھ لیا تھا، کہ مقابلہ برابر کا نہیں، اس لئے یہ شرط صلح پیش کی۔ کہ اگر دمیاط میرے حوالہ کردو۔ تو جو مقبوضات مفتوحہ صلاح الدین ہیں واپس کرتا ہوں، صلیبیوں کو یقین تھا۔ کہ مصر کی تسخیر کوئی دن کی بات ہے۔ اس لئے صلح سے انکار کردیا، خوش قسمتی سے دریائے نیل طغیانی پر آگیا، اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ مسلمانوں نے تمام بند کھول دیئے، اہلِ صلیب سیلاب کی زد میں آگئے دمیاط سے تمام رسل و رسائل کے راستے منقطع ہوگئے، اور رسد کا سامان جو ان فاقہ مستوں کے لئے آرہا تھا، مسلمانوں نے لوٹ لیا۔ وہ ایک ایسے مقام میں گھر گئے، جو جزیرہ نما بنا ہؤا تھا، مسلمانوں نے بھی چاروں طرف سے حملے شروع کردیئے، اب ان کے حواس ٹھکانے لگے، صلح کی درخواست کی۔ اپنے اکابر یرغمال میں دیئے، اور صرف اتنا مطالبہ کیا کہ ساحل تک بحفاظت پہنچ جائیں یہ مطالبہ منظور کیا گیا۔

حرب صلیبیہ ہفتم

ادھر اہلِ صلیب سے ملک خالی ہؤا، ادھر ملک العادل کے بیٹوں

تنازعہ شروع ہوگیا۔ ملک المعظم نے علاء الدین خوارزم شاہ کے بیٹے جلال الدین سے ساز باز شروع کی اور ملک الکامل نے فریڈرک ثانی شہنشاہ جرمنی سے خط وکتابت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس کے نام تقدس مآب کا حکم صادر ہو چکا تھا کہ ساتویں لڑائی میں فوراً شامل ہو جاؤ۔ ملک المعظم ۱۲۲۷ء میں فوت ہوگیا، اس کا بیٹا ملک الناصر داؤد جانشین ہوا۔ ۱۲۲۹ء میں فریڈرک ثانی بھی شام کے ساحل پر آ اترا۔

فریڈرک ثانی (Frederick II) شہنشاہ جرمنی اوائل عمر ہی سے اسلام کا گرویدہ تھا، اس کی پیدائش اور پرورش اور تعلیم و تربیت جزیرہ صقلیہ میں ہوئی تھی جہاں کسی وقت اسلامی پرچم لہرا تا رہا، اس وقت جرمنی کے مقبوضات میں داخل تھا، مگر ابھی تک اسلامی اثر کے تحت تھا۔ فریڈرک کو عربوں سے اختلاط کی وجہ سے خاص لگاؤ تھا۔ خود عربی بدوی لہجہ میں فصیح بول سکتا تھا، اس کے بعض امراء وزراء اور سپاہ میں بھی عربی تھے،

"ڈاکٹر ڈریپر" لکھتا ہے کہ عربوں اور یہودیوں نے اسے چرچ کا مضحکہ اڑانا سکھایا۔ ابن رشد کے دو بیٹے اس کے دربار کی رونق تھے، جب پوپ کا حکم اس کے نام صادر ہوا تو اول اول تو باتوں اور بہانوں سے ٹالتا رہا۔ جب پوپ دھمکیوں پر اتر آیا، تو کچھ خالف ہو کر جنگی جہاز پر قدم رکھا، مگر تیسرے دن باد مخالف کے عذر نے پھر سے صقلیہ واپس جانے پر مجبور کیا۔ پوپ تاڑ گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ فریڈرک کے خلاف ارتداد (Ex, Communication.) کا فتویٰ صادر کیا، فریڈرک نے جواب دنداں شکن دیا کہ

"روم نفسانی خواہشات میں غرق ہے، پادری خود گمراہ اور لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں، وہ لوگوں کو خداوند مسیح کا وعظ نہیں سناتے، بلکہ اس کی آڑ میں روپیہ بٹورتے ہیں، اب وہ حواریان مسیح کی سادگی، پیشوایان دین امیر کبیر بن گئے چرچ کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں، اور کوئی دم میں یہ مذہبی ڈھونگ ختم ہو جائیگا۔"

اس کا جواب الجواب ایک اور کفر کا فتوے صادر ہوا، فریڈرک کے پشت پناہ مسلمان تھے۔ اس نے روم میں عام بغاوت پھیلا دی، تقدس مآب روم سے بھاگ گئے، اس فتح کے بعد

فریڈرک نے مناسب خیال کیا کہ مسیحی دنیا میں شرمسار نہ ہو، اس لئے برضا و رغبت ارض فلسطین کی طرف رخ کیا۔

یورپ کے مشہور شہسواروں اور زائرین نے گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ملک الکامل اور فریڈرک میں پیشتر ہی مراسم دوستانہ تھے، اب اس اتحاد کو اور پختہ کرنے کا موقعہ مل گیا، فریڈرک کے کیمپ میں بدویوں کا ہجوم رہتا۔ جنگی مجادلہ کی جگہ مذہبی مباحثہ وہ بھی بغرض تفریح مجلس کی رونق کا باعث تھا، فلسفیانہ نکات میں مسیحت کو رسوا کیا جاتا، سلطان ملک الکامل نے ایلچی تحائف کے ساتھ بھیجے جو بخوشی نہاطر منظور کرلئے اور ایلچیوں کو چپکے سے خلوت میں سمجھا دیا کہ میں اس جگہ لڑنے کے لئے نہیں آیا، بلکہ بزدلی کا الزام دور کرنے اور مسیحی دنیا کی نگاہ میں وقار قائم رکھنے کے لئے مجبوراً آنا پڑا۔ اور سلطان سے استدعا کی کہ بیت المقدس چپکے سے میرے حوالے کردو۔ کہ میری بات بھی بنی رہے اور جنگ بھی ختم ہو جائے۔

یہ جنگ زرگری کچھ دن جاری رہی، اور سلطان نے یروشلم حوالے کردیا، فریڈرک شاداں و فرحاں فتح کے شادیانے بجاتا وطن کو لوٹا، یہاں ایک اور خطرناک فتویٰ کفر اس کا منتظر تھا، پوپ نے نہ صرف فریڈرک کو مرتد اور خارجی قرار دیا، بلکہ مقدس مقبرہ مسیح علیہ السلام اور شہر قدس کو بھی انٹرڈکٹ (Interdict) کے تحت رکھا۔

فریڈرک پر حسب ذیل الزامات عائد کئے:۔

(۱) پوپ نے فریڈرک کو پطرس اعظم حواری کے آلٹر (Altar) کے سامنے ایک تلوار مسیحی دین کی حفاظت کے لئے دی تھی، فریڈرک نے یہ تلوار سلطان کی نذر کی۔

(۲) فریڈرک نے یروشلم میں قرآن کے وعظ کی اجازت دی۔

(۳) اس صلح کے عہد سے جو سلطان سے باندھا انطاکیہ کے عیسائیوں کو خارج رکھا

(۴) اس عہد نامہ کی ایک شرط یہ ہے کہ اگر کبھی مسیحی یورپ یروشلم کو اسلامی نجاست سے پاک کرنے کے لئے جنگ کرے تو فریڈرک مسلمانوں کی طرف سے لڑے گا۔

فریڈرک اور پوپ میں علانیہ جنگ چھڑ گئی، تیس ہزار عرب فریڈرک کے ساتھ تھے۔ مگر یہ واقعات ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اتنا اشارہ کافی ہے کہ فریڈرک کے اصلاح

(Reformation) کا سنگ بنیاد رکھ دیا، جو لوتھر وغیرہ کے کام آیا۔ لوتھر کو بارگاہ پوپ سے سگِ مجذ کا خطاب ملا،

حرب صلیب ہشتم ملک الکامل ۶۳۸ھ ۱۲۳۸ء میں فوت ہوا، امراء نے پہلے اس کے بیٹے ابوبکر الملک العادل کو تخت پر بٹھا دیا، مگر وہ نالائق ثابت ہوا، تو دوسرے بیٹے ایوب الصالح کے سر پہ تاج رکھ دیا۔

شاہ فرانس لوئس نہم (IX Louis) آٹھویں صلیبی لڑائی میں سالار فوج تھا، دمیاط" پر آتما، جس کو مسلمان اس کی آمد پر خالی کر چکے تھے۔ بندرگاہ اور شہر پر قبضہ ہو گیا تو اہلِ صلیب اپنی روائتی عیش وعشرت میں مشغول ہو گئے، بے حیائی اس طرح کھلے بندوں ہو رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہی ایک مذہبی رسم ہے، جسے یہ لوگ خلوص نیت سے ادا کر رہے ہیں، لیکن شہر کب تک ان کے اخراجات مسرفانہ کا متحمل ہوتا، آخر باہر نکلنا پڑا، اور یہ جرأت اس وقت ہوئی جب ملک الصالح کا انتقال ۶۴۷ھ ۱۲۴۹ء میں ہو گیا،

اس کا ایک ہی بیٹا تورانشاہ اس وقت شام میں تھا، والدہ ملکہ شجرة الدر نے امراء سے اس کے حق میں بیعت لی، لوئیس شاہ فرانس صلیبیوں کے ساتھ دمیاط سے نکل کر قاہرہ کی طرف بڑھا،

اس حرب صلیب کے چشم دید حالات "جین" (Jean de Joinville) نے لکھے ہیں، یہ ایک نائٹ (Knight) لوئیس شاہ فرانس کے ہم رکاب تھا، اور شاہ فرانس کے ساتھ ہی اسیران جنگ میں بھی شامل تھا، اس نے اپنی تاریخ سینٹ لوئس (History of St. Louis) میں اس صلیبی معرکہ کے حالات مفصل بیان کئے ہیں وہ اس معرکہ کو حروب صلیب ہفتم سے موسوم کرتا ہے، وہ لکھتا ہے۔ کہ

جب فرنگیوں نے دمیاط پر ۶۵۰ھ مطابق ۱۲۵۲ء میں قبضہ کر لیا، ملک الصالح ابن ملک الکامل شام میں تھا، یہ خبر وحشت اثر سن کر مصر کی طرف آیا، وہ سخت بیمار پالکی میں لایا گیا، لوئس نے اسے لکھا۔ کہ مصر ہمارے حوالے کر دو۔ جان کی امان دیتا ہوں، سلطان نے اپنی فوجیں "منصورہ" میں جمع کیں، جو اس کے باپ ملک الکامل نے ہی بسایا تھا، سلطان کے ہمراہ

اس کی حسین زوجہ "شجرۃ الدر" بھی تھی، سلطان تو بہت بیمار بیٹھا تھا، مگر "شجرۃ الدر" تمام امور خود نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی تھی، اثنائے محاصرہ میں ملک الصالح کا انتقال ۱۵ شعبان ۶۴۷ھ مطابق ۲۲ نومبر ۱۲۴۹ء میں ہوگیا، شجرۃ الدر نے سلطان کی موت کو کسی شخص پر ظاہر نہ ہونے دیا، لاش خاموشی سے قاہرہ بھجوا دی، جہاں سلطان دفن ہوا۔ سلطان کا بیٹا الملک المعظم توران شاہ اس وقت دمشق میں تھا، اُسے خفیہ اطلاع دی اور لکھا، کہ بلاتاخیر مصر میں پہنچو۔

اس اثناء میں اہل صلیب اور مسلمانوں میں دریائے نیل میں اور خشکی میں جھڑپیں ہوتی رہیں۔ جو چند ہفتے جاری رہیں، منصورہ اور اہل صلیب کے درمیان نیل کی ایک کھاڑی جسے بحر اشموم کہتے حائل تھی، عیسائی جان توڑ کوشش کرتے رہے، کہ اُسے عبور کر کے منصورہ پر حملہ بول دیں، لیکن مسلمانوں کی دریائی کشتیوں اور خشکی کی طرف سے نفت (Greek Fire) نے ان کو بہت پریشان کیا، آخر کار ان کو ایک پایاب جگہ کا علم ہوگیا، اور وہ مغربی کنارے پر اُترے۔ ان کی پیدل فوج نے لوئس کے بھائی کاؤنٹ ڈی آرٹوئس (Count de Artois) کے تحت اچانک حملہ کر دیا، یہ حملہ عین غفلت میں ہوا۔ اور مسلمانوں کا سالار فوج فخر الدین مارا گیا۔ شکست یقینی تھی، مگر اس وقت بحری مملوک دشمن پر ٹوٹ پڑے۔ ان کا سردار "بیبرس بندوقداری" تھا، فرنگی صفیں ٹوٹ گئیں، اور شاہ فرانس کا بھائی کاؤنٹ بھی اور اکثر ٹمپلر نائٹ (Templar Knight) بھی میدان میں کھیت رہے، رات کی تاریکی میں بقیۃ السیف مشرقی کنارے پر اتر گئے، یہ واقعہ ذوالقعدہ ۶۴۷ھ مطابق ۸ فروری ۱۲۵۰ء کا ہے۔ اصل میں اس وقت شجرۃ الدر ہی سپہ سالاری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ مصر کی تاریخ میں یہ ایک عجیب واقعہ ہے کہ ایک مسلمان عورت جس کا خاوند چند دن ہوئے فوت ہوا، شمشیر بکف میدان جنگ میں فوج کی قیادت کر رہی تھی، اس واقعہ کے دس روز بعد ملک معظم توران شاہ بھی تازہ فوج کے ساتھ آگیا۔ اب ملک الصالح کی وفات کی خبر شائع کی گئی۔ دمیاط سے اہل صلیب کی کمک کو چند جہاز اسلحہ سے لدے ہوئے نیل میں آرہے تھے مسلمانوں کے ہاتھ پڑے، مسیحی فوج کی یہ حالت تھی کہ پہلے منصورہ کا محاصرہ کیا اب خو

محصور ہوگئی۔ قحط اور وبا، نے بھی ان کے حوصلے پست کردیئے، ہر طرف سے نفرت کے بان برس رہے تھے۔ لوئس نے صلح کی درخواست اس شرط پر کی، کہ مصر سے اپنی فوج ہٹا لے گا، بشرطیکہ یروشلم اس کے حوالے کیا جائے۔ لیکن یہ درخواست مسترد کی گئی۔ لوئس ۲ محرم الحرام ۶۴۸ھ مطابق ۵ اپریل ۱۲۵۰ء کو پردۂ شب کی تاریکی میں دمیاط کی طرف ہٹ رہا تھا، مگر مسلمان ان کی نقل و حرکت دیکھ رہے تھے، جوش و خروش سے حملہ کیا، اور صبح ہوئی تو فرنگی ہر طرف سے نرغہ میں تھے، گھمسان کا رن پڑا مسلمانوں کا حوصلہ بلند تھا۔ مگر فرنگی بھی جان سے ہاتھ دھو کر لڑے، آخر اہلِ صلیب نے شکست فاش کھائی، ہزاروں اسیر ہوئے، جن میں خود لوئس بھی تھا، اس نمایاں فتح پر جمال الدین ابن مطروح وائے دمشق کے مشہور شاعر نے ایک قصیدہ لکھا

قل للفرنسیس اذا جئتہ	سینٹ لوئیس کو یہ نصیحت ایک فصیح شخص
مقال نصح من قؤول نصیح	کی زبانی سنا دو
اجرک اللہ علی ما جری	یسوع مسیح کے پجاریوں کی ہلاکت جو تیری
من قتل عباد یسوع المسیح	وجہ سے ہوئی، خدا تجھے اس کا اجر دے
اتیت مصر تبغی ملکھا	مصر میں اس ملک پر قابض ہونے کی ہوس
تحسب ان الزمر باطبل ریح	تجھے لائی، تیرا خیال تھا کہ تیرا جوش مذہبی مفید ثابت ہوگا،
فساقک الحین الی ادھم	تقدیر نے گنجان لشکر کی طرف تیری رہنمائی کی
ضاق بہ عن ناظریک الفسیح	جن کا شمار تیری نظر نہ کر سکی،
وکل اصحابک اودعتھم	تُو نے اپنے حسن تدبر سے اپنے تمام ہم نشین
بحسن تدبیرک بطن الضریح	لوگوں کو قبر کے عمیق گڑھے میں دھکیل دیا
سبعون الفا لا یری منھم	یہ ستر ہزار تھے جو یا تو قتل یا اسیر یا
الا قتیل او اسیر او جریح	زخمی ہوئے۔
وفقک اللہ لامثالھا	خدا کرے کہ تو اسی طرح یہ عمل دہراتا رہے

لعل عیسیٰ عنکم یستریح — تاکہ عیسیٰ تجھ سے نجات پائے۔
ان کان باباکم بذا راضیا — اگر تمہارا پاپائے روم اس پر راضی ہو۔ تو
فرب غش قداتی من نصیح — ایک مشورہ دینے والے (شیطان) سے
فریب ہی متوقع ہے،

وقل لهم ان اضمروا عودته — ان کو کہو کہ اگر وہ بغرض انتقام یا کسی
لاخذ ثار او لفعل قبیح — منصوبہ کے ساتھ مراجعت کی ٹھان لیں
دار ابن لقمان علی حالها — تو ابن لقمان کا گھران کی تواضع کے لئے
والقید باق والطواشی صبیح — اور صبیح کی زنجیریں ان کو جکڑنے کے لئے موجود ہیں

آخری شعر میں ابن لقمان سے مراد قاضی القضاۃ ہے جس کے قید خانہ میں لوئیس اس کے ہمراہی مقید رہے، جن کو جلال الدین صبیح جکڑ کر لایا تھا۔ یہ مملوک بحری کا ایک سردار تھا، چار لاکھ دینار ملکہ فرانس مارگریٹ نے (Marguerite de Provence) جو دمیاط میں تھی۔ بصد مشکل جمع کئے اور زر فدیہ دے کر شوہر کو آزاد کرایا،

دولتِ ترکیہ ایبکیہ مصریہ

ملک الصالح نے ملوک کی ایک فوج تیار کی تھی جن کو بحری ملوک کہتے ہیں۔ ان کی رہائش بحر نیل کے کنارے پر تھی اس لئے وہ اس نام سے موسوم ہوئے، یہ نہایت خود سر تھے، توران شاہ نے ارادہ کیا۔ کہ ان کا قلع قمع کیا جائے۔ لیکن ان ہی کے ہاتھ سے قتل ہؤا، اس کی والدہ شجرۃ الدر کو ان لوگوں نے تختِ مصر پر بٹھا دیا۔ اس نے ترکمانی سردار امیر معز الدین ایبک جاشنگیر سے نکاح کر لیا لیکن بحری ملوک نے مناسب سمجھا کہ کوئی ایوبی خاندان کا شہزادہ تخت نشین ہو، موسیٰ بن یوسف بن اسد الدین شیرکوہ کو جو اس وقت فرمانروائے یمن تھا تخت مصر پر بٹھایا گیا۔ امیر معز الدین ایبک مدار المہام رہا، لیکن ملک اشرف سے نہ بنی۔ اس لئے تنگ وہ واپس یمن کی طرف چلا گیا، اور ایبک سلطان مصر ہو گیا،

خاندان ایوبیہ کا خاتمہ مصر میں ہو گیا۔

شام اور عراق میں ایوبی خاندان کے والیانِ ملک نے طوائف الملوکی قائم کی
[ہو]ئی تھی۔ الملک الناصر کو بارگاہ خلافت سے سلطان کا خطاب عطا ہوا۔ صلاح الدین نے
[اپن]ے برادر زادہ الملک المظفر تقی الدین کو "حما" کا والی مقرر کیا تھا، اس کی اولاد میں مسلسل ہا
[ت]ویں پشت میں مشہور مورخ الملک المویَد عماد الدین اسمٰعیل ابو الفدا "حما" کا والی تھا۔

[...] وہیر معز الدین ایبک دو سال سلطنت کے بعد قتل ہوا، اس کا بیٹا ملک منصور
[نو]ر الدین علی تخت نشین ہوا۔ ایبکی خاندان کا خاتمہ الملک المظفر رکن الدین بیبرس نے
[...]، ہلاکو خاں بغداد کی تباہی کے بعد شام پر حملہ آور ہوا تو بیبرس نے اس کی فوج کو سرحد
[ع]راق پر شکست دی۔ مستعصم باللہ تو ہلاکو خاں کے ہاتھ سے ہلاک ہوا، بیبرس نے پھر سے
[خلا]فتِ عباسیہ مصر میں قائم کر دی۔ بیبرس کی اولاد میں سلطنت ۸۲ھ تک اکتالیس برس
[رہ]ی۔ اس کے بعد مصر میں دولتِ چرکسیہ کا دور شروع ہوا، اور آج تک قائم ہے۔ ہم اس
[خا]ندانوں کے حالات اپنے زمانہ کے حکمرانوں کے حالات کے تحت مناسب مقام پر
[لک]ھیں گے، سرِ دست قارئین کو وسط ایشیا اور ایران اور ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں
[کی] طرف لاتے ہیں۔

آل طاہر خلافت عباسیہ کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ خراسان ولائیت ہے جہاں ہمیشہ شورش برپا رہی، چنانچہ ابومسلم خراسانی نے اموی خلافت کے خلاف اسی ملک سے علم بغاوت بلند کیا، اس کے بعد یہاں سے مدعیانِ نبوت بھی پیدا ہوئے، خلیفہ ماموں رشید کے عہد خلافت میں خراسان حکومت طاہر کو ملی، جس نے خلیفہ امین ماموں کے بھائی کو قتل کیا اور کل دنیا اسلام کا واحد مالک ماموں کو بنادیا تھا،

شجرہ نسب خاندان طاہریہ

مصعب
|
حسین
|
طاہر

طاہر کی اولاد: طلحہ — عبداللہ

عبداللہ
|
طاہر (متوفی سنہ ۸۶۲ء)
|
محمد (سنہ ۸۷۳ء)

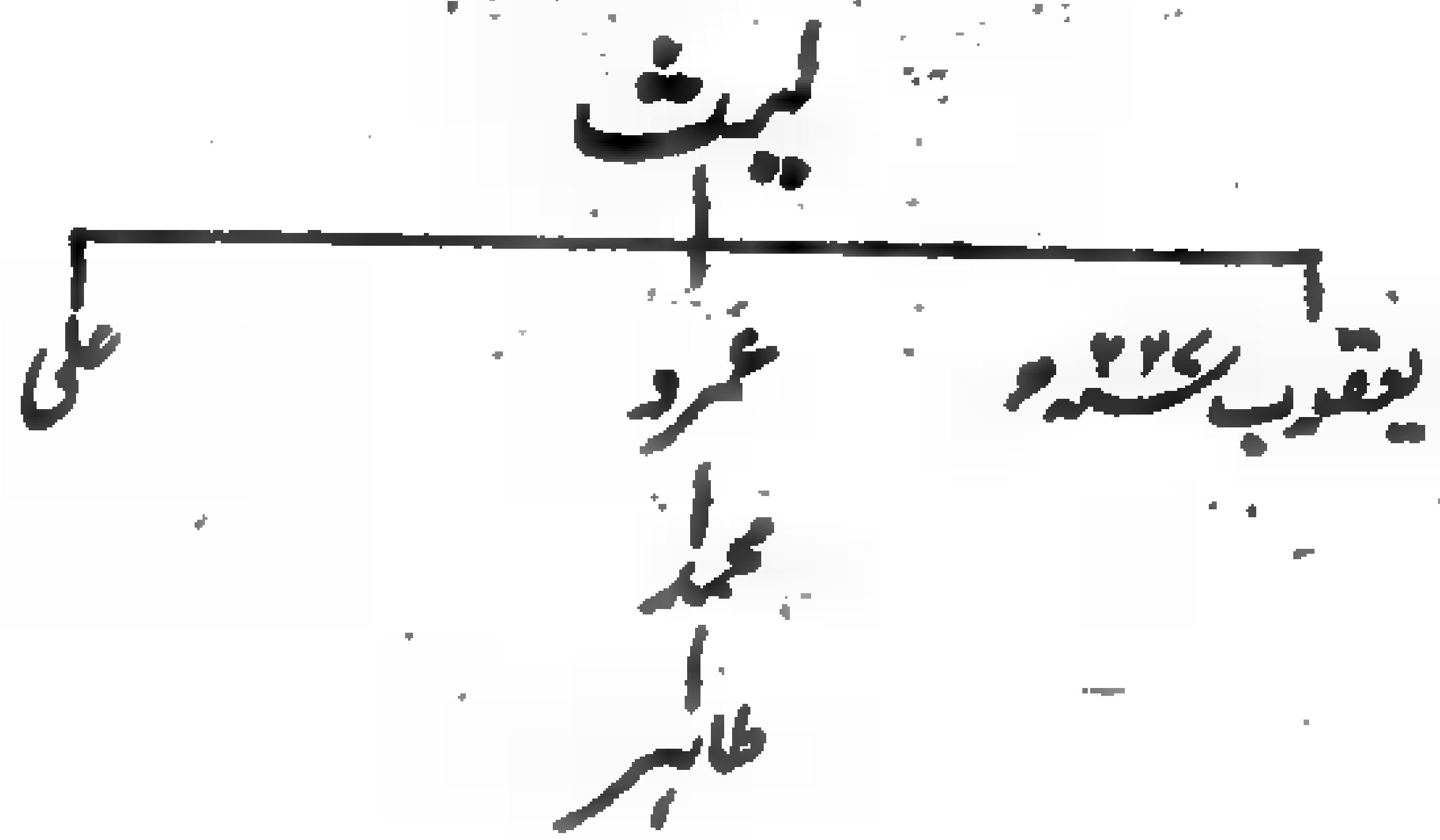
آل طاہر کا دارالسلطنت نیشاپور تھا، اگرچہ حکومت طاہریہ خلافت عباسیہ کے تحت مگر خود مختار ہی تھی، اسی طرح اور بھی والیان ولایات کو خودسری اور خودمختاری کا حوصلہ ہوا رفتہ رفتہ تمام ولایات کے والی خودمختار بن بیٹھے، ہر ایک کو اپنے مملکت کی وسعت کی ہوس بھی تھی اس لئے خانہ جنگی بھی جاری رہتی،

طاہریہ حکومت کا آخری تاجدار محمد تھا جو یعقوب بن لیث کے ہاتھ سے مارا گیا،

صفاریہ

یعقوب کا باپ لیث لوہار تھا، اس لئے اس خاندان کو "صفاریہ" کہتے ہیں یہ ایک معمولی سپاہی تھا۔

شجرہ نسب



یعقوب کا پیشہ ابتدا میں قزاقی اور سرقہ تھا، چوروں کی ایک جماعت کے ساتھ ابراہیم بن حسین والئے سجستان کے خزانہ کو نقب لگائی، بوریاں نکالیں، پہلی بوری کھولی۔ تو اس میں سے نمک نکلا، سمجھے کہ سب بوریاں نمک سے بھری ہیں، اس لئے چھوڑ کر چلے گئے۔ صبح امیر کو اطلاع ہوئی، تو چوروں کی تلاش ہوئی، آخر امیر نے اعلان کیا اگر چور حاضر ہو کر واردات سرقہ کے حالات بتادے تو قصور بھی معاف کیا جائے گا، اور انعام بھی دیا جائے گا۔ یعقوب بے دھڑک حاضر ہوا، اور کہا حضور یقین تو یہ تھا کہ خزانہ میں درہم و دینار ہوں گے نکلا نمک، "میں نمک حرام نہیں ہوں"۔

امیر بہت خوش ہوا، اور مقربان دربار میں جگہ دی اس نے چند روز میں امیر اور رعایا کے دل میں گھر کرلیا۔ امیر میں سپاہیانہ ولولہ نہ تھا، اس نے ایک لشکر فراہم کرلیا اور عسکری تعلیم و تربیت دے کر اس قابل بنا دیا کہ ہمسایہ والیان ملک بھی خوف زدہ ہو گئے، درہم کی وفات کے بعد امیر سجستان تسلیم کیا گیا۔

آل زیدیہ علویہ خراسان پر آل طاہر حکمران تھی، اور طبرستان میں زیدیہ حکومت تھی، محمد بن طاہر آخری تاجدار کو خراسان سے بھگتے ہی یعنی خراسان پر قابض ہو کر اب طبرستان کی تسخیر کا ارادہ کیا، طبرستان کی حکومت کا مختصر حال یہ ہے کہ یہ خاندان علوی تھا۔

شجرہ نسب

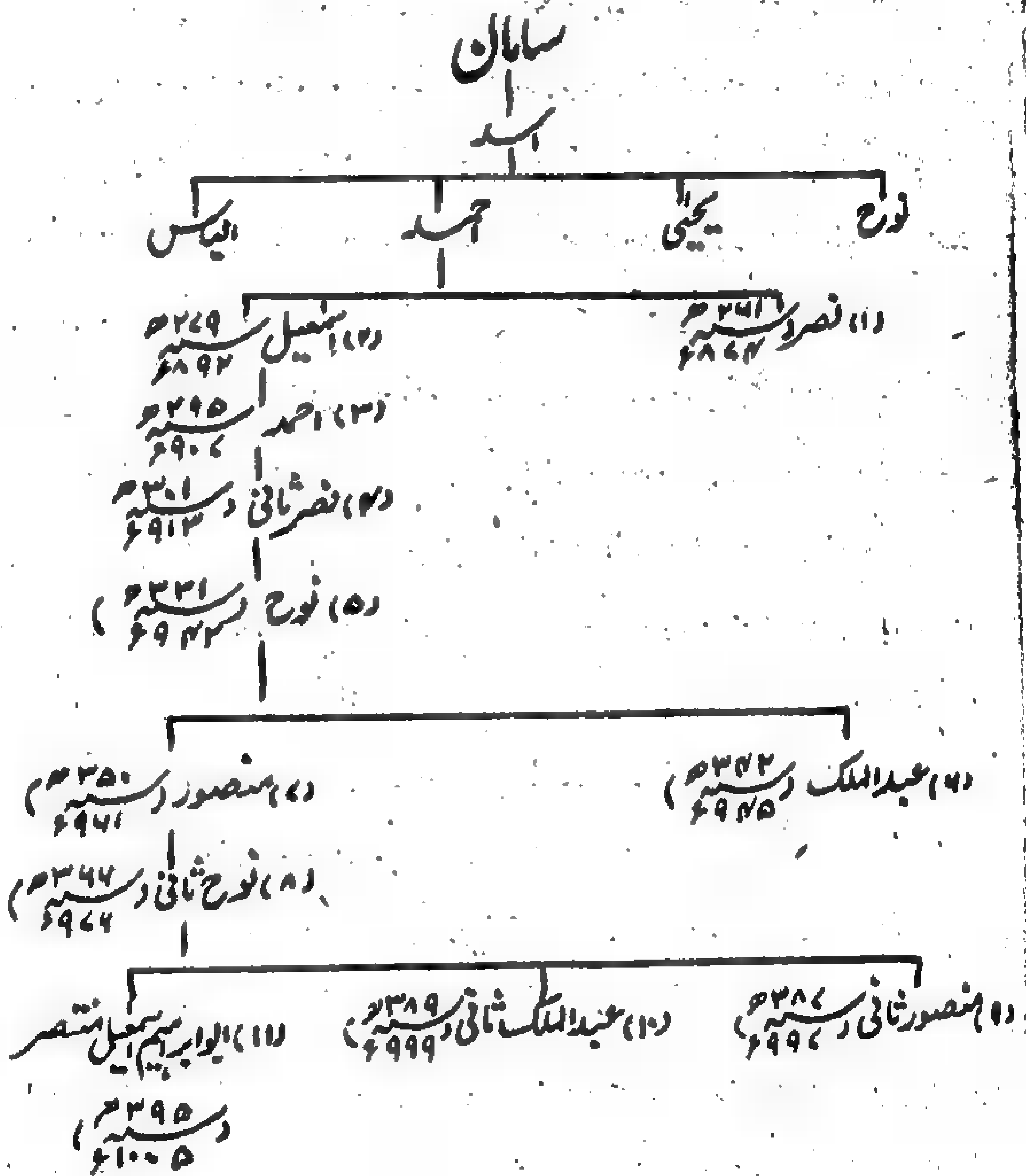
حضرت علیؓ
|
حسن
|
زید
|
حسن
|
اسمٰعیل
|
محمد
|
زید

حسن اطروش — محمد قائم بالحق

حسن بن زید کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے طبرستان کے لوگوں میں دعوت آل محمد شائع کی، اور بعد ازاں وہاں کا حاکم تسلیم کیا گیا، ۲۷۰ھ میں یعقوب بن لیث نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا،

آلِ سامان دولتِ صفاریہ کی ایک اور حریف سلطنت سامانیہ تھی۔ مختصر حالات حسبِ ذیل ہیں :-

شجرہ نسب آلِ سامان



بہرام چوبین کی نسل سے اسد بن سامان تھا۔ ماموں کو خاص لگاؤ اہل ایران سے تھا۔

اس لئے اس کا بھی بہت احترام کرتا، اس کے چار بیٹوں نے بغداد میں تعلیم و تربیت پائی اور اعلیٰ مناصب بھی حاصل کئے، نوح سمرقند اور یحییٰ شاش، اور احمد فرغانہ اور الیاس ہرات کا حاکم ہوا، ان کو آل طاہر کے تحت رکھا گیا، جو ولایت خراسان پر حکمران رہے۔

اسمٰعیل بن احمد پہلا شخص ہے جو بادشاہ کہلایا، اس نے ترکستان کا اکثر حصہ فتح کر لیا۔ شاہ ترکستان اور اس کی خاتون کو گرفتار کر کے سمرقند لایا، تمام علاقہ ماوراء النہر اس کے قبضہ میں آ گیا۔ دارالحکومت بخارا مقرر کیا، خلیفہ بغداد نے بھی خلعت سلطانی عنایت کی آل سامان یوں تو خود مختار تھے اور سلطنت موروثی تھی، مگر دربار خلافت کا احترام دیگر خود مختار سلاطین کی طرح اتنا ضرور تھا کہ سالانہ نذر و نیاز پیش کرتے رہے جسے خراج سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

آل سامان کی حریف سلطنتیں صفاریہ اور دیالمہ اور زیدیہ تھیں ان سے اکثر جھڑپیں ہوتی رہیں، اسمٰعیل آخر عمر میں بدمزاج ہو گیا، اس لئے ارکین دولت کی سازش سے قتل ہوا، منصور ابن نوح بن ابو الحسن نصر اپنے بھائی عبدالملک کی وفات کے بعد خراسان اور ماوراء النہر کا بادشاہ ہوا، عبدالملک کے بعد اس کا غلام الپتگین سپہ سالار افواج شاہ منصور کی تخت نشینی کے خلاف تھا، جب منصور وارث تخت و تاج ہوا تو بھاگ کر غزنی کے پہاڑوں میں پناہ لی اور اسی کے غلام اور داماد سبکتگین نے غزنی میں خاندان غزنویہ کی سلطنت قائم کر دی۔

نوح اپنے باپ کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا، عضدالدولہ دیلمی اس وقت خلیفہ اور خلافت کا سرپرست تھا، وزیر فخر الدولہ سے اکثر معرکہ آرائی رہی، نوح فخر الدولہ کا طرفدار تھا، لیکن اکثر دفعہ شکست کا منہ دیکھنا پڑا، دیگر سلاطین نے بھی ہر طرف سے اس پر یورش کی اور اس کے ہاتھ سے خراسان اور جرجان اور طبرستان نکل گئے، اکثر امراء نمک حرام ثابت ہوئے، اس وقت سبکتگین غزنی میں تھا، اسے مدد کے لئے لکھا، وفادار غلام اب تک سلطانی کے لقب سے احتراز کرتا رہا، اور اپنے آپ کو آل سامان کے تحت ہی سمجھتا تھا

اپنے بیٹے محمود کے ساتھ مدد کو آیا، دشمنوں کو شکست دے کر پھر سے نوح کو ماوراء النہر کی بادشاہت دلوائی، نوح نے سبکتگین کو ناصر الدولہ والدین اور محمود کو سیف الدولہ والدین کا خطاب عطا کیا،

منصور بن نوح بن منصور تخت نشین ہوا۔ تو امراء دربار کی باہمی رقابت اور بعض نمک حراموں کی سازش سے نظامِ سلطنت درہم برہم ہوگیا، منصور کو معزول کر کے آنکھیں نکلوادیں، اور اس کے بھائی عبدالملک کو تخت پر بٹھادیا، یہ امراء کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھا محمود سے لڑوادیا، آخر بھاگتے ہی بن پڑی، ایک کاشغر کے پٹھان نے اُسے گرفتار کیا، اور خود دارالسلطنت پر قابض ہوگیا، اس کے بھائی منتصر نے کچھ ہاتھ پاؤں ملے مگر کچھ کام نہ بنا، اور اسی پر آلِ سامان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور اس کے ساتھ ہی غزنویہ نے دولتِ صفاریہ کو بھی بے سروسامان کر دیا،

خاندانِ غزنویہ

شجرہ نسب سلاطین غزنی

(۱) امیر ناصر الدین سبکتگین سنہ ۳۶۶ھ / ۹۷۶ء

(۳) یمین الدولہ امین الملت محمود سنہ ۳۸۸ھ / ۹۹۸ء

(۲) اسمٰعیل (سنہ ۳۸۷ھ / ۹۹۷ء)

(۱۱) ابراہیم ظہیر الدولہ (سنہ ۴۵۱ھ / ۱۰۵۹ء)

(۱۲) مسعود ثالث علاء الدولہ سنہ ۴۹۲ھ

(۴) محمد جلال الدولہ (سنہ ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء)

(۵) مسعود ناصر الدین اللہ (سنہ ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء)

(۹) عبد الرشید عز الدولہ سنہ ۴۴۰ھ / ۱۰۴۹ء

(۶) شہاب الدولہ مودود سنہ ۴۳۲ھ

(۸) ابوالحسن علی بہاء الدولہ

(۱۰) جمال الدولہ فرخ زاد

- (۷) مسعود ثانی سنہ ۴۹۰ھ / ۱۰۹۸ء
  - (۱۲) مسعود ثالث علاء الدولہ
    - (۱۳) شیرزاد کمال الدولہ سنہ ۵۰۸ھ / ۱۱۱۴ء
    - (۱۴) ارسلان شاہ سلطان الدولہ سنہ ۵۰۹ھ / ۱۱۱۵ء
    - (۱۵) بہرام شاہ یمین الدولہ سنہ ۵۱۲ھ / ۱۱۱۸ء
      - (۱۶) خسرو شاہ معز الدولہ سنہ ۵۴۷ھ / ۱۱۵۲ء
        - (۱۷) خسرو ملک تاج الدولہ سنہ ۵۵۵ھ / ۱۱۶۰ء

تاریخ خلافت اسلامیہ میں یہ واقعہ خاص ہے کہ بنو ہاشم، عباسیہ و فاطمیہ جو سلطنت کے مالک ہوئے سب لونڈیوں کے بطن سے پیدا ہوئے، اور جب خلافت غیر عرب اقوام کے ہاتھ میں چلی گئی، تو اکثر سلاطین غلام یا غلاموں کی اولاد تھے ان میں سے ایک خاندان غزنویہ ہے اور ہم غلامی کی تاریخ کا مطالعہ یونانی اور رومی اور ایرانی اور ہندوستانی شہنشاہوں اور بادشاہوں اور راجوں اور مہاراجوں کی فتوحات میں کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلافت اسلامیہ کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عالم انسانی کو ایک ایسی ہموار سطح پر لائے کہ کوئی شخص اپنے حسب نسب پر فخر کا مدعی نہ ہو، اعلیٰ طبقہ کو نیچا دکھائے، اور ادنیٰ کو ابھارے تاکہ دونوں ایک سطح پر آجائیں، اس کے بعد اس کا حقیقی مقصد جو ہم بیان کر آئے ہیں یہ ہے کہ عالم انسانی اپنا مقام کائنات میں پہچانے اور یہ مسجود ملائک اپنی حقیقت سے واقف ہو، نہ کوئی غلام ہو نہ آقا، سب اللہ وحدہٗ لاشریک کے فرمانبردار بندے تمام کائنات پر حکومت کریں،

اس آیہ کریمہ میں اس کے ذہنی اور مادی ارتقاء کی صلاحیت فطری کو کس خوش اسلوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ

ولقد کرمنا بنی ادم وحملنھم فی البر والبحر ورزقنھم من الطیبٰت وفضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا (بنی اسرائیل) اور تحقیق ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی۔ اور ان کو خشکی و تری میں اونچا اٹھایا، اور اپنی پیدا کردہ مخلوقات میں نمایاں فضیلت دی،

اور اس آیۂ مبارک میں کتنی زبردست تحریک ارتقاء اہل عقل وفکر کے لئے ہے

وسخر لکم ما فی السمٰوٰت والارض جمیعًا منہ ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یتفکرون۔ اور ہم نے اپنی رحمت کاملہ سے جو کچھ بھی آسمانوں اور جو کچھ بھی زمین ہے تمہارے لئے مسخر کردیا ہے اس میں ان لوگوں کے لئے مقصد حیات انسانی کی پتہ کی باتیں ہیں جو اہل فکر ہیں،

جب تک انسان عقل وفکر سے کام نہ لے گا، وہ ادنیٰ زندگی کی نمود شان اور لہو ولعب کی خاطر جنگ وجدل اور فتنہ وفساد میں مبتلا رہے گا، یہ عذاب جس میں وہ تاریخی زمانہ بلکہ

اس سے بہت عرصہ پہلے سے گرفتار رہا ہے، ایک انتباہ فطرت کی طرف سے ہے مگر ہمارے زمانہ تک نہ سمجھا اور نہ قریب تر زمانہ میں توقع ہے، کہ سمجھ بوجھ سے کام لے گا، خیر یہ مرحلہ ارتقا تو ابھی بہت دور ہے، لیکن جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، تو میں بنتی اور بگڑتی رہیں، لیکن منشا فطرت پورا ہوتا رہا ہے، انسانیت مسلسل ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے اور ایک روز اسی نے اسی اعلےٰ مقام پہ آنا ہے جس کی طرف قرآن عظیم رہنمائی فرما رہا ہے، لیکن بعد از ہزار رسوائی،

خاندان غزنویہ کا مشہور تاجدار سلطان محمود ہے، چہرہ پر چیچک کے داغ تھے، اور حسن صورت سے عاری تھا، اس کی زندگی کا اکثر حصہ مجاہدانہ سرگرمی میں گزرا بالخصوص ہندوستان جیسے گرم ملک کے میدانوں اور ریگستانوں میں سترہ دفعہ آمد و رفت سے سفید و سُرخ رنگ کو سانولہ کر دیا تھا، گبن لکھتا ہے کہ

"اس مسلمان "ہیرو" کی دور دراز ممالک تک یلغاروں کا مقابلہ اگر ہینی بال (Hannibal) کی مارچ سے کیا جائے، جس کو "نپولین" دنیا کے تمام سپہ سالاروں پر فضیلت دیتا ہے تو مؤخر الذکر ہیچ معلوم ہوتا ہے"۔

غزنی افغانستان کا ایک پہاڑی حصہ ہے، خاندان غزنویہ کے ساتھ اسلامی تاریخ افغانستان کا آغاز ہوتا ہے، اس وقت پشاور اور کابل اور افغانستان کا اکثر حصہ پنجاب کے راجہ جیپال کی عملداری میں تھا، ہوس ملک گیری نے مغرب کی طرف غزنی کی جانب لشکر کشی پر آمادہ کیا تو یہاں سبکتگین سے تصادم ہوا اور منہ کی کھانی پڑی۔

سلطان محمود کی فتوحات کا تذکرہ بے فائدہ ہے، کیونکہ تاریخ ہند میں ان کو نمایاں جگہ دی گئی ہے، اور ہر ایک طالب علم واقف ہے، "تاریخ یمینی" میں عتبی (متوفی ۳۵۸ھ) نے سلطان کے حالات مفصل چشم دید لکھے ہیں، لیکن فتوحات کے ضمن میں ایک خاص بات قابل توجہ ہے کہ سلطان پر ناواقف مورخین کا یہ الزام ہے کہ اس نے ہندوؤں کے مندروں کو مسمار کیا اور بتوں کو توڑا۔ اور یہ کہ اس کے حملوں کا بھی ایک خاص مقصد تھا اور وہ چاہتا تھا کہ بزور شمشیر تمام ہندوستان میں اسلام

پھیلا دے، مندروں کو تو اس نے مسمار نہیں کیا، البتہ سومناتھ جی کے بت کو ضرور توڑا اور اس کے حملوں کا مرکز کوئی نہ کوئی مندر ہمیشہ ہی رہا، اس نے کسی کو بزورِ شمشیر مسلمان نہیں بنایا، پنجاب کے راجہ جے پال سے اس کے والد سبکتگین کی لڑئیاں ہوئیں یہ ایک ہمسایہ ملک تھا۔ سلطان سے بھی لڑائیاں ہوئیں، اور ہمیشہ فتح سلطان کی ہوئی لیکن اس پر بھی سلطان نے اس کے ملک پر غاصبانہ تصرف نہیں کیا۔

آنند پال پسر جے پال نے شکست کی ندامت سے خودکشی کی اور سلطان نے بھی آئے دن کی لڑائی سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے پنجاب کو سلطنت غزنی میں شامل کر لیا یہ واقعہ کہ اس کی توجہ ہمیشہ مندر ہی رہے، تاریخی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان ایام میں مندر ہی زر و مال کا خزانہ تھے، ہندوؤں پر دینی حکومت ہمیشہ غالب رہی ہے۔ یہاں تک کہ دنیوی حکومت جو چھتری راجوں کے ہاتھ میں تھی، برہمنوں کی دینی حکومت سے ہمیشہ دبتی رہی، اس میں کچھ شک نہیں کہ ہندو تاریخ کا آغاز ہی برہمنی اقتدار سے شروع ہوتا ہے، چھتری راجے تھے مگر وزارت ہمیشہ لازماً برہمن کے ہاتھ میں رہی۔ اور وہی سیاہ و سپید کا مالک ہوتا،

خلفاء عباسیہ نے بھی اپنے نظام حکومت میں وزارت کو داخل کر لیا، اور اس کے نتائج بھی دیکھ لئے، چھتری راجوں نے جب دیکھا کہ وہ بالکل وزیروں کے رحم و کرم پر جیتے ہیں تو ردِ عمل ہوا، جس کو راجہ رام چندر چھتری اور برہمن راون کے جنگ میں استعارۃً بیان کیا گیا ہے، اگرچہ اس کے بعد برہمنوں کا وہ زور نہ رہا۔ مگر شبھ گھڑی شبھ لگن مہورت برہمن ہی بتاتے اور وہ مذہبی کتب وید شاستر کے بھی عالم تھے، ویدوں کی سنسکرت مردہ زبان تھی۔ اور برہمن ہی جانتے تھے، لیکن غیر برہمن کو نہ بتاتے اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ آج بھی برہمن کی دینی حکومت قائم ہے، اور اس کی آڑ میں دنیوی زر و مال زیادہ سے زیادہ ان کو ملتا ہے، مندروں کے متولی بھی تھے، جہاں ہر ایک شخص حسب مقدار چڑھاوا چڑھاتا، حد ہے کہ راجے اپنی بیٹیوں تک نذر کر دیتے، غرض مندروں میں زر و مال اتنا جمع تھا، کہ راجوں کے ہاں کبھی نہ ہوتا، اور یہی کشش تھی۔ کہ سلطان کی توجہ کو جذب

رہی تھی، سومناتھ کی مورتی خالص سونے کی تھی، جب سلطان نے اسے توڑا تو اس کے اندر سے جواہرات اُگل پڑے، اسی ایک بُت کی شکست و ریخت کا ذکر تاریخوں میں ہے سلطان جانتا تھا کہ بت پوجاریوں کے ہاتھ کی صنعت ہے، اس کے توڑنے سے نہ کمی واقع ہو سکتی ہے اور نہ ہو گی، مندر بھی سنگ و خشت کی عمارت ہی ہیں، اگر ایک گرایا جائے تو اس کی جگہ بہتر عمارت کھڑی ہو سکتی ہے، وہ ان فضول باتوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوا۔

دوسرا الزام جو سلطان پر شد و مد سے لگایا جاتا ہے، بُخل کا ہے، ابوالقاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ

"مورخین کا یہ الزام بخل و طمع سلطان محمود کے خلاف بے بنیاد ہے اور صریحاً ناانصافی ہے، اگرچہ دولت اس کے پاس ذخیرہ رہتی، مگر فتح بلاد پر دل کھول کر خرچ کرتا، کتاب مقالات ابونصر مشکاتی اور مجلدات ابوالفضل اس امر کے شاہد ہیں کہ اس کے دربار میں اس قدر علماء و فضلاء اور شعراء و حکما کی کثرت تھی، جو اس کے مائدہ احسان اور خوان دولت سے بہرہ مند ہوتے، کہ کسی بادشاہ کو کم نصیب ہوتے ہوں گے، ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ یہ امر بدون صرف درم و دینار میسر نہیں ہوتا، اہل حیثیت اور وضع داروں کو دوست رکھتا تھا، اور انعام و اکرام سے نوازش فرماتا، اس کے علاوہ مستحقین کے وظائف بھی مقرر تھے، عصایری رازی نے ایک قصیدہ مدحیہ لکھا، سلطان نے چودہ ہزار درم انعام دیا، جس شخص کے بذل و کرم کا یہ حوصلہ ہو وہ بخل و طمع کا ملزم کیسے ہو سکتا ہے"۔

جس طرح ایک سومناتھ کی مورتی توڑنے پر سلطان بت شکن مشہور ہوا۔ اسی طرح ایک فردوسی کے شاہنامہ کی معہودہ رقم ادا نہ کرنے پر بخیل بن گیا، اول الذکر واقعہ تو تاریخی ہے، دوسرا محض دشمنوں کی اختراع ہے جس نے تاریخی صداقت محض اس لئے حاصل کر لی کہ اسے خاص شہرت دی گئی، اور ہر ایک مورخ بلا تحقیق نقل کرتا رہا۔

ہم نے اس موضوع پر ایک مقالہ رسالہ "ایشیا" امرتسر میں ۱۹۰۵ء میں شائع کیا، پھر یہی مقالہ رسالہ تہذیب الاخلاق (امرتسر) میں شائع ہوا، تیسری دفعہ ہماری کتاب "مشاہیر اسلام" میں جو ۱۳۲۹ھ میں طبع ہوئی شائع ہوا، اس مقالہ میں ہم نے

شاہنامہ کی داخلی شہادت پیش کرتے ہوئے لکھا تھا کہ شاہنامہ سلطان کی تخت نشینی سے سترہ (۱۷) سال پیشتر مکمل ہوچکا تھا، اور جب اس کو تخت کیانی خالی نظر آیا، اس تلاش میں تھا کہ کسی والی ملک کے حضور پیش کرے۔

ندیدم سرافراز بخشندہ را — نگاہ کیاں بر درخشندہ را
سخن را نگہ داشتم سال بیست — بداں تا سزاوار این گنج کیست

فردوسی خود لکھتا ہے کہ

ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد بار — کہ گفتم من ایں نامہ شاہوار

یعنی سنہ ۴۰۰ھ میں شاہنامہ ختم کیا، دس سال بعد جب کہ سلطان کے حملہ قنوج نے دنیاء اسلام میں سلطان کا نام بلند کیا۔ فردوسی بھی حاضر دربار ہوا، ایک قصیدہ لکھا جس میں "قنوج" کا خاص طور پر ذکر کیا ہے،

یکے گفت ایں شاہ روم است وہند — ز قنوج تا پیش دریاء سند

چونکہ ہم نے اس موضوع پر مفصل بحث اپنے مقالہ میں کی ہے اور اس کا اثر ہمارے معاصر اہل الرائے پر بھی ہوا، جنھوں نے ہماری تحقیق کا فائدہ اٹھا کر مقالے لکھے (اگرچہ ہمارا نام نہیں لیا) اس لئے اس پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

سلطان محمود کی مجاہدانہ سرگرمی نے صرف اتنا کیا کہ سندھ میں تو اسلام بہت پیشتر شائع ہوچکا تھا، اب ہندوستان کا راستہ بھی صاف ہوگیا، ابوریحان بیرونی نے ہندوستان میں سفر کیا، اور یہاں کے پنڈتوں سے ملا، سلطان کا درباری تھا، سنسکرت اور دیگر زبانوں کی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں دی جاتی، جس کو نظام الملک طوسی اور ملک شاہ سلجوقی نے تعمیر کیا تھا، اور جس کا ایک وظیفہ خوار طالب علم شیخ سعدی بھی تھا، اس کے علاوہ خود سلطان نے کئی مدرسے غزنی میں کھول رکھے تھے، اور یہاں سنسکرت بھی پڑھائی جاتی۔ اسیرانِ جنگ میں کئی پنڈت بھی تھے، جن کو بیش قرار ماہانہ ملتا، ابوریحان سنسکرت کا بہت بڑا عالم تھا، اور علم ہیئت میں بھی ماہر تھا، ہمارے زمانہ میں کس ہولڑ کو پنڈت کہنا چاہیے حالانکہ اس نے کسی پنڈت سے باقاعدہ سنسکرت نہیں سیکھی تھی،

ایک انگریز مؤرخ مسلمان مورخین کے حوالہ پر لکھتا ہے کہ

"محمود نے ہندوستان پر حملے مسلسل کئے۔ مگر محرک مذہبی جنون نہ تھا، اس کے ہمعصر مؤرخ اس امر کا کہیں ذکر نہیں کرتے، کہ اس نے کسی ہندو کو زبردستی مسلمان بنایا ہو، اور نہ کسی ہندو کو میدان جنگ کے باہر قتل کیا ہو، بت وبت خانہ کی شکست وریخت بھی لڑائی کے وقت ہی ہوئی، امن کی حالت میں نہ کسی بت کو توڑا اور نہ کسی مندر کو مسمار کیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ غزنی میں جو ہندو آباد تھے، انہیں کامل مذہبی آزادی حاصل تھی، اور ان کے شہری حقوق ایسے ہی محفوظ تھے، جیسے مسلمانوں کے۔ اکثر ہندو مسلمانوں کی طرح نظام اور انتظام سلطنت میں حصہ لیتے رہے، اور ان میں سے بعض "تلک" اور "سیح رائے" جیسے امراء کے طبقہ میں شمار ہوتے، اور وہ ہر طرح قابل اعتبار اور سلطنت کے خیر خواہ اور وفادار بھی ہوتے، اگر اس کی لڑائیاں ہندو راجوں سے ہوئیں۔ تو ویسی ہی ایران اور ماوراالنہر کے مسلمان سلاطین سے بھی تھیں، یہی لوٹ گھسوٹ جو وادی گنگا میں جاری رہی وہی کوہ "دماوند" اور "جیحوں" کے کناروں پہ بھی روا رکھی۔"

سلطان محمود تئیس برس کی عمر میں تخت نشین ہوا، ساٹھ سال کی عمر میں وفات پائی، تیس سالہ حکومت کے دور دورہ میں اس نے آرام حرام قرار دے رکھا تھا، اس کا پاؤں ہمیشہ رکاب ہی میں رہا، عراق سے وادی گنگا اور خوارزم سے کاٹھیاواڑ گجرات تک اس کا جولانگاہ تھا، کسی لڑائی میں اس نے شکست نہ کھائی، حالانکہ اس کا مقابلہ بہترین جنگ جو لیڈر سپاہیوں سے ہوا، وسط ایشیا کے ترک اور ہندوستان کے راجپوت اس کے سامنے جھک گئے۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، محمود کو ہندوستان کا بادشاہ کہنا صحیح نہیں، اس نے اس کا کوئی حصہ اپنی مملکت میں شامل نہ کیا جو دراصل عراق سے غزنی تک ہی تھی پنجاب کا الحاق اس نے مجبوراً کیا، محمود نے جب قنوج پر حملہ کیا تو یہاں کے راجہ

راجپال نے اطاعت اختیار کی، محمود غزنی کی طرف لوٹا، تو راجپوت راجوں کی غیرت قومی حرکت میں آگئی، قنوج کے راجہ کو قتل کیا، اور اس کے خاندان کو تخت و تاج سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کا سرغنہ "چندل" کالنجر کا راجہ تھا، محمود کو اطلاع ہوئی تو راجہ کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے پھر لوٹا، چندل بھاگ گیا، راستہ میں راجہ ترلوچن پال بن انند پال پسر جے پال کی طرف سے کچھ مزاحمت ہوئی، اس لئے اُسے برطرف کر کے لاہور میں اپنا نائب مقرر کیا، جو اس کا مشہور غلام ملک ایاز تھا۔

سلطان محمود کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مسعود تخت نشین ہوا، سلطان محمود کے عہد میں احمد نیالتگین افسر خزانہ تھا، مسعود نے ولایت پنجاب کا انتظام اس کے حوالہ کیا، قاضی صاحب کو یہ امر ناگوار گذرا، کہ احمد دنیوی امور میں تو دخل دے رہا تھا دینی معاملات میں بھی دست اندازی کرنے لگا، بدقسمتی سے احمد نے بنارس پر چڑھائی کی تو یہاں کچھ بے اعتدالی خلاف احکام شرعیہ ظہور میں آئی، قاضی صاحب نے سلطان کے کان بھرے، سلطان نے مناسب خیال کیا کہ ہندوؤں پر ہندو ہی حکومت کا اہل ہے اس لئے "تلک" کو جو غزنی میں ہندوؤں کی فوج کا افسر اعلیٰ تھا احمد کی جگہ مقرر کیا، تلک فارسی اور ہندی زبانوں کا ماہر تھا۔ دو سال کے عرصہ میں اس نے انتظام خاطر خواہ کر دیا، بلکہ سلطنت غزنویہ کو ہانسی تک وسعت دے دی۔

سلطان محمود کے عہد کا یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ ایک ترکمانی قبیلہ ماوراء النہر میں آکر آباد ہو گیا، اور عملاً اپنی حکومت قائم کر لی، سلطان صرف سالانہ خراج پر راضی ہو گیا، پھر غالباً اس خیال سے کہیں زیادہ زور نہ پکڑ جائیں، اس قبیلہ کی ایک شاخ کو خراسان میں لاکر بسایا۔ ان کا سردار سلجوق تھا، سلطان کی وفات کے بعد اس کے بیٹے مسعود نے چاہا کہ سلجوقیوں کو خراسان سے نکال دے، ہرات پر مقابلہ ہوا تو سلطان مسعود نے شکست کھائی، خراسان غزنی سے علیحدہ ہو گیا۔

خاندان سلجوقیہ کے حالات ہم بیان کر چکے ہیں، ۵۵۵ھ ۱۱۵۰ء میں غوریوں نے غزنی پر قبضہ کر لیا اور آخری تاجدار خسرو ملک نے لاہور میں پناہ لی۔

اب ہم ہندوستان کی تاریخ اسلامیہ بیان کریں گے، لیکن ابھی چند واقعات ایسے ہیں جو وسط ایشیا میں رونما ہوئے، تاریخ ہند سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ اس لئے مناسب بھی ہے کہ ان واقعات کو جو مغلیہ شہنشاہیت کے بنیادی اسباب ہیں ہم پہلے بیان کریں، ان واقعات نے ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ جس کا اثر ایران اور شام اور عرب اور شمالی افریقہ پر پڑا،

سلطنت خوارزم شاہیہ | خوارزم شاہی سلطنت سلجوقی سلطنت کے خاتمہ پر ظہور میں آئی،

شجرہ نسب سلاطین خوارزم شاہیہ

انوشتگین

(۱) قطب الدین محمد سنہ ۴۹۰ھ

(۲) التنز سنہ ۵۲۱ھ

ایل ارسلان شاہ سنہ ۵۵۱ھ

سلطان شاہ محمود سنہ ۵۶۷ھ — تکش خاں سنہ ۵۸۹ھ

تکش خاں کا بیٹا: علاؤ الدین محمد خوارزم شاہ سنہ ۵۹۶ھ

علاؤ الدین کے بیٹے: رکن الدین (حاکم عراق) — جلال الدین (حاکم خوارزم) — غیاث الدین (حاکم کرمان) — قطب الدین

خانذم جس کو اب "خیوا" کہتے ہیں، ملک شاہ سلجوقی کی سلطنت میں شامل تھا، ملک شاہ کا ایک غلام نوشتگین نامی تھا، اُسے حکومت خوارزم سپرد ہوئی، اس کی اولاد میں اس کا بیٹا محمد پہلا سلطان خوارزم شاہ ۴۹۰ھ میں کہلایا، اس کا لقب قطب الدین تھا، سلطان سنجر کا وفادار رہا، اس نے بتیس سال حکومت کی۔ اور ۵۲۲ھ میں فوت ہوا، اس کا بیٹا التنز جانشین ہوا، انتیس برس حکومت کے بعد ۵۵۱ھ میں مرگیا، اس کا بیٹا ایل ارسلان شاہ سترہ سال حکومت کے بعد انتقال کرگیا۔ ایل ارسلان شاہ کے چھوٹے بیٹے سلطان شاہ نے تخت وتاج سنبھال لیا، بڑے بھائی تکش (تکش) نے بھی دعوئے شاہی کیا، آخر دونوں بھائیوں میں صلح ہوگئی، سلطان شاہ ۵۸۹ھ میں فوت ہوا، تو تکش شاہ خراسان اور عراق پر بھی متصرف ہوگیا، اس وقت خلافت عباسیہ پر الناصر لدین اللہ کا قبضہ تھا، تکش کے مقابلہ میں شکست کھائی،

تکش کا بیٹا سلطان محمد خوارزم شاہ تخت وتاج کا وارث ہوا، غیاث الدین غوری خراسان کو اپنی مملکت میں شامل کرنا چاہتا تھا، محمد خوارزم شاہ سے معرکہ آرائی ہوئی، خوارزم شاہ غالب آیا، غیاث الدین کے بھائی شہاب الدین نے بھی کوشش کی، مگر کچھ پیش نہ گئی، شاہ خوارزم نے ملک خطا وختن پر بھی قبضہ کرلیا، اور غزنی اور غور بھی اس کی مملکت کی حدود میں آگئے، سلطنت غزنویہ کا خاتمہ تو غوری کرچکے تھے غوریوں کو ختم خوارزم شاہ نے کردیا۔

کہتے ہیں کہ غور کے خزانہ میں خلیفہ بغداد کو ایک خط ملا جس میں شہاب الدین کو خوارزم شاہ کے مقابلہ کی ترغیب دی گئی تھی، اس لئے اس نے ارادہ کرلیا کہ خود خلافت پر قابض ہوجائے، خلیفہ کو اطلاع ہوئی، تو شیخ شہاب الدین سہروردی کو بطور ایلچی بھیجا، اگرچہ سلطان بہت عزت و احترام سے پیش آیا، مگر لشکر کشی کا ارادہ ترک نہ کیا، حقیقت یہ ہے کہ وہ فتوحات کے نشہ میں سرشار تھا اور یہ چاہتا تھا کہ عرب و شام پر بھی چھا جائے

چہ خوش است اگر بود آں قدرِ ہوس بلندی منظرت
کہ برآں مکاں چو قدم نہی خم گردنے نخورد سرت

کہتے ہیں کہ جب خوارزم شاہ نے شیخ الشیوخ کو صاف جواب دیا تو آپ کبیدہ خاطر ہو کر نکل آئے، اور بد دعا کی، خوارزم شاہ نے لشکر کشی کی، مگر موسم سرما تھا اور اس بلا کی سردی پڑی کہ فوج ٹھٹھر کر رہ گئی اور اکثر ہلاک ہوئے۔

چنگیز خان

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خوارزم شاہ کی مملکت کی حدود وسیع ختطا کے بعد چینی تاتار سے ٹکرائی یہ سرزمین بلند پہاڑیوں اور وسیع میدانوں کی ہے جسے مغلیہ (منگولیا) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس میں خانہ بدوش اقوام آباد تھیں۔ تنازعہ للبقا نے ان کو سخت جنگ جو بنا دیا تھا، ان ہی کی غارت گری سے تنگ آ کر شاہان چین نے وہ دیوار تعمیر کی، جو ہمارے زمانہ میں بھی موجود ہے اور عجائبات زمانہ میں شمار ہوتی ہے، غرض یہ تھی کہ سدِ سکندر کا کام دے۔

روایت یہ ہے کہ کسی نامعلوم زمانہ میں ان ہی خانہ بدوش قبائل کا مورث اعلیٰ النجہ نامی تھا، اس کے دو توام بیٹے مغول اور تاتار نامی تھے۔ اور ان کی اولاد ان ہی کے نام سے مشہور ہوئی، مغلوں میں ایل خان سردار قوم ہوا، اسی کی اولاد میں چنگیز خاں ۵۴۹ھ پیدا ہوا۔ اس نے مغلوں اور تاتاریوں کو اپنے ساتھ ملا کر ترک تازی شروع کر دی، جو اس کا آبائی پیشہ تھا، آخر ایک وسیع ملک کا بادشاہ بن گیا، اسلام اس کی حدود میں بہت عرصہ پہلے پھیل چکا تھا، اس کے دربار میں کچھ مسلمان امرا بھی تھے، اور رعایا میں اکثر مسلمان تاجر تھے، چنگیز خاں چاہتا تھا کہ دنیائے اسلام سے رابطہ دوستانہ قائم کرے، اس کا ارادہ یہ تھا کہ تمام چین کو فتح کر لے، لیکن حالات نے خوارزم شاہ کی عاقبت نا اندیشی سے ایسا پلٹا کھایا کہ اس کی غارت گری کی توجہ ممالک اسلام کی طرف لگ گئی، اس نے ایک مسلمان اکابر سے خوارزم شاہ کے پاس بھیجا تاکہ دونوں سلطنتوں میں تجارتی رابطہ قائم ہو جائے۔
کچھ عرصہ تجارتی قافلے دونوں طرف سے آتے جاتے رہے، ۶۱۵ھ میں ایک تاتاری تجارتی قافلہ دریائے سیحوں کے کنارے پر اترا، یہاں کے حاکم نے خوارزم شاہ کو لکھا کہ چنگیزی جاسوس تاجروں کے لباس میں آتے ہیں، خوارزم شاہ نے بلا تحقیق حکم دیا کہ ان کو قتل کیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل خاطر خواہ ہوئی اور تمام تاجر مارے گئے، سامان تجارت مال غنیمت تھا

چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو لکھا کہ تم نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی ہے تمام سامان یا اس کی قیمت ادا کرو۔ اور غائر خاں جس کی شرارت سے یہ حرکت کی گئی ہے ہمارے حوالے کرو۔ خوارزم شاہ نے ان نامہ بروں کو بھی قتل کر دیا۔

اب چنگیز خاں کا پیمانہ صبر بھی چھلک پڑا، مگر خوارزم شاہ نے پیش دستی کر کے ترکستان میں لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم رکھا، ابن اثیر لکھتا ہے کہ خوارزم شاہ نے خود چنگیز خاں کو دعوت جنگ دی، تاتار کی سرحدوں پر دونوں کا مقابلہ ہوا، اور خوارزم شاہ نے ایسی شکست کھائی کہ پھر کہیں اس کے قدم نہ جمے، راہ فرار اختیار کی، مغل اس کا تعاقب سرگرمی سے کر رہے تھے، پہلے غزنی آیا، یہاں سے کرمان اور پھر بحیرہ طبرستان کے ایک ایک جزیرہ میں پناہ لی، تاتاریوں نے تمام ملک میں قتل و غارت کا لامتناہی سلسلہ جاری رکھا، چنگیز کا حکم تھا کہ خوارزم شاہ کا پیچھا نہ چھوڑو، جہاں ملے قتل کر دو، تاتاری مغل اس جزیرہ میں بھی آدھمکے، مگر چند روز پہلے خوارزم شاہ کا انتقال ہو چکا تھا،

خوارزم شاہ اپنی زندگی میں جلال الدین کو اپنا ولی عہد مقرر کر چکا تھا، چنگیز خاں کے مقابلہ کی تاب نہ تھی، غزنی میں پناہ لی، مگر چنگیز نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا، یہاں سے بھاگ کر ہندوستان کا ارادہ تھا، دریا سندھ پر آیا، یہاں چنگیز خاں نے گھیر لیا۔ اور جلال الدین نے دلیرانہ مقابلہ کیا، اور کئی دفعہ چنگیزی فوج کو پسپا ہونا پڑا، اگر اس کے ہمراہ کافی جمعیت ہوتی، تو ممکن تھا کہ قسمت پلٹا کھاتی، لیکن نصیب یاور نہ تھے، ایک پہاڑی درہ میں گھر گیا، گھوڑے پر سوار تیس فٹ بلند چٹان پر چڑھ گیا، چاروں طرف چنگیزی سپاہی تھے، اس وقت اس نے وہ دلیرانہ کام کیا کہ چنگیز بھی انگشت بدنداں تھا گھوڑے کے ساتھ دریا میں کود پڑا، چنگیز دیکھ رہا تھا بے اختیار منہ سے نکلا

"وہ باپ کتنا خوش قسمت ہے جس کا سپوت جلال الدین ہے"

سنہ ۶۲۴ھ میں چنگیز خاں مر گیا، تو جلال الدین کی بھی بن آئی، عراق اور فارس اور ملحقہ علاقہ پر اپنا تسلط جما لیا، لیکن چنگیز خاں کے بیٹوں میں سے اکتائی خان نے اسی ہزار کی جمعیت سے جلال الدین پر چڑھائی کی، جلال الدین نے خلیفہ و دیگر سلاطین سے مدد کی درخواست

۔ مگر کسی نے پروا نہ کی، اگر اس وقت یہ لوگ متفقہ طاقت سے مقابلہ کرتے تو وہ دل ویہنے والے واقعات جو ہلاکو خاں کی ترکتازی کی صورت میں پیش آئے نہ آتے

جلال الدین نے پھر راہ فرار اختیار کی اور کردستان کی پہاڑیوں میں پناہ لی، مگر اس بد ایک منک حرام کردونے ہی کا کام تمام کر دیا۔ اس کے ساتھ دولت خوارزمی کا چراغ ل ہوگیا۔

چنگیز خاں کی اولاد تو بہت تھی، لیکن چار نامور بیٹے ہوئے،

(۱) جوجی خان اس کے حصہ میں سائبیریا جس کو دشت قبچاق بھی کہتے ہیں آیا، اس کا بڑا بیٹا باتو خان تھا، روس، بلگیریا، اور ہنگری اور پولینڈ تک ممالک مسخر کئے۔ اس کا بھائی برکہ خان مشرف باسلام ہوا،

(۲) چغتائی قاآن۔ اس کو خوارزم اور ترکستان اور خراسان اور ماوراء النہر کی حکومت دی گئی، یہ تیمور لنگ گورگان کے خسر کا مورث اعلیٰ ہے، اور اسی کی نسبت سے تیمور چغتائی کہلاتا ہے۔

(۳) اوکتا قاآن۔ چنگیز خان نے اس کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔

(۴) تولی خاں۔ اس کے چار بیٹوں میں سے ہلاکو خاں نے وہ کام کیا جس پر "پدر نتواں پسر تمام کند" کی مثل صادق آتی ہے،

چنگیز خان کی نسبت مورخین لکھتے ہیں۔ کہ

بلخ میں بارہ سو مساجد اور اتنے ہی حمام تھے، سب کو خاک کے برابر کردیا،

"مرو" میں چو[redacted] لاکھ مسلمان اور نیشاپور میں تیرہ لاکھ سینتالیس ہزار اور ہرات میں انیس لاکھ سات سو مارے گئے"

یہ تو بڑے بڑے شہروں میں قتل و غارت کا حال ہے، وہ خود کہتا تھا کہ آسمان پر ایک خدا اور زمین پر میں اس کے عذاب کی صورت ہوں، علماء و حکماء اور زاہدوں اور عابدوں اور صوفیوں کو چن چن کر قتل کیا، اس کے پوتے ہلاکو خاں نے بغداد تک اور تمام عراق اور شام میں حلب تک جو رستہ میں پڑا تلوار کی گھاٹ اتار دیا، اس خاندان کا محبوب مشغلہ یہی تھا

اس کا بیٹا "نکوداز" مسلمان ہوگیا اور اپنا نام "احمد" رکھا، اس کے بھتیجے کی اولاد
الجایتون خان ہے، جس نے اپنا لقب "سلطان محمود خدابندہ" رکھا، اس کی حکو
کے دائرہ میں شام اور کرمان اور سیستان اور سائبیریا اور روس اور بلگاریہ اور ما
اور خوارزم اور گیلان شامل تھے، اس نے اشاعت اسلام میں انتہائی کوشش کی، تم
تاتاری اور مغل مسلمان ہو گئے، اس کے بیٹے سلطان ابوسعید نے بھی دینداری ورثہ میں
ابوسعید کی وفات کے بعد مغلیہ سہنشاہت طوائف الملوکی میں تقسیم ہوگئی،

"دولت ازبکیہ" ماوراالنہر میں مغلیہ حکومت تھی، "دولت آل کرت" ترکیہ بلخ اور ہرا
اور ہرات اور کابل پر چھائی رہی، امیر تیمور نے اس کا خاتمہ کر دیا،

"دولت آل مظفر" فارس پر حکمران تھی یہ بادشاہ خواجہ شمس الدین حافظ کے ممدو
شاہ شجاع اور سلطان اویس اور زین العابدین اور آخر شاہ منصور پر یہ دولت تیمو
ہاتھ پر ختم ہوئی،

تیمور گورگاں

مغل اور ترک کی اصل ایک ہے، مغل تو منگولیا اور منچوریا اور
اور دشت قبچاق یعنی سائبیریا وغیرہ وحشی یا نیم وحشی خانہ
قبائل ہیں اور ترک اسلام کے زیر اثر مہذب اور متمدن قوم ہے، مورخین تیمور کا سل
نسب "تومنہ خان" سے ملاتے ہیں، چنگیز خاں کا نسب بھی اس سے جا ملتا ہے جو اس
بعد چہارم ہے، اور تیمور کا جد پنجم ہے، چونکہ اس کا خسر چنگیز خاں کی نسل سے تھا اس
اس کو چغتائی بھی کہتے ہیں، جو چنگیز کے ایک بیٹے کا نام ہے، مورخین کا اس پر اتفاق
تیمور ترک ہے مغل چغتائی نہیں،

یہ عام دستور ہے کہ ہر ایک شخص جو کسی وجہ سے صاحب دولت وثروت
ہے اپنا سلسلہ نسب کسی مشہور ہستی سے ملاتا ہے، خواہ اس مشہور شخص کے آباؤ اجدا
چور اور ڈاکو ہی ہوں، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو بھی سردار قوم ہوا اسی قماش کا آدمی
تھوڑے ہیں جو اپنی نیک نفسی سے سیادت اور احترام کے مستحق تھے، لقب "سید"
دنیا اسلام میں واجب الاحترام ہے کبھی بنو فاطمہ یا بنو ہاشم کا امتیازی جزو نام نہ تھا

ب غیر عرب کے ہاتھ میں حکومت بنو فاطمہ یا عباسیہ کے تحت آئی تو ان میں سے بعض
ندیہ معنی "سردار" کہلائے، ناصر خسرو جو خود علوی اسمٰعیلی ہے، اپنے "سفر نامہ" میں قرامطہ
رین کی نسبت لکھتا ہے، کہ ان میں سے صاحب حکومت "سید" سے موسوم تھے غالباً
ہی لوگوں نے پہلی دفعہ اس لقب کو خاص معنوں میں رائج کیا، "فرقہ باطنیہ" کا بانی ابوالخطاب
مون القداح اپنا سلسلہ نسب محمد بن الحنفیہ علوی سے ملاتا ہے، قرامطہ جس کا بانی ابو سعید
اہر تھا، باطنیہ کی ایک شاخ ہے، القداح کی نسبت مؤرخین کہتے ہیں، کہ امام جعفر صادق
نے اس کو اپنے "اہل بیت" میں شامل کر لیا تھا، جس طرح روایت ہے کہ آنحضرت نے سلمان
رسی کی نسبت فرمایا کہ "من اہل بیتی"

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی ؎ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

تیمور کو "تمر لنگ" اس لئے کہتے ہیں کہ وہ لنگڑا تھا، "بایزید ایلدرم" سلطان روم جب
اسیر ہو کر اس کے سامنے آیا، تو دیکھ کر بہت ہنسا، ایلدرم نے کہا کہ مجھے اس حالت میں
دیکھ کر ہنستا ہے، کہا خدا کی قسم یہ بات نہیں، تیری یورپ میں اور میری ایشیا میں
دھاک بیٹھی ہوئی ہے، اور ہم دونوں عظیم الشان سلطنتوں کے مالک ہیں، "تو کانا اور میں لنگڑا!"
اللہ کا دین ہے، حسن و صورت کی کیا قیمت ہے، یوسف مصر کے بازار میں بکا، میں اپنی اولاد
کو وصیت کروں گا کہ اس واقعہ کو ہمیشہ یاد رکھیں"۔ چنانچہ جہانگیر نے اپنی تزک میں
اسے نقل کیا ہے۔

تیمور کو صاحب قران بھی کہتے ہیں، اس لئے کہ پیدائش، رشعبان ۷۳۶ھ مطابق
۹ اپریل ۱۳۳۶ء ہوئی، جب سعد ستاروں کا قران ایک برج میں ہوا یا اس لئے کہ اس کا
عہد حکومت دو صدیوں کو ملاتا ہے، اس کی وفات، ماہ شعبان ۸۰۷ھ مطابق ۱۸ فروری
۱۴۰۵ء ہوئی، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نہایت منحوس گھڑی میں اس کی ولادت ہوئی،
عربی مؤرخ اسے "الوحش" کے مہیب نام سے یاد کرتے ہیں، اور اگر اس کے کارناموں
کو دیکھا جائے تو نہایت موزوں اور مناسب نام ہے، اس کی فتوحات یونانی سکندر اعظم
سے بڑھ چڑھ کر ہیں، بحیرہ روم اور بحرالکاہل غرباً اور شرقاً اس کی مملکت کے حدود تھے سکندر

مرا تو مملکت پاش پاش ہو گئی، مگر تیمور نے اپنی اولاد میں دیانت چھوڑی۔ ایک شاخ ہندوستان میں مغلیہ شہنشاہیت تھی جس کے حالات ہم آگے چل کر لکھیں گے، افسوس اس کا اس لئے کہتے ہیں، کہ قتل و غارت گری میں چنگیز اور ہلاکو سے کم نہیں، اس کے دست ظلم و ستم سے جو کچھ نقصان اسلام اور اہل اسلام کو پہنچا، اس کا افسوس زیادہ تر اس لئے ہے کہ وہ مسلمان تھا، اور اس کے پیش رو چنگیز اور ہلاکو خان نا مسلمان تھے فارس کی تسخیر کے وقت آل مظفر کا آخری تاجدار منصور تھا، اس نے کھلے میدان میں اس کا مقا[بلہ] کیا، منصور کی شجاعت کی داد تیمور کے خوشامدی مؤرخ خاوند شاہ مؤلف "روضۃ الصفا" بھی دیتا ہے،

منصور تیموری صفوں کو چیرتا ہوا سیدھا تیمور پر حملہ آور ہوا، یہ لوہے میں غرق گھوڑے پر سوار تھا، سلحدار جو ہر قسم کے ہتھیار لئے اس کے ہمرکاب تھے خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے، منصور نے سات دفعہ لپک کر زور سے تلوار کا حملہ کیا، اگر ان میں سے ایک بھی کارگر ہوتا تو غالباً تیمور اور اس کی اولاد کا نام تاریخ اسلام میں نہ ہوتا، مگر ایک بھی کار[گر] نہ ہوا، اس کا بیٹا شاہ رخ بیچ ہی آڑے آیا، منصور مارا گیا، اس لڑائی نے فارس کی قسمت کا فیصلہ کر دیا،

فارس پر قبضہ کے بعد تیمور عراق کے سرسبز میدانوں میں آ تھما، اس وقت برائے نام خلیفہ بغداد المتوکل علی اللہ ابو عبد اللہ تھا جس کی حیثیت ایسی تھی کہ مصر اور شام میں اس کا نام خطبہ میں پڑھا جاتا تھا، یہاں طوائف الملوکی تھی، اور ہر ایک سلطان تھا "سلطان" کا لقب سب سے پہلے خلیفہ واثق نے اختراع کیا، اور ایک ترکی سردار کو اس سے نوازا، پھر ہر ایک مدعی حکومت کو بارگاہ خلافت سے عطا ہوتا رہا، اس [کا] مفہوم نائب السلطنت تھا، اس وقت ملک الناصر ابو فرج بن برقوق چرکسی سلطان مصر اور شام تھا، ۸۰۳ھ میں تیمور حلب اور حمص اور حمی اور بعلبک کو روندتا ہوا دمشق کے سامنے نمودار ہوا، اہل شہر تیمور کی سفاکی کی داستان پہلے ہی سن چکے تھے، اکثر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے، ملک الناصر ملوکی سپاہ کے ساتھ آگیا قلعہ اور شہر پناہ کی مرمت

بعد سامان رسد قلعہ میں جمع کیا، اور خود قلعہ کی دیواروں کے نیچے تیموری سپاہ مقابلہ کیا جو بُری طرح پسپا ہوئی،

دیار شہر قلعہ کی بلندی اور استحکام و استواری" اور سامانِ حرب سہم ناوک مذراد قارورہ ہائے نفط عالم سوز ... وضرب سنگ عرادہ منجنیق و دیگر اسباب حفاظت و مدافعت خاوند شاہ کے لفظوں میں ایسی تھی کہ ہیچ کس ... بال نہیادند" کے نزدیک پھٹک سکے۔ تیمور نے دیکھا کہ شہر اس طرح مسخر نہ ہوگا، سپاہیانہ چال چلا، اس کا بھتیجا امیرزادہ حسین ملک الناصر کے پاس آیا اور ظاہر کہ تیمور سے بگڑ کر آیا ہوں، ملک الناصر نے خیال کیا کہ تیموری لشکر میں پھوٹ پڑ چکی ہے، اب کسی قسم کا خطرہ نہیں مصر کی طرف چلا گیا،

تیمور کئی میل دور ہٹ گیا تھا، جب ناصر کے جانے کی اطلاع ہوئی تو پلٹ کر آیا شہر کی تسخیر اب بھی ٹیڑھی کھیر تھی، لیکن اہلِ شہر نے مناسب خیال کیا کہ تیمور کو صلح پر آمادہ کیا جائے، ایک وفد جس میں مؤرخ قاضی القضاۃ ولی الدین ابن خلدون بھی تھا بھیجا اہلِ دمشق کو جان و مال کی حفاظت کا یقین دلایا تو شہر پر قابض ہوگیا،، اپنے سرداران لشکر کو مخاطب کر کے کہا کہ

"مجھے تعجب ہوتا تھا کہ اہلِ دمشق نے معاویہ اور یزید کے ساتھ ابن عم و وصی رسول اللہ اور سبطِ اکرم امیر المومنین حسین کا مقابلہ کیا لیکن آج یقین ہوگیا کہ یہ واقعات سچے ہیں، دیکھو اہلِ شام کیسے سیاہ باطن ہیں اپنے آرام و آسائش کے لئے عمارات رفیع اور دلپذیر تعمیر کر رکھی ہیں۔ اور امہات مومنین حرم خاتم النبیین کے مقبرے اُجڑے ہوئے ہیں یہ نالائق اسی لائق ہیں کہ ان سے وہ سلوک کیا جائے جس کے یہ مستحق ہیں"

یہ اشارہ کافی تھا شہر میں قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا۔ خاوند شاہ لکھتا ہے کہ

"دمشق را از پیر و جوان و قوی و ناتوان و شیوخ و اطفال و نساء و رجال باسیری گرفتند"

اور جو کچھ سالہا سال سے

"از بحر و کان بود ند از در و جواہر و زر و زیور در یک ساعت بدست شاہ والا بارگاہ افتاد"

اس کے بعد لکھتا ہے۔ کہ

"غارت گران اردوئے ہمایوں" کا یہ حال تھا۔ کہ فارس کے برتن اور دکسی غنیمت اشیاء اور سقرلات مل بنات اور متفرق اشیاء جو سکندریہ اور مصر سے ان سے پیشتر ان کے قبضہ میں تھیں پھینک دیں۔ اور ان کی جگہ سونا اور چاندی اٹھالیا، اشراف اور عوام الناس سے روپیہ وصول ہو چکا۔ تو ان کو جبراً آبِ شور گرم پانی میں راکھ ملا کر پینے پر مجبور کیا، کوئی شخص مسلمان ہو یا نا مسلمان، یہود و نصاریٰ اس کی تیغ ستم سے نہ بچا، عورتوں اور بچوں کو بھیڑ بکری کے ریوڑ کی طرح سپاہی ہانک کر لشکر میں لا رہے تھے، حضرات شیعہ کو بھی یہی وقت مناسب ہاتھ آیا، جامع اموی کے محلوں میں آگ لگا دی، جس کے شعلوں نے مسجد کو بھی لپیٹ میں لے لیا، چوبی سقف جل کر راکھ ہو گئی، خاوند شاہ اس کو قہر الٰہی سے تعبیر کرتا ہے، یہ اللہ کا گھر آتشکدہ بن گیا، جب "سمع مبارک شاہ" تک اس کی خبر پہنچی، تو فرمایا کہ مسجد کو بچانا چاہئیے، اسے معجزہ سمجھنا چاہئیے کہ "منارہ عروس" اگرچہ چوبی ہے مگر آگ کا اثر اس پر نہ ہوا، وجہ یہ ہے کہ اس پر نزول حضرت مسیحؑ کا ہو گا"

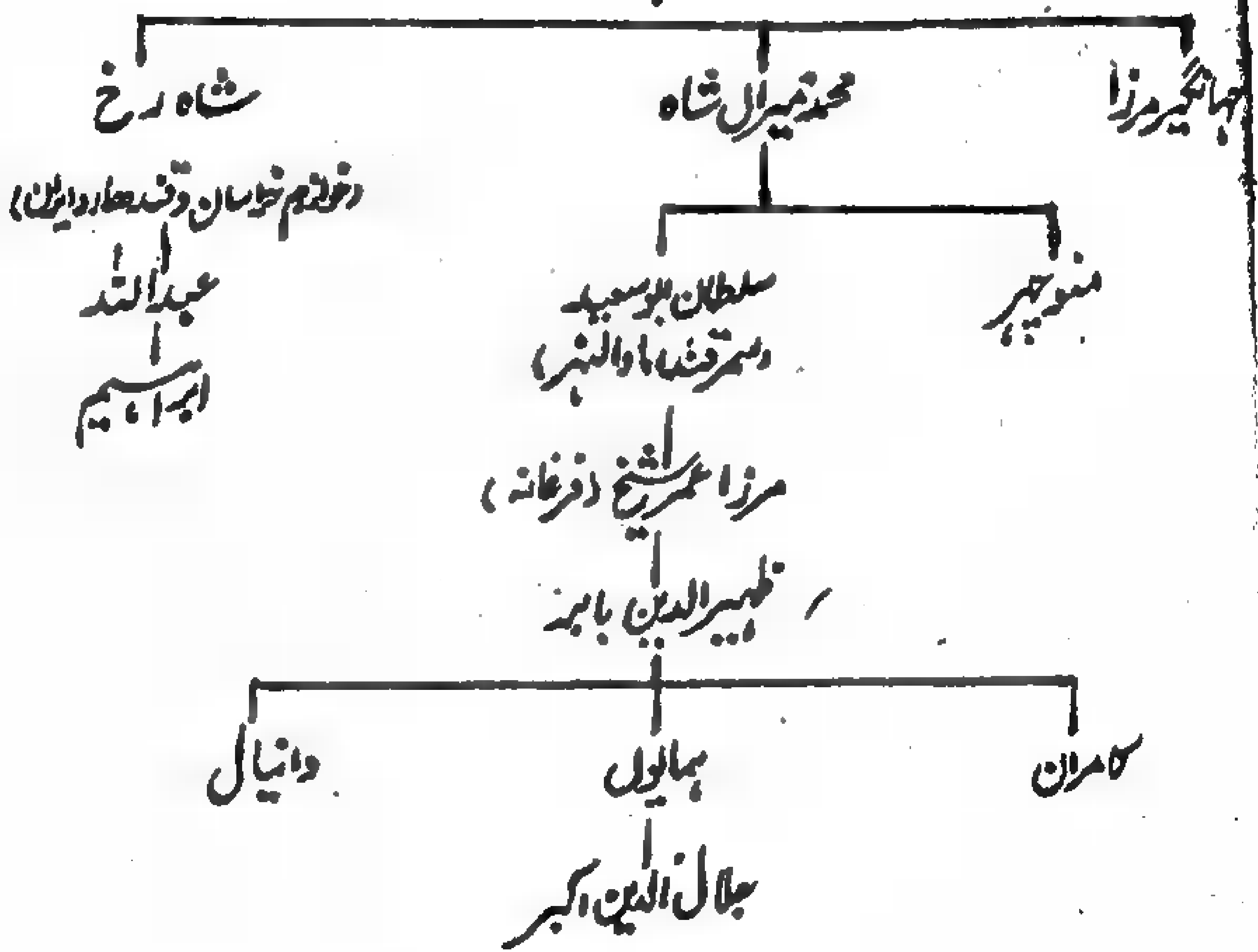
گبن لکھتا ہے کہ سات سو سال بعد ایک ترک کے مذہبی جوش نے ایک عربی خون کا انتقام لیا۔ اور دمشق کا مال و دولت سمیٹ کر لے گیا۔

تیمور چاہتا تھا کہ سلطان کے مقبوضات ایشیاء کو چک کو بھی اپنے تصرف میں لے لے سلطان بایزید ایلدرم اس وقت قسطنطنیہ کا محاصرہ ڈالے پڑا تھا، ناچار محاصرہ اٹھا لیا اور تیمور کو لکھا کہ تقاضائے اسلام یہ ہے کہ آپ روس کی طرف متوجہ ہوں اور مجھے یورپ کی تسخیر سے مانع نہ ہوں، اگر ہم دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ ایک ہی مقصد کے لئے دشمن

ن سے لڑیں، تو اخوت فی الدین کا مطالبہ یہی ہے۔

تیمور کسی اور وطن میں مقامِ "انقرہ" پر دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ ایلدرم اسیر ہوا۔
نا غیور تھا کہ اس صدمہ سے جانبر نہ ہوا۔ تاریخ فتح تیموریہ غلبت الروم فی ادنی
ارض" ہے۔ "ارض" کا اعلیٰ حرف الف اور ادنیٰ "صاد" ہے جس کے عدد (ص ۹ ا د)
فتنہ ھ ہیں۔

سلاطین خاندانِ تیموریہ



شاہان ایران اور سلاطین روم کے حالات ہم سلاطین ہند کے بعد لکھیں گے
اس لئے کہ اول الذکر دو کے آثار ہمارے زمانہ میں بھی پائے جاتے ہیں، اور شاہان ایران
تعلق کم و بیش ہند سے رہا ہے،

خاندان غزنویہ کے حالات ہم سلطان محمود تک لکھ چکے ہیں، سلطان کے بعد
اگرچہ یہ سلطنت عرصہ تک رہی مگر جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے شجرہ نسب
سے ان کے نام معلوم ہو سکتے ہیں، اور تخت نشینی کی تاریخ بھی۔ اس خاندان کے خاتمہ
خاندان غوریہ کا آغاز ہوا۔ یہ دونوں خاندان ترک تھے۔ یہ کہنا چاہیے، کہ اہل عرب کے
خلافت ترکوں کو ملی،

سلطنت غوریہ

اہلِ غور اصل میں پٹھان یا ترک ہیں، جنہوں نے خاندان غزنویہ کے بعد اپنی حکومت قائم کی، ان میں سے سیف الدین محمد بن حسین غزنی کے آخری تاجدار بہرام شاہ کا داماد تھا، ہوسِ سلطنت نے اس کو بغاوت پر آمادہ کیا، اس کے بھائی شور دین نے سر اٹھایا، بہرام شاہ نے قلم کر دیا، تیسرے بھائی علاء الدین نے بغرضِ انتقام چڑھائی کی، مقابلہ ہوا۔ تو بہرام شاہ مارا گیا۔ علاء الدین غزنی پر قابض ہو گیا۔ غزنی کو سلطان محمود نے اتنی رونق دی ہوئی تھی کہ اس کو "عروس البلاد" کہتے، آتشِ انتقام اتنی بھڑکی ہوئی تھی کہ غزنی کو لپیٹ میں لے لیا، شاہانِ غزنی کی قبریں اکھڑوا کر ان کی ہڈیاں جلادیں۔ صرف سلطان محمود کے روضہ کو چھوڑ دیا،

اس آتش افروزی کی وجہ سے، اس کا لقب "جہاں سوز" تاریخ کے صفحات پر اس کے نام کے ساتھ باقی ہے،

"حُبِّ انتقام" ایک جنون ہے جب کسی کے سر پر سوار ہو جاتا ہے، تو دماغی توازن قائم نہیں رہتا، بنو عباس نے یہی سلوک بنو امیہ کی قبروں سے کیا، تعجب ہے کہ آج سب سے بڑی قوم و دعوے دار تہذیب کے سپہ سالار لارڈ کچنر نے مہدی سوڈانی عثمان دقنہ کی قبر اکھڑوا کر ہڈیاں جلا کر دریا برد کر دیں، غالباً اس وحشیانہ حرکت کی بیہودگی کا احساس اُسے اس وقت ہوا جب اول جنگ کے دوران میں جب برطانیہ نے قیصر جرمن سے لڑی وہ فرعون کی طرح سمندر کی موجوں کے تھپیڑے کھاتا ہوا غرق ہو رہا تھا،

بہرام شاہ کا بیٹا خسرو شاہ بھاگ کر لاہور آیا، اور پھر پنجاب ہی میں رہا، علاء الدین نے اپنا لقب سلطان اعظم رکھا، مگر جہاں سوز ہی مشہور رہے،

(شجرہ نسب اگلے صفحہ پر درج ہے)

شجرۂ نسب سلاطین غور

حسین

(۱) علاء الدین حسن ۵۴۵ھ
(۲) سیف الدین سنہ ۵۵۱ھ

سام

(۳) غیاث الدین (سنہ ۵۵۶ھ)
(۵) محمود (سنہ ۶۰۲ھ)
(۶) بہاؤ الدین (سنہ ۶۰ھ)

(۴) شہاب الدین (سنہ ۵۹۹ھ)

اس خاندان میں دو اولوالعزم سلطان غیاث الدین اور اس کا بھائی شہاب الدین گذرے ہیں۔ یہ پہلے مسلمان سلطان ہیں جنہوں نے شمالی ہند میں اسلامی حکومت بالاستقلال قائم کی،

غیاث الدین تو تخت غور اور غزنی پر متمکن تھا، اس کا بھائی شہاب الدین سپہ سالار تھا، پہلا کام جو اس نے اپنے بھائی غیاث الدین کے حکم سے کیا، وہ غزنوی مقبوضات کو غوری سلطنت میں شامل کرنا تھا، جو پنجاب پر مشتمل تھے۔ وہ پہلے ملتان میں آیا، ملتان اس وقت "قرامطہ" کے قبضہ میں تھا، ان کا قلع قمع کیا تو "اوچھ" لے لیا، ملتان میں اپنا نائب اور سپاہ کا کچھ حصہ متعین کر کے غزنی کو لوٹا، تین سال بعد اس نے انہلواڑہ

گجرات پر فوج کشی کی، بھیم دیو گجھیلا راجپوت راجہ نے مقابلہ کیا، اور شہاب الدین کو شکست ہوئی، فوج کا اکثر حصّہ کچھ لڑائی اور کچھ راجپوتانہ کے ریگستانوں میں تباہ ہو گیا، شہاب الدین کے استقلال پر اس شکست کا کچھ اثر نہ ہوا، دوسرے سال ایک نیا راستہ اختیار کیا، پہلے پشاور لیا۔ پھر لاہور کی طرف بڑھا، خسرو شاہ غزنوی نے اپنا بیٹا یرغمال میں دے کر گلو خلاصی کرائی،

سیالکوٹ میں چکرویو راجہ جموں نے اسے مدد کے لئے بلایا، کھوکھر قبائل کشمیر سے جموں تک تمام پہاڑی علاقہ پر قابض تھے اور راجہ ان کے ہاتھ سے تنگ آ چکا تھا، اس مہم کا یہ نتیجہ ہوا کہ شہاب الدین نے یہاں بھی اپنی سپاہ کا کچھ حصّہ راجہ کی حفاظت اور مدد کے لئے چھوڑا، شہاب الدین چاہتا تھا کہ سیالکوٹ کو اپنی سپاہ کا مرکز قرار دے کر ہندوستان پر حملہ کرے، وہ غزنی کی طرف فراہمی فوج کے لئے گیا، اس کی عدم موجودگی میں خسرو ملک نے سیالکوٹ کا محاصرہ کیا، سنہ ۱۱۸۶ء میں شہاب الدین کو مجبوراً پھر پنجاب کی طرف متوجہ ہونا پڑا، لاہور کے قلعہ کو محاصرہ میں لے لیا، خسرو ملک تاب مقابلہ نہ لایا اور صلح کی درخواست کی، شہاب الدین نے اسے اور اس کے خاندان کو غزنی کے قلعہ "فیروز کوہ" میں نظر بند کر دیا، اس طرح غزنوی حکومت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔

اب غوری کے قبضہ میں تمام پنجاب اور وادی سندھ آ چکی تھی، ہندوستان کی تسخیر کا عزم مصمم ہو چکا تھا، اب راستہ بھی صاف تھا۔

اس وقت شمالی ہند میں بڑے مہاراجے ایک تو چوہان راجپوت تھے جو دہلی اور اجمیر پر حکمران تھے، دوسرے گہڑوار اور راٹھور تھے جن کی سلطنت میں قنوج اور بنارس تھے، اور بہار تک پھیلی ہوئی تھی، تیسرے چندیلہ راجپوت تھے، جو بندیل کھنڈ میں حکمران تھے، اور کالنجر اور کالپی وغیرہ مقامات پر ان کے مضبوط قلعے تھے۔ بنگال پر "سینا" حکومت کرتے تھے۔

سنہ ۱۱۹۱ء میں شہاب الدین نے ایک لشکر جرار تیار کیا، اور بھٹنڈہ تک آیا، جو چوہان راجپوت راجہ دہلی کی حد پر واقع ہے، اس وقت پرتھوی راج راجہ تھا، وہ شہاب الدین کے

کے ارادہ سے بے خبر نہ تھا، ہندوستان کے راجوں کو لکھا، کہ ایک ایسے مہیب دشمن کے مقابلہ میں متحد ہو جاؤ۔ جو سب کا ہے۔ ایک سو سے زیادہ راجوں نے اپنی فوج پرتھوی راج کی مدد کے لئے بھیج دی، لیکن جے چند راجہ قنوج علیحدہ ہی رہا۔ اس کی وجہ کچھ رنجش خانگی معاملات ہی تھی۔ "ترین یا ترائن" کے میدان میں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا، غوری نے اپنے سواروں کے دستے کے ساتھ راجپوتی لشکر کے مرکز پر حملہ کیا، لیکن حریف کی تعداد بہت زیادہ تھی، مسلمان لشکر کے دونوں بازوؤں پر ٹوٹ پڑے، اور شہاب الدین پرتھوی راج کے ہاتھی تک پہنچ چکا تھا۔ کہ اس کا لشکر گھبرگیا وہ خود بھی سخت زخمی ہوا، ایک جانثار سپاہی اس کے گھوڑے پر بیٹھ گیا اور شہاب الدین کو گرتے گرتے سنبھال لیا، اس کی سپاہ پسپا ہوئی، چالیس میل تک راجپوتوں نے تعاقب کیا، اگر اس وقت پرتھوی راج ذرا دور اندیشی سے کام لیتا، اور لاہور تک بڑھ آتا تو غالباً تاریخی واقعات کی صورت کچھ اور ہوتی۔ اس عظیم الشان فتح کا فائدہ اس نے نہ اٹھایا

شہاب الدین مستقل مزاجی کی ایک بے مثل نظیر ہے، دوسرے سال اس شکست کا داغ مٹانے کے لئے اس نے ایک لاکھ بیس ہزار کی جمعیت فراہم کی، اس کے ترکی اور افغان سوار اور پیدل پشاور کے راستہ پھر اسی میدان جنگ میں اترے۔ جہاں شکست کا منہ دیکھا تھا۔ شہاب الدین نے ایک ہزار تیر انداز محافظ سواروں کے ساتھ اس زور کا حملہ کیا کہ قلب لشکر تک صفوں کو الٹ دیا۔

"فرشتہ" لکھتا ہے کہ ہندوؤں کی جمعیت کہیں زیادہ تھی، مگر جب ایک دفعہ بھاگ کھڑی تو پھر قدم نہ جمے، پرتھوی راج میدان جنگ میں کام آیا، شہاب الدین نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا، جس نے دارالسلطنت لاہور مقرر کر کے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، دوسرے سال شہاب الدین خود آیا۔ اور جے چند سے مقابلہ ہوا، جے چند بھی لڑائی میں مارا گیا، اب مسلمانوں کی سلطنت بنارس سے آگے بہار تک پھیل گئی، غیور راجپوت "قنوج" وغیرہ شہروں سے نکل کر مارواڑ کے ریگستان کی طرف چلے گئے، اور یہاں اپنا راج قائم کر لیا، جو بعد ازاں "راجپوتانہ"

سے موسوم ہوا۔

قطب الدین ایبک نے اجمیر کے تخت پر پرتھوی راج کے ایک بیٹے کو بٹھا دیا۔ مگر راجپوتوں نے بغاوت کردی ہیمراج اس بغاوت کا سرغنہ تھا، ان کا مطالبہ یہ تھا۔ کہ راجہ پرتھوی راج کا جائز بیٹا نہیں، باغیوں کو شکست ہوئی ہیمراج مارا گیا، اور ایبک نے راجہ کی حفاظت کے لئے ایک افسر مقرر کردیا۔

اب ایبک نے ان تمام صوبوں کو جو شمالی ہند میں واقع تھے، ایک ایک کرکے مسخر کرلیا۔ "بہار" اصل میں "وہارہ" ہے جو بدھ مت کے مذہب کے پیشوایان کی خانقاہیں تھیں یہاں مسلمانوں کو بلا مقابلہ کامیابی ہوئی، قطب الدین کے ایک فوجی افسر بختیار خلجی نے بنگال مسخر کرلیا، بختیار اب آسام کی طرف بڑھا، لیکن پہاڑی راستہ دشوار گذار تھا، سامان خورد و نوش بھی ختم ہوچکا اس لئے تمام لشکر تباہ ہوگیا، صرف ایک شخص علی بن مردان خلجی بچا جو بعد ازاں بنگال کا حاکم ہوا،

شہاب الدین ہندوستان کی طرف سے مطمئن تھا، ترکوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی حدود سے باہر مصروف رہا، کھوکھر اور دوسرے قبائل نے متحد ہوکر جو کھیوڑہ کی نمک کی کان کے آس پاس آباد تھیں، متحد ہوکر بغاوت کردی، شہاب الدین غزنی سے اور قطب الدین لاہور سے ان کی گوشمالی کے لئے بڑھا، ان کا سردار "رائے سال" تھا ایک ہی لڑائی میں باغی تتر بتر ہوگئے،

۱۲۰۶ء میں شہاب الدین جہلم دریا کے کنارے پر خیمہ میں رات کو سویا ہوا تھا کہ بیس کھوکھر خیمہ میں گھس آئے، اور اس فاتح ہند کو شہید کردیا، لاش غزنی میں لی گئی، اور یہیں مدفون ہوا، شہاب الدین اپنے بھائی کی وفات کے بعد تخت غور پہ بیٹھا تھا، اس کی اولاد نرینہ نہ تھی، اس کا بھتیجا محمود پسر غیاث الدین جانشین ہوا لیکن یہ سمجھنا چاہیئے کہ سلطنت غور یہ ختم ہوچکی تھی، تاج الدین "یلدوز" غزنی میں اور ناصر الدین قباچہ ملتان اور سندھ میں، ایبک لاہور سے دہلی تک اور خلجی بہار اور بنگال میں خود مختار بادشاہ تھے۔ "قطب مینار" دہلی قطب الدین کی یادگار ہے، اصل میں یہ ایک

مسجد "قوت الاسلام" کا منارہ ہے جو قطب الدین تعمیر کرنا چاہتا تھا تعمیر
کام اس نے شروع کیا مگر اس کی تکمیل عرصہ بعد التمش نے کی،

ہندوستان میں خلافت اسلامیہ کا آغاز خاندان غلاماں سے ہوتا ہے جس
حکومت سنہ ۱۲۰۶ء سے سنہ ۱۲۹۰ء تک رہی۔ اس کے بعد حسب ذیل خاندان ایک دوسرے
کے بعد حکمران رہے،

(۱) خاندان خلجی سنہ ۱۲۹۰ء سے سنہ ۱۳۲۰ء تک
(۲) خاندان تغلق سنہ ۱۳۲۰ء سے سنہ ۱۴۱۴ء تک
(۳) خاندان سادات سنہ ۱۴۱۴ء سے سنہ ۱۴۵۰ء تک
(۴) خاندان لودھی سنہ ۱۴۵۰ء سے سنہ ۱۵۲۶ء تک

شمس الدین التمش

خاندان غلاماں اور خلجی اور تغلق پٹھان یا ترک
سادات عرب ہاشمی اور لودھی افغان یا پٹھان
مؤرخین کا ان کی قومیت کے بارے میں اختلاف ہے۔ بہر حال یہ افغانستان سے آئے
قطب الدین ایبک کے بعد اس کا بیٹا آرام بادشاہ ہوا، ملک میں عام بدنظمی پھیل
گئی اور آرام سے بیٹھا دیکھتا رہا اور کچھ نہ کر سکا، اس کے ایک غلام شمس الدین
التمش نے اسے برطرف کر کے خود عنان حکومت ہاتھ میں لے لی، خلیفہ بغداد
طرف سے سند سلطانی عطا ہوئی، التمش قطب الدین کا داماد بھی تھا۔

تاج الدین یلدوز غزنی میں حکمران تھا، سلطان خوارزم سے لڑائی جھگڑا رہتا
آخر یلدوز کو غزنی سے بھاگنا پڑا، لاہور اس وقت قباچہ کے قبضہ میں تھا، اس
سپاہیوں کو قلعہ سے نکال کر خود قابض ہو گیا، التمش جس نے قطب الدین ایبک
وفات کے بعد لاہور کی جگہ دہلی پایہ تخت قرار دیا تھا، یلدوز کو بے دخل کرنے کے
دہلی سے آیا، تھانیسر کے میدان میں سنہ ۱۲۱۶ء میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ یلدوز گرفتار
ہوا۔ بدایوں کے قلعہ میں محبوس ہوا اور یہیں مر گیا،

اب ناصر الدین قباچہ حریف رہ گیا، "بھکھر" پر قباچہ کو شکست ہوئی دریائے سندھ

بھاگتے وقت ڈوب مرا، اب التمش کے قبضہ میں پنجاب اور بنگال اور درمیانی
قہ آگیا، دریائے سندھ سے دریا، نربدا تک التمش کی سلطنت تھی۔ یلدوز اور
اچہ وغیرہ کی خانہ جنگی سے یہ اسلامی سلطنت جو شہاب الدین نے قائم کی تھی،
بہت جلد ختم ہو جاتی، کیونکہ راجپوت راجے پھر متحد ہو رہے تھے۔ التمش نے بیک
ت یلدوز اور قباچہ سے خلاصی حاصل کی، اور راجپوتوں کو بھی نیچا دکھایا۔
س لئے التمش ہی در اصل پہلا حکمران ہے، جس نے اسلامی سلطنت کی بنیاد
ہندوستان میں استوار کی۔

التمش خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مرید تھا، جن کا مزار پرانی دہلی میں
ر ولی میں ہے۔ قطب صاحب خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے خلیفہ اور مرید
ھے۔ التمش نے خواجہ اجمیری کا زمانہ بھی دیکھا، اس نے مینار قطب کی تکمیل
بڑا بیٹا فیروز التمش کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا۔ چھوٹا رکن الدین جانشین ہوا،
ند ماہ حکومت کی۔ اُمرا نے اُسے برطرف کر کے التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ
تخت و تاج دے دیا۔

اس کی نسبت "فرشتہ" لکھتا ہے کہ رضیہ کا دل و دماغ مردانہ تھا، اور رکن الدین جیسے بیس
بھی ہوتے تو اس کے سامنے ہیچ تھے، دہلی کے تخت پر یہی عورت اول و آخر بیٹھی، عورت ذات
کمزور دیکھ کر "سرہند"[1] کے حاکم نے علم بغاوت بلند کیا، رضیہ اس کے مقابلہ کے لئے اُٹھی، مگر اس
کے اپنے ترکی سرداروں نے اُسے "ملک التونیہ" باغی کے حوالے کر دیا، اس کی عدم موجودگی میں اس
کے بھائی بہرام نے دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا، رضیہ نے ملک التونیہ سے نکاح کر لیا، اور دہلی
کی طرف لشکر کشی کی، کیتھل پر شکست کھائی، اور وہ اور اس کا خاوند دونوں مارے گئے۔

---

[1] "سرہند" اصل میں "سہ رند" کا مفہوم شیر یا چیتا ہے، اور "رند" کے معنی جنگل ہے۔ یعنی
ایسا جنگل جہاں شیر رہتے تھے، بگڑ کر سرہند ہو گیا، اور عوام غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان
کی حد یہاں سے شروع ہوتی ہے، الفاظ "سہ" اور "رند" حصار اور ٹپالہ وغیرہ میں اسی معنی میں
اب بھی استعمال ہوتے ہیں، فرشتہ بھی اسے "سہ رند" ہی لکھتا ہے۔

التمش کی اولاد میں، رضیہ کے بعد اس کا بیٹا بہرام اور پوتا ناصر الدین تخت نشین ہوئے مگر زمام حکومت اصل میں ایک امیر بلبن " کے ہاتھ میں تھی، ناصر الدین کی دین داری اور خدا ترسی کی مثال خلفاء راشدین ہی میں ملتی ہے، اگر اس کی اپنی قوم صحابہؓ کی طرح ہوتی تو تاریخ پھر سے ان واقعات کا اعادہ کرتی جو خلافتِ راشدہ میں رونما ہوئے اس لئے بادشاہ ہو یا کوئی صدر وغیرہ وہ صرف اپنے زمانہ کی ذہنیت کا نمائندہ ہی ہو تو کامیاب ہو سکتا ہے، لیکن اگر رعایا مطمئن ہو تو ایسے نیک نہاد حکمران اور تو کچھ نہیں اپنا وقت اطمینان قلب کے ساتھ گزار سکتے ہیں تواریخی واقعات شاہد ہیں کہ اس خونخوار دنیا میں خونریز ابنِ آدم ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ناصر الدین اپنی ہاتھ کی کمائی سے روٹی کماتا، زوجہ چولہا گرم کرتی، کوئی غلام کوئی لونڈی خدمت کے لئے مامور نہ تھی، ایک دفعہ بیوی کا ہاتھ روٹی پکاتے جل گیا تو کہا کہ صبر کرو اللہ نیک اجر دے گا،

چنگیزی حملے التمش کے وقت سے شروع ہو گئے تھے، چنگیز خان خوارزم شاہ کے بیٹے جلال الدین کے تعاقب میں سندھ تک آ چکا تھا، بلبن اس وقت فوجی افسر کی حیثیت سے اس کا راستہ روکنے کے لئے دوسری طرف کھڑا تھا، چنگیز دوسرے کنارے سے لوٹ گیا، لیکن وادی سندھ میں مغلوں کی ترکتازی برابر جاری رہی اور ناصر الدین کی تخت نشینی تک وہ سندھ کے غربی کنارے تک تمام علاقہ پر قابض ہو چکے تھے، کھوکر قبائل جن کے ہاتھ سے شہاب الدین غوری شہید ہوا تھا، مغلوں سے ساز باز کرتے تھے، اور پنجاب میں اودھم مچا رکھا تھا، بلبن نے ان کی سرکوبی خاطر خواہ کی، الودھر ستد راجپوت راجپوتانہ اور جمنا اور گنگا کے دوآبہ میں شورش بپا کر رہے تھے، اور مالوہ آزاد ہو چکا تھا، بلبن نے ان کو بھی نیچا دکھایا، ناصر الدین بلبن کا داماد تھا۔ بستر مرگ پر بلبن کو بلایا، اور کہا کہ اپنے بعد میں اپنا جانشین تجھے نامزد کرتا ہوں،

بلبن کے عہد کے آغاز میں باغیوں نے ہر طرف سے سر اٹھایا، لیکن بلبن اس وقت تک چین سے نہ بیٹھا جب تک ان کو قرار واقعی سزا نہ دی، شاید ہی کوئی شخص

موت کے منہ سے بچا ہو، اس نے حجاج بن یوسف کا نام زندہ کر دیا، لیکن اس کے سوا چارہ کار نہ تھا، میواتی سخت شورہ پشت تھے، ان کی وہ خبر لی کہ ساٹھ سال تک سر نہ اٹھا سکے۔

دہلی اس وقت ان سلاطین کی پناہ گاہ تھی جو مغلوں کی چیرہ دستی سے اپنے ملک سے بھاگ کر آئے تھے، بلبن نے ان کا واجب احترام اور سرکاری خزانہ سے امداد بھی کرتا رہا، ان کی تعداد پندرہ بیان کی جاتی ہے۔

بلبن اسی سال کی عمر میں ۱۲۸۶ء میں فوت ہوا، اس کا بیٹا محمد ولایت ملتان کا والی تھا، مغلوں کے مقابلہ میں لڑتا ہوا مارا گیا، اسی کی ملازمت میں مشہور شاعر امیر خسرو بھی تھا، وہ بھی اسیر ہوا، بلبن کو بیٹے کی موت کا صدمہ اس ضعیف العمری میں ایسا ہوا کہ جانبر نہ ہو سکا، اس کا دوسرا بیٹا بغرا خاں ولایت بنگالہ کا حاکم تھا، اس کی نسبت بلبن کی رائے اچھی نہ تھی، محمد شہید کے بیٹے کے خسرو کو اپنا جانشین نامزد کیا ۱۲۰۲ء سے ۱۲۹۰ء چوراسی سال تک خاندان غلاماں حکمران رہا۔

شجرہ نسب خاندان غلاماں

- قطب الدین ایبک (متوفی سنہ ۱۲۱۰ء)
  - آرام (سنہ ۱۲۱۱ء)
- شمس الدین التمش (سنہ ۱۲۱۱ء)
  - رکن الدین (سنہ ۱۲۳۶ء)
  - رضیہ سلطانہ (سنہ ۱۲۳۶ء)
  - بہرام (سنہ ۱۲۴۰ء)
    - ناصر الدین محمود (سنہ ۱۲۴۶ء تا سنہ ۱۲۶۶ء)
- (۱) غیاث الدین بلبن (سنہ ۸۶، ۱۲۶۶ء)
  - بغرا خاں
    - (۲) کے قباد (سنہ ۹۰، ۱۲۸۶ء)
  - محمد
    - کے خسرو

دس شاہان غلاماں میں سے تین بادشاہ قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن اولوالعزم تھے، اور یہی تین اپنی طبعی موت مرے، باقی سات قتل ہوئے، ان تین نے اسلامی سلطنت کو دریائے سندھ سے برہم پتر تک وسعت دی، اور ان ہی کے عہد میں اشاعت اسلام بھی خاطر خواہ ہوئی، آخری تاجدار کیقباد ۱۲۹۰ء میں خلجی سرداروں کی سازش کا شکار ہوا، اب سلطنت ترکوں سے ہاتھ سے نکل کر افغانوں کے ہاتھ میں آگئی،

ہم بیان کر آئے ہیں کہ قطب الدین ایبک کا نائب السلطنت بنگال میں محمد بختیار خلجی تھا، اور اسی نے بہار اور بنگال فتح کیا تھا، پایۂ سلطنت "گور" تھا بختیار کے بعد اسی قبیلہ کے سردار یکے بعد دیگرے حکمران رہے، لیکن عموماً شاہان دہلی کے نائب السلطنت ہی تھے، دہلی میں بھی ان کے قبیلہ کے سردار طبقہ امراء میں تھے اور شائستہ خدمات پر مامور تھے، رفتہ رفتہ اتنا زور پکڑ گئے، کہ "قباد" کو جو آرام طلب شخص تھا قتل کیا اور سلطنت پر قابض ہو گئے، اس وقت ان کا سردار ستر سال کا بوڑھا فیروز شاہ فوج کا بخشی تھا، اسی کو تخت پر بٹھا دیا، ترکی امراء کے ہاتھ سے اقتدار نکلا تو دوبارہ ہاتھ پاؤں مارے، بلبن کا برادر زادہ کستلو خان جو "ملک چھجو" کے نام سے مشہور ہے، دہلی پر چڑھ دوڑا، مگر "بدایوں" کے قریب شکست کھا کر اسیر ہوا۔ جلال الدین نے قصور معاف کر دیا، اور کہا کہ میں اب اللہ کے حضور میں پیش ہونے والا ہوں، اپنے ہاتھ ایک مسلمان کے خون سے رنگین نہ کروں گا،

بلحاظ تقوی: اخلاق عالیہ ہر ایک شخص انفرادی زندگی میں قابل تعریف ہے۔ لیکن جب اس کا اثر اجتماعی زندگی پر بالخصوص نظام حکومت پر مخالفانہ پڑتا ہو۔ تو نتیجہ یہی ہوتا ہے، جو جلال الدین کے رحم و کرم نے سلطنت میں پیدا کر دیا، چوروں اور راہزنوں نے مملکت کے طول و عرض میں اودھم مچادیا، خاص شہر دہلی میں ایک ہزار ٹھگ موجود تھے، دہلی میں ایک شخص سید مولا بلبن کے عہد میں تھا مشہور صوفی بزرگ بابا فرید الدین مسعود شکر گنج کا مرید تھا، سید درویش تھا۔ لیکن لنگر خانہ ہر ایک شاہ گدا کے لئے

دن رات کھلا رہتا، اور یہاں شب و روز خلقت کا ہجوم اور ان کی ارادت نے حکومت
کو چوکنا کر دیا، عموماً ترک یہاں جمع ہوتے۔ اُن کی کرامت کا شہرہ دور دور تک ہوا
ترکوں نے خفیہ یہ منصوبہ گانٹھا کہ ناصر الدین محمود کی ایک دختر کا نکاح سید سے
کیا جائے، اور اس کی آڑ میں پھر سے تخت و تاج پر قبضہ جما لیں۔ یہ راز فاش ہو گیا
اور جلال الدین کے حکم سے سید مولا قتل ہوا۔

یہ فتنہ تو فرو ہو گیا، مگر ان ہی ایام میں مغلوں نے ہلاکو خان کے تحت ہندوستان
پر دھاوا بول دیا، اور حسب عادت قتل و غارت کا بازار گرم کر دیا، اگرچہ شاہی فوج نے شکست
فاش دی، مگر سلطان رحم و کرم نے اسیران جنگ کو جو ہزاروں کی تعداد میں تھے دہلی کے
قریب ہی بسا لیا۔ اس کو "مغل پورہ" کہتے ہیں، جہاں ان کی بستی تھی، اور بعد میں سازش اور
شورش کا مرکز بن گئی، جس نے حکومت دہلی کو کبھی چین نہ لینے دیا، یہ مغل اگرچہ سب
مسلمان ہو گئے تھے مگر اپنے اقتدار کے زمانہ میں جو عہد تغلق سے شروع ہوا، ان کی یہ
حالت تھی کہ ہر ایک امیر و غریب کے گھر کے ساتھ ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا جو مسجد
کا کام دیتا، ان کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ کسی ہم چشم کی مسجد میں نماز بھی پڑھیں
اس لئے "ڈیڑھ اینٹ کی مسجد" ضرب المثل ہو گئی۔

اگر جلال الدین کا برادر زادہ علاء الدین امور سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں نہ
لیتا تو خلجی ختم ہو جاتے، اس نے سلطان کی اجازت سے ملک دکن کی تسخیر کا ارادہ
کیا، صرف آٹھ ہزار سوار اس کے ہمرکاب تھے، سپاہیانہ چال یہ چلا کہ سلطان سے
ناراضی کی وجہ سے "تلنگانہ" کے راجہ کی ملازمت میں جانا چاہتا تھا، اس مفروضہ واقعہ
کو اتنی شہرت دی کہ سات سو میل کا سفر بندھیاچل کے جنگلوں اور پہاڑیوں میں
برار اور خاندیس سے ہوتا ہوا طے کر گیا اور کسی راجہ نے مزاحمت نہ کی۔

غالباً وہ اس خیال میں محو تھے کہ اس کے ذریعہ پھر سے ہندو راج قائم کریں گے
یک لخت وہ "دیوگڑھی" (دولت آباد) کے سامنے نمودار ہوا، یہاں کا راجہ رام چندر کرشن
مہاراج کے قبیلہ "یادو" کی نسل سے راج کرتا تھا، علاء الدین نے اسے غفلت میں آلیا

مقابلہ تو کیا مگر شکست کھائی، راجہ کا بیٹا شنکر دیو اس وقت باہر تھا اطلاع ہوئی. تو ادھر اُدھر سے جمعیت فراہم کی، لیکن شکست کا منہ دیکھنا پڑا، اسیر ہوا تو زر و جواہرات دے کر گلو خلاصی کرا لی، مگر علاء الدین نے کچھ علاقہ ہتھیا لیا. جو بعد میں ایلچ پور کے نام سے مشہور ہوا،

اب مسلمانوں کا قدم دکن میں بھی جم گیا، محمد غوری کے بعد ایک سو سال کا عرصہ گذرا کہ ۱۲۹۴ء میں شمالی ہند کے بعد جنوبی ہند کی باری آ گئی،

مالِ غنیمت جو علاء الدین کے ہاتھ لگا، اس نے اپنے ہی قبضہ میں رکھا سلطان جلال الدین نے لکھا. کہ مجھے آ کر مِلو، یہ ٹالتا ہی رہا، آخر سلطان خود ملنے کے لئے آیا، دریا گنگا میں کشتی پر سوار تھا، اُمراء نے بہت سمجھایا کہ علاؤالدین کی نیت خراب ہے مگر بوجہ محبت یقین نہ کیا، علاء الدین سلطان کا داماد بھی تھا، فرشتہ لکھتا ہے کہ ایک مجذوب فقیر گنگا کے کنارے "کورا" میں جہاں علاء الدین ڈیرہ ڈالے پڑا تھا، جب علاؤالدین نے سُنا، سلطان خود ملاقات کے لئے آ رہا ہے، دِل میں چین تو تھا ہی مجذوب کے پاس گیا، اس نے کہا، کہ

ہر کہ با تو کند جنگ. سرِ و در کشتی تن در گنگ شد

ادھر سے سلطان اور اُدھر سے علاء الدین کشتیوں میں سوار چلے، علاء الدین کے اشارہ پر اس کے محافظوں نے سلطان کا سر قلم کر دیا، جو دریا میں گرا اور تن بے سر کشتی میں تڑپ تڑپ کر سرد ہو گیا، جلال الدین شہید کے بیٹے رکن الدین ابراہیم نے دھلی کے قریب مقابلہ کیا، مگر وہ اور اس کا بھائی "ارقلی" اسیر ہوئے، آنکھیں نکلوائی گئیں. علاء الدین کی داد و دہش نے بدگوئیوں کا منہ بھی بند کر دیا، خلجی خاندان میں یہی اولوالعزم بادشاہ ہوا ہے،

جلال الدین نے سنہ ۱۲۹۰ء سے سنہ ۱۲۹۶ء تک حکومت کی، علاء الدین نے سنہ ۱۲۹۶ء سے سنہ ۱۳۱۶ء اور اس کے بیٹے شہاب الدین عمر نے صرف ایک ماہ اور قطب الدین مبارک دوسرے بیٹے نے سنہ ۱۳۱۶ء سے سنہ ۱۳۱۸ء تک حکومت کی، اس پر خلجی خاندان کا خاتمہ ہو گیا

شہاب الدین محمد غوری اور اس کے نائب قطب الدین ایبک نے شمالی ہندادہ علاء الدین نے جنوبی ہند فتح کیا۔ یہہ امر یاد رکھنا چاہیئے، کہ مغلوں یا ترکوں اور افغانوں میں خلوص اور محبت کا کوئی رشتہ نہ تھا، جب علاؤالدین کے لشکر نے قلعہ "رنتھمبور" کا محاصرہ ڈالا تو رانا ہمیر دیو کی فوج میں ترک ہی تھے، جنہوں نے ایک سال تک مقابلہ کیا، اور اگر اس کا وزیر رام مل غداری نہ کرتا اور خلجیوں کی راہنمائی قلعہ کے اندر نہ کرتا تو اس کا سَر ہونا بہت مشکل تھا،

۱۳۰۳ء میں علاء الدین نے چتوڑ کا محاصرہ کیا، حملہ کا ایک سبب یہہ بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان رانا کی زوجہ رانی پدمنی کے حسن و جمال کا شہرہ سن کر فریفتہ ہوگیا،

" نہ تنہا عشق از دیدار خیزد بسا کیں دولت از گفتار خیزد

یہ واقعہ صرف فسانہ نگار مورخ ابوالقاسم فرشتہ ہی بیان کرتا ہے، جس نے اپنی تاریخ سولھویں صدی عیسوی میں لکھی، ہمعصر مورخین اس کی نسبت خاموش ہیں حقیقت بھی یہی ہے، کہ یہ صرف افسانہ ہے تاریخی واقعہ نہیں ہے، البتہ یہ تاریخی واقعہ ہے کہ ۱۲۹۷ء میں علاء الدین کے لشکر نے گجرات مسخر کیا تو راجہ رائے کرن تو بھاگ گیا رانی کملادیوی اسیران جنگ کے ساتھ دھلی میں آئی، علاء الدین نے اس سے عقد نکاح کرلیا، اسی کے بطن سے شہاب الدین عمر تھا، جو علاء الدین کے بعد تخت دھلی پر بیٹھا غالباً علاؤالدین یہ چاہتا تھا کہ ہندو راجاؤں سے رشتہ قائم کرے جس پر عمل بعد ازاں اکبر نے کیا مشہور مؤرخ ضیاءالدین برنی نے علاء الدین کے عہد کے واقعات مفصل لکھے ہیں، امیر خسرو اور نظام الدین اولیاء اسی کے عہد میں موجود تھے، "ملک کافور" اول تو مخنث تھا۔ مگر دکن کی فتوحات اسی کی مردانہ کوشش کا نتیجہ ہیں، آخری تاجدار مبارک شاہ کا منظور نظر ایک نیچ ذات کا ہندو تھا، اس نے اسلام قبول کرلیا، مگر سلطان کو قتل کرکے خود مالک تخت وتاج ہوگیا، اپنی ذات پات کے ہندوؤں کو اپنے گرد جمع کرلیا اور تمام مناصب اور عہدے ان میں تقسیم کردیئے، مسلمان امراء نے متحد ہوکر غازی ملک کو جو پنجاب میں حاکم تھا دعوت تخت وتاج دی، اس نے ملک خسرو کو قتل کیا، اور تغلق خاندان کی بنا ڈالی،

ملک تغلق

(۱) غازی ملک غیاث الدین (سنہ ۱۳۲۰ء)
(۲) جونا خان محمد (سنہ ۱۳۲۵ء)

ملک رجب
(۳) فیروز شاہ (سنہ ۱۳۵۱ء)

فتح خان
(۴) غیاث الدین

ظفر خان
(۵) ابوبکر

(۶) ناصر الدین محمود شاہ (سنہ ۱۳۹۰ء)

(۷) ہمایوں (سنہ ۱۳۹۴ء)
علاء الدین سکندر شاہ

(۸) محمود (سنہ ۱۳۹۴ء)

(۹) غیاث الدین ثانی (سنہ ۱۳۸۸ء)

خاندان تغلق میں دو بادشاہ محمد تغلق اور فیروز شاہ قابلِ ذکر ہیں، ضیاء الدین برنی کا خاندان خلجی وغیرہ دورہ میں اچھے اچھے عہدوں پر مامور تھا، برنی اگرچہ محمد تغلق کا درباری تھا۔ مگر اس کی طرف سلطان کی توجہ کم تھی، اس لئے وہ سلطان سے کبیدہ خاطر رہتا۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس نے محمد تغلق کے حالات اس پیرایہ میں لکھے ہیں، کہ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو خللِ دماغ کا عارضہ تھا، اس میں کچھ شک نہیں کہ محمد تغلق بلا کا ذہین تھا جو کچھ اس کے دماغ میں کوئی مفید تصور آتا اُسے عمل میں لانے کی کوشش کرتا۔ مگر یہ نہ سمجھ سکا، کہ آیا زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات کے مناسب بھی ہیں، جو شخص ان حالات کے تقاضہ کو نہیں سمجھ نہیں سکتا، خواہ اس کا تصور کتنا ہی بلند پایہ ہو، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آنحضرتؐ اور خلفاء راشدین کی کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ ارتقاء انسانی کا ممکن عالی مقام قرآن میں پیش کرتے ہوئے اصلاح اسی حد تک کی، جس کی اجازت ان کے اپنے زمانہ کے ذہنی اور خارجی حالات نے دی، بقول ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) جو مصلحان یہ چاہتے ہیں کہ ان کی اپنی زندگی میں اصلاح کی تکمیل ہو وہ ایک معاشری اصلاح کی جگہ سو معاشری خرابیاں پیدا کر دیتے ہیں، اصلاح بتدریج اور اعتدال کے ساتھ ہونی چاہئیے،

محمد تغلق نے کاغذی سکہ چلانا چاہا۔ جو آج ہمارے زمانہ میں جاری ہے۔ اور معاشرت کے کاروبار میں سہولیت پیدا کر رہی ہے، مگر کامیاب نہ ہوا، جب اس وسیع سلطنت پر نظر کی جو پشاور سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی، تو ہندوستان کے وسط میں دارالحکومت کی تلاش کی، دیوگڑھی جس کا نام دولت آباد رکھا دہلی اُجاڑ کر آباد نہ ہو سکی، ملک کے طول و عرض میں بغاوت نے نظامِ سلطنت درہم برہم کر دیا، ہر ایک صوبہ خود مختار تھا، دکن میں سلطنت بہمنیہ کی بنیاد پڑ گئی، فرشتہ نے لکھا ہے، کہ تبت اور چین کی تسخیر کا ارادہ رکھتا تھا، اصل واقعہ یہ ہے کہ اس پہاڑی سلسلہ میں جو کوہ ہمالیہ ہی کا ہے اور پنجاب اور ہندوستان کے شمال اور شمال غرب میں واقع ہے۔ بہت پہاڑی راجے تھے نہیں مطیع

کرنے کے لئے لشکر روانہ کیا، کانگڑہ مسخر تو ہوا، مگر فوج واپسی پر تباہ ہو گئی، ضیاء الدین برنی اور ابن بطوطہ سیاح جو محمد تغلق کے عہد میں آیا تھا، لکھتے ہیں کہ دھلی سے دس منزل پر ایک پہاڑی راجے کے خلاف مہم بھیجی گئی تھی،

محمد تغلق سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوت کی آگ بجھانے میں مصروف ہوا، ملک ساہو ملتان کا حاکم لودھی تھا، علم بغاوت بلند کیا جب سنا کہ سلطان اس کی سرکوبی کے لئے آ رہا ہے تو بھاگ کر سندھ میں پناہ لی، سلطان بھی تعاقب میں تھا۔ ٹھٹھہ پہنچا تو بیمار ہو گیا، اور ۱۳۵۲ء میں فوت ہو گیا، بدایونی اپنی منتخب التواریخ میں لکھتا ہے کہ

"خلق خدا نے اس سے اور خلق سے اس نے چھٹکارا پایا، بدایونی اکبر کا معصر تھا۔"

سلطان غیاث الدین کا چھوٹا بھائی سپہ سالار رجب اس وقت دریائے سندھ پر فوج کے ساتھ پڑا تھا، جب محمد تغلق کی وفات کی خبر سنی، اپنے صغر سن بیٹے فیروز شاہ کو جانشین نامزد کیا، فیروز شاہ کی ماں راجپوت عورت "نن ل" بھٹ حاکم ابوھر کی لڑکی تھی، غیاث الدین تغلق کی والدہ بھی ہندو تھی، اس وقت فیروز شاہ کی عمر چھ سال تھی، سینتیس ۳۷ سال حکومت اس نے کی، جنوبی ہند کے ممالک ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ مدانہ کی۔ البتہ شمالی ہند پر قبضہ بحال رکھا، اس نے سمجھ لیا تھا کہ اتنے بڑے ملک پر یا بر صغیر پر شخصی حکومت ان کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی، اس کی زیادہ تر توجہ رعایا کی خوشحالی اور تعمیری کاموں پر صرف ہوئی، پنجاب میں فیروز پور اور حصار فیروزہ جو مخفف ہو کر "حصار" رہ گیا، اسی کی یادگار ہے، دھلی کے قریب فیروز آباد بسایا، بنارس کے شمال مغرب میں "جون پور" محمد تغلق کا نام زندہ رکھنے کے لئے آباد کیا،

برنی لکھتا ہے کہ پچاس بند دریاؤں پر باندھے تاکہ زراعت کے لئے آبپاشی کے وسائل کی کمی نہ رہے، تیس مدرسے اور ان کے ملحق مساجد تعمیر کیں، سو کارواں سرائے اور دو سو قصبات، سو ہسپتال، پانچ عجائب خانے، دو سو حمام اور ایک سو پچاس پل بنائے غرض وہ کام کیا کہ شاہجہان کو بھی نصیب نہ ہوا، ابھی تک اس کی یادگار وہ نہریں

جو ہانسی اور حصار تک خشک اراضی کو سیراب کرتی ہے، دھلی کو اس نے بارونق دی، بارہ ہزار باغات دھلی کے قرب وجوار میں تھے، اس نے "توزک" بھی لکھی جس کا نام "فتوحات فیروز شاہی" ہے، اس کی خاص توجہ اشاعت اسلام کی طرف بھی تھی، سنسکرت سے بعض کتابوں کا ترجمہ بھی اسی کے عہد میں ہوا، جوالا مکھی کانگڑہ سے ایک کتاب ہاتھ آئی، اس کا ترجمہ "دلائل فیروز شاہی" ہے شمس السراج عفیف اور ضیاء برنی کی تاریخ اسی کے عہد میں لکھی گئی۔

خان جہان ایک ہندو نو مسلم اس کا وزیر دست راست تھا، ۱۳۷۰ء میں فوت ہوا۔ تو فیروز شاہ کو سخت صدمہ ہوا، تین سال بعد اس کا بڑا لڑکا فتح خان بھی فوت ہوا۔ جہان خان کے بیٹے کو وزارت دی، وہ بھی ایک سازش کا شکار ہوا، فیروز شاہ دل دنیا سے سرد ہو چکا تھا، عمر بھی تہتر سال تھی، اپنے بیٹے ناصر الدین محمد کے حق میں تخت وتاج سے دست بردار ہو کر گوشہ عبادت میں بیٹھ گیا، شہزادہ نالائق ثابت ہوا۔ پھر خلوت خانہ سے باہر آنا پڑا، اپنے پوتے کو مدار المہام مقرر کیا اور نوے سال کی عمر میں یہ نیک نہاد بادشاہ رحلت کر گیا، جانشین ایسے ہوئے کہ تغلق خاندان کو ختم کر کے رہے۔

امیر تیمور لنگ جس کے حالات ہم لکھ چکے ہیں، اپنی "توزک" میں لکھتا ہے۔

"مجھے ہندوستان پر حملہ کی جرأت اس لئے ہوئی کہ تغلق حکومت روبزوال تھی"

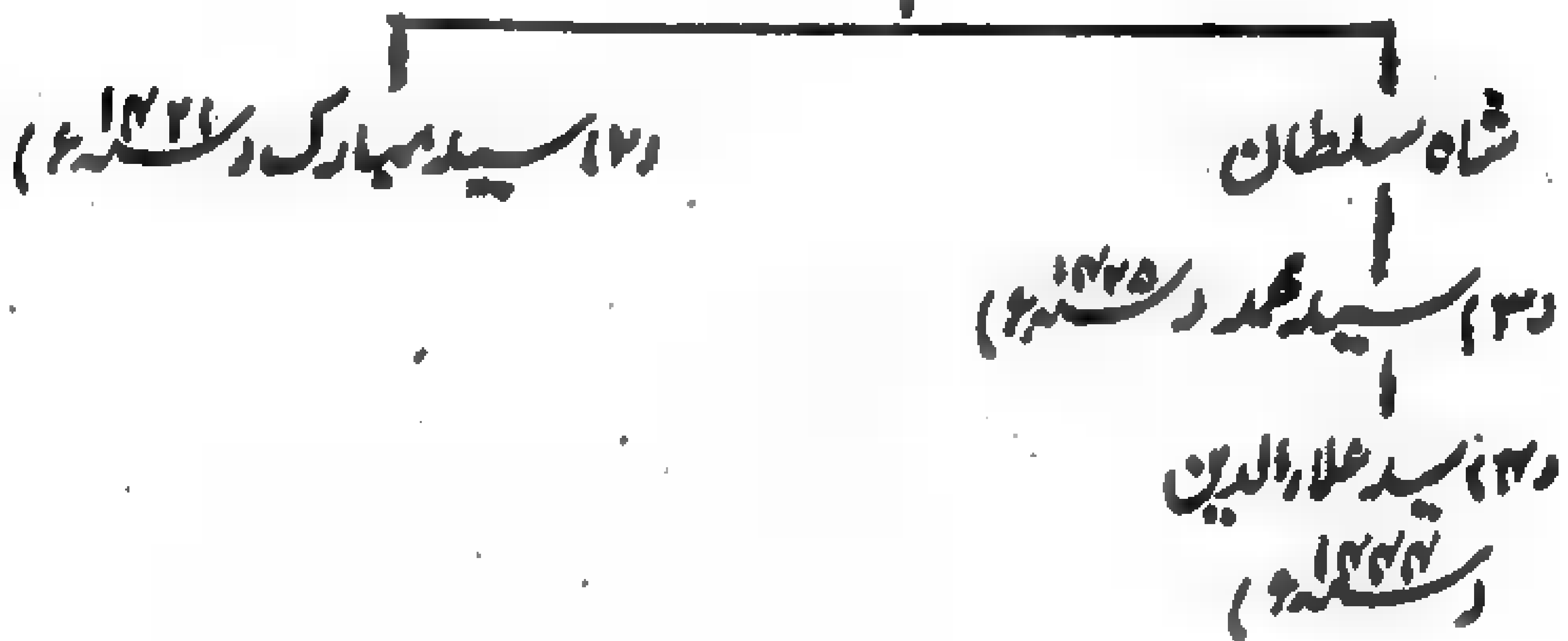
ایک لاکھ بیس ہزار سوار و پیدل کی جمعیت کے ساتھ دھلی پر بڑھا، ہراول اس کے پوتے پیر محمد کے تحت وادی سندھ میں لوٹ گھسوٹ کے بعد دریا کو عبور کر کے ٹھٹھہ اور ملتان میں آیا۔ تیمور بھی اس سے بانوے ہزار سواروں کے ساتھ آملا، اور دھلی تک قتل وغارت کا بازار گرم رکھا، جس کی وجہ سے مغربی مؤرخین اسے "الوحش" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ محمود تغلق اور اس کے وزیر اقبال خان نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی اور تیمور شہر میں داخل ہوا، اور پانچ روز قتل وغارت جاری رکھی، دو ہفتہ دھلی میں مقیم رہ کر میرٹھ اور ہردوار کی طرف گیا، کانگڑہ اور جموں کے راستہ ہندوستان سے نکل گیا۔

اپنے پیچھے بد نظمی، قحط، وبا، ویرانی کا منظر چھوڑ گیا، پانی پت کے میدان پر شکست کھا کر محمود تغلق گجرات کی طرف بھاگ گیا، تیمور کے جانے کے بعد پھر واپس آیا، اور سنہ ۱۴۱۲ء میں فوت ہوا، اور تغلق خاندان ختم ہوا،

خاندان سادات سید خضر خان پنجاب میں تیمور کا نائب السلطنت تھا فوج لے کر دہلی میں داخل ہوا اور خاندان سادات کی بنیاد ڈالی،

شجرہ نسب خاندان سادات

(۱) سید خضر خان (سنہ ۱۴۱۲ء)



خاندان سادات کی حکومت برائے نام ہی تھی خطبہ اور سکہ تیمور کے نام جاری رکھا اور خود بطور نائب السلطنت دہلی اور اس کے قرب وجوار پر حکومت کرتے رہے کوئی قابل ذکر کام بھی نہ کیا، سید علاء الدین اپنی رضا و رغبت سے دستبردار ہو گیا اور بدایوں میں عمر کے بقیہ ایام امن سے بسر کئے۔

خاندان لودھی بہلول خان اس وقت سرہند میں تیمور کا نائب السلطنت تھا دھلی پر قابض ہوگیا۔ بہلول لودھی کے آباؤ اجداد تجارت پیشہ تھے۔ ان میں سے بعض سلاطین دھلی کی ملازمت میں بھی رہے،

(۱) سلطان بہلول خان (۱۴۵۰ء)

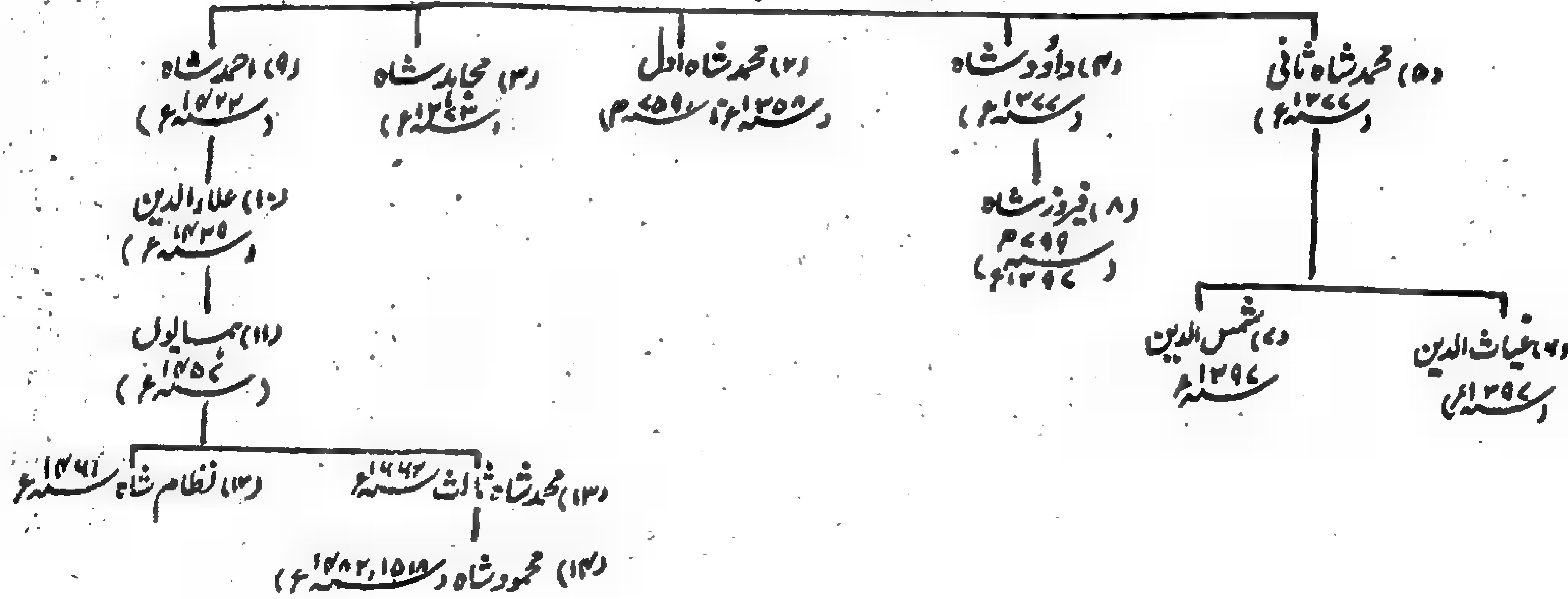
(۲) نظام خان سلطان سکندر غازی (۱۴۸۹ء)

(۳) ابراہیم لودھی (۱۵۱۷ء تا ۱۵۲۶ء)

بہلول اور اس کے جانشین صرف اتنا ہی کام کرسکے، کہ نظام سلطنت جو درہم برہم ہوچکا تھا، درست کیا، اور خود مختار صوبہ داروں کو پھر سے اطاعت پر مجبور کیا آخری تاجدار ابراہیم لودھی پانی پت کے میدان میں ظہیر الدین بابر بادشاہ کے مقابلہ میں مارا گیا، اور سلطنت ہند بابر کی اولاد میں آگئی،

سلاطین دکن اس وقت ہندوستان کا نقشہ یہ تھا کہ ولایت سندھ اور ملتان اور جون پور اور بنگالہ اور گجرات اور مالوہ اور اڑیسہ میں خود مختار سلطنتیں قائم ہوچکی تھیں، فرشتہ اور دیگر مورخین نے ان ممالک کے سلاطین کے حالات مفصل لکھے ہیں، شاہان مغلیہ نے ان کو رفتہ رفتہ زیر کرلیا، ان میں سے قابل ذکر دکن کی بہمنی سلطنت اور وہ حکومتیں ہیں جو اس کی حریف ہیں،

اس خاندان کا دار السلطنت ابتدا میں "گل برگہ" تھا۔ سلطان احمد شاہ نے "بیدر" مقرر کیا، خاندان بہمنیہ کے سلاطین کی لڑائیاں اکثر "وجیا نگر" کے راجوں سے رہیں، ان کا مورث اعلیٰ "ہری ہر" دیوگری کے راجوں کے خاندان سے تھا


(۱) علاؤالدین حسن شاہ گنگو بہمنی (سنہ ۱۳۴۷ء، سنہ ۱۳۵۸ء)
(۲) محمد شاہ اول (سنہ ۱۳۵۸ء، ۷۵۹ھ)
(۳) مجاہد شاہ (سنہ ۱۳۷۵ء)
(۴) داؤد شاہ (سنہ ۱۳۷۷ء)
(۵) محمد شاہ ثانی (سنہ ۱۳۷۷ء)
(۶) غیاث الدین (سنہ ۱۳۹۷ء)
(۷) شمس الدین سنہ ۱۳۹۷ء
(۸) فیروز شاہ (سنہ ۷۹۹ھ ۱۳۹۷ء)
(۹) احمد شاہ (سنہ ۱۴۲۲ء)
(۱۰) علاؤالدین (سنہ ۱۴۳۵ء)
(۱۱) ہمایوں (سنہ ۱۴۵۷ء)
(۱۲) نظام شاہ سنہ ۱۴۶۱ء
(۱۳) محمد شاہ ثالث سنہ ۱۴۶۳ء
(۱۴) محمود شاہ (سنہ ۱۴۸۲ء، ۱۵۱۸ء)

خاندان بہمنی کے زوال پر پانچ سلطنتیں دکن میں قائم ہوگئیں۔

(۱) عادل شاہیہ۔ اس کی بنیاد عادل شاہ نے ۱۴۸۹ء میں ڈالی، پایہ تخت بیجا پور تھا

(۲) نظام شاہیہ، بانی ملک احمد ہے، پایہ تخت احمد نگر تھا،

(۳) قطب شاہیہ، قطب الملک نے ۱۵۱۲ء میں بنیاد رکھی، دارالسلطنت گولکنڈہ

(۴) عماد شاہیہ، "برار کے صوبہ میں قائم ہوئی، ۱۵۷۴ء میں نظام شاہیہ میں مدغم ہوگئی۔

(۵) بریدشاہیہ، دارالسلطنت "بیدر" تھا،

ان خاندانوں میں اکثر خانہ جنگی رہتی۔ وجیانگر کے راجہ "رام رائے" کو مداخلت کا موقع ملتا رہا۔ بلکہ یہ بے غیرت اس کو خود ہی امداد کے لئے بلاتے رہے، ۱۵۴۳ء میں رام رائے اور شاہان احمد نگر اور گولکنڈہ کی متحدہ فوجوں نے بیجا پور پر حملہ کر دیا، پندرہ سال بعد والئی بیجاپور نے اس کے ساتھ سازباز کی، اور احمد نگر پر حملہ کر دیا، نظام شاہی سلطنت میں وہ تباہی مچائی کہ فرشتہ لکھتا ہے کہ

"وجیانگر کے کفار کی بن آئی، وہ ظلم وستم ڈھایا کہ مسلمان عورتوں کو بے حرمت کیا، مسجدیں ڈھادیں، اور قرآن مجید کو پاؤں تلے روندا۔"

اس واقعہ نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگادی، سب نے خیال کیا کہ خانگی جھگڑوں کو چھوڑ کر متحد ہوں، شاہان بیجاپور اور گولکنڈہ اور احمد نگر اور بیدر کی متحدہ افواج بسرکردگی شاہ بیجاپور ۱۵۶۵ء میں "تلی کوٹ" پر جمع ہوئیں، یہ ایک چھوٹا سا قصبہ دریا "کشنا" کے شمال اور بریدشاہیہ کی حدود میں واقع تھا، راجہ بھی لاؤ لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے آگیا، فریقین کو معلوم تھا کہ یہ فیصلہ کن جنگ ہے، اور ان میں سے ایک فریق کی مکمل تباہی لازمی ہے، رام رائے نے ہر طرف سے فوج جمع کی، غالباً کسی ہندو راجہ اتنی بڑی جمعیت کسی میدان میں اب تک نہ لایا تھا، مسلمان تعداد میں بہت کم تھے، پہلے ہی حملہ میں اسلامی فوج کا ایک بازو ٹوٹ گیا، حسین نظام شاہ توپ خانہ کے ساتھ قلب لشکر میں تھا، توپوں میں تانبے کے پیسے گولیوں کا کام دے رہے تھے۔

۔۔وہ آگ برسائی کہ نہ صرف حریف کی پیش قدمی رُک گئی۔ بلکہ اکثر مارے گئے اور
امیں ابتری پھیل گئی، بیجاپور کے فوجی افسر کشور خاں نے وجیانگریوں کے دائیں اور
ئیں حملہ کردیا، ان کے پاؤں اُکھڑ گئے، رام رائے مارا گیا۔ اندازہ مقتولین ایک
لکھ ہے،

"تلی کوٹ" کا معرکہ تاریخ ہند میں ایسا ہی مشہور ہے جیسے تھانیسر اور پانی پت
لڑائیاں، ریاست وجیانگر تو فتح مند شاہان دکن نے آپس میں تقسیم کرلی، لیکن اب
ب کہ کوئی مقابل نہ رہا، انسانی طینت کے تقاضہ سے مجبور ہوکر آپس میں لڑنے لگے۔

"درعالم اضداد چہ اندیشۂ صلح ہست   باخود نتواں ساخت اگر جنگ نکردے"

تاریخ اس واقعہ کو ہمیشہ دھراتی رہتی ہے، جسے امن وسکون کہتے ہیں وہ اس دنیا
ی نہیں، یہ مقام جد وجہد ہے، اور ہر ایک آرام طلب سکون پسند شخص ہو یا قوم دیر سویر
ٹ جاتی ہے، زندگی "جہاد" ہے،

"اگر خواہی حیات اندر خطر زی   حیاتِ جاوداں اندر ستیز است"

انسان کی بہت بڑی بھول یہ ہے کہ وہ اپنے ہی ہم جنس کے درپے آزار رہتا ہے
س کے دشمن بہت ہیں، اگر اس کا علم ہو تو کائنات مسخر کرلے، آخر ذہنی ارتقاء ایکدن یہ
حقیقت واضح کردے گا،

ریاست وجیانگر تو ختم ہوگئی لیکن ہندو ؤں نے "نجوز"، "دلوز" اور "ندورا" اور دیگر
مقامات پر چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں، یہ در اصل جاگیردار ہی تھے، لیکن نیم خود مختاری
کی وجہ سے راجہ اور رائے کہلائے، وجیانگر کے راجوں کی اولاد میں سے ایک راجہ نے
انگریزوں کو وہ قطعہ زمین دیا جہاں اب شہر مدراس آباد ہے،

دکن کی ریاستوں اور گجرات وغیرہ کا تذکرہ ہم مغلیہ شہنشاہیت کے ضمن میں
بیان کریں گے،

شجرۂ نسب خاندانِ مغلیہ

تیمور

محمد میران شاہ

سلطان ابو سعید

مرزا عمر شیخ

(۱) ظہیر الدین بابر بادشاہ (۹۳۲ھ)

مرزا کامران — (۲) ہمایوں (۹۳۷ھ) — مرزا ہندال — مرزا عسکری

مرزا محمد حکیم

(۳) جلال الدین اکبر (۹۶۳ھ)

(۴) سلیم نور الدین جہانگیر (۱۰۱۴ھ)

(۵) شہاب الدین شاہجہاں (۱۰۳۷ھ)

دارا شکوہ

دارا شکوہ — (۶) محی الدین اورنگ زیب سنہ ۱۰۶۹ھ — شاہ شجاع — مراد بخش

(۶) محی الدین اورنگ زیب:
- (۷) محمد اعظم (سنہ ۱۱۱۸ھ)
- محمد اکبر
- (۸) معظم شاہ عالم بہادر شاہ (سنہ ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء)
- محمد سلطان
- کام بخش

(۸) معظم شاہ عالم بہادر شاہ:
- عظیم خان
  - (۱۰) فرخ سیر (سنہ ۱۱۲۵ھ)
- (۹) معز الدین محمد جہاندار شاہ (سنہ ۱۱۲۴ھ)
  - (۱۰) عزیز الدین عالمگیر ثانی سنہ ۱۱۶۷ھ
    - عالی گوہر شاہ عالم ثانی سنہ ۱۱۷۳ھ
      - محمد اکبر ثانی سنہ ۱۲۲۱ھ
        - سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر سنہ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۵۷ء
- رفیع الشان
  - (۱۱) رفیع الدرجات سنہ ۱۱۳۱ھ
  - (۱۲) رفیع الدولہ سنہ ۱۱۳۱ھ
- خجستہ اختر
  - (۱۳) محمد شاہ رنگیلہ روشن اختر سنہ ۱۱۳۱ھ
    - (۱۴) مجاہد الدین ابو النصر احمد شاہ سنہ ۱۱۶۱ھ

مغلیہ سلطنت کا بانی ظہیر الدین بابر بادشاہ ہے۔ اپنے آبائی ملک میں تو اُسے چین نہ ملا ہندوستان میں طوائف الملوکی تھی، مستقل مزاج اور بلند ہمت اور دلیر سپاہی تھا، قسمت نے جب "فرغانہ" میں یاوری نہ کی، تو ہندوستان میں یاور ہوئی، دہلی کے تخت پر سلطان ابراہیم حسین سکندر لودھی تھا، ایک لاکھ کی جمعیت سے پانی پت کے میدان میں مقابلہ کیا مگر شکست کھائی، اگرچہ بابر کے ساتھ قلیل فوج تھی، مگر توپ خانے نے جس سے ہندوستانی بادشاہ اور راجے ابھی تک ناواقف تھے، اور بندوقوں نے ابراہیم کے فیل اور گھوڑوں کو خوف زدہ کر دیا اور لشکر میں سراسیمگی پیدا ہو گئی،

پانی پت کی لڑائی کے بعد بابر دہلی اور آگرہ پر قابض ہو گیا، ہندو راجپوت راجے یہ سمجھتے تھے کہ بابر تیمور ہی کا بیٹا ہے، جس طرح وہ آندھی آئی اور مطلع صاف ہو گیا، بابر بھی کچھ لوٹ گھسوٹ کے بعد چلتا بنے گا، مگر بابر تو گھر سے نکلا ہوا تھا جب دیکھا کہ وہ قدم جما کر بیٹھ گیا ہے، تو اس کے نکالنے کی تدابیر کرنے لگے، جودھپور کا راجہ سنگرام سنگھ جو رانا سانگا کے نام سے مشہور ہے، بہادر سپاہی تھا اس کی تمام عمر لڑتے بھڑتے ہی گزری،

کہتے ہیں کہ اس کے جسم پر اسی زخموں کے نشان تھے، ایک آنکھ بھی جاتی رہی۔ اور ایک ٹانگ بھی بے کار تھی، اس نے راجپوتوں کو ہر طرف سے اکٹھا کیا، اور یہ ٹڈی دل آگرہ کی طرف تیزی سے بڑھا، آگرہ سے تیس میل کے فاصلہ پر بابر اپنی قلیل فوج کے ساتھ "کنواہہ" پر استقبال کے لئے سامنے آیا، راجپوتوں کا لاؤ لشکر دیکھ کر سرداروں نے بابر کو یہ مشورہ دیا کہ مناسب ہے کہ یہاں سے ہٹ جائیں، اور اگلے سال مناسب تیاری کے بعد جنگ کریں،

بابر اپنی توزک میں لکھتا ہے۔ کہ

"میں نے امیروں کو سمجھایا کہ بادشاہت اس طرح کم ہمتی سے نہیں ملتی۔ اور اتنا تو سوچو کہ اگر ہم یہاں سے پیچھے ہٹے تو دشمن کب مہلت دے گا کہ ہم کابل تک پہنچیں، جو کہ کئی کوسوں دور ہے اگر یہ معرکہ جیت لیا تو ہندوستان

ہمارا، ورنہ میدان جنگ میں مر کر شہادت کا درجہ ملے گا"!

بابر نے شراب نوشی سے توبہ کی، اور فرش خاک پر سجدہ کرتے ہوئے دعائے فتح و نصرت مانگی۔ راجپوت جی توڑ کر لڑے، لیکن یہاں بھی توپوں اور بندوقوں کی شلک سے ہاتھی اور گھوڑے بدکے اور اپنے ہی لشکر کو روند ڈالا، اس پر بھی بہادر رانا سانگا ڈٹا رہا۔ جب دیکھا کہ سپاہ دل ہار چکی ہے، اور بری طرح بھاگ رہی ہے تو چند سپاہیوں کے ساتھ میدان حریف کے ہاتھ میں دے کر جان بچائی لاکھوں پائے،

بابر نے پھر ایک دفعہ فرش لالہ زار پر سجدہ تشکر ادا کیا، اور کہا کہ اے خالق ارض و سما اگر تو حافظ و ناصر نہ ہوتا، تو یہ عظیم الشان فتح نصیب نہ ہوتی "کنواہہ" کا نام فتح پور سیکری رکھا۔ اس کے بعد چندیری اور چمپانیر کے مضبوط قلعے بھی سر کئے، اور بہار پر افغانوں کو شکست دے کر بنگالہ پر بھی تسلط جما لیا، بابر نے دار السلطنت کابل ہی رکھا ۱۵۳۰ء میں وفات پائی نعش ہندوستان سے کابل میں لے گئے اور وہاں دفن ہوا،

ہمایوں بابر کا سب سے بڑا بیٹا وارث تخت ہند ہوا۔ باپ کی وصیت کے مطابق بھائیوں کو مختلف علاقوں کی حکومت دے دی، کامران کو کابل اور قندھار اور پنجاب اور عسکری کو میوات اور ہندال سنبھل جسے روہیل کھنڈ بھی کہتے ہیں ملا روہ "کابل کا پرانا نام ہے روہیل کھنڈ میں پٹھان آباد ہوئے تو آبائی وطن کی یاد میں اس نام سے یاد کیا، یہ سب برادران یوسف ثابت ہوئے،

بابر کی وفات کے بعد پھر عام بغاوت نے ہمایوں کو ادھر متوجہ کیا، ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد لودھی سردار گجرات اور مالوہ میں پناہ گزین ہوئے یہاں بہادر شاہ حکمران تھا، اس نے ان کی خوب آؤ بھگت کی، اور مغلوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے ایک لشکر جرار تیار کیا،

سلاطین گجرات

گجرات کی ولایت میں ایک خاص بات یہ ہے کہ علاوہ اس کے کہ یہاں کی زمین سرسبز اور آب و ہوا معتدل ہے کئی بندرگاہیں ہیں جن میں "دیو" اور "بھروچ" "اور کھمبے" اور "چول" مشہور ہیں۔ اس لئے گجرات کا تجارتی تعلق

ایران اور عرب اور مصر سے ہمیشہ رہا ہے۔ ایسی متمول ولایت پر شاہان دہلی کی نظر التفات ہمیشہ رہی، اس کے شمال میں اردلی کا پہاڑی سلسلہ بندھیاچل سے جاملتا ہے۔ اس لئے شمالی جانب سے یہ محفوظ مقام ہے، علاءالدین خلجی نے اسے پہلی دفعہ سلطنت دہلی میں شامل کیا، اس کے بعد یہ دہلی کے بادشاہوں کے تحت ہی رہا، اور دہلی ہی سے نائب السلطنت مقرر ہوتے رہے، آخر ایک نومسلم راجپوت ظفرخاں نے یہاں خودمختار حکومت قائم کی جو مظفرشاہ اول کے لقب سے مشہور ہوئی۔

سلاطین گجرات

(۱) ظفرخان مظفرشاہ (سنہ ۸۰۶ھ / ۱۴۰۱ء)

تاتارخان

(۲) احمد شاہ (سنہ ۸۱۳ھ / ۱۴۱۱ء)

(۳) محمد سنہ ۸۴۶ھ

(۴) قطب الدین (سنہ ۸۵۵ھ)

(۵) سلطان محمود بیکرہ (سنہ ۸۶۳ھ / ۱۴۵۹ء)

(۶) احمد مظفرشاہ ثانی سنہ ۱۵۱۱ء

(۷) بہادرشاہ

(۸) محمود شاہ ثانی

اس خاندان میں احمد شاہ اور اس کا پوتا سلطان محمود بیگرہ بہت نامور بادشاہ گذرے ہیں۔ احمد شاہ نے ہندو راجاؤں سے کاٹھیاواڑ لے لیا، ان کے مشہور اور مضبوط قلعے جوناگڈھ (گرنار) اور ناگور پر قبضہ کے بعد تمام جزیرہ نما کو سلطنت گجرات میں شامل کر لیا۔ اسی نے احمد آباد بسایا، جو گجرات کا دارالسلطنت ہو گیا، سلطان محمود شاہ کو راجپوت راجوں سے لڑنا پڑا، اور گرنار اور چمپانیر اور مدگڑھ فتح کر کے مستقل سلطنت گجرات میں شامل کر لئے۔ اس لئے وہ "بی گڑھا" کے لقب سے مشہور رہے، یعنی دو قلعوں والا، اس کی شہرت دنیائے اسلام میں بھی پھیل گئی، شاہ اسمٰعیل صفوی جو اس وقت ایران کا کج کلاہ تھا اس نے اپنا ایلچی تحائف کے ساتھ بھیجا، ترکی سلطان سلیم نے پرتگیزوں کے خلاف مدد کی درخواست کی، ان کے تجارتی اور قزاقی جہاز بحیرہ روم اور بحیرہ عرب میں پھر رہے تھے، قلعہ "دیو" پر اُن کا قبضہ ہو گیا، تو یہاں ۱۵۰۹ء میں سلطان محمود کے آخری ایام میں ایک "فیکٹری" یعنی تجارتی کوٹھی قائم کر لی،

محمود کے بعد اس کا بیٹا مظفر شاہ ثانی تخت نشین ہوا، رانا سانگا میواڑ کے راجہ نے مالوہ کے راجہ کو شکست دی، اور دارالسلطنت "منڈو" پر قبضہ کر لیا اس کے بعد گجرات کا رخ کیا، رانا راجپوتانہ کی متحدہ فوج کا سردار تھا، مظفر شاہ کب تک لڑتا، مگر اس نے ہمت نہ ہاری، تائید غیبی سے رانا سانگا کی توجہ بابر کی طرف لگ گئی،

شیخ بیجو

مظفر شاہ کا بیٹا بہادر شاہ گجرات پر حکومت کرتا تھا، ہمایوں نے اس پہ فوج کشی کی، توپ خانہ اس کے فوجی افسر "رومی خان" کے تحت تھا، وہ ہمایوں سے مل گیا، بہادر شاہ نے بھاگ کر جان بچائی، ہمایوں نے حسب عادت معمولی قتل و غارت سے احمد آباد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، مال غنیمت میں اسیران جنگ میں مشہور ماہر فن موسیقی شیخ "بیجو باورا" بھی تھا، اور ایک "طوطا" جو شاہی محل میں تھا، ہمایوں کو لٹا ہندو راجوں نے بھی مدد دی تھی، ایک راجہ اردو ہمایونی سے گزر رہا تھا، شیخ بیجو کو پہچان لیا اور مغل سپاہی سے مطالبہ کیا کہ اسے چھوڑ دو۔ اس پر تنازعہ ہوا تو معاملہ ہمایوں کے گوش گذار ہوا، راجہ نے کہا کہ حضور اس شخص کا جواب آج تمام ہندوستان میں نہیں۔

ہمایوں کی فرمائش پر شیخ بیجو نے امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کی غزلیں سنائیں۔ تو ہمایوں بھی جھوم گیا، شیخ سے دریافت پر یہ انعام منظور کیا، کہ اس کے بھائی بند سپاہیوں کی قید میں ہیں۔ ان کو چھوڑ دیا جائے،

ہمایوں نے حکم دیا کہ شیخ جسے چاہے آزاد کرا سکتا ہے،

شیخ صاحب نے لشکر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر کاٹا۔ جو اسیر ملت اس کے اشارہ پر چھوڑ دیا جاتا، ہمایوں کے پاس شکایت ہوئی تو کہا کہ شیخ بیجو کی خاطر سب کو رہا کر دو۔

ہمایوں شیخ سے جدا ہونا نہ چاہتا تھا۔ مگر شیخ اس کی صحبت سے گھبراتا۔ شیر شاہ افغان کی شورش کی وجہ سے ہمایوں کو ادھر متوجہ ہونا پڑا، تو اسے موقعہ مل گیا۔ چپکے سے کھسک گیا، اور اپنے آقا ولی نعمت سے آملا، بہادر شاہ کہا کرتا کہ مجھے شیخ بیجو مل گیا سلطنت جانے کا غم نہیں،

طوطا بھی عجیب مخلوق تھا، ہمایوں کی مجلس میں امرا کے ساتھ رومی خان بھی بیٹھا ہوا تھا۔ کہ یک لخت طوطا بولا "پھٹے منہ رومی خان"۔ رومی خان زمین میں گڑ گیا، ہمایوں نے کہا کہ بے شعور جانور ہے۔ غالباً محل میں اس نے یہ فقرہ سن لیا، اگر کوئی آدمی یہ کہتا تو اس کی زبان کھینچ لیتا،

اکبر نے سلاطین گجرات کا خاتمہ کر دیا،

شجرہ نسب خاندان سوری

ابراہیم خاں

جمال خاں

(۱) فرید خاں الملقب بہ شیر شاہ سنہ ۹۴۸ھ

(۲) سلیم شاہ سنہ ۹۵۳ھ

(۳) فیروز شاہ سنہ ۹۶۱ھ

اس خاندان میں صرف ایک شیر شاہ قابل ذکر ہے اس کا دادا ہندوستان آیا۔ اور امراء کی خدمت میں رہا، باپ حاکم جون پور کے لشکر میں افسر تھا، چند گاؤں سہسرام اور خواص پور جاگیر میں ملے، جو شیر شاہ کو وراثت میں ملے بابر نے بھی جاگیر میں کچھ اضافہ کیا، یہ اولوالعزم اپنی طاقت بڑھاتا گیا، اور رفتہ رفتہ بہار اور بنگال پر متصرف ہو گیا، ہمایوں جس وقت گجرات میں قتل و غارت کا بازار گرم کر رہا تھا، شیر شاہ نے چنار اور بنارس پر حملہ کر دیا، ہمایونی لشکر چنار پر یلغار کرتا ہوا آ رہا تھا، شیر شاہ میں مقابلہ کی تاب نہ تھی، بھاگ کر بنگال کے میدانوں میں پہنچ گیا، ہمایوں بھی تعاقب میں تھا،

بنگال میں برسات کثرت سے ہوتی ہے، اس لئے موسمی بخار بھی عام ہے شاہی لشکر اس میں مبتلا ہو گیا، اس نے موقعہ کو غنیمت سمجھ کر فوراً حملہ کر دیا، بکسر کے قریب "چولسہ" کے میدان میں خونریز جنگ ہوئی، شاہی فوج نے راہِ فرار اختیار کی، پٹھان تعاقب میں تھے،

ہمایوں نے گھوڑا دریا میں ڈال دیا، گھوڑا ران کے نیچے سے نکل گیا، نظام سقہ مشک دبائے
تیرتا آرہا تھا، اس نے تھام کر کنارے لگایا،

آگرہ میں خوار و خستہ پہنچا، بھائی کامران اور عسکری اور ہندال موجود تھے آڑے
وقت کام نہ آئے، خود مختاری کے منصوبے باندھ رہے تھے، شاید دست و گریبان ہو
مگر بیگمات نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرا دی، یہاں ہمایوں نے ایک لاکھ فوج جمع کی، "قنوج" کے
قریب شیر شاہ سے مقابلہ ہوا، مگر شکست فاش کھائی، ہمایوں بھاگا، راجپوتانہ کی خاک چھا
ہوا امرکوٹ پہنچا، یہاں وہ لڑکا پیدا ہوا جو بعد میں اکبر اعظم ہوا، آخر ایران کی حدود میں داخل
ہوگیا، اس وقت طہماسپ صفوی شاہ ایران تھا، احترام سے پیش آیا، اس کی مدد سے دوبارہ
ہندوستان پر قبضہ کیا، شیر شاہ فوت ہو چکا تھا، اس کے جانشین میں تاب مقاومت نہ

شیر شاہ نے صرف چھ سال حکومت کی، لیکن اس قلیل عرصہ میں رفاہ عام کے بہت کا
کئے، رعایا کی خوشحالی کا اسے بہت خیال تھا، اس کا نیک سلوک جہاں مسلمانوں سے تھا
ہندوؤں سے بھی ویسا ہی تھا، اسی کا مشیر مال ٹوڈرمل تھا، جو بعد میں دربار اکبری کا ایک
رتن ہوا، سڑکیں اور سرائیں ملک کے طول و عرض میں تعمیر کیں، ان میں وہ سڑک جو اب تک
موجود ہے اس کے دارالحکومت "گوڑ" واقع بنگال سے پشاور تک آئی ہے، افسوس ہے
کہ اس کا جانشین اس کے دل و دماغ کا نہ تھا، اس کے بیٹے سلیم شاہ کی وفات کے بعد اس
کے برادرزادہ ابراہیم نے تخت سنبھال لیا، یہ "اندھلی" کے نام سے مشہور ہے خوشامدیوں
نے "عدلی" بنا دیا، اس کی فوج کا سپہ سالار ہیموں بقال تھا، اور سیاہ و سفید کا مالک تھا،
سودی خاندان کے سردار ہر ایک تخت دہلی کا دعوے دار تھا، اور آپس میں لڑ رہے تھے
اور جہاں جو ملک یا اس کا حصہ آتا خود مختار ملک بن جاتا، ہمایوں نے انکو آسانی سے شکست
دے کر پنجاب اور دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا، ابھی فتح مکمل نہ ہوئی تھی کہ "از بام افتا
اور مر گیا،

ہمایوں کے لشکر میں اکثر ایرانی شیعہ تھے، ایک دن ایک سنی عالم نے خلوت میں ک
کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہر طرف یہی نظر آتے ہیں، ان کا اثر یہ ہے کہ اب سنی بھی اپنی اولا

کا نام علی اور حسن وحسین رکھتے ہیں، ہمایوں سخت برافروختہ ہوا اور کہا کہ میرے دادا کا نام "عمر" تھا، ہمایوں کی شکست کا موجب اس کے اپنے بھائی تھے۔ ایک دن شاہ طہماسپ کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا، شاہ کا بھائی طشت لئے ہاتھ دھلا رہا تھا، شاہ نے ہمایوں کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا کہ

دیکھو بھائی اس طرح اور اس مقام پر رکھنے چاہئیں"

خاندان مغلیہ میں چار نامور بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت آگرہ پہ بیٹھے، اکبر اعظم ہی دراصل اس خاندان کی شہنشاہیت کا بانی ہے، عدلی شاہ بنگالہ میں تھا، ہیموں کو لشکر جرار کے ساتھ آگرہ کی طرف روانہ کیا، اکبر کا لڑکپن تھا، اس کا وزیر اور سپہ سالار بیرم خاں اتالیق تھا، کابل سے آگرہ کی طرف آرہا تھا، کہ کلانور میں ہمایوں کی وفات کی خبر ملی، بیرم نے اسی جگہ اکبر کی جانشینی کا اعلان کر دیا، ادھر آگرہ سے مغل بھاگ کر کابل کی طرف جا رہے تھے۔ بیرم نے ان کو مدد کا اور آگرہ کی طرف بڑھا، ۱۵۵۲ء میں پانی پت کے میدان میں ہیموں سے مقابلہ ہو گیا، شکست کھائی اور مارا گیا، اس فتح سے بابر کا تمام مفتوحہ علاقہ اکبر کے قبضہ میں آگیا،

اکبری عہد کے حالات مجلدات ابوالفضل کے علاوہ عبدالقادر بدایونی کی تاریخ "منتخب التواریخ" میں مفصل بیان کئے گئے ہیں، ابوالفضل تو وزیر اعظم تھا، وہ اکبر کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے، اور عبدالقادر بدایونی اکبر کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی ہر ایک حرکت پر سخت نکتہ چینی کرتا ہے، اور ابوالفضل اور اس کا بڑا بھائی فیضی شیخ مبارک کے بیٹے تھے، شیخ مبارک خود غلام یا غلام زادہ تھا، لیکن اپنے زمانہ کے اکابر علماء کی صحبت کا فیض یافتہ تھا، فطرۃً ذہین تھا، اس لئے اس کا شمار اس زمانہ کے علماء میں ہوتا ہے، اسی کا شاگرد بدایونی ابوالفضل اور ابوالفیض فیضی کا ہم مکتب تھا، شیخ مبارک ذرا آزاد خیال واقع ہوا تھا، اور اس پر یہ بھی الزام تھا کہ فرقہ مہدویہ سے تعلق رکھتا ہے،

سید محمد المہدی جونپوری

ہم نے ان اوراق میں کئی مہدیوں کے حالات لکھے ہیں جو عرب اور ایران اور مصر میں ہوئے ہمارے ہندوستان

کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ اس لحاظ سے کسی سے پیچھے نہ رہے ۔

اس وقت دھلی خاندان تغلق رو بزوال تھا، دکن میں بہمنیہ کا ستارہ اوج پر تھا گجرات پر سلطان محمود بیگڑہ حکمران تھا، شمالی ہند میں طوائف الملوکی تھی، جون پور میں سید محمد کی ولادت ہوئی، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، سات سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا، بارہ سال کا تھا کہ درسیہ کتابیں بھی دیکھ لیں، بڑے بوڑھے اس کی ذہانت پر حیران تھے، شیخ دانیال کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور خاندان چشتیہ سے وابستہ اور مراتب سلوک طے کرنے کے بعد خود صاحب ارشاد ہو گیا، جوانی کا عالم اور زھد و تقویٰ، بزرگی اور تقدس کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا، حلقہ ارادت روز بروز وسیع تر ہوتا گیا، سلطان حسین والی داناپور ایک ہندو راجہ کی ریاست میں جاگیردار تھا سید کی خدمت میں بقصد عقیدت حاضر ہوا، اور کچھ ایسا گرویدہ ہوا کہ عرض کی کہ یا تو مجھے اجازت دیں کہ کاروبار سلطنت چھوڑ کر خدمت میں رہوں یا آپ میرے پاس رہیں، سید نے آخر الذکر استدعا منظور کی لیکن سید ایک جگہ جم کر نہ بیٹھا، قرب و جوار کے شہروں میں وعظ کا سلسلہ شروع ہو گیا،

یہ سمجھنا چاہیئے کہ سید جہاں جاتا وہاں مریدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی اور یہ سب کچھ دلیپ رائے کی حدود سلطنت میں ہو رہا تھا، مگر رائے کو یہ امر ناگوار گزرا اور اُسے خطرہ بھی محسوس ہوا، کہ اس کی ریاست کے نہ صرف مسلمان بلکہ ہندو بھی پروانہ وار سید کے گرد جمع ہوتے ہیں اور اکثر اسلام قبول کرتے ہیں، مگر اس لئے دم بخود تھا کہ اگر ذرا سختی کی تو ہمسایہ مسلمان ریاستیں کہیں دھاوا نہ بول دیں، لیکن زیادہ دیر تک خاموش بھی نہ رہ سکتا تھا، وہ سخت متعصب ہندو تھا، اور جب سنتا کہ اس کی ہندو رعایا میں سے آج فلاں خاندان مسلمان ہو گیا ہے تو سینہ پر سانپ لوٹ جاتا مناسب خیال کیا کہ سلطان حسین کو سمجھا دے کہ ایسی حرکت نازیبا ہے جس کا نتیجہ کسی وقت ریاست میں شورش ہو دلیپ رائے کو ڈر زیادہ تر "فوج بیراگیاں" کا تھا، جو سید نے تیار کر رکھی تھی، یہ لوگ ہر وقت ہتھیار بند بھی رہتے، سلطان کی طلبی ہوئی تو وہ سید کی خدمت میں آیا، سید اس وقت

حلقہ مریدان باصفا میں بیٹھا ہوا تھا، سلطان نے دلیپ رائے کا پیغام سنایا۔ تو سید جلال میں آگیا اور کہا

"کم بخت آج روئے زمین پر تجھ سے زیادہ محروم شخص کوئی نہ ہوگا تو حق کو چھوڑ کر باطل کا پرستار ہے مسلمان ہوتے ہوئے ایک کافر کا باجگذار ہے" سلطان لرز گیا، سید نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"چھوڑو اس مردود کو میں آج کافر دلیپ رائے کے خلاف اعلان جہاد کرتا ہوں"

اعلان جہاد ہوا۔ تو فوج بیراگیاں کے علاوہ جس خوش عقیدہ نے سنا، حاضر ہو گیا۔ چند روز میں ہزاروں جمع ہو گئے حسین کے پاس جو تھوڑی جمعیت تھی وہ بھی ملحق ہو گئی دلیپ رائے غافل نہ تھا، جب اس کو پرچہ لگا تو فوراً ان دیوانوں کی شوریدہ سری کے علاج کے لئے اٹھا، ادھر سید دلیپ رائے کی راج دھانی "گوڑ" کی طرف یلغار کرتا ہوا بڑھا سلطان حسین کے ہمرکاب تیس ہزار کی جمعیت تھی، مگر اکثر رضاکار ہی تھے، فوج بیراگیاں ایک ہزار عقب لشکر میں تھی، دونوں لشکروں کا تصادم ہوا۔ تو سلطانی فوج پسپا ہونے لگی، سلطان حسین کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں، سید کے قریب ہی سوار تھا، گھبرا کر سید کو متوجہ کرنا چاہتا تھا، اس وقت سید جمال اور جلال کی دلکش تصویر تھی۔ سلطان سے آنکھیں دوچار ہوئیں، سلطان زبان حال سے کہہ رہا تھا، کہ ابھی وقت ہے، آؤ کسی طرف نکل چلیں سید نے جب سلطانی سپاہ کو پسپا ہوتے دیکھا تو نعرۂ تکبیر اور فوج بیراگیاں کے ساتھ دلیپ رائے پر ٹوٹ پڑا، سلطانی فوج بھی سنبھل گئی، بیراگیاں کا حملہ اتنا پرزور تھا کہ قلب لشکر تک رائے کی فوج کی صفیں الٹ گئیں، خود سید دلیپ رائے کے پہلو میں تھا، دلیپ رائے تلوار کا وار کرنا چاہتا تھا، مگر کسی قوت نے ہوا میں ہاتھ تھام لیا سید نے شمشیر براں کا وہ ہاتھ دیا کہ سر پر پڑی تو سینہ تک کہیں دم نہ لیا بے سر فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جب سید نے دلیپ رائے کو خاک و خون میں غلطاں دیکھا، تو

دلیپ رائے کا دل باہر نکلا ہوا تھا، جس پر اس بُت کا نقش نمایاں تھا جس کی وہ پوجا کیا کرتا، بات اصل میں یہ ہے کہ دلیپ رائے کے سینہ پر اس بُت کا نقش تھا جب سید کی نظر اس پر پڑی تو ایک نعرہ مارا اور بیہوش ہوگیا، کہ بتوں کے پرستاروں کو اپنے ٹھاکروں سے اتنا والہانہ عشق ہو، تو اللہ تعالٰے کی خالص بلا شائبہ شرک عبادت کرنے والوں کو کیا کچھ نہ ہونا چاہیئے،

کہتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد سید عرصہ تک حالتِ جذب میں رہا، بارہ برس کا عرصہ اسی حالت میں گذر گیا، اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ سلوک کی کن منازل کو طے کرتا ہوا کس مقام عالی تک پہنچا، آخر اس نے عالمِ لاہوت سے ناسوت کی طرف نزول کیا پھر وہی وعظ اور وہی سفر تھا۔

سلطان حسین تو دلیپ رائے کی ریاست کا خود مختار شاہ اور سید کو اشاعت اسلام کی دھن تھی ہندوستان کے لوگ درویشوں کے بڑے گرویدہ ہوتے ہیں اور اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ ان ہی درویشوں نے اس ملک میں اسلام پھیلایا، ان میں سے خاندان چشتیہ کے اکابر خواجہ معین الدین اجمیری اور آپ کے خلفاء نے نمایاں کام کیا، خاندان چشتیہ میں سماع کا رواج ہے اور یہ بھی مزید کشش کا باعث تھا کیونکہ ہندوستانی راگ کے بہت دلدادہ ہیں،

دلیپ رائے کے خاندان نے بھی اسلام قبول کیا، ان میں سے ایک جس کا اسلامی نام میاں دلاورؔ تھا، سید کا رفیق سفر و حضر میں آخر دم تک رہا۔

سید اپنے عیال و اطفال اور چند مریدوں کے ساتھ اسلامی ریاستوں میں وعظ کرتا رہا، یہ سید کا پہلا سفر ہے، اسی سفر میں اس پر سلسلہ الہامات شروع ہوگیا، اور اس اسی سفر میں دعوئے مہدویت کیا، مریدوں نے بلا چوں و چرا تسلیم کیا، ہمارے ہندوستانی مہدی میں ایک خاص امتیازی خوبی ہے جو دیگر مدعیان مہدویت میں جو اس سے پیشتر گذرے نہیں پائی جاتی، اگر اسے ہوس سلطنت ہوتی تو وہ دلیپ رائے کی جگہ بادشاہ بسہولت ہوسکتا تھا، لیکن مدت العمر وہ درویش ہی رہا، سلاطین اس کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے،

شہر "منڈو" دارالسلطنت مالوہ میں سید کو امید سے بڑھ کر کامیابی ہوئی، سلطان غیاث الدین حلقۂ ارادت میں داخل ہوگیا۔ امراء سلطانی میں سے ایک شخص مسمّٰی "الہ داد" سید کا مرید ہوا، یہ بہت بڑا عالم تھا، اور اس کی وجہ سے سید کو ہر ایک جگہ بہت کامیابی ہوئی کہ جب اس پایہ کا عالم سید پر ایمان لائے تو عوام کو زیادہ سوچ بچار نہ کرنی چاہئیے یہ بھی سید کا رفیق ہمیشہ رہا، صاحب تصانیف بھی ہے۔ رسالہ "بار امانت" اور "ثبوت مہدویت" اسی کی تصنیف ہیں، "صاحب دیوان" بھی ہے، سید نے اب گجرات کی طرف توجہ کی، سلطان محمود "بیکرہ" اگر علماء مانع نہ آتے تو سید کا مرید ہو چکا تھا، اس جگہ ایک نوجوان طالب علم یہاں نظام الدین نامی مرید ہوا، ہر ایک سفر میں ہمراہ رہا، اس جگہ سید کی زوجہ کا انتقال ہوگیا، مہدوی اسے بی بی "آمنہ" کہتے، قلعہ کے قریب ہی مزار ہے، اب سید نے بعض ہمعصر اور ہمسر دکنی حکومتوں کا دورہ کیا، پایہ تخت احمد نگر میں احمد نظام شاہ "بحری" حلقۂ ارادت میں شامل ہوا، پھر سید پایۂ تخت بریدشاہیہ میں آیا، خود بانئ سلطنت ملک قاسم برید بصد عقیدت مرید ہوگیا، عوام الناس کے علاوہ علماء اسلام بھی حلقہ ارادت میں داخل ہوئے، یہاں سید نے حج کے ارادے سے خاک سیاہ ہند کو خیرباد کہا، حرم میں داخل ہوا۔ تو حدیث بروایت ام سلمہؓ یاد آئی، کہ مہدی کے ہاتھ پر "بین الرکن والمقام" لوگ بیعت کریں گے، اگرچہ یہ حدیث عبداللہ بن زبیرؓ کے حق میں سنہ ھ میں پوری ہو چکی تھی، مگر پیش گوئی کا مصداق ہر ایک مدعی مہدویت ہو سکتا ہے۔ رکن اور مقام کے درمیان سید نے کہا کہ

"من اتبعنی فھو مومن" جو بھی میرا اتباع کرے کا مومن ہے مریدوں نے بیعت کی

حج سے فارغ ہوا۔ تو احمد آباد گجرات میں اترا، علماء اسلام نے مخالفت کی سلطان محمد نے خارج از بلد کیا، قصبہ "بدلی" میں بھرے جلسہ میں اپنے جسم کی جلد کو دو انگلیوں سے پکڑ کر کہا، کہ

"جو شخص اس ذات کے دعوئے مہدویت کا منکر ہے کافر ہے"۔

یہاں بھی علماء فرمان سلطانی بلا رنا گہانی کی طرح لائے، شہر "ٹھٹھہ" دارالسلطنت سندھ

سے بھی نکلنا پڑا، خراسان کی طرف ہجرت کی، قندھار میں میرزا شاہ بیگ حاکم کے روبرو جامع مسجد میں علماء کا مناظرہ ہوا، علماء درشت کلامی سے پیش آئے، میں عجز و انکسار سے گفتگو کرتا رہا۔ اس کا اثر حاکم پر خاطر خواہ ہوا۔ عزت و احترام سے رخصت کیا، "فراہ" میں آیا، امیر ذوالنون حاکم شہر نے کل حالات مرزا حسین سلطان خراسان کی خدمت میں لکھے، جواب کا منتظر تھا، کہ سید کا انتقال ۹۱۱ھ تریسٹھ برس کی عمر میں ہوگیا، اور یہیں مدفون ہوا۔ دکن میں محمد المہدی کا کلمہ اب بھی پڑھا جاتا ہے۔

سید کی وفات کے بعد میاں عبداللہ نیازی جو شیخ سلیم چشتی کے خلفاء میں سے تھا حلقہ مہدویت میں داخل ہوگیا۔ اسی کی وساطت سے شیخ علائی جو شیوخ بنگالہ سے تھا ایک جوشیلا آدمی تھا، مہدوی ہوا، اس کے ذریعہ اس فرقہ کو بہت فروغ ہوا، سلیم شاہ کے دربار میں شیخ علائی کا مناظرہ علماء اسلام سے ہوا، ملا جلال دانشمند نے وہ حدیث پڑھی جس میں امام مہدی کا حلیہ مذکور ہے، اور لفظ "اَجلَیُّ الجبہتہ" بفتح جیم اور تشدید لام جو جلال سے مشتق اور جلیل کی تفضیل ہے پڑھا،

شیخ علائی نے کہا کہ تو نے لوگوں میں اپنے آپ کو علامہ مشہور کر رکھا ہے، عربی کا ایک فقرہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا، حدیث کے نکات خاک سمجھے گا، یہ لفظ "اجلی الجبہتہ" جلی کی تفضیل ہے، نہ کہ تیرے نام جلال کی" بے چارہ ملا تو اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اسی مجلس میں ابوالفضل اور فیضی کا باپ شیخ مبارک بھی موجود تھا، شیخ علائی کی تقریر کا اثر تو ضرور ہوا۔ گو یہ امر مشتبہ ہے کہ وہ مہدوی تھا کہ نہیں، مگر اس پر اکبر کے عہد میں علماء اسلام نے شبہ ضرور کیا،

اکبر کو دونوں بھائیوں ابوالفضل اور فیضی سے انتظام مملکت میں بہت مدد ملی مورخین کی یہ رائے کہ ابوالفضل نے اکبر کو گمراہ کیا تھا، قطعاً غلط ہے، ابوالفضل ایک ملا تھا، بساط سیاست پر وہ اکبر کا مہرہ تھا جس کو اکبر نے اپنے زمانہ کے ملاؤں کے مقابل کیا، اور مات دی، اکبر نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ خاندان سوری کے عہد میں یہ ملا اتنے خود سر ہوگئے تھے کہ اپنی دینی حکومت کی آڑ میں سلطنت اور سلاطین پر چھا

ہے، جب تک یہ حالت ہے، وہ برائے نام ہی بادشاہ رہے گا۔ ان دنوں شیخ عبدالنبی صدرالصدور آگرہ میں تھا، امام ابوحنیفہ کی اولاد سے تھا، اس لئے بھی اس کا احترام کرتا تھا، اکبر بقول بدایونی اس کی جوتیاں سیدھی کرتا۔

اکبر پہلے سیاسی چال چلا، کہ ایک مجلس مناظرہ منعقد کی۔ اور مختلف العقیدہ علماء کو دعوت دی، غرض یہ تھی کہ ہر ایک اختلافی مسئلہ پر علماء بحث و مباحثہ کے بعد جب اتفاق کریں گے۔ تو وہی تمام مملکت میں بطور قانون شریعت نافذ کر دیا جائے گا بدایونی لکھتا ہے کہ علماء کرام کی یہ حالت تھی کہ ہر ایک اپنا علم و فضل جتانے کے لئے اگر ایک کسی شئے کو حلال کہتا تو دوسرا حرام قرار دیتا، اور تائید روایات سے کرتا۔ کتب خانہ شاہی سے کتابیں بھی منگوائی جاتیں، آخر یہ حالت ہوئی کہ بحث کی گرمی میں لام و کاف تک نوبت پہنچ گئی۔ اور بادشاہ کی موجودگی کا کچھ پاس نہ رہا۔

ایک روز اکبر نے کہا کہ اگر خلاف آداب مجلس کسی نے کوئی نا ملائم فقرہ استعمال کیا تو نکال دیا جائے گا، بدایونی بھی قریب ہی بیٹھا تھا بی زبان سے کہا کہ پھر تو سب اسی لائق ہیں! بادشاہ نے سن تو لیا، مگر تجاہل عارفانہ سے کہا کہ کیا کہتا ہے بدایونی نے کہا، حضور نے صحیح فرمایا۔ اکبر نے بھی ان سنی بات کی، اس کا نتیجہ خاطر خواہ ہوا علماء لوگوں کی نظروں سے ایسے گرے کہ ان کا وقار اورنگ زیب کے عہد تک بھی نہ تھا، جو سوری خاندان کے دور دورہ میں رہا۔

اس وقت آگرہ میں شیخ عبدالنبی اور لاہور میں عبداللہ مخدوم الملک دینی حکومت کے مالک تھے، دونوں کو بیک وقت حکم ملا کہ حج کے لئے مکہ جاؤ، زادراہ کے علاوہ لاکھوں روپیہ اکبر نے وہاں کے مستحقین کے لئے بھیج دیا، حکم یہ تھا کہ جب تک دوسرا حکم نہ ملے واپس نہ آؤ۔ اکبر کی دوسری سیاسی چال تھی، حج کا انکار کس طرح کرتے، بادل نخواستہ جانا ہی پڑا، وہاں سنا کہ مرزا حکیم نے کابل میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ ایک ملحد بادشاہ کے خلاف اس دیندار کی حمایت فریضہ مذہبی تھی، دونوں چل پڑے، بندرگاہ سورت میں اترے تو پہلی بد خبر یہ سنی کہ میرزا حکیم کی بغاوت تو چند روز کے بعد فرو ہو گئی تھی، مخدوم الملک

تو کلیجہ پکڑ کر رہ گیا، اسہال شروع ہو گئے اور جانبر نہ ہو سکا،

عبدالنبی ذرا سخت جان واقع ہوا تھا، آگرہ میں اکبر کی ملاقات کے لئے بے تکلف آیا، اکبر نے اس زور کا گھونسہ منہ پر رسید کیا کہ پاؤں اکھڑ گئے، لڑکھڑاتا ہوا گرا، اکبر نے ٹوڈرمل کے حوالے کر دیا کہ اس سے حساب ان روپوں کا لو جو مستحقین کے لئے دیا گیا تھا، ٹوڈرمل نے قلعہ میں نظر بند رکھا، شیخ نے بھی خیر دنیوی اور سعادت آخروی اسی میں دیکھی کہ عاقبت میں حساب کتاب سہل تھے، چند روز کے بعد فوت ہو گیا،

اب اکبر کے لئے میدان خالی تھا۔ مگر ایک جماعت اور باقی تھی۔ یہ خانقاہوں کے شیخانِ جاہل اور پیرانِ گمراہ تھے، ان کی مزاج پرسی ہوئی تو خانقاہیں چھوڑ کر بھاگے۔ اکبر کا مطالبہ یہ تھا کہ یا تو کچھ کشف و کرامات کا کرشمہ دکھاؤ یا چلتے پھرتے نظر آؤ۔ ان میں سے بعض کی طلبی ہوئی تو کسی نے اپنے کان کی طرف اشارہ کیا کہ اونچا سنتا ہے اور کسی نے پیٹ کی طرف، کہ بڑا ظالم ہے۔ بعض اکڑے تو قید و بند نے حواس خمسہ درست کئے۔ اکبر کو حضرت معین الدین چشتیؒ سے انتہائی عقیدت تھی، جب کبھی زیارت کو آتا تو دس میل کے فاصلہ پر پاپیادہ ہو جاتا، اس خانقاہ کے بوڑھے متولی کو قلعہ گوالیار میں نظر بند رکھا، اس نے حرم کی وساطت سے درخواست مخلصی بھی کی مگر اکبر یہی کہتا کہ رہا ہو کر لوگوں کو گمراہ کرے گا، بیچارہ وہیں واصل بحق ہوا،

بدایونی لکھتا ہے کہ "یہ ناخلف فرقہ اسی لائق تھا"۔

اب اکبر نے اطمینان کا سانس لیا، اس نے "دین الٰہی" کا سیاسی ڈھونگ ضرور کھڑا کیا، جس پر "شیری" مشہور شاعر نے ایک قطعہ لکھا جو زبان زد خلائق ہو گیا۔ اس کا ایک شعر یہ ہے کہ

"شاہ من امروز دعویٰ نبوت کردہ است — سالِ دیگر گر خدا خواہد خدا خواہد شدن"

اس معاصر اور وظیفہ خوار شاعر نے دعوئے نبوت کی طرف جو اشارہ کیا ہے، صحیح نہیں البتہ "خواہد شدن" کا جلوہ دین الٰہی میں ضرور نظر آتا ہے، اکبر نے سمجھ لیا تھا کہ اہل ہند کی پست ذہنیت اس عقیدہ سے پہلے ہی واقف ہے، کہ راجہ "نہ کلنک" بے عیب شخصیت

پرم ایشر سروپ اور اوتار ہوتا ہے، ہندؤں نے تو بلا چوں وچرا تسلیم کرلیا، بلکہ بڑے بڑے پنڈتوں نے شاستروں سے کلنکی اوتار کی پیش گوئی بھی اکبر پر چسپاں کردی مسلمان کب ماننے والے تھے، انہیں زیر کرنے کے لئے پیری مریدی کا سلسلہ جاری کردیا، چنانچہ جو مقرب بارگاہ تھے "چیلے" کہلائے، مرید اور مرید خاص اور مرید خاص الخاص مدارج تھے جو ان چیلوں کو طے کرنے پڑتے، یہ سلسلہ پیری مریدی اورنگ زیب کے زمانہ تک جاری رہا

شاہجہان کا ایک وزیر عبدالحکیم پنجابی تھا جس کی وزارت کی یادگار شہر وزیر آباد ہے جو آب گوجرانوالہ اور گجرات کے درمیان ریلوے جنکشن بھی ہے، اسی کی تعمیر کردہ مسجد دہلی دروازہ لاہور کے اندر مسجد وزیر خاں سے موسوم ہے، اس کے خوبصورت دروازہ کی داہنی دیوار پر جلی حروف میں کاشی کے نقش و نگار میں وزیر خاں اپنے آپ کو "مرید خاص الخاص" کہتا ہے،

عبدالقادر بدایونی سات اماموں میں سے ایک تھا جن کے پیچھے اکبر روزانہ نماز ادا کرتا فتح بنگالہ پر مان سنگھ پسر راجہ بھگوان داس مامور تھا۔ اس نے شہر کے بعد شہر لئے، فتح بنگالہ کا سہرا اسی کے سر ہے، اگرچہ عام علماء اسے "جہاد" سے تعبیر نہیں کرتے تھے۔ مگر بدایونی لکھتا ہے کہ مجھے اس کی پروا نہ تھی کہ امیر لشکر ایک ہندو ہے، بادشاہ تو مسلمان ہے اس لئے بغرض ثواب میں نے بھی شمولیت کی درخواست کی، اکبر سے رخصت ہونے کے لئے آیا، چبوترہ پر بیٹھا ہوا تھا، میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا، تھوڑی دیر "مراقبہ" میں گیا، اور پھر سر اٹھا کر کہا، کہ

"۔۔۔انشاء اللہ تم ہی سب سے پہلے فتح کی خوش خبری مجھے سناؤ گے"

پھر مٹھی بھر اشرفیاں مجھے زادِ راہ دیں، میں مان سنگھ کے تحت چند ماہ لڑتا رہا، بنگالہ قریب قریب مسخر ہو چکا تھا، میں نے مان سنگھ سے رخصت چاہی مسکرا کر کہا، واہ ملا صاحب مجھے تو یہ توقع تھی کہ آپ میدان جنگ میں لشکر کی امامت کا فرض ادا کریں گے" مجھے رخصت کیا اور سفید ہاتھی اور زروجواہر میرے ساتھ کر دیا، اکبر کی خلوت میں حاضر ہوا، تو کہا کہ "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم ہی فتح کی خوشخبری لاؤ گے"!

اس میں کچھ شک نہیں کہ اکبر علماء دین اور خانقاہوں کے حجرہ نشین ریاکاروں سے سخت متنفر تھا، اور حق بجانب بھی تھا، عبداللہ مخدوم الملک کے مرنے کے بعد جب لاہور میں اس کی خانہ تلاشی ہوئی تو کسی نے جڑ دی کہ صحن خانہ میں چند قبریں ہیں انہیں بھی کھولا جائے، ان کے اندر سے سونے اور چاندی کی اینٹیں نکلیں۔

اکبر سیاسی بہروپیہ تھا مسلمانوں میں پکا مسلمان اور ہندوؤں میں کٹر ہندو۔ اس نے ایک جھروکہ درشن بھی بنایا، ہندوؤں کی مذہبی رسم ہے کہ صبح غسل کرتے ہیں پھر ٹھاکروں کی پوجا کرتے ہیں، اکبر اب ان کا مہادیو تھا، اشنان کے بعد جھروکہ درشن کے نیچے گزرتے بادشاہ سلامت کے درشن کے بعد روٹی کھلتے، جب عالمگیر نے یہ جھروکہ بند کر دیا تو کئی روز ان لوگوں نے واویلا کیا، کہ بادشاہ درشن نہیں دیتے، عالمگیر اکبر کو "جد اکفر" کہتا ہے، اس میں کچھ شک نہیں کہ بلحاظ مذہب خواہ کچھ ہو، کامیاب اور ایسا کامیاب بادشاہ تھا کہ ہندوستان کے تخت پر اس کے بعد کوئی نہ ہوا۔

مورخین نے اکبر کے بارے میں ایک اور غلطی یہ کی ہے کہ لکھا ہے کہ اکبر جاہل تھا لکھنا پڑھنا نہ جانتا تھا، ان لوگوں نے اکبر کے ہمعصر مورخین کے خلاف یہ رائے قائم کی ہے بدایونی لکھتا ہے کہ لڑکپن میں اکبر شیخ عبدالنبی سے پڑھتا رہا، اور علم حدیث بھی سیکھا، ہمایوں جب بھاگ کر ایران گیا تو وہاں عبداللطیف قزوینی سے ملاقات ہوئی، اس کا علم تاریخ و سیر میں جواب نہ تھا، ہمایوں نے ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، شاہ طہماسپ سے اختلاف عقائد کی وجہ سے تذبذب تو ہندوستان آیا، ہمایوں کا انتقال ہو چکا تھا، اکبر نہایت احترام سے پیش آیا، دیوان حافظ قزوینی ہی سے پڑھا، پڑھنا تو وہ جانتا ہی تھا، اس کے مطالب ایک اہل زبان سے سیکھے، اس کا بیٹا اکبر کا مصاحب خاص تھا، اور سایہ کی طرح اکبر کے ساتھ رہتا، اکبر کو تواریخ و سیر سے اسی نے واقف کیا، بدایونی کی تائید جہانگیر "توزک" میں بھی کرتا ہے۔

اکبر کو معلوم تھا کہ خلفاء اور اس کے اجداد بھی خطبہ پڑھا کرتے ایک دفعہ جرأت کر کے منبر پر چڑھ گیا، مگر خطابت ایک فن ہے، فیضی کے چند اشعار جو حمد میں اس نے لکھے

سنے ، پڑھ کر آتے گیا ، بات اصل میں یہ ہے کہ اس کے دربار میں اس زمانہ کے وہ منتخب اشخاص تھے جو یگانہ روزگار تھے ، ان کے سامنے علم و حکمت کا اظہار محض لاف زنی تھا ، اکبر کی سیاست کا یہ تقاضہ تھا کہ اس میدان میں اس نے قدم نہ رکھا ، جس کے سامنے ابوالفضل کے مجلدات پڑھے جاتے ، وہ جاہل کیسے ہو سکتا ہے ، آج ان ہی دفتروں کو پڑھ کر لوگ فاضل بن جاتے ہیں ۔

مغلوں نے سلطنت پٹھانوں سے چھینی تھی ، ان پر اعتبار نہیں ہو سکتا تھا اس لئے اس نے ان کے مقابل میں ہندو راجپوتوں کو کھڑا کر دیا ، یہ سیاسیات کا ناگزیر تقاضہ تھا ، خلفاء عباسیہ نے عربوں سے بھی یہی سلوک کیا ، طبری لکھتا ہے کہ خلیفہ منصور کو جب ایک غلام کی نسبت معلوم ہؤا کہ عرب نژاد ہے تو اسے موقوف کرتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم نہ تھا ، تم نہایت اچھے کارکن ہو ، مگر میرے حرم میں کوئی عرب ملازم نہیں رہ سکتا ،

اکبر نے راجپوتوں سے رشتہ بھی جوڑا ، جے پور کے راجہ بہاری مل کی لڑکی سے شادی کی ، اس کا بھائی راجہ بھگوان داس اور اس کے بیٹے مان سنگھ نے وفاداری کا حق ادا کر دیا ، راجہ کی لڑکی کے بطن سے جہانگیر پیدا ہؤا ، جس کا عقد نکاح جودھپور کے راجہ کی لڑکی جودھا بائی سے ہؤا ۔ ہندو رسم و رواج اور تیوہار اکبر بڑی شان سے مناتا رہا ، اور ہندو مناصب اعلیٰ پر بھی ممتاز تھے ، جن کا مذکور "اکبر نامہ" میں مفصل ہے ، اس کا نتیجہ یہ ہؤا کہ ہندو دور بگڑ گئے ، اور اس کا خمیازہ اورنگ زیب اور اس کے جانشینوں کو بھگتنا پڑا ، مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے ۔

اکبر کے بعد نورالدین جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت نشین ہؤا ، ۱۶۲۷ء تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی اس نے تزک لکھی ہے اور اپنی خامیاں بھی آپ ہی بیان کرتا ہے ، اس کے عہد کا مشہور واقعہ نور جہاں کا عقد نکاح ہے جس کا دلدادہ جہانگیر شہزادگی کے ایام میں بھی تھا ، دوسرا واقعہ احمد نگر کی فتح کا ہے ، احمد نگر اکبر کے زمانہ ہی میں فتح ہو چکا تھا ، نابالغ سلطان کی سرپرست اس کی پھوپھی چاند بی بی تھی جو ہندوستان میں رضیہ سلطانہ کے بعد کم مشہور نہیں ، اکبر کے عہد میں شہزادہ مراد نے برار کے علاقہ پر ہی اکتفا

کی، جہانگیر نے اسے مکمل سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا،

تیسرا واقعہ جو نتیجہ کے لحاظ سے بعد رس ہے یہ ہے کہ شاہ انگلستان جیمز اول (James I) نے اپنا سفیر "سر تھامس رو" جہانگیر کے دربار میں بھیجا۔ اس کی کوشش سے انگریزوں کو سورت اور کھمبایت اور گوا اور احمد آباد میں تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت مل گئی، اس سیاسی غلطی نے انگریزوں کو آخر ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا،

شہاب الدین شاہجہاں (۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک) کا عہد نہایت امن و سکون سے گزرا، تعمیری کام کی طرف خاص توجہ رہی، آگرہ اور دھلی اور لاہور اور کشمیر میں شاہجہان کی عمارات آج بھی موجود ہیں، اس نے آگرہ سے دھلی میں پایۂ تخت منتقل کیا اور دہلی کا نام جہاں آباد رکھا، مگر زبان زد دھلی ہی رہا، جامع مسجد اور لال قلعہ جمنا کے کنارے پر عالیشان عمارات ہیں۔

شاہ جہان اکثر و بیشتر آگرہ ہی میں رہا، اس کی بیوی ممتاز محل کا روضہ "تاج" عجائبات عالم میں شمار ہوتا ہے۔ لاہور میں شاہدرہ میں اس کے والد جہانگیر کا مقبرہ ہے، جب سفیر ایران فاتحہ خوانی کے لئے آیا تو پہلے لاہور میں جہانگیر کی قبر پر گیا، اس وقت خام تھی افسوس کرتے ہوئے کہا، کہ شہنشاہ کی قبر اس حالت میں نہ ہونی چاہیئے، پرچہ نویس نے شاہجہان کے گوش گذار یہ بات کردی۔ سفیر آگرہ میں آیا تو چھ ماہ مہمان شاہی رہا، واپسی پر پھر مقبرہ پر آیا تو ایک طلسمی کارخانہ دیکھ کر محو حیرت ہو گیا، شیر پنجاب رنجیت سنگھ نے امرت سر دربار صاحب میں سنگ مرمر کا پتھر یہیں سے اکھڑوا کر لگایا۔ "فکر ہر کس بقدر ہمت اوست" شالامار باغ بھی قابل دید ہے، جو کشمیر کے باغ کے نمونہ پر بنایا گیا ہے۔ نور پور سے ایک نہر اسے سیراب کرنے کے لئے لائی گئی، جو اضلاع لاہور کو بھی سیراب کرتی ہے۔ تخت طاؤس نے تخت سلیمان کو بھی مات کر دیا، نادر شاہ ایرانی اپنے ساتھ لے گیا،

شاہ جہان ابھی زندہ ہی تھا کہ چاروں بیٹوں میں تخت و تاج کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اورنگ زیب سب سے چھوٹا غالب آیا، بڑا دارا شکوہ مارا گیا، شاہ شجاع برہما کی طرف بھاگ گیا، وہیں مارا گیا، مراد قید و بند میں ختم ہو گیا، شاہ جہان بھی بقیہ عمر

قلعہ آگرہ میں نظر بند رہا، اگر اورنگ زیب بھائیوں سے یہ سلوک نہ کرتا۔ تو وہ اس کے ساتھ یہی کچھ کرتے۔

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر (۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء) کے عہد میں مغلیہ سلطنت منتہا عروج پر تھی، لیکن اکبر اعظم کا بویا ہوا بیج اب بارور ہو رہا تھا، راجپوت راجے باغی ہو رہے تھے اسیواجی نے مرہٹہ سلطنت قائم کر لی جس کو شاہان دکن بھی مدد دے رہے تھے، اورنگ زیب نے سب کو نیچا دکھایا، پنجاب میں سکھوں نے بھی سر اٹھایا، اگر عالمگیر کا جانشین بھی باپ کے دل و دماغ اور عزم کا آدمی ہوتا۔ تو حالات بدل جاتے مگر یہ تاریخ کا اہم واقعہ ہے جس کا اعادہ ہمیشہ ہوتا رہتا ہے، کہ ان تمام اولوالعزم بادشاہوں کے جانشین ناخلف ہی ثابت ہوئے۔ جن کے نام کے ساتھ "اعظم" کا لقب ہے،

اورنگ زیب کے تعصب مذہبی کو انگریز مورخین نے اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے نمایاں کیا ہے۔ اور اس کا مقابلہ اکبر سے کرتے ہوئے اکبر کو بہت اونچا اور اورنگ زیب کو نیچا کرتے ہیں، اورنگ زیب کے عہد میں ملک کے طول و عرض میں ہندو راجپوت راجوں اور مرہٹوں اور سکھوں اور جاٹوں نے سر اٹھایا، اس شورش کا سبب مورخین غلط فہمی سے اورنگ زیب کا مذہبی تعصب بیان کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ہندو یہ چاہتے تھے کہ شاہجہاں کا جانشین داراشکوہ ہو۔ جس پر ویدانت کا فلسفہ اتنا اثر کر چکا تھا کہ شہزادگی کے عالم میں بھی اس کی صحبت ہندو جوگیوں سے رہتی، "اپنشد" کی نسبت اس کا عقیدہ یہ تھا کہ "کتاب مکنون" یہی ہیں اور آیت "انہ القرآن کریم فی کتب مکنون" کی تفسیر یہ کرتا کہ قرآن اپنشدوں سے ہی ماخوذ ہے۔ اسے نہ تو قرآن کا فہم تھا اور نہ اپنشد کے معنی سے واقف تھا، "اپنشد" مرکب ہے "اُپا۔ نی۔ شد" الفاظ سے، اس کا ترجمہ اردو میں "بیٹھنا" "نیچے" "نزدیک" ہے۔ یعنی گورو یا معلم کی صحبت میں بیٹھ کر علم معرفت حاصل کرنا۔ اور کتاب مکنون کا ترجمہ ہے پوشیدہ احکامات کی کتاب (نظریات) چونکہ صوفی ہمیشہ راز دارانہ خلوت ہی میں زندقہ کی تلقین کرتے جیسا کہ ہم ان اوراق میں واضح کر چکے ہیں اور پنڈت ویدوں کے اسرار دوسری ذات والوں کو اس لئے نہ بتلاتے کہ ان کی سیادت اور قیادت ان کے ہاتھ سے نکل کر دوسری نیچ ذاتوں

میں نہ چلی جائے۔ اس لئے دارا شکوہ نے پوشیدگی کو بہت اہمیت دی، اور فرقۂ "باطنیہ" کا ہم نوا ہوگیا،

رادھا کرشنن اپنی کتاب ہندوستانی فلسفہ (Indian Philosophy) میں لکھتا ہے کہ رفتہ رفتہ اپنشد کا مفہوم پوشیدہ عقائد ہوگیا، اور یہی مفہوم دارا شکوہ کے دماغ میں بھی ٹھونسا گیا، اس نے ان کا ترجمہ فارسی زبان میں بھی کیا،

اکبر کی سیاسی حکمت عملی نے راجپوت راجاؤں کو اتنی تقویت دی کہ وہ عملاً خود مختار ریاستوں کے ایسے ہی مالک تھے جیسے خلفاء عباسیہ کے عہد میں غیر عرب، جب اورنگ زیب نے عنانِ حکومت سنبھالی تو اس کا سیاسی تدبر اس خودسری کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ جو ملک کے طول وعرض میں وہ شہزادگی کے دنوں میں دیکھ چکا تھا، اور ہندو یہ چاہتے تھے کہ وہی حالات جاری رہیں جو اکبر کی سیاسی حکمت عملی نے پیدا کر رکھے تھے، اور وہ رفتہ رفتہ اتنی تقویت حاصل کریں کہ اسلامی حکومت اپنی موت مر جائے، یا وہ اسے پیش از وقت ختم کردیں اور حالات کی رفتار یہی کچھ تھی، یہی وجہ تھی کہ خود شاہجہان بھی یہی چاہتا تھا کہ دارا شکوہ اس کا جانشین ہو، دارا شکوہ بڑا بیٹا تھا، لیکن اس کے وزیر اعظم سعد اللہ خاں نے شاہجہان کو بروقت متنبہ کردیا تھا کہ اگر سلطنت قائم رہی تو اورنگ زیب کی تخت نشینی سے ہی رہ سکتی ہے لیکن شاہ جہان نے وزیر باتدبیر کے مشورے پر عمل نہ کیا، اورنگ زیب کو دکن کی ولایت پر مامور کیا، جو مملکت کا ایسا حصہ تھا جہاں بدنظمی زیادہ تر تھی، ایک طرف مرہٹے اور دوسری طرف گولکنڈہ اور بیجاپور کے بادشاہ باہمی ساز باز سے مغلیہ سلطنت کی بیخ کنی کے درپے تھے، شاہان دکن کو تو یہ خوف بجا تھا کہ شہنشاہان مغلیہ ان کی ریاستوں کو ہڑپ کر جائیں گے۔ مرہٹے رام راج قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان حالات میں اورنگ زیب کے لئے وہی چارہ کار رہ گیا تھا جو تاریخی واقعات ہیں، اگر وہ ذرا غفلت برتتا اور دارا شکوہ تخت نشین ہوتا، تو مغلیہ شہنشاہیت ختم ہو جاتی،

اورنگ زیب پر تعصب کا الزام بھی بے جا ہے، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ اس رنگ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جو سراسر ہندوانہ تھا، جس کو ہندو رانیوں سے عقد نکاح

نے اتنا گہرا کر دیا تھا کہ صبغۃ اللہ مدجم پڑ گیا،

رقعات عالمگیری میں وہ اپنے بیٹوں کو جو کچھ ہدایات دیتا ہے ان کے مطالعہ سے اس کا منشا صاف نظر آجاتا ہے، شہزادہ معظم کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ پرچہ نویس کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ فرزند ارجمند نے ہندوانہ تہوار منایا، اور بکرماجیتی رسم کو زندہ کیا" عمر عزیزت چہل و شش نازم بریں ریش وفش،

دوسرے بیٹے کو لکھتا ہے کہ سنا ہے کہ آپ فلاں درویش گندم نما جو فروش کے گرویدہ ہو رہے ہیں، برخوردار "اہل اللہ کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا ہے" پھر اپنا واقعہ بیان کرتا ہے کہ میں شاہ عبداللطیف کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی کہ چند گاؤں خانقاہ کے نام پر لکھ دوں کہ طالب علموں اور درویشوں کے مصارف کے متحمل ہوں، شاہ صاحب مسکرائے اور فرمایا

"شاہ مارا دیہہ دہد منّت نہد رازقِ ما رزق بے منّت دھد"

اورنگ زیب کی حکمت عملی ردِ عمل اکبر کی حکمت عملی کا تھا، اکبر کی حکمت عملی کو تقویت دینے والے اس کے دو جانشین جہانگیر اور شاہ جہان تھے، مگر اورنگ زیب کے بعد کوئی جانشین اس کے دل و دماغ کا نہ ہوا، اس لئے جس فتنہ کو اس نے دبا دیا تھا، اس کی وفات کے بعد پھر ابھر آیا، اور وہی واقعات ظہور میں آئے جن کی تاریخ ہمیشہ اعادہ کرتی رہتی ہے، بیٹوں میں تخت نشینی کے لئے جنگ، امراء دربار کا ہوس اقتدار، فرخ سیر کے عہد میں دو امراء جو بھائی ہی تھے سید عبداللہ اور سید حسین ایسے ہی بادشاہ گر تھے جیسے خلافت عباسیہ میں سلاطین خلیفہ گر، صوبیدار اپنے اپنے صوبوں کے خود مختار بادشاہ طوائف الملوکی کی وجہ سے مرکزی حکومت کی کمزوری، بیرونی حملوں اور اندرونی خرخشوں کی وجہ سے مغلیہ شاہوں کی بے قدری، نظام الملک نے دکن میں علی وردی خان نے بنگال میں، سعادت علی خاں نے اودھ میں ان کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں صوبہ داروں نے قائم کر لیں مرہٹے زور پکڑ گئے، نادر شاہ بے روک ٹوک دھلی میں آیا، قتل و غارت نے دھلی کی تباہی کی پرانی روایات کو زندہ کر دیا، احمد شاہ ابدالی شاہ افغانستان نے پنجاب اور سندھ کو اپنی سلطنت

میں شامل کرلیا، اور اگر شکر کرتا تو صوبہ وار پہلے ہی خود مختار تھے، اور ان میں خانہ جنگی بھی تھی ان میں سے کوئی مالک بن بیٹھتا، آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر ملک شعر کا بادشاہ رہ گیا تھا، چار دیوان یادگار چھوڑ گیا ابراہیم ذوق اور اسد اللہ خاں غالب کو بادشاہ کی استادی کا فخر یکے بعد دیگرے حاصل رہا، ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اسے رنگون میں نظر بند کردیا۔ جہاں وہ فوت ہوا، انگریز اس وسیع مملکت کے مالک ہوگئے۔ جو بابر سے لے کر اورنگزیب تک شاہان مغلیہ نے حاصل کی تھی،

غالباً خلافت اسلامیہ کے مطالعہ کے بعد جس کے واقعات ہم نے اس حد تک بیان کئے ہیں، یہ سوال ہر ایک طالب علم کے دل میں پیدا ہوتا ہوگا کہ اس ہندوستان کے بعد اسلام نے کیا فائدہ اٹھایا، اس فائدہ سے تو انکار نہیں ہوسکتا کہ آج بھی ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں، لیکن اس کا سہرا مغلیہ شہنشاہیت کے سر پر نہیں، اشاعت اسلام پٹھان بادشاہوں کے عہد میں ہوئی۔ پنجاب شروع سے افغان سلطنت کا ایک صوبہ تھا۔ اور بنگال بہا عرصہ تک یہی حکمران رہے اور یہ دو صوبے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت رہی۔ آگرہ اور دھلی اور ملحقہ صوبہ جات میں ہندوؤں کی اکثریت بحال رہی، اور آگرہ اور دہلی میں مغلیہ شہنشاہوں کے پایہ تخت تھے۔ اگر مغلوں کی جگہ پٹھان شہنشاہ ہوتے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ بنوامیہ کی طرح اشاعت اسلام میں انتہائی کوشش کرتے۔ اور افغانستان اور بلوچستان کی طرح یہاں بھی خالص مسلم آبادی ہوتی۔ مغلیہ سلطنت نے جو کچھ اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچایا، اس کی تلافی اورنگ زیب کی انفرادی کوشش سے خاطر خواہ نہ ہوئی۔ لیکن اتنا ضرور ہوا، کہ مسلمان ہندوؤں میں جذب ہوتے ہوتے بچ گئے، ان سے پیشتر کئی قومیں ہندوستان میں فاتحانہ داخل ہوئیں، اور ان کی امتیازی ہستی محو ہو کر رہ گئی۔ ذات پات کے امتیاز نے ان کی بھی ایک ذات کا نشان قائم رکھا جس سے ان کی اصل کا پتہ ملتا ہے لیکن من حیث القوم وہ جذب ہو کر رہ گئیں

ہندوستان میں اوسط آبادی اب بھی چالیس کروڑ ہے اور چالیس سے زیادہ اقوام کا اختلاط مشاہدہ ہوتا ہے اور مختلف ایک سو پچاس بولیاں بولی جاتی ہیں تیس مختلف رسم الخط بھی ہیں،

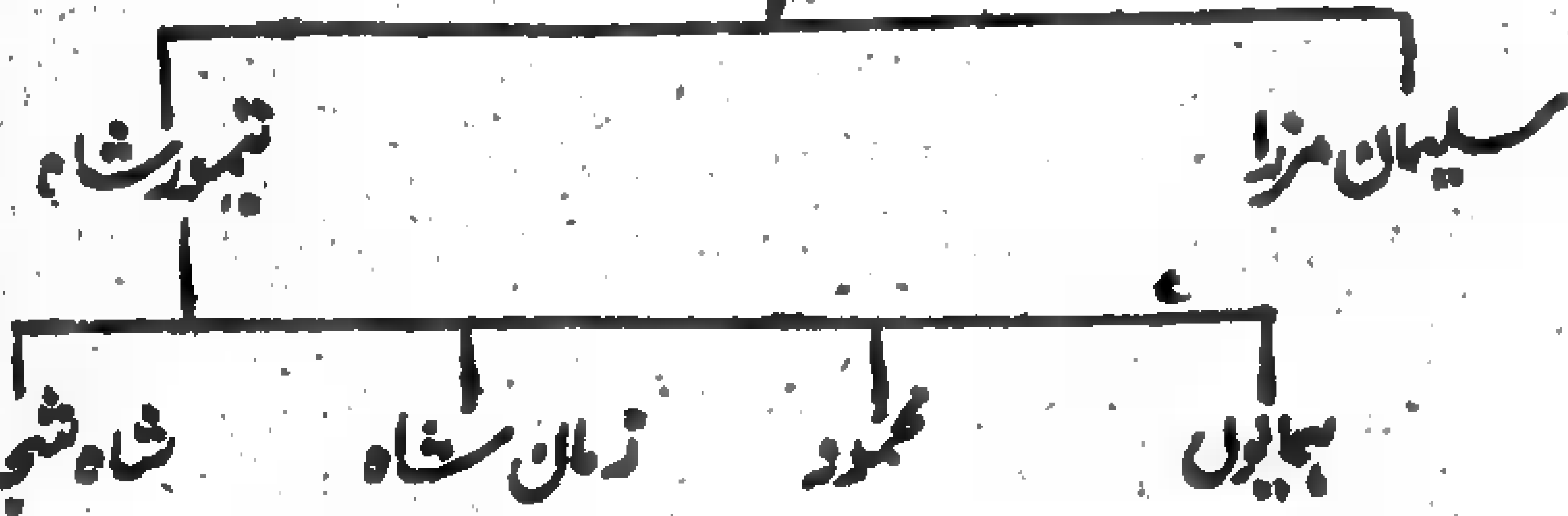
مختلف قرون میں مختلف قومیں یہاں آکر آباد ہوئیں، ایرانی اور یونانی اور سکاتھی (Scythians) اور ہن (Huns) کا داخلہ تو کل کی بات ہے، مگر سب ایسے محو ہوئے کہ اب امتیاز مشکل ہے۔ مسلمان سب سے اخیر آئے اور فاتحانہ انداز سے آئے۔ یہاں کی آبادی سے اختلاط اہل عرب کا ہندوستان کے مغربی ساحل پر ہوا، اس کا نتیجہ وہ نسل ہے جو "موپلا" کہلاتی ہے، لیکن یہ مسلمان ہی رہے اور اپنی قومی روایات کو نہیں بھولے۔

اسلام چونکہ عالمگیر دین ہے، اس لئے اس میں ذاتوں کا امتیاز نہیں، لیکن جہاں تک تقسیم انسانی فطری ہے اسے نظر انداز نہیں کرتا۔ پٹھان پٹھان اور مغل مغل ہی رہے لیکن مسلمان ہیں۔ دوسری اقوام میں یہ کیفیت نہیں۔ وہ آپ بھی بگڑے اور ویدک مذہب کو بھی بگاڑا۔ اسلام نے جو کچھ اثر ہندوؤں کی ثقافت پر کیا وہ نمایاں ہے۔ بہرحال ہر ایک زمانہ میں ہندوستان کی اقوام میں رہتے ہوئے مسلمان الگ ہی نظر آتے ہیں، اور اسی وجہ سے پاکستان کا ظہور بھی ممکن ہو گیا۔

اب ہم اپنے زمانہ کے قریب آ گئے ہیں، لیکن پیشتر اس کے کہ ہم اپنے زمانہ کے تاریخی واقعات قلم بند کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے زمانہ کی اسلامی سلطنتوں کے ابتدائی حالات بیان کریں۔

افغانستان

بنو امیہ کے عہدِ خلافت میں اسلام افغانستان میں شائع ہو چکا تھا۔ ہر ایک قوم جو ہندوستان میں داخل ہوئی افغانستان کے ہی سے آئی۔ اس لئے اسے "باب الہند" کہنا چاہیئے، افغانستان بھی اسی قوم کے قبضہ میں رہا۔ جو ہندوستان پر حکومت کرتی رہی، افغانستان کی اپنی تاریخ کا آغاز احمد شاہ سے ہوتا ہے۔



قبیلہ ابدالی کی دو شاخیں "پوپل زئی" اور "بارک زئی" مشہور ہیں، ان میں سے "سدو" اور "محمد" دو نامور "سدوزئی" اور "محمد زئی" کے مورث اعلیٰ ہیں، احمد شاہ سدوزئی تھا جمال خاں محمد زئی کی اولاد احمد شاہ کی اولاد کے بعد آج تک افغانستان پر حکمران ہے، لیکن تمام امیروں اور بادشاہوں میں صرف ایک احمد شاہ کو مشاہیر اسلام کی صف میں جگہ دی یہ شخص غازی صلاح الدین الیوبی کی طرح دشمنانِ دین کے حملوں کی تمام عمر مدافعت کرتا رہا اگر چاہتا تو پھر سے شیر شاہ سوری کی طرح افغانی حکومت قائم کر سکتا تھا۔ کاش کرتا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنحضرت کے اس ارشاد پر کہ

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان امن میں رہیں"

ہمیشہ کاربند رہا، اس کا دستِ حق پرست جب بھی اٹھا مسلمانوں کی حمایت میں اٹھا

کبھی اور جہاں کہیں اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے امن میں غیر مسلم رخنہ انداز ہو رہے
وہاں پہنچا، اور زبان سیف سے دشمنان دین کی دندان شکنی کی۔
پنجاب غزنوی اور خاندان غوری کی سلطنت کا شروع سے ایک حصہ تھا مغلیہ
شاہوں نے جب ہندوستان پر تسلط جمالیا، تو پنجاب بلکہ افغانستان اس کے قبضہ میں
۔ بانی شہنشاہیت بابر کا پایہ تخت تو کابل ہی تھا، اور وہ اسی جگہ مدفون ہوا، احمد شاہ
الی کے زمانہ میں سلطنت مغلیہ سرعت سے پستی کی طرف جا رہی تھی، بلکہ یہ کہنا چاہئیے
لوائف الملوکی قائم ہو چکی تھی ہر ایک صوبہ دار اپنی اپنی جگہ خود مختار تھا، اس حالت میں
ٹھوں نے سر اٹھایا۔ اورنگ زیب کے عہد میں سیواجی کی شورش دبی رہی۔ مگر شہنشاہ کی
ت کے بعد اس میں پھر جان پڑ گئی، اور شمالی ہند پر چھا گئے، پنجاب میں بھی طوائف الملوکی
اور یہاں صوبہ داروں میں خانہ جنگی ہو رہی تھی، سکھوں نے ان کا بھی ناطقہ بند کر
ا تھا، اور دھلی تک قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا، ان واقعات کو ہم کچھ تفصیل سے
تھ بیان کرتے ہیں،
نادرشاہ کی فوج میں دو سردار کریم خاں اور احمد نامی تھے، نادر کو اپنے زنانہ داروں
قتل کر دیا کریم خاں نادر کا جانشین ہوا اور "احمد" افغانستان کا بادشاہ بن گیا، اور
انی خاندان کی بنا ڈالی، لوگ اسے "دُرِ دُراں" کہتے، "دُر" کے معنی موتی مخفف ہو کر
درانی" رہ گیا،

بالاراؤ مرہٹوں کا بردھان پنڈت یعنی پیشوا تھا، انتظام مملکت "شیوراؤ بھاؤ" کے
تھ میں تھا، جو تمام ہندوستان کی تسخیر کا مصمم ارادہ کر چکا تھا، ہر سال ایک مہم روانہ
تا اور لوٹ گھسوٹ کے بعد جو کچھ ہاتھ آتا، خزانہ میں داخل ہوتا، جسے خراج کہتے مرہٹوں
کی اصطلاح میں "چوتھ" اور "سرولش" کہتے ہیں، صوبہ داروں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ آئے
دن ان کا مطالبہ ہوتا،
اس وقت مرہٹہ سپہ سالار رگھوناتھ راؤ تھا۔ اس کے ماتحت ملہار راؤ ہلکر اور
جانکوجی سندھیا اور دوسرے سردار بھی تھے، پنجاب کی باری آئی، یہاں ابدالی کا نائب

السلطنت خان جہاں مرہٹہ لشکر جرار کا مقابلہ نہ کر سکا، اور کابل کی طرف بھاگ گیا۔ رگھوناتھ نے لاہور میں ڈیرہ ڈال دیا، کچھ عرصہ یہاں رہ کر مجبوراً واپس ہونا پڑا، کیونکہ لشکر کے سپاہیوں کو چند ماہ کی تنخواہ نہ ملی تھی، اور ان میں بے چینی پائی جاتی تھی، جب حساب شیوراؤ بھاؤ کے سامنے پیش ہوا، تو معلوم ہوا کہ سپاہیوں کی تنخواہ بقدر اٹھاسی لاکھ روپیہ واجب الادا ہے، بھاؤ جھلا اٹھا اور کہا کہ اسی عقل و ہمت پر ہندوستان کی تسخیر کا ذمہ اٹھایا تھا" رگھوناتھ نے کہا کہ "آئندہ آپ ذرا عقل و ہمت سے کام لینا" بات بڑھ جاتی، مگر پیشوا نے بیچ بچاؤ کر کے دونوں کو ٹھنڈا کیا، مرہٹہ سرداروں کو بھاؤ کی نخوت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی مگر وہ سیاہ سپید کا مالک ہو چکا تھا اس لئے دم بخود ہو رہے،

پیشوا کا بیٹا بسواس راؤ اس وقت پندرہ سال لڑکا تھا، مرہٹوں کے قدیم دستور کے مطابق اس کو سپہ سالار بنایا، مگر انتظام کی باگ خود اسی کے ہاتھ میں تھی، پرچہ لگا۔ کہ احمد شاہ ابدالی اپنے آبائی ملک پنجاب کو واپس لینے کے لئے آرہا ہے، بھاؤ نے مرہٹوں کی کل طاقت ایک جگہ جمع کر دی، رگھوناتھ راؤ کو پھر سپاہ کی قیادت کے لئے کہا اس نے صاف انکار کر دیا، اس لئے مجبوراً آپ ہی مرہٹہ فوج کو لئے دہلی کی طرف چل پڑا، ہندوستان کے تمام صوبہ داروں کے پاس اپنے وکیل روانہ کئے، اور اپنے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی ایک وکیل نواب وزیر شجاع الدولہ والئے اودھ کے پاس تحائف لیکر آیا، اور عرض کی کہ جب بھاؤ اودھ میں داخل ہوگا۔ تو "نارو شنکر" خدمت میں حاضر ہو کر قدم رنجہ فرمانے کی تکلیف دے گا، امید ہے کہ نواب مستطاب مرہٹہ لشکر میں شامل ہو کر ایک ایسے شخص کا مقابلہ کریں گے جو ہندوستان پر قابض ہونا چاہتا ہے، اور ہم سب کا مشترکہ دشمن ہے،

نواب کو بھاؤ کے ارادہ کا علم تھا، وکیل کو چکنی چپڑی باتوں سے ٹال دیا، اور دبی زبان سے یہ بھی کہا کہ ایک عرصہ سے دکن کے برہمن ہندوستان پر چھائے ہوئے ہیں، نہ کسی کو چین لینے دیتے ہیں اور نہ خود چین سے بیٹھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ صوبہ داروں نے تنگ آکر احمد شاہ کو دعوت دی ہے، نارو شنکر مشہور ادیب میر غلام علی آزاد بلگرامی کا شاگرد تھا،

احمد شاہ نے ادھر ادھر سے فوج جمع کی، اس عرصہ میں نجیب الدولہ نواب "روہیل کھنڈ"

بھی پہنچ گیا، اور مرہٹوں کے حالات سے آگاہ کیا، احمد شاہ نے نجیب الدولہ کو نواب شاہ شجاع
کے پاس بھیجا کہ جس طرح ہو نواب وزیر کو اپنے ساتھ لاؤ، یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی فوج ہمارے
حوالے کر دے بلکہ اس کی ذاتی شمولیت ضروری ہے، نجیب الدولہ نواب وزیر کے پاس اس وقت
پہنچا جب کہ سوچ رہا تھا کہ کس کا ساتھ دے، مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بھی
خائف تھا، مگر یہ بھی جانتا تھا کہ اگر مرہٹے غالب آئے تو وہ بھی کہیں کا نہ رہا، نجیب الدولہ برابر
کا نواب تھا، آخر اس کے سمجھانے سے نواب نے وعدہ کر لیا کہ اگر کسی کا ساتھ دیا تو احمد شاہ
کا ہوں گا۔

۱۷۶۰ء میں احمد شاہ نے کابل سے ہندوستان کا رخ کیا، سب سے پہلے اس کا
مقابلہ دتاجی سندھیا سے ہوا، دتاجی نے راہ فرار اختیار کی، مگر بدقسمتی سے نجیب الدولہ سے
مڈھ بھیڑ ہو گئی، نجیب الدولہ تمام روہیلہ سرداروں اور فرخ آباد کے پٹھانوں کو لئے احمد شاہ سے
الحاق کے لئے آ رہا تھا کہ "بدلی" پر دتاجی سے آمنا سامنا ہو گیا اور دتاجی مارا گیا، اس کا بھائی
جانکوجی سندھیا بھاؤ کے ہمرکاب تھا، بھائی کے قتل کی خبر سنی تو دانت پیس کر رہ گیا، نجیب الدولہ
نواح انوپ شہر میں گنگا کے کنارے احمد شاہ سے آملا، اس جگہ ابدالی لشکر خیمہ زن تھا،

بھاؤ آگرہ کے قریب پہنچا تو سورج مل جاٹ راجہ بھرت پور نے حاضر ہو کر نذرانہ پیش کیا
اور مشورہ دیا کہ عادت کے خلاف مرہٹے ایک جگہ جم کر شاید مقابلہ نہ کر سکیں، اور یہ پنڈارے
لوٹیرے جو ساتھ ہیں مناسب ہے کہ رسد کا سامان ہی اکٹھا کرتے رہیں۔ بھرت پور اور ڈیگ کے
قلعوں میں سے جو پسند خاطر ہوں وہاں غیر ضروری سامان حرب جمع کر دیں، یہ قلعہ بھی پشت پناہ
رہیں گے، اور آپ بھی سبکدوش ہو کر اس اہم مہم کا خاطر خواہ انجام دے سکیں گے، بھاؤ نے اس
مشورہ پر عمل نہ کیا، سورج مل بادل نخواستہ ہمرکاب ہو گیا، مگر دونوں کی نیت بخیر نہ تھی، بھاؤ نے
ایک دستہ فوج سورج مل کے بازو پر متعین کر دیا،

بھاؤ نے دہلی کو محاصرہ میں لے لیا، قلعہ احمد شاہ کے وزیر اعظم شاہ ولی خاں کے برادر
زادہ یعقوب علی خاں کی حفاظت میں تھا، مقابلہ بے فائدہ تھا، چند شرائط پر قلعہ حوالہ کر دیا، بھاؤ
نے تمام شاہی املاک پر قبضہ جما لیا، دیوان خاص کی روپہلی چھت جس کو صنعت نے نقش و نگار سے

آراستہ کر رکھا تھا۔ الکمردادی، بالیت ستر لاکھ روپیہ تھی، ایسی ہی اور بھی دست درازی کی
بھاؤ نے کا ارادہ ہوا کہ بسواس راؤ کو دہلی کے تخت پر بٹھا کر مرہٹہ شہنشاہیت کا اعلان کر دے
جب دشمن قریب ہی پہنچ چکا تھا مناسب خیال کیا کہ پہلے اس سے نپٹ لوں، پھر ہندوستان
ہمارا ہی تو ہے۔ نواب وزیر کو بھی بھاؤ کی چیرہ دستی اور ارادہ کی اطلاع ہوئی، تو عجب مخمصے
میں پڑ گیا، اسے یقین تھا کہ مرہٹے غالب آئیں گے، یکایک نجیب الدولہ دو ہزار سواروں
ساتھ پھر آدھمکا، اور وہ قرآن شریف سامنے رکھا جس پر ابدالی اور اس کے وزیر اعظم شا
کی مہریں ثبت تھیں، یہ عہد واثق تھا کہ نواب کے مرتبہ میں کوئی فرق نہ آئے گا، نواب تھوڑی
جمعیت کے ساتھ احمد شاہ ابدالی سے آملا۔ خوب آؤ بھگت ہوئی، احمد شاہ نے کہا کہ میں
کو اپنے بیٹوں کے برابر سمجھتا ہوں، آپ کا انتظار تھا اب دیکھنا میں مرہٹوں کی کیا گت بناتا
اس کے بعد لشکر میں اعلان کر دیا کہ نواب مہمان عزیز ہے اگر کسی درانی سپاہی نے کچھ بے عنو
کی تو سخت سزا دی جائے گی۔

نواب شجاع الدولہ کے ہمراہ اس کا میر منشی پنڈت کاشی راج تھا، اس نے اس معرکہ
چشم دید حالات لکھے ہیں۔ جن کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے شائع کیا، اب ہم اس لڑ
کی کہانی پنڈت جی کی زبانی بیان کرتے ہیں،

برسات زوروں پر تھی، احمد شاہ ابدالی کوچ کرتا ہوا جمنا کے کنارے شاہدرہ پر آٹھہرا، شا
دہلی کے مقابل واقع ہے، دوسرے کنارے پر مرہٹوں کے خیمے اور خرگاہ نظر آ رہے تھے، دریا چڑ
پر تھا، اس حالت میں عبور کرنا خطرناک تھا۔

اب ذرا بھاؤ کے بھی حواس ٹھکانے آنے لگے، پنڈت بھوانی شنکر بھاؤ کا مشیر تھا، نوا
شجاع الدولہ کے پاس اسی کو پیغام دے کر بھیجا، کہ مرہٹوں اور نواب کے خاندان میں پرا
مراسم دوستانہ ہیں، جب نواب کے والد نواب صفدر جنگ کی لڑائی احمد شاہ سے ہوئی تو مرہٹوں
نے نواب کی مدد کی تھی، زیبا نہیں کہ نواب اب دشمن کا ساتھ دے، اگر خود ہمارے ساتھ ملنا منظور
نہیں چاہتا تو کم از کم احمد شاہ سے علیحدگی اختیار کر لے،

بھوانی شنکر اورنگ آباد (دکن) کا رہنے والا تھا، جب اس کو معلوم ہوا کہ پنڈت کاشی را

(کا) دکنی ہے تو ان سے ملا، نواب شجاع الدولہ کی ملازمت میں راجہ دیوی دت دھلوی ایک
(خا)ندانی امیر تھا، محمد شاہ رنگیلا کا ندیمی تھا، سادات بارہ عبداللہ اور حسین علی بادشاہ گر کے
(د)ور دورہ میں اس کا باپ مہتمم خزانہ شاہی تھا، کاشی راج لکھتا ہے کہ نواب نے ہم دونوں کو پنڈت
(بھو)انی شنکر کے ہمراہ بھاؤ کے پاس روانہ کیا، بھاؤ نے ایک خط دکھنی زبان میں مجھے بھی لکھا
(تھ)ا، مگر خط کا عنوان مناسب القاب و خطاب سے معرّا تھا، اس لئے میں نے اس بے تمیز کو کچھ
(جوا)ب نہ دیا، جب بھاؤ نے بھوانی شنکر سے وجہ دریافت کی تو منشی پہ برس پڑا، راجہ دیوی دت
(نے) محمد شاہ کا دربار دیکھا ہوا تھا، بھاؤ کو کب خاطر میں لاتا تھا، دونوں جیسے گئے ویسے لوٹ
(آئ)ے۔ نجیب الدولہ کو سرے سے منظور ہی نہ تھا، کہ صلح ہو، اس نے ہر ایک امر میں مشکلات پیدا
(ک)یں، شجاع الدولہ صلح کے نامہ و پیام میں نجیب الدولہ سے مشورہ کرتا، اور نجیب الدولہ ابدالی سے
(ج)و کچھ ابدالی کہتا نجیب الدولہ شجاع الدولہ کو مشورہ دیتا!

سورج مل جاٹ اور ملہار راؤ ہلکر کی بھی خفیہ خط و کتابت نواب سے ہو رہی تھی، اور وہ
(ن)یک مشورہ کے طالب تھے، نواب نے کہلا بھیجا کہ علیحدہ ہو جاؤ، ورنہ خیر نہیں، سورج مل نے
کہلا بھیجا کہ مناسب وقت کا منتظر ہوں میری کڑی نگرانی ہو رہی ہے، نواب نے بھاؤ کو کہلا
بھیجا کہ غنیمت سمجھو کہ احمد شاہ کے لشکر میں ہوں، صلح کا دروازہ کھلا ہے میری وساطت سے
باعزت شرائط پہ صلح ہو سکتی ہے، اگر تمہاری یہی خواہش ہو تو میری خدمات حاضر ہیں۔
احمد شاہ اور وزیر اعظم شاہ ولی خان بھی وعدہ کر چکے ہیں کہ گفتگو صلح ہندوستانی نوابوں
سے تعلق رکھتی ہیں تو میں، ان کی دعوت پر آیا ہوں اگر وہ صلح پر رضامند ہوں تو مجھے بھی انکار نہیں
لیکن جنگ ہوئی تو اس کا انتظام میرے ہاتھ میں رہے گا!"

بھاؤ نے نواب شجاع الدولہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ کی صائب رائے پر
حتی المقدور عمل کروں گا، احمد شاہ سے ہماری کوئی عداوت نہیں اپنے ملک کو واپس چلا جائے۔
اٹک کے اس طرف ملک اس کا ہے ادھر کا ملک ہندوستانی سرداروں کا ہے، وہ جس طرح
چاہیں آپس میں تقسیم کر لیں، اگر شاہ کو یہ منظور نہ ہو تو لاہور اس کی سلطنت کی حد ہے اگر اس سے
بھی تسلی نہ ہو تو سرہند تک ملک دینے کو تیار ہوں۔ ہم کبھی مداخلت نہ کریں گے۔

واجہ سورج مل دہلی سے چھ کوس کے فاصلہ پر پڑا تھا، ادھر کا غذی گھوڑے دوڑتے تھے۔ اُدھر وہ اپنی فوج کے ساتھ چپکے سے کھسک گیا، بھاؤ کو خبر اس وقت ہوئی، جب وہ ایک دن دو راتوں میں پچاس کوس کا فاصلہ طے کر کے قلعہ میں بح الخیر پہنچ گیا،

برسات ختم ہونے کو تھی، بھاؤ نے ارادہ کیا کہ "کنج پورہ" پر جو دہلی سے پچاس کوس کے فاصلہ پر جمنا کے کنارے واقع ہے، قبضہ کر کے دریا کو اسی جگہ سے عبور کیا جائے اس جگہ روہیلے قابض تھے، اگرچہ سخت مقابلہ کیا، مگر شکست کھائی، ان کا سردار دلیل خاں اسیر ہوگیا، مرہٹوں نے خون سے خوب ہاتھ رنگے، احمد شاہ کو اطلاع ہوئی تو ارادہ کیا کہ کنج پورے مرہٹوں کو مار کر ہٹا دوں۔ مگر دریا ابھی تک چڑھاؤ پر تھا۔

برسات ختم ہو گئی۔ احمد شاہ نے اپنی فوج کا جائزہ لیا، درانی سپاہ شاہ ولی خان، سلطان جہاں کے ماتحت چوبیس دستے تھی، ہر ایک دستہ میں بارہ سو سوار تھے۔ فوجی افسر شاہ پسند خاں، نصیر خان بلوچ، برخوردار خاں، وزیر اللہ خاں قزلباش اور مراد خاں ایرانی مغل بھی تھے۔ کل چالیس توپیں بھی تھیں، ان کے علاوہ دو ہزار اونٹ، ہر ایک اونٹ پر دو بندوقیں زنبورک کے لئے سوار تھے۔

نواب شجاع الدولہ کے ہمراہ دو ہزار سوار اور دو ہزار پیدل اور بیس چھوٹی بڑی توپیں تھیں نجیب اللہ کے ساتھ چھ ہزار سوار اور بیس ہزار پیدل روہیلہ سپاہی تھے،

دھونڈے خاں اور حافظ رحمت اللہ کے ہمراہ چار ہزار سوار پندرہ ہزار روہیلے پیدل اور کچھ توپیں تھیں۔

احمد خاں بنگش کے ماتحت ایک ہزار سوار اور ایک ہزار پیدل اور کچھ توپیں تھیں کل تعداد اکتالیس ہزار آٹھ سو سوار اور اڑتیس ہزار پیدل اور ستر اسی کے لگ بھگ توپیں تھیں، یہ تو باقاعدہ فوج تھی، ان کے علاوہ رضاکار بھی تھے، جن کو ابدالی نے عقب لشکر پر رکھا ہوا تھا۔

فوج کا جائزہ لینے کے بعد احمد شاہ نے دو دن کی تیاری کے بعد کوچ کا حکم دیا دوسری طرف حریف بھی اپنے لشکر کا جائزہ لے رہا تھا، اس کی فوج کا شمار حسب ذیل ہے :-

(۱) ابراہیم خاں گردی	دو ہزار سوار نو ہزار پیدل	(۹) راجہ بٹھل شیودیو	تیس ہزار سوار
(۲) خاص پگاہ	چھ ہزار سوار	(۱۰) بلونت راؤ	سات ہزار سوار
(۳) ملہار راؤ ہلکر	پانچ ہزار سوار	(۱۱) پگاہ بسواس راؤ	پانچ ہزار سوار
(۴) جانکوجی سندھیا	دس ہزار سوار	(۱۲) پنڈارے سوار	پندرہ ہزار سوار
(۵) آماجی گائیکواڑ	تین ہزار سوار	(۱۳) انتاجی منیکر	دو ہزار سوار
(۶) جسونت راؤ پوار	دو ہزار سوار	(۱۴) راٹھور اور کچھواہ کیل	تین ہزار سوار
(۷) شمشیر بہادر	تین ہزار سوار	(۱۵) بھوانی شنکر	چھ ہزار سوار
(۸) بالاجی جادول	تین ہزار سوار	(۱۶) پیدل فوج	پندرہ ہزار

دو سو توپیں اور دیگر آتشی سامان حرب مرہٹوں کے ہمراہ تھا، اس فہرست میں دو نام ابراہیم گردی اور شمشیر بہادر ہیں، دونوں مسلمان تھے، کسی قوم میں غدار مشکل سے ملیں گے مگر مسلمانوں میں ان کی کثرت ہے،

۱۶ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو احمد شاہ تمام رات کوچ کرتا ہوا دوسرے روز دہلی سے اٹھارہ کوس کے فاصلہ پر ٹھہرا، احمد شاہ ایسے مقام کی تلاش میں تھا، جہاں سے جمنا عبور کر سکے۔ اگرچہ برسات ختم ہو چکی تھی مگر پانی ابھی تک چڑھاؤ پر تھا، شاہ نے دو روز روزہ رکھا، اور نماز فرائض اور نوافل میں بسر کئے، تیسرے روز ایک مقام جس کی جستجو تھی دریافت ہوا، مگر اس قدر تنگ تھا۔ کہ یہاں سے عبور کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا، پانی عمیق تھا، مگر اس سے بہتر کوئی اور مقام بھی نہ تھا،

۲۲ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو شاہ نے گھوڑا "بسم اللہ مجریہا و مرسہا" کہہ کر پانی میں ڈال دیا، اور بخیریت دوسرے کنارے پر آ لگا، دو دن میں کل فوج جمنا عبور کر گئی۔

بھاؤ نے پانی پت میں پڑاؤ کیا ہوا تھا، اس میں شہر بھی شامل تھا۔ احمد شاہ دریا عبور کرنے کے فوراً بعد دشمن کی طرف بڑھا، ۲۶ اکتوبر بوقت دوپہر دونوں فوجوں کے ہراول ٹکرائے، مرہٹے پسپا ہوئے۔ طرفین کا نقصان جان تین ہزار تک ہوا، احمد شاہ دلیرانہ بڑھتا گیا، کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں جس میں نقصان ناقابل ذکر خفیف ہی ہوا مگر احمد شاہ

برابر مرہٹوں کو دباتا ہوا چلا گیا۔ اب پانی پت کے میدان میں بھاؤ اور احمد شاہ کے لشکروں میں فاصلہ صرف چار کوس کا رہ گیا۔ احمد شاہ نے یہاں قیام کیا،

بھاؤ نے گوبند پنڈت کو بارہ ہزار سوار کے ساتھ ابدالی فوج کی رسد و سامانی کا سلسلہ منقطع کرنے کے لئے روانہ کیا، پنڈت درانی لشکر کے عقب میں میرٹھ تک بڑھ گیا اور کامیابی کے ساتھ سلسلہ توڑ دیا، ابدالی لشکر میں اضطراب پیدا ہوگیا معمولی آٹا پچھلے کا دو سیر بکنے لگا، احمد شاہ نے وزیر اعظم کے برادر زادے عطائی خاں کو دو ہزار چیدہ سواروں کے ساتھ علاوہ آٹھ ہزار رضا کاروں کے پنڈت کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا، عطائی خاں ملیغار کرتا ہوا ایک رات میں چالیس کوس نکل گیا، اور صبح دم غافل پنڈت پر بلائے ناگہانی کی طرح ملیغار کرتا ہوا نازل ہوا، مرہٹوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پنڈت نے راہ فرار اختیار کی، مگر ضعیف تھا کہ گھوڑے پر سنبھل نہ سکا، گرا اور درانیوں نے سر کاٹ لیا، جو احمد شاہ کے حضور عطائی خاں نے پیش کیا۔ اس کے بعد نہ بھاؤ کو دوبارہ جرأت ہوئی مادہ نہ ابدالی سپاہ کو رسد کی کمی محسوس ہوئی۔

سپاہ کو تنخواہ تقسیم کرنی تھی، بھاؤ نے دو ہزار سوار دہلی روانہ کئے۔ کہ روپیہ لائیں، خزانہ یہاں محفوظ تھا۔ حکم یہ تھا کہ چپکے رات کے وقت کوچ کریں۔ اور ایسا راستہ اختیار کریں جو عام گذرگاہ نہ ہو۔ بدقسمتی سے رات کے وقت واپسی پر ہر ایک سوار دو ہزار کی تھیلی لئے آرہا تھا سید ھا درانی کے لشکر کے قریب پہنچ گیا، مرہٹی زبان میں آوازیں دیں درانی سپاہیوں نے سمجھا کہ دشمن شب خون مارنے آیا ہے، چاروں طرف سے گھیر لیا، گم کردہ راہ مرہٹوں میں سے ایک بھی نہ بچا، تمام روپیہ درانیوں کے ہاتھ لگا،

احمد شاہ نے ایک سرخ خیمہ اپنے لشکر کے سامنے ایک کوس کے فاصلہ پر نصب کیا ہوا تھا، صبح کی نماز اسی جگہ ادا کرتا، نماز سے فارغ ہو کر اپنے بیٹے اور محافظ سواروں کے ساتھ گرداوری اور دشمن کی فوج کی دیکھ بھال کرتا، دوپہر کے بعد اپنے خیمہ میں جو مرکز میں تھا لوٹتا، روزانہ اس کا یہی معمول تھا۔

روزانہ دونوں فوجیں صف آرا ہوتیں، مرہٹوں کو شکست بھی ہوتی۔ بعض اوقات

سواروں میں مٹھ بھیڑ ہوجاتی، سرِ شام اپنے قیام گاہ کو لوٹ آتیں۔ تین ماہ تک یہی کیفیت رہی، تین دفعہ اچھی خاصی جھڑپیں ہوئیں، مگر فریقین پر اس کا اثر نہ ہوا، ہندوستانی نواب احمد شاہ سے کہتے کہ یہ جنگ زرگری کب تک رہے گی، احمد شاہ کہتا کہ

"حرب ایک فن ہے، دیگر امور جس طرح چاہو، طے کر لیا کرو لیکن لڑائی کے معاملہ میں دخل نہ دو!!"

ایک رات قریباً بیس ہزار آدمی جو مرہٹوں کے خیمہ و خرگاہ کی بار برداری پر متعین تھے، جنگل میں لشکر سے دور سوختنی لکڑی کی تلاش میں نکلے، درانی طلایہ شاہ پسند خاں کی زیر تحت لشکر کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ سب کو گھیرے میں لے لیا، صبح ہونے سے پہلے سب کا خاتمہ کر دیا۔ احمد شاہ کو اطلاع ہوئی تو موقعہ واردات کا معائنہ کیا، لاشوں کے تودے لگے ہوئے تھے اس واقعہ نے مرہٹوں کے دل ہلا دیئے، اور بھاؤ کے چہرہ پر بھی وہ ضبط کے آثار نہ رہے جو اس وقت تک بہ تکلف ظاہر کرتا رہا۔

نواب شجاع الدولہ کے لشکر میں بھاؤ کا ایک پرچہ نویس بھی تھا، مگر اس لئے کہ کوئی سردار نہ تھا، خط و کتابت کاشی راج کی معرفت ہی ہوتی، بھاؤ نے ایک مرصع پگڑی نواب کے پاس بھیجی، یہ پرانا دستور پگڑی بدلنے کا تھا، غرض یہ تھی کہ نواب بھی پگڑی بدلے گا، اور برادرانہ تعلق قائم ہو جائیں گے، اس کا اثر نواب پر خاطر خواہ ہوا، وزیر اعظم کو صلح پر آمادہ کر لیا، احمد شاہ نے کہا صلح اچھی چیز ہے، مگر اس میں نجیب الدولہ کی منظوری بھی ضروری ہے۔ نواب نے کاشی راج کو نجیب الدولہ کے پاس بھیجا۔ کاشی راج نے تمام حالات گوش گزار کیے اور کہا کہ تمام ہندوستانی سرداروں کی خواہش بھی یہی ہے کہ صلح ہو جائے،

نجیب الدولہ نے کہا کہ نواب کا رتبہ مجھ سے برتر ہے، مگر جوان ہے ابھی تک بات کی تہ کو نہیں پہنچا، یہ سب سیاسی چال دغا اور فریب ہے، دشمن جب لاچار ہو۔ تو ہر ایک شرط پر صلح کا خواستگار رہتا ہے۔ لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ آئندہ داغ بدنامی مٹانے اور اپنی وقار کی بحالی کے لئے وہ کچھ نہ کرے گا، تم نواب کی خدمت میں میری

طرف سے عرض کر دینا کہ میں خود خدمت میں حاضر ہو کر نشیب و فراز سمجھا دوں گا۔

دوسرے روز نجیب الدولہ احمد شاہ ابدالی سے ملا اور پختہ وعدہ لے لیا کہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہ کروں گا، اس کے بعد نواب شجاع الدولہ سے ملا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی مگر بے نتیجہ رہی۔ ادھر تو صلح و صفائی کی باتیں ہو رہی تھیں ادھر مرہٹوں کے لشکر میں قحط پڑا ہوا تھا۔ سرداران فوج بھاؤ کے پاس آئے اور کہا کہ اکثر سپاہی و... کے بھوکے ہیں مناسب ہے کہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں مارا یا مرے۔

بھاؤ نے کاشی راج کی معرفت نواب کو لکھ بھیجا، کہ اب پیمانہ لبریز ہو چکا ہے ایک قطرہ کی بھی گنجائش نہیں اگر صلح ہو سکے تو خیر ورنہ صاف جواب دو" یہ خط نواب کو صبح میں ملا۔ قاصد اور کاشی راج کو لے کر احمد شاہ کے پاس آیا، احمد شاہ نے پنڈت سے مزید حالات دریافت کئے اس نے بتایا کہ علی الصباح مرہٹے حملہ کریں گے، احمد شاہ گھوڑے پر ... ہوا جو ہر وقت کسا ہوا خیمہ کے باہر کھڑا رہتا۔ اور نصف کوس کا چکر لگایا، سرداران لشکر کو صفوں کی آراستگی کا حکم دیتا جاتا تھا۔ کہ اتنے میں کچھ درانی سوار مال غنیمت لئے سامنے سے گذرے سواروں سے پوچھا گیا کہ یہ مال کیسا ہے، انہوں نے حال بتایا کہ مرہٹے بھاگ رہے ہیں، احمد شاہ نے نواب کی طرف اور نواب نے کاشی راج کی طرف دیکھا، کاشی راج نے کہا کہ تم نے جو کچھ مجھے بتایا اس کی تصدیق صبح کے وقت ہو جائے گی، ان سواروں نے یہی ... کہا تھا سو سچ ہی جاشد کے بعد جہار راؤ بلکر بھی فرار کے لئے بے قرار ہو رہا تھا، موقع غنیمت دیکھ کر کھسک گیا، سواروں نے انہیں بھاگتے دیکھا اور جو کچھ وہ چھوڑ گئے مال غنیمت ...

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مرہٹے تو ڈیڑھ کوس کے قریب میدان جنگ میں آگے بڑھ آئے ایک دفعہ توپوں کی گرج سے میدان گونج اٹھا، احمد شاہ اس وقت بحالت سواری قلیان کے کش لگا رہا تھا، نواب کو کہا کہ تمہارا پنڈت سچ کہتا تھا، غذیر اعظم کو طلب کیا، تمام ... بھی جمع ہو گئے، سب کو نہایت اطمینان سے ہدایات دیں۔ اور ایک دفعہ پھر اپنی صفوں کے سامنے سے گذر گیا۔

سپیدۂ صبح نمودار ہو رہا تھا مرہٹوں کا رُخ جانب مشرق اور درانیوں کا منہ مغ...

کی طرف تھا، مرہٹوں کی توپیں بڑی اور بھاری تھیں، اور درانی لشکر سے بھی ان کا جواب نہ دیا گیا۔ البتہ وزیر اعظم کی طرف سے شلک ہوتی رہی، بہرحال ان کا اثر کچھ نہ ہوا،

ابراہیم گردی گھوڑا دوڑاتا ہوا بھاؤ کے سامنے آیا، اور کہا کہ آپ مجھ سے اس لئے ناراض ہیں کہ سپاہ کی تنخواہ کا مطالبہ کرتا تھا، مگر اب ہو تو شکایت کا نہیں جانبازی کا ہے" ادب سے سلام کیا اور اپنی فوج کے سامنے آ کر حکم دیا کہ توپوں کا منہ بند کر دو سنگینیں چڑھا لیں اور روہیلوں پر اس زور سے حملہ کیا کہ آٹھ ہزار روہیلے کھیت رہے، ان میں ایسی ابتری پھیلی کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ رہی،

حافظ رحمت اللہ بیمار پالکی میں سوار تھا، پالکی برداروں کو کہا کہ مجھے دھونڈے خاں کے پاس لے چلو، ادھر دھونڈے خاں حافظ کی تلاش میں تھا، ابراہیم گردی نے اگرچہ داد شجاعت دی مگر اس کے سات دستوں کا صفایا ہو چکا تھا، حافظ اور دھونڈے خاں کی فوج نے اس کو نرغہ میں لے لیا تھا، زخمی ہو کر گھوڑے سے گرا، اور گرفتار ہو گیا،

بھاؤ اور بسواس راؤ کا سامنا وزیر اعظم سے ہوا، درانی لشکر کی صفوں کو دیکھتے دیکھتے الٹ دیا، وزیر اعظم کا برادر زادہ عطائی خاں جس نے پنڈت گوبند کے مقابلہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی کام آیا، وزیر اعظم کی فوج پسپا ہو رہی تھی، وزیر اعظم خود لوہے میں غرق چلا رہا تھا کہ کہاں جاتے ہو، کابل دور ہے مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔ ایک بازو کے عقب میں شاہ شجاع اپنی فوج کے ساتھ کھڑا تھا، مرہٹے صفوں کو چیرتے ہوئے اس کے لشکر کے قریب آ گئے تھے، بھاؤ کو اب یقین ہو گیا تھا کہ میدان مار لیا، لیکن اس وقت میدان جنگ نے گرگٹ کی طرح رنگ بدل دیا،

احمد شاہ ایک بلند مقام پر میدان جنگ کے حالات دیکھ رہا تھا ہر کارے بھی برابر خبریں پہنچا رہے تھے، اس وقت روہیلہ سردار دھونڈے خاں اور وزیر اعظم مرہٹوں کے نرغہ میں تھے اپنی محافظ فوج کے پانچ سو سواروں کو حکم دیا کہ منتشر فوج کو جمع کرو اور جو بھاگے قتل

کردو، قریباً آٹھ ہزار سپاہی بھاگتے ہوئے چلے، نجیب الدولہ اور شاہ پسند خاں کو حکم ملا کہ وزیر اعظم کے میمنہ اور میسرہ پر قائم ہو کر حریف پر حملہ کرو۔

نجیب الدولہ کا سامنا جانکوجی سندھیا سے ہوا، دونوں میں خاندانی خصومت تھی، شاہ پسند خاں نے چکر کاٹ کر سندھیا کے عقب پر حملہ کیا، ایک گولی سندھیا کے بازو پر لگی گھوڑے سے لڑکھڑا کر گرنے کو تھا کہ ایک نیزہ شانہ میں پیوست ہو گیا، شاہ پسند کے آدمیوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا، سندھیا کی فوج کا صفایا ہو گیا،

اس وقت آفتاب نصف النہار طے کر چکا تھا، وزیر اعظم کے ساتھ آٹھ ہزار سوار جو احمد شاہ نے بطور کمک بھیجے تھے ملحق ہو گئے، ایک گھنٹہ تک لڑائی دست بدست جاری رہی، اللہ اکبر اور ہر ہر مہادیو کے نعروں سے میدان جنگ گونج رہا تھا، بسواس راؤ کی آنکھ کے اوپر ایک تیر لگا، زخم خفیف تھا مگر گھبرا کر ہاتھی سے اتر آیا، گھوڑے پر سوار ہوا، بھاؤ نے اپنا ہاتھی سواری کے لئے بھیج دیا، نجیب الدولہ اور شاہ پسند خاں نے اس سرعت سے حملے کئے کہ مرہٹے بدحواس ہو گئے، درانی لشکر نے تین طرف سے گھیرے میں لے لیا، وہ ہاتھی جس پر بسواس راؤ سوار تھا، نرغہ میں آ گیا، ایک سپاہی نے عماری پر چڑھ کر بسواس راؤ پر ولایتی ہاتھ ایسا دیا کہ تلوار رگِ گردن کاٹتی ہوئی رکی، مگر بسواس راؤ کا دم ہوا ہو چکا تھا۔ بھاؤ بھی کس مپرسی کی حالت میں مارا گیا، ساٹھ ہزار مرہٹے میدان جنگ میں کام آئے، جو بھاگے ان کو راستہ میں بھی پناہ نہ ملی، جاٹوں نے لوٹا،

جانکوجی سندھیا شاہ پسند کی قید میں تھا، سات لاکھ زرفدیہ پر رہائی کا وعدہ ہوا روپیہ کہاں سے دستیاب ہوتا، شاہ شجاع کو لکھا کہ اگر مدد کرو تو تمام عمر احسان نہ بھولوں گا، نواب زرفدیہ دینے کے لئے تیار ہو گیا، مگر شاہ پسند ڈر گیا، کیونکہ احمد شاہ کو بھی اس کی اطلاع ہو چکی تھی، چپکے سے سندھیا کا چراغ حیات گل کر دیا،

ابراہیم احمد شاہ کے حضور پیش ہوا، تو پوچھا۔

"کھو خاں صاحب اس جگہ کیسے آنا ہوا؟"

عرض کی کہ جانباز سپاہی ہوں حضور نوکر رکھ لیں تو سر فروشی کے لئے حاضر ہوں"

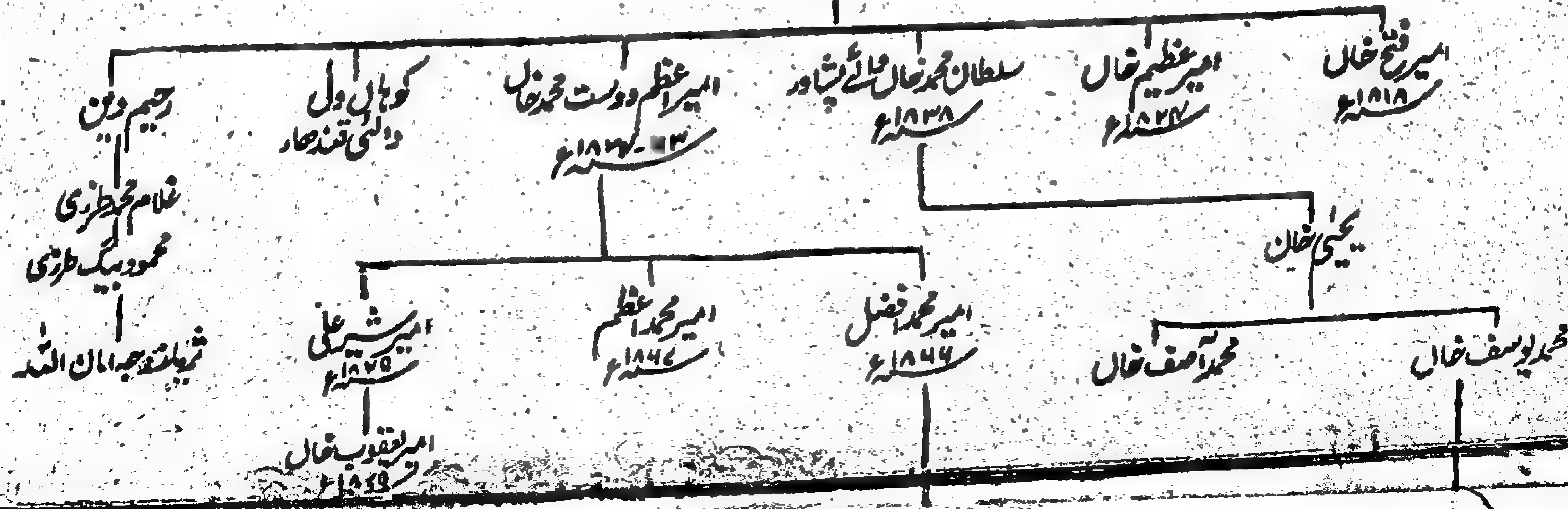
کہا کہ میں ایمان فروش سے کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا"

اشارہ ہوتے ہی گردن کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا،

بسواس راؤ کی لاش ہاتھی پر اور بھاؤ کا تن میدان جنگ میں اور سر ایک درانی سپاہی کے خیمہ میں تھا، تلاش ہوئی تو نواب شجاع الدولہ کی سفارش پر دیوان موتی لال کے حوالے کی گئیں اور نذر آتش ہوئیں،

دوسرے روز احمد شاہ پانی پت میں داخل ہوا، حضرت بو علی قلندر کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد دہلی کی طرف کوچ کیا، اور شالامار باغ میں آکر شاہ عالم کو تخت دہلی پر بٹھایا، نواب شجاع الدولہ وزیر ممالک ہند اور نجیب الدولہ امیر الامراء مقرر ہوا، اس انتظام کے بعد کابل کی طرف لوٹا، مرہٹوں کی کمر ٹوٹ چکی تھی اور وہ کھنڈ ہندوستان پر رام راج کا جو خواب دیکھ رہے تھے پریشان ہو کر رہ گیا، احمد شاہ نے انگریزوں کے لئے راستہ صاف کر دیا، سکھوں نے پنجاب میں اودھم مچا رکھا تھا، اگرچہ احمد شاہ ان کی سرکوبی خاطر خواہ کرتا رہا مگر اس کی وفات کے بعد اس کے پوتے زمان شاہ نے رنجیت سنگھ کو اپنا نائب السلطنت لاہور میں مقرر کیا۔ رنجیت سنگھ سکھوں کا اول اور آخر راجہ ہوا۔ اس کے بعد انگریزوں نے پنجاب کو بھی اپنے تسلط میں لے لیا،

ابدالی کے بیٹے تیمور شاہ کے چھتیس (۳۶) لڑکے لڑکیاں تھے ان میں سے بتیس صرف لڑکے تھے، امارت تو احمد شاہ کے خاندان سدوزئی میں رہی، اور وزارت حاجی جمال خاں محمدزئی کے خاندان میں رہی آخر اس کی اولاد نے امارت اور وزارت دونوں پر قبضہ کر لیا، امان اللہ امیر سے شاہ بنا انگریزوں سے نہ بنی، انہوں نے بچہ سقہ کو شہ دے کر کابل کے تخت پر بٹھا دیا، امان اللہ خاں "سوئزرلینڈ" میں اب زندگی کے دن کاٹ رہا ہے، اس کے بعد نادر شاہ بادشاہ ہوا، مارا گیا تو اس کا بیٹا ظاہر شاہ اب شاہ افغانستان ہے،


شجرہ نسب امیران و شاہانِ افغانستان
حاجی جمال خان محمدزئی
سردار پایندہ خان
امیر فتح خان
سنہ ۱۸۱۸ء
امیر عظیم خان
سنہ ۱۸۲۳ء
سلطان محمد خان طلائی پشاور
سنہ ۱۸۳۸ء
امیر اعظم دوست محمد خان
سنہ ۱۸۶۳ء
کوہاں دل
والئی قندھار
رحیم دل
غلام محمد طرزی
محمود بیگ طرزی
ثریا زوجہ امان اللہ
یحیٰی خان
محمد یوسف خان
محمد آصف خان
امیر محمد افضل
سنہ ۱۸۶۶ء
امیر محمد اعظم
سنہ ۱۸۶۷ء
امیر شیر علی
سنہ ۱۸۷۹ء
امیر یعقوب خان
سنہ ۱۸۷۹ء

امیر عبدالرحمٰن سنہ ۱۸۸۰ء

- امیر حبیب اللہ سنہ ۱۹۰۱ء
  - شاہ امان اللہ سنہ ۲۹، ۱۹۱۹ء
  - عنایت اللہ امیرزادہ
  - اسد اللہ خاں نائب وزیر اعظم سنہ ۱۹۲۹ء
- نصر اللہ

زوجہ حبیب اللہ خاں

- نادر شاہ سنہ ۳۳، ۱۹۲۹ء
  - ظاہر شاہ سنہ ۱۹۳۳ء
- محمد ہاشم خاں وزیر اعظم سنہ ۴۶، ۱۹۲۹ء
- محمد عزیز خاں سنہ ۱۹۳۳ء میں برلن میں مارا گیا
  - داؤد شاہ
  - نعیم شاہ
- شاہ ولی سفیر لندن
- شاہ محمود خاں وزیر اعظم سنہ ۱۹۴۶ء

امیر عبدالرحمٰن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۸۹۵ء میں "کافرستان"ؔ
مسخر کیا اور یہاں کے لوگوں کو حلقہ بگوش اسلام کیا، امان اللہ عبدالرحمٰن کے پوتے سے سیاسی
غلطی یہ ہوئی کہ ثریا بیگم کو ساتھ لے کر یورپ کی سیر کے لئے روانہ ہوگیا، حالانکہ شاہی حاصل کئے
تھوڑا عرصہ ہی گزرا تھا۔ انگریزوں نے اس کے بے پردہ فوٹو افغانستان کے طول و عرض میں اس
کی عدم موجودگی میں نشر کئے، ملا شور بازار نے لوگوں کے مذہبی جذبات کو ابھارا، جب شاہ
واپس آیا تو انگریزوں نے بچہ سقہ کو مدد دے کر مقابلہ کے لئے کھڑا کر دیا، امان اللہ نے بھاگ کر
سوئٹزرلینڈ میں پناہ لی، ہم نے تو اسی وقت جب وہ سفر یورپ پر روانہ ہوا تھا کہہ دیا تھا کہ

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی — کیں راہ کہ تو میروی بہ انگلستان است

اگر چند ملاؤں کے ساتھ حج بیت اللہ کرتا تو عقیدت بھی لوگوں میں پیدا ہو جاتی اور
یہ روز بد نہ دیکھتا، اب زبان حال سے مسلم ارباب حکومت کو کہہ رہا ہے کہ

"من نہ کردم شما حذر بکنید"

تاریخی واقعات میں ایک سبق ہے "فرخندہ بخت آنکہ بسمع رضا شنید"

سردست اب ہم ہندوستان کی حدود سے باہر پھر سے ایران و شام و عرب و
افریقہ کی طرف جاتے ہیں، ہندوستان اور افغانستان کے قریب تر ایران ہے۔

ایران

خلفاء بنو امیہ کے دور دورہ میں ایران حلقہ بگوش اسلام ہو چکا تھا، عباسیہ
کے دور خلافت میں مامون رشید کے بعد اکثر والیان ولایات ایران خود مختار ہو گئے۔ اور
طوائف الملوکی شروع ہو گئی۔ ان کے حالات ہم نے آل طاہر کے تذکرہ میں کئے ہیں، چنگیز خاں کے
پوتے ہلاکو خاں نے بیٹے پانچ بیٹوں میں مملکت ایران تقسیم کر دی تیمور نے ایران پر تسلط جمایا۔ تو اس
کے بیٹے یہاں حکمران رہے، آخری تاجدار سلطان ابو سعید ہے یہ دور حکومت تیموریہ ایران میں ختم ہوا
تو صفوی بادشاہوں کی باری آئی

ؔ کافرستان کو اب نورستان اور جدید الاسلام بھی کہتے ہیں۔

خاندانِ صفویہ

شاہ صفی الدین

شاہ صدر الدین

شاہ علی

شاہ جنید

سلطان جنید

(۱) شاہ اسمٰعیل (۹۰۸ھ)

(۲) شاہ طہماسپ (۹۳۲ھ)

(۳) شاہ اسمٰعیل ثانی (۹۸۳ھ)

(۴) شاہ محمود خدابندہ (۹۸۵ھ)

(۵) شاہ عباس (۹۹۶ھ)

صفی مرزا

(۶) شاہ صفی ثانی (۱۰۳۹ھ)

(۷) شاہ عباس ثانی (۱۰۵۲ھ)

(۸) شاہ سلیمان (۱۰۷۷ھ)

(۹) شاہ صفی ثالث (۱۱۰۶ھ)

صفوی خاندان کے مورثِ اعلیٰ شاہ صفی الدین کا پوتا شاہ علی "اردبیل" واقع آذربائیجان میں تھا، حلقہ ارادت وسیع تھا، امیر تیمور آپ کا بہت معتقد تھا، جب بایزید یلدرم کو شکست دے کر اردبیل میں آیا تو شاہ علی کی خدمت میں حاضر ہو کر زر وجواہر مالِ غنیمت میں سے کچھ بطور نذرانہ پیش کئے، شاہ صاحب نے قبول نہ فرمائے، اور فرمایا کہ اگر دیتے ہو تو سب امیرانِ جنگ جو شام اور بایزید کی شکست کے بعد تمہارے پاس ہیں میرے حوالے کر دو، امیر نے دے دیئے، اب شاہ صاحب نے ان کو آزاد کر دیا، اور وطن جانے کی اجازت دی، مگر وہ کچھ ایسے گرویدہ ہوئے کہ جدا ہونا پسند نہ کیا، اور سب مریدانِ باصفا کے زمرہ میں شامل ہو گئے، یہ اور دوسرے مرید آخر میں "قزلباش" کہلائے۔ جب شاہ اسمٰعیل آبائی مسندِ ارشاد پر بیٹھے تو ان ہی لوگوں نے کشور ستانی کی ترغیب دی، ایران طوائف الملوکی تھی بسہولت مسخر ہو گیا۔

خاندانِ صفوی کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ مذہب شیعہ اثنا عشریہ کو ایران کے طول میں رائج کیا، اس مذہب کی اشاعت بہت عرصہ پہلے ہو رہی تھی، اور ایران ہی اس کی ترویج کے لئے مناسب سرزمین ہے، حضرت علی نے جب مدینہ سے کوفہ میں دار الخلافت منتقل کیا تو مجوسی طرفداروں کی ہئیت میں فرق نہ آیا، ان میں سے ہر ایک فرقہ کے عقائد کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ امر مشترک سب میں ہے، کہ خلافت کا حق بنو فاطمہ کا ہے، اور جن بزرگوں نے اس خاندان کو ان کے جائز حق سے محروم کر دیا اور کافریا فاسق نہیں تو قابلِ ملامت اور بعض کے نزدیک قابلِ لعنت ہیں،

شیعوں کے بہت فرقے ہیں اور ایک سے ایک بڑھ کر غالی ہے یہ غلو خاندان صفویہ نے خاطر خواہ پیدا کیا، وہ اور ان کے مرید علانیہ اصحاب کبار کو سب وشتم سے یاد کرتے تھے یہ تبرا ان کے مذہب کا جزو اعظم ہے، ظاہر ہے کہ حقِ خلافت پر کسی مذہب کی بنیاد سیاسی ہی ہو سکتی ہے، لیکن جب کسی شخصیت کی ذات میں دنیوی اور دینی حکومت "امامت"

چوں تو سیاسی عقاید کو دینی عقائد سے علیحدہ کرنا مشکل ہے بہرحال حضرات شیعہ شخصی حکومت دینی اور دنیوی کے قائل ہیں، اور اس حکومت کو صرف نبو فاطمہ میں محدود رکھتے ہیں،
شاہ اسمٰعیل کے عہد میں ایران میں سنی مسلمانوں کا قتل عام ہوا، شاہ نے پہلے ہی اعلان کردیا تھا کہ تمام سنی مسلمان اس کی مملکت سے نکل جائیں، اگر رہنا چاہتے ہیں تو ان کو مذہب اثنا عشریہ تسلیم کرنا پڑے گا، مجتہدین کا ایک وفد شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ یہ فرمان مذہب کے خلاف ہے، اور ویسے بھی سیاسی تدبر کا تقاضہ ہے۔ کہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہ کی جائے، "لا اکراہ فی الدین" اگر ایران میں لاکھوں سنی ہیں تو سلطان روم و شام کی عملداری میں بھی لاکھوں شیعہ اس کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اگر وہاں ردعمل شروع ہوا، تو نقصان جان و مال یکساں ہیں، علاوہ ازیں اختلاف ایک فرعی عقیدہ کا ہے، سنی حضرت علیؓ کا ویسے ہی احترام کرتے ہیں، جیسے دیگر خلفاء کا، البتہ خارجی حضرت علیؓ کی خلافت کے قائل نہیں ہیں، اور ہماری مملکت میں کوئی خارجی نہیں"

صفوی شاہ اسمٰعیل افیون کے رسیا تھے، مجتہدین نے بہت سمجھایا ایک نہ سنی، شاہ اسمٰعیل نے کہا، کہ میرے یار دیار حافظ و ناصر دوازدہ امام ہیں، مجھے سلطان روم کی عسکری قوت کی ذرا بھی پرواہ نہیں، سنیوں کا دھڑ قتل عام شروع ہوا تو شام میں سنی مشتعل ہوئے وہاں شیعوں کا ہوا، سلطان نے یہ آتش فتنہ جلدی بجھا دی مگر اس بدعت کے مرغنہ شاہ اسمٰعیل پر فوج کشی کی چونکہ شاہ میں مقابلہ کی تاب نہ تھی، ترکی سپاہ کے راستے پر حدود کے قریب چند دیہات ویران کر دیئے، اس لئے ترکوں کو چارہ وغیرہ کی سخت تکلیف ہوئی، شاہ اسمٰعیل بھاگ رہا تھا، اور سلطانی لشکر تعاقب میں تھا سلیم نے زنانہ لباس اور ایک زنانہ لباس اور ایک ڈبیا میں افیون بھیجی، یہ طعن کارگر ہوا، اور دونوں لشکروں میں معرکہ آرائی ہوئی، ترکی توپ خانہ کا جواب نہ تھا، شاہ زخم خوردہ تبریز کی طرف بھاگا، سلیم نے پیچھا نہ چھوڑا ناچار شاہ نے کچھ تحائف اور ہدیہ دے کر صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ صلح ہوگئی،

آنچہ دانا کند کند ناداں لیک بعد از ہزار رسوائی

شاہ عباس اور سلیم کے جانشین سلیمان سلطان روم میں بھی لڑائی ہوئی، اس میں بھی

صفوی شاہ کو نیچا دیکھنا پڑا، مزید حالات سلاطین روم و شام کے تحت لکھے جائیں گے۔

شاہ طہماسپ کے عہد میں ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر ایران میں آیا ایک قطعہ لکھ کر شاہ کے حضور میں پیش کیا، جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:۔

دشمنم شیر است و عمری لیست بر من کردہ است ۔۔۔ چاہئے از کین و عداوت زدہ با من کردہ است

التماس از شاہ این دارم کہ با من آن کند ۔۔۔ آنچہ با سلمان علی در دشت ارژن کردہ است

ان اشعار میں اس قصہ کی طرف اشارہ ہے، کہ حضرت علیؓ نے سلمان کو دشتِ ارژن میں ایک شیر کے پنجہ سے چھڑایا تھا، ہمایوں کا دشمن بھی شیر شاہ تھا، اس لئے شاہ سے یہ توقع تھی کہ اسے بھی حضرت علیؓ کی طرح شیر کے پنجہ سے چھڑائے گا، گویا ہمایوں سلمان فارسی اور شاہ حضرت علیؓ کی جگہ ہیں، شاہ نے مدد دی اور ہمایوں پھر سے ہندوستان پر قابض ہو گیا،

صفوی خاندان کی توجہ زیادہ تر عراق اور ہرات اور قندھار کی طرف مبذول رہی، عراق میں وہ تاریخی مقدس مقامات ہیں جن سے شیعہ مذہب کی روایات وابستہ ہیں نجف جہاں حسب روایات حضرت علیؓ مدفون ہیں، کربلا جہاں حضرت امام حسین شہید ہوئے اور کاظمین واقع بغداد، اس لئے ان مقامات کو اپنے قبضہ تصرف میں رکھنے کے لئے ان کو سلاطین روم و شام سے الجھنا پڑا، دوسری طرف ہرات و قندھار پر تسلط محض ہوس ملک گیری تھی اور یہاں ترکوں بالخصوص ازبکوں اور افغانوں سے لڑنا پڑا، اس خانہ جنگی نے صفوی حکومت کی بنیاد کھوکھلی کر دی،

عراق و عجم میں شیعہ آبادی کی اکثریت پہلے بھی تھی، صفوی خاندان کے دور دورہ میں اس کو اور بھی تقویت ملی، اور سنی بڑے شہروں ہی میں رہ گئے، اس مذہبی مناقشات کا فائدہ برطانیہ نے خوب اٹھایا، اور عراق اور ایران پر اپنا اقتدار جما لیا،

ہرات اور قندھار ہمیشہ سے شاہان ایران اور ترکوں اور افغانوں میں نزاع کا موجب رہے ہیں، جب مغلیہ سلطنت ہندوستان میں قائم ہو گئی، تو بابر سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر تک خاندان صفویہ سے ان ولایات پر کبھی ایرانیوں اور کبھی مغلوں کا قبضہ رہا۔ اور کبھی مغل اور کبھی ایرانی لڑائیوں میں غلبہ حاصل کرتے رہے، جب احمد شاہ ابدالی نے افغانستان

حکومت قائم کرلی تھی ہرات اور قندھار اور ملحقہ علاقہ سمرقند اور بخارا اور بدخشاں دونوں حریف سلطنتوں کے لئے کشمکش کا باعث بنا رہا، اس کا فائدہ بھی گورنمنٹ برطانیہ نے خاطر خواہ اٹھایا جب کبھی افغانوں کی توجہ ہندوستان سے ہٹانا منظور ہوتا ایرانیوں کو اکساتے اور جب ایرانیوں پر اپنا اقتدار ڈھیلا پڑتا دیکھتے تو افغانیوں کو ایرانیوں سے لڑا دیتے، ہندوستان پر اپنی گرفت محکم رکھنے کے لئے یہ ناگزیر امر تھا، کہ برطانیہ ایران اور افغانستان پر اپنا اقتدار قائم رکھے، ہرات روسی سرحد سے قریباً پچاس میل کے فاصلہ پر ہے، اور روسی حملہ کے لئے راستہ کھلا ہے، ہمارے اپنے زمانہ کے تواریخی واقعات کا تقاضا ہے۔ کہ یہ واقعات اچھی طرح ذہن نشین ہوں۔ جو شاہان ایران اور سلاطین روم اور امیران افغانستان کی باہمی چپقلش کے باعث ظہور میں آئے، ان واقعات کو ہم مناسب مقام پر بیان کریں گے۔ سردست ہمیں ایران کی ابتدائی تاریخ جو صفوی خاندان اور اس کے جانشین خاندانوں سے تعلق رکھتی ہے بیان کرنا ہے،

غلزئی

مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ غلزئی اصلی پٹھان ہیں "محمد بن نجیب بکران" اپنی تاریخ "جہاں نامہ" میں جو اس نے ۶۲۵ھ میں لکھی، قبیلہ غلجی کو جو ہندوستان پر حکمران رہا، ترک لکھتا ہے، جو "خلج" سے زابلستان میں آکر آباد ہوا۔ لیکن دیگر مورخین غلجیوں کو غلزئی ہی کہتے ہیں، جو اصل باشندگان "تہر سلیمان" کے سلسلہ کوہ میں قدیم الایام سے رہائش رکھتے ہیں، اور یہی مقام پشتون یا پختون یا پٹھان کی جنم بھومی ہے "طبقات ناصری" میں یا جو ضیاء الدین برنی نے لکھی اس کی معقول تشریح کی گئی ہے۔ عرب جغرافیہ دان "اصطخری" چونکہ پٹھانوں کو بھی ترک ہی سمجھتا رہا، اس لئے اس نے بھی قبیلہ غلزئی کو ترک ہی خیال کیا، اور اسی کی تحریر سے غلط فہمی محمد بن نجیب کو بھی ہوئی، بہر حال غلزئی پٹھان خانہ بدوشی کی حالت میں اپنے بھیڑ بکری کے ریوڑ کے ساتھ بلخ اور ترکستان وغیرہ ممالک تک نکل جاتے مگر ان کا وطن مالوف غور کی پہاڑیاں تھیں جہاں وہ پھر پھرا کر آجاتے۔ جہاں "ہری رود" ہے، ہمارے موضوع کا تعلق اس بحث سے نہیں کہ یہ ترک ہیں یا پٹھان، اور یہ کہ دونوں اصل میں ایک ہیں، یا علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔ ہمیں صرف یہ جاننا کافی ہے کہ یہ پٹھان ہیں،

اور پشتو بولتے ہیں،

شاہ عباس صفوی کے عہد میں قندھار اور ہرات ایرانی سلطنت میں شامل تھے قندھار میں پٹھان اکثر شورش برپا رکھتے، اس لئے ان میں سے اکثر کو ہرات میں جلا وطن کیا گیا۔ یہ ابدالی پٹھان تھے قندھار کے قرب میں غلزئی رہتے تھے۔ ان کی بن آئی اس وقت شاہ عالم مغلیہ شہزادہ جو بعد میں بہادر شاہ کے لقب سے بادشاہ ہوا۔ کابل کا والی تھا، اس سے ساز باز کی، یا اس نے ان سے سازش کی، مغلیہ شہزادہ تو کامیاب نہ ہوا غلزئی تقویت پکڑتے گئے۔ اور قندھار پر قابض ہو گئے۔

اس وقت صفوی خاندان پستی کی طرف سرعت سے جارہا تھا، ۱۷۲۱ء میں غلزئی سردار محمود نے اصفہان پر لشکر کشی کی اور اصفہان کی تسخیر کے بعد صفوی تخت پر متمکن ہو گیا، چار سال بعد محمود مارا گیا اور اس کا چچیرا بھائی جانشین ہوا، اور طہران پر قابض ہو گیا، اس وقت شاہ طہماسپ ثانی آبائی ملک واپس لینے کے لئے جد وجہد کر رہا تھا ایک فوجی افسر نادر قلی بیگ نے اس آڑے وقت میں بگڑا ہوا کام سنوار دیا، ہرات پر ابدالی قابض تھے، ان کو نیچا دکھایا، اور ان میں سے اکثر کو اپنے لشکر میں شامل کر لیا اسی افغان دستہ کا افسر احمد شاہ ابدالی تھا، اس نے غلزئی سے اصفہان اور طہران لے لیا اس کے بعد نادر نے طہماسپ ثانی کے بیٹے شاہ عباس ثالث کو برطرف کر کے خود تاج و تخت سنبھال لیا، نادر "قزلو" تھا، جو قبیلہ افشار کی ایک شاخ ہے" اور اس کی اصل ترک ہے، آخری دور حکومت میں اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ مذہب کے نام پر جو مناقشات اور شر انگیز تفرقہ مسلمانوں میں پیدا ہو گیا ہے، اس کا انجام کیا ہوگا، اس لئے کوشش کی کہ سنی اور شیعہ کا جھگڑا ختم کیا جائے۔

اس نے سنی علماء اور شیعہ مجتہدین کو ایک جگہ اکٹھا کیا، اور ہدایت کی اختلافی مسائل کے تصفیہ کے بعد دونوں ایک ہو جائیں، دونوں میں گفتگو کا نتیجہ خوشگوار رہا۔ مگر شر پسند طبقہ نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا، نادر کے بیٹے کو لگا دی کہ نادر سنی مذہب قبول کر چکا ہے ادھر نادر کو بھڑکایا کہ تیرا بیٹا بغاوت پر آمادہ ہے، باپ بیٹے میں بگاڑ پیدا ہوا تو بیٹے کی

آنکھیں نکلوا دیں، نادر کو جب اصل حالات کا علم ہوا تو قزلباشوں کی شامت آ گئی، بڑے بڑے سرغنے قتل ہوئے، مورخین نے غلط فہمی سے یہ رائے قائم کی ہے کہ نادر آخر عمر میں دیوانہ سا ہو گیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ قزلباش نادر اور نادر شاہی کا خاتمہ کرنے کے لئے تلے ہوئے تھے، لیکن نادر کے لشکر میں ہزاروں افغان تھے ان کی موجودگی میں علانیہ جرأت نہ ہوئی تو رات کے وقت جب وہ سویا ہوا تھا کام تمام کر دیا، افغان محافظ فوج کا افسر احمد شاہ تھا، جب اُسے معلوم ہوا کہ نادر مارا گیا تو اس کے سوا چارہ کار نہ تھا کہ قزلباش محافظ دستہ سے لڑ بھڑ کر اپنا راستہ صاف کرے اس طرح بخیریت قندھار پہنچ گیا،

خاندان قاچار شاہ عباس ثانی نے بحیرہ خضر (Caspian Sea) کے جنوب مغربی میدانوں میں ایک ترکی قبیلہ "قاچار" بسایا، جو رفتہ رفتہ اتنی طاقت پکڑ گیا کہ ایران پر قابض ہو گیا،

نادر کے بعد کریم خاں زند ۱۷۵۰ء سے ۱۷۷۹ء تک حکمران رہا، زند ایک قبیلہ فارس کے جنوب میں آباد ہے، اس کا پایہ تخت شیراز تھا، اس کے عہد میں شیراز نے ہر لحاظ سے بہت ترقی کی، اور کریم خاں کا عہدِ سلطنت کی برکات کی یاد اہلِ ایران کے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے، اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ اس کی وفات کے بعد مختلف قبائل میں تخت فلج کے لئے کشمکش جاری رہی، اور امن پسند لوگوں کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا، آغا محمد خاں نے قبیلہ قاچار کو متحد کیا، ۱۷۹۴ء میں ایران پر قابض ہو گیا، اگرچہ مخنث تھا، مگر عسں بربریت اور سفاکی سے کام کیا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ شاید ہی سلاطین میں سے کوئی شخص فرعون کے بعد ایسا گزرا ہے کہ جس کے نام پر لوگ لعنت بھیجتے ہیں۔

لڑکپن میں آغا ایک ایسے دشمن قبیلہ کے ہاتھ پڑا جس نے اُسے مخنث بنا دیا، غالباً اسی کا انتقام تھا جو اس نے اہلِ ایران سے لیا، اہلِ ایران نے اطمینان کا سانس لیا جب ایک ہی سال بعد کسی دل جلے نے اُسے قتل کر دیا۔

اس کا برادر زادہ فتح علی جانشین ہوا، تو ملک کی اندرونی بدنظمی کا فلکۂ روس نے یہ

اٹھایا کہ جارجیا (Georgia) کا علاقہ دبالیا، فرانس اور انگریزوں میں یورپ اور ہندوستان میں اقتدار کے لئے رسہ کشی ہو رہی تھی، اور دونوں ایران میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں لگے ہوئے تھے، فتح علی نے فرانس کی مدد کی درخواست کی۔ شہنشاہ نپولین (Emperor Napoleon) ایک مراسلہ میں شاہ ایران کو یہ دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ دیتا ہے کہ ایک ایسی قوم سے جو تجارت پیشہ ہے اور اپنے ہی مفاد کی خاطر سلاطین ہند کے تخت و تاج کو بھی تجارتی مال کی طرح مبادلہ اشیاء سے زیادہ وقعت نہیں دیتی شاہ کو ان سے کوئی تعلق دوستانہ نہیں رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۸۰۷ء میں فرانس اور ایران میں ایک معاہدہ ہوا، فرانس نے مدد تو دی مگر کامیابی نہ ہوئی۔

روس کے دانت در اصل ہندوستان پر تھے۔ محمد شاہ قاجار کے عہد میں ۱۸۳۷ء میں روس دونوں حریف طاقتیں بساطِ سیاست پر ایران اور افغانستان کو اپنے مہرے سمجھتے تھے "دو عاقل را نباشد کیں و پیکار" یہ شاطر پس پردہ تھے، اور ان کی انگلیوں کے اشارے ایران اور افغانستان ناچتے رہے۔ انگریز فائدہ میں رہے وہ چاہتے تھے کہ ہمسایہ ملک افغانستان ایران سے الجھا رہے، اور ہندوستان سے اس کی توجہ بالکل ہٹ جائے کی کامیابی کا راز اس میں تھا کہ روس میں شخصی حکومت تھی، اور ملک کے طول و عرض میں بغاوت کا جال پھیلا ہوا تھا، اور زار روس جو بھی تخت نشین ہوتا اپنی جان سے پہلے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا حکومت روس اندرونی خرخشوں کو مٹانے میں زیادہ مصروف رہتی، انگریزوں میں بھی اگرچہ شخصی حکومت تھی، مگر بادشاہ برائے نام ہی تھا، اور اب بھی اس کی حیثیت ایک ربڑ سے زیادہ نہیں۔ یہاں دستوری (Parlimentary) حکومت ہے اور تمام اختیارات عوام کے نمائندہ صدر اعظم (Premier) اور اس کی کابینہ (Cabinet) کو حاصل ہے، ان لوگوں نے اقتدار کا راز معلوم کر لیا تھا اور یہ وہی کچھ ہے جو ایک عرب قبیلہ فنیقی (Phenocians) نے صدہا سال پیشتر معلوم کیا تھا۔ کہ "یہ تجارت میں ہے"!

یہ راز ان سے پیشتر اہلِ ہالینڈ نے معلوم کیا، اور ان کی تقلید انگریزوں بھی کی

مناسب مقام پر اس کی وضاحت کی جائے گی۔

ہرات اور قندھار کے لئے ایران اور افغانستان میں لڑائی جاری رہی، ایران اب بیرونی ممالک کے سیاسی جال میں پھنس چکا تھا۔ اور اس سے مخلصی کی اب کوئی راہ نہ تھی۔ اگر ہندوستان کی طرح یہاں بھی لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تو ایران کا حشر بھی ہندوستان کی طرح ہوتا، لیکن صفوی خاندان کے سیاسی تدبر نے ایرانیوں کو ایک قوم بنادیا، ایک زبان پارسی اور ایک مذہب اثنا عشری نے ان کو متحد کر دیا، لیکن ان کے مذہبی عقائد میں ایک خامی ایسی رہ گئی کہ زمانہ کے ذہنی ارتقاء کے نامناسب تھی، یہ عقیدہ شخصی حکومت کا حامی رہا۔ اس لئے ایک قبیلہ کے بعد دوسرا قبیلہ جس کو ذرا طاقت حاصل ہوئی۔ ایران کا مالک بن بیٹھا، چند سال "کوس لمن الملک" بجایا اور "رخت منزل بدیگرے پرداخت"۔

انگریزوں اور روسیوں کے لئے یہ سہل سی بات تھی کسی قبیلہ کو شہ دے کر کھڑا کر دیا اس لئے زبان اور مذہب کی یک رنگی بھی کام نہ آئی۔ علاوہ ازیں ایران ہر ایک ضروری امر میں اغیار کا محتاج تھا، فتح علی کو اسلحہ کی ضرورت تھی، تو دولِ یورپ کے آگے دستِ سوال دراز کیا۔ اب دولِ یورپ کے مشن کی آمد و رفت شروع ہو گئی، محمد شاہ قاچار نے دیکھا یورپ کی منظم فوج کا مقابلہ ایرانی نہیں کر سکتے، دولِ یورپ سے لڑائی مول لینے کی ضرورت تو نہ تھی، ہمسایہ ممالک افغانستان اور ترکوں کو نیچا دکھانا منظور تھا اس لئے فرانس سے معلم آئے۔ انگریزوں اور فرانس میں اقتدار کے لئے پہلے ہی کش مکش جاری تھی۔ ایران میں نہ تو روس اور نہ فرانس کا اقتدار پسند کر سکتے تھے۔ ناصر الدین شاہ قاچار تخت نشین ہوا ۱۸۴۸-۹۶ء، تو افغانستان سے لڑائی چھڑ گئی، ۱۸۵۶ء میں ہرات تو لے لیا مگر انگریز آدھمکے، بلکہ ایران کے خلاف اعلان جنگ بھی کر دیا، افغانوں کی مدد کی۔ اور ناصر الدین کو ہرات چھوڑنا پڑا۔

ایران خوانِ یغما تھا، انگریزوں اور فرانسیسیوں اور آسٹریا اور اٹلی کے فوجی اور تجارتی مشن یکے بعد دیگرے آنے شروع ہوئے۔ روس نے بھی اپنی خدمات پیش کیں "ایرانی

کاسک (Cossack) کی تعلیم و تربیت روسی وضع پر روسی جرنیلوں کے تحت ہونے لگی،

برطانیہ ایران میں بالخصوص ساحلی علاقہ پر قدم استقلال کے ساتھ جمانا چاہتا تھا۔ ایران بھی چاہتا تھا کہ یورپ کی ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ قدم بقدم چلے لیکن سیاسی نقطہ نظر سے اس نے غلط روش اختیار کی او وہ بہشت میں اطمینان کی پائی مردی سے داخل ہونا چاہتا تھا، اگر وہ جاپان کی تقلید کرتا، اور جوانان ایران کو یورپ کے مختلف ممالک میں علوم و فنون کی تعلیم کے لئے بھیجتا رہتا تو اس کی تاریخ کا نیا باب کھلتا، تار برقی کا سلسلہ برطانیہ نے ایران میں قائم کیا۔ رایوٹر (Baron Reuter) نے قومی بنک کھولا جو بعد میں شاہی بنک سے موسوم ہوا، برطانیہ نے دریا "قرون" میں جہاز رانی کا واحد اجارہ بھی حاصل کیا،

آج تک شاہان ایران میں سے کسی نے بھی اپنے ملک سے باہر سیر و سیاحت کو قدم نہیں رکھا تھا، یا تو بحیثیت فاتح یا بحالت جلاوطنی ہی مجبوراً باہر جانا پڑا تا صرف قاچار نے یورپ بالخصوص انگلستان کا سفر ۱۸۷۳ء میں کیا، اس سفر کے حالات اس نے آپ ہی لکھے ہیں، شاید سفر کی غرض یہ تھی کہ دول یورپ کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور معلوم کرے کہ وہ کیا اسباب ہیں کہ وہ کرۂ ارض پر چھائے ہوئے ہیں یہ حقیقت اس کے ذہن نشین ہو گئی یا کی گئی کہ مغربی طرز حکومت اور علوم جدیدہ میں ان کی ترقی کا راز ہے لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ ارتقار ذہنی اور خارجی حالات کے مناسب ہی ہوتا ہے اسی حد تک ممکن ہے، جس حد تک وہ اجازت دیں، اور یہ کہ محض نقالی "قروۃ الخاسین" طرح کچھ مفید نہیں، حکومت کی خواہ کوئی صورت ہو، وہ بہر حال ایک صورت ہے اور جب تک اس میں روح حیات کارفرما نہ ہو وہ محض ایک بے جان پتھر کی مورتی ہے۔ اصلاح کی کوشش تو بہت کی مگر [illegible] ماندہ و درماندہ ہو کر کہنا پڑا کہ

"اصلاح ایران کے حسب حال نہیں"

جب دول یورپ کو علم ہوا کہ مجلاہ اصلاح کا ارادہ عملاً چاہتا ہے اور یہ توانائی میں

حالات تھی کہ اصلاح کے "گر" بھی لوگ جانتے ہیں، ہیں گئے ان حضرات نے اپنی خدمات پیش کیں لیکن ایک شرط مراعات" بھی تھی، ان کی باہمی رقابت اور سیاسی چالوں اور باہمی نخوت نے ان کا کھیل بگاڑ دیا، ایرانیوں کا اعتماد یورپ والوں پر نہ رہا اور شاہ نے بھی تنگ آکر کہہ دیا کہ میں چاہتا ہوں کہ کوئی یورپین سرزمین ایران پر نہ رہے۔ ورنہ آئندہ یہ قدم نامبارک ومسعود یہاں آئے، لیکن حالات اب ایسے پیدا ہو چکے ہیں کہ

"باہمیں مرداں بباید ساخت   چہ تواں کرد مرداں ایں اند"

محمد علی باب محمد شاہ اور ناصر الدین کے عہد کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک شخص محمد علی المقلب بہ "باب" نے دعوئے مہدویت کیا۔ یہ شخص سید تھا، اور توقع تھی کہ سادات پرست اسے کم از کم اپنا امام تسلیم کریں گے، حق خلافت تو تسلیم شدہ عقیدہ ہے، لیکن شاہ قاچار کو اس طرح تخت و تاج سے محروم ہونا پڑتا۔

محمد علی کا یہ دعوئے تھا۔ کہ اس کی ذات میں دو اوصاف جمع ہیں ایک تو وہ مدینۃ العلم محمد ہے، اور دوسرے "باب علم" علی ہے۔ اب زیر بحث "علم" تھا، مجتہدین عصر نے اس کا جائزہ لیا تو وہ کورا نکلا، اس کی تقریر و تحریر میں جب صرف و نحو کی غلطیاں اس پر واضح کی گئیں، تو کہا کہ میں ان قواعد کا پابند نہیں ہوں۔ بلکہ قواعد صرف و نحو میرے پابند ہیں، اس کے داعیوں میں سے ایک نوجوان حسین عورت "طاہرہ" نامی تھی۔ شعر بھی اچھے کہتی تھی اس نے بے پردہ ایران میں دعوت محمد علی شروع کر دی، اس کی والہانہ عقیدت اور حسن دجال نے وہ اثر کیا جو دعوئ "علم" بھی نہ کر سکا،

اب حکومت کے کان کھڑے ہوئے، محمد علی اور اس کے داعیان اور یہ داعیہ بھی گرفتار ہوئے اور آخر مارے گئے۔ لیکن شاہ کو عقیدت مندوں نے چین نہ لینے دیا یہ بھی ۱۸۹۶ء میں ان ہی کے ہاتھوں سے مارا گیا،

بہاؤ اللہ محمد علی باب اور اس کے چالیس ہزار مرید تہ تیغ بیدریغ ہوئے تو ایک

مرید مرزا یحییٰ نے قیادت سنبھال کی اور ایران میں خیر نہ دیکھی تو "اڈریا نوپل" میں ترکیہ کے زیرِ عاطفت فرقہ بابی کی سرگرمی جاری رکھی، لیکن اس فرقہ میں تف[illegible] پیدا ہو گیا،

مرزا یحییٰ صبح ازل کا سوتیلا بھائی میرزا حسین مقابلہ میں کھڑا ہو گیا، د[illegible] بہاء اللہ کا لقب اختیار کیا، ۱۹۱۲ء میں صبح ازل کا آفتابِ حیات شام ابد میں [illegible] ہو گیا تو بہائی فرقہ چمک اٹھا، اس کا دعویٰ ہے کہ تمام اقوام کے مذاہب ایک عظیم [illegible] شخصیت کے منتظر ہیں، یہود و نصاریٰ مسیحؑ کی، اہلِ اسلام مہدی کی آمد ثانی کی [illegible] "کلنکی اوتار" کی اور علیٰ ہذا القیاس یہ شخصیت میری ذات ہے، تمام شریعتیں منسوخ ہو چکی ہیں، اور میں ایک نئی شریعت لایا ہوں،

بہاء اللہ کے دعوئے رسالت بلکہ "الوہیت" کے بعد اس کے داعی تمام مہذب [illegible] میں پھیل گئے، تبلیغ کا مرکزی مقام "عکہ" واقع ارضِ فلسطین قائم کیا گیا جہاں بہاء[illegible] مدفون ہے، اس کا بیٹا اور جانشین عباس آفندی بہائی تحریک کا قائد ہوا۔ امریکہ میں [illegible] ہیں کہ بہائی مذہب کو نمایاں کامیابی ہوئی ہے، اس کے معبد "ولمٹ" (Wilmetta) اور "ایلی نوس" (Illinois) اور تہران میں ہے،

اس کتاب خلافت اسلامیہ کے مؤلف کو ایک بہائی داعی حکیم میرزا محمود زرقانی [illegible] دو دفعہ امرتسر (پنجاب) میں ملنے کا اتفاق ہوا، یہ ایرانی نثراد ادیب بھی تھا۔ اردو [illegible] مافی الضمیر اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا تھا، میں نے کہا کہ آپ فارسی میں گفتگو کریں۔ [illegible] میں کوشش کرتا ہوں کہ اردو میں گفتگو کروں، کیونکہ ہندوستان کی اکثریت یہی زبان [illegible] ہے اور ایسے تعلیم یافتہ لوگ جو فارسی زبان جانتے ہیں مجھے اردو میں بہت کچھ مدد دے سکتے [illegible] میں نے کہا کہ اردو سیکھنے کے لئے آپ کو بہت وقت مل جائے گا، سردست میں چاہتا [illegible] کہ آپ اپنی زبان میں گفتگو کریں، تاکہ مجھ پر آپ کا مافی الضمیر بخوبی واضح ہو۔ پہلے [illegible] قرآن کی چند آیات درباره یوم قیامت اور حشر و نشر پڑھ کر کہا کہ مسلمانوں کا عقید[illegible] یہ ہے کہ یوم قیامت ایک خاص دن ہے کہ جب قبور سے مردے اٹھیں گے یہ عقید[illegible]

نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ دن ہے، جب ایک رسول کا دورِ رسالت ختم ہوتا ہے، اور نئے
کی بعثت پر نیا دور، جس کی مدت ایک ہزار سال ہے۔ شروع ہوتا ہے، اس کی تائید میں
نے قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیا،

بر الامر من السماء | اللہ ایک امر کی تدبیر آسمان سے زمین کی طرف کرتا
الارض ثم یعرج الیہ | ہے۔ پھر وہ امر ایک دن میں جس کی تعداد تمہاری
یوم کان مقدارہ الف | گنتی کے مطابق ایک ہزار سال ہے اللہ کی طرف
سنة مما تعدون (۲۱/۱۴) | رجوع کرتا ہے

اس پر اس نے یہ استدلال کیا، کہ آنحضرتؐ کا امرِ رسالت ایک ہزار سال کے بعد ختم ہوگیا،
امر بہاء اللہ کا دور دورہ ہے،

میں نے جواب دیا کہ ایک امر کا انتہائی ارتقاء عروج اس آیت کی رو سے بلاشبہ ایک ہزار
سال ہی ثابت ہوتا ہے، اس امر کی تکمیل کے بعد دوسرے امر کا آغاز ہونا چاہئیے، لیکن اس ایک
کا اطلاق ان رسولوں پر ہوتا ہے، جو آنحضرتؐ سے پیشتر گذرے ہیں، ان کی شریعت کا منشاء
ایک ہزار سال میں پورا ہوا، لیکن قرآن کے بارہ میں ارشاد ہے کہ

انا انزلنہ فی لیلۃ القدر وما | ہم نے ہی اس قرآن کو لیلۃ القدر میں نازل کیا، اور
ادرٰک ما لیلۃ القدر لیلۃ القدر | تو کیا جانے کہ لیلۃ القدر کیا ہے۔ لیلۃ القدر
خیر من الف شہر، تنزل الملٰئکۃ | ایک ہزار ماہ سے بہتر ہے اس میں ملائکہ اپنے
والروح فیہا باذن ربہم | پروردگار کے اذن سے "کل امر" کے ساتھ نازل
من کل امر۔ (۳۰/۲۲) | ہوتے ہیں،

اب سوال یہ ہے کہ "من کل امر" کا انتہائی عروج یا تکمیل کتنے عرصہ میں ہوگی۔
اس کے بارہ میں ارشاد ہے کہ

من اللہ ذی المعارج | اللہ کی طرف سے جو ہر ایک امر کو درجہ بدرجہ ترقی دیتا ہے
تعرج الملٰئکۃ والروح | من کل امر کے نزول کے بعد انتہائی عروج ملائکہ کے ساتھ
الیہ فی یوم کان مقدارہ | الروح کا اللہ کی طرف ایک یوم میں ہوتا ہے، جس کی

خمسین الف سنۃ (۴۰) مقدار پچاس ہزار سال ہے۔

میں نے داعی امرہائی کو آیاتِ قرآن کے الفاظ کی طرف متوجہ کیا، کہ جو آیت اس نے اپنے دعوئے کی تائید میں پیش کی ہے اس میں نزول و عروج "الملئکۃ والروح" مذکور نہیں لیکن جو آیات میں نے پیش کی ہیں ان میں خصوصیات کے ساتھ مذکور ہے۔ اور یہ کہ داعی کی پیش کردہ آیت میں ایک خاص امر کا مذکور ہے، مگر آیات سورہ لیلۃ القدر میں "من کل امر" کا ہے۔ یہہ ظاہر ہے کہ آنحضرت کی بعثت سے پیشتر ایک ایک خاص امر ہزار ہزار سال میں تکمیل پاچکا تھا۔ لیکن قرآن "من کل امر" کا حامل ہے، اور اس کی تکمیل بتدریج پچاس ہزار سال میں ہوگی، اس لئے آنحضرت کا دورِ رسالت پچاس ہزار سال تک رہے گا۔

داعی کی بحث کا موضوع دراصل "خلافت اسلامیہ تھا"، اور یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ خلافت کے خاتمہ کا اعلان ترکوں نے ہمارے زمانہ میں کردیا، اور اس اعلان کے بعد احیاء خلافت اس کے اصطلاحی معنوں میں مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوا، داعی مذکور نے آیہ استخلاف تلاوت کرنے کے بعد کہا کہ "ختم نبوت" کا مفہوم جیسا کہ مسلمانوں کا عام عقیدہ ہے، صحیح نہیں، آنحضرتؐ کی بعثت سے پیشتر ہر ایک رسول کے بعد انبیاء مسلسل پے در پے مبعوث ہوتے رہے ہیں، لیکن آنحضرت کا مقام چونکہ سابقہ رسل سے اعلیٰ واقع ہے اس لئے آنحضرت کے جانشین خلفاء ہوئے انبیاء نہ ہوئے، یہہ خلافت اب ختم ہوگئی اس لئے آنحضرت کا دورِ رسالت بھی ختم ہوگیا۔

مَیں نے کہا کہ آپ ایک مغالطہ میں اُلجھے ہوئے ہیں، آپ نے آنحضرتؐ کے نشاء کو تو صرف خلافت میں محدود کردیا ہے، حالانکہ خلافت صرف ذریعہ تمکین دین کا تھا۔ مقصد حقیقی تو "دین" ہے، جب اس کو خلافت کے ذریعہ تمکین حاصل ہوگئی جو ایک ثابت شدہ امر با بداہت ہے تو ذرائع منقطع ہوگئے، یہہ کہاں سے ثابت ہوگیا کہ دین بھی ذرائع کے ساتھ ختم ہوگیا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ دین کے راستہ میں جو اُمور سدِ راہ تھے ان کو خلافت نے ختم کردیا۔

اب دین کا راستہ صاف ہے، یہہ دین جس کے ساتھ آنحضرت مبعوث ہوئے پچاس ہزار

ہزار سال میں اپنا منشا پورا کرے گا، یہ کہنا چاہیئے کہ جس امن کا وعدہ آیہ استخلاف میں کیا گیا ہے جہاں تک اس کا تعلق دین سے ہے اس کا دور تو اب شروع ہوا ہے، اور قیامت" کے بارہ میں جو کچھ آپ نے کہا ہے کہ ہر ایک دورِ رسالت کے اختتام اور نئے دور پر قائم ہو جاتی ہے، ایک تاویل آیات قرآن کی ہے، اور یہی تاویل علماء اسلام بھی کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ کے دورِ رسالت کے خاتمہ کے بعد قیامت قائم ہو جائے گی،

اس کی کیا صورت ہوگی؟ اگرچہ قرآن میں اس کا مفصل مذکور ہے مگر سردست زیر بحث نہیں، آپ پچاس ہزار سال تک منتظر رہیں، انسان خلیفہ فی الارض ہے اس کی خلافت ختم نہیں ہوئی، اسلام انسانیت کا دین ہے،

داعی نے بحث کا موضوع بدل کر کہا، کہ امید ہے کہ آپ بوقت فرصت ملتے رہیں گے، یہ میل ملاقات بھی ہماری زندگی کا ایک مقصد ہے، دوران گفتگو میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ لوگ بحث میں وہی روش اختیار کرتے ہیں جو ان سے پیشتر داعیان فرقہ باطنیہ اختیار کر چکے تھے، یہ پہلے مخاطب کے عقائد کا جائزہ لیتے ہیں، اور شبہات پیدا کرتے ہیں

"ہر بنائی کہنہ کہ باداں کنند — اول آں بنیاد را ویراں کنند"

جب ایک دفعہ شبہات پیدا ہو گئے اور ایمان متزلزل ہو گیا، تو پھر جو چاہیں منوا سکتے ہیں کیونکہ یہ علم نفسیات کا ایک اہم مسئلہ ہے،

انسانی طبیعت اپنی تسکین کے لئے کسی عقیدہ کا سہارا تلاش کرتی ہے خواہ غلط ہی ہو۔ داعی صاحب نے یہی حربہ مجھ پر بھی استعمال کیا، جب یہ کارگر نہ ہوا تو اب میری باری تھی کہ وار کرتا مگر مجھے ان کے عقائد کا علم نہ تھا، اس لئے میں نے سوال کیا کہ آپ مجھے اپنی شریعت سے آگاہ کریں، تاکہ میں بھی غور کروں کہ مسلمانوں کی شریعت سے کس حد تک بہتر ہے، اور یہ کہ جناب بہاء اللہ صاحب کی اپنی کتاب کا حوالہ دیں،

داعی صاحب یہ کہہ کر ٹال گئے کہ کتاب اقدس میرے پاس نہیں، اس بحث کے بعد میں نے اس فرقہ کی کتب اور عقائد کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ جس ماحول میں جناب بہاء اللہ نے پرورش پائی اور مغربی تہذیب و تمدن کا اثر آپ کے دل و دماغ پر گہرا تھا، اس لئے

اپنی قوم کی اصلاح کے لئے کوشش کی، اس کوشش کا نتیجہ اتنا ضرور ہوا کہ زرتشتی مذہب کے پیرو جن کی تعداد چند ہزار نفوس ایران میں تھی، اس فرقہ میں شامل ہو گئے فرقہ بہائیہ کو کسی مذہب سے پرخاش نہیں، ان کے پیشوا کا ارشاد ہے کہ سب سے شیر و شکر کی طرح رہو خواہ وہ کافر اور ملحد ہی کیوں نہ ہو۔ بہائی "جناب بہاء اللہ کو اسی طرح مظہر الوہیت یقین کرتے ہیں جس طرح مسیحی حضرت مسیح کو۔ یہ امر اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہئیے کہ اب کوئی شخص دعوئے نبوت و رسالت کرے گا تو ضرور ہے کہ وہ یہ بھی کہے کہ "انت بمنزلہ اولادی" یا "انت اولادی" اور یہ کہ اپنے معتقدین کو "اپنا بندہ" بھی کہے گا۔ جو سراسر توحید کے منافی ہے۔ بہائی مذہب باطنیہ کی ایک صورت ہے،

ناصر الدین کے بعد مظفر الدین (۱۸۹۶ء سے ۱۹۰۶ء تک) کے عہد میں روس کا اثر انتہائی عروج پر تھا۔ اصلاحات کے لئے ساڑھے ستائیس ملین قرضہ پانچ فی صدی شرح سود پر لیا، لیکن ان کو بھی سیر و سیاحت کی سوجھی، اور یہ روپیہ اسی کار خیر اور دیگر مسرفانہ مصارف پر خرچ ہو گیا، رعایا بدحال تھی، لیکن خارجی سیاسیات کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ ان کو جھنجھوڑ رہی تھی، اور بیداری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے عوام شہری حقوق کا مطالبہ کر رہے تھے، اس لئے مجبوراً شاہ نے ۱۹۰۶ء میں پہلی پارلیمنٹ کا افتتاح کیا۔

ایران کی سیاسی حالت یہ تھی کہ پندرہ دول خارجہ نے اپنے شہریوں کے تنازعات کے فیصلہ کا حق بلا مداخلت حکومت ایران اپنے لئے بذریعہ معاہدات محفوظ کر لیا، روس کے پہلے قرضہ میں سے چھ لاکھ "روبل" روسی بقایا تھے، کہ روس نے فوراً ایک کروڑ روبل اور قرضہ دے دیئے، اور شاہ کو پھر سیاحت یورپ کی سوجھی، روس نے اپنی درآمد پر محصول میں بہت کچھ کمی کی رعایت بھی حاصل کر لی اور دیگر ممالک کی درآمد پر محصول بڑھایا گیا،

۱۹۰۷ء میں مظفر الدین فوت ہو گیا اس کا بیٹا محمد علی شاہ جانشین ہوا، پارلیمنٹ تو قائم ہو چکی تھی، اس میں نمائندگی کے لئے رقابت اور رقابت کے ساتھ بدمزگی بھی ناگزیر امر تھا۔ شاہ نے پارلیمنٹ توڑنے کی کوشش کی، سعدی نے سچ کہا کہ

"دو عاقل را بنا شد کین و پیکار" انگریزوں اور روس میں سمجھوتہ ۱۹۰۷ء میں ہو گیا روس جاپان کے مقابلہ میں شکست کھا چکا تھا، برطانیہ پارلیمنٹ کا حامی تھا۔ جس کا مطالبہ یہ تھا کہ روس سے قطع تعلق کیا جائے، لیکن برطانیہ کو اس کا بھی احساس تھا۔ کہ جرمن مشرق قریب میں خلیج فارس تک ریلوے سڑک تعمیر کرنے کا منصوبہ باندھ چکا ہے۔ اس کا خطرہ روس اور برطانیہ کو یکساں تھا، اس لئے دونوں میں سمجھوتہ ہو گیا اور سمجھوتہ میں ایران اور افغانستان اور تبت میں اقتدار کا سوال تھا، ایران میں دونوں نے اپنا اپنا حلقہ اثر تقسیم کر لیا،

شاہ کو تو پارلیمنٹ کا توڑنا مدِ نظر تھا، جون ۱۹۰۸ء میں روسی کرنل لیخوف (LIAKHOF) نے پارلیمنٹ کی عمارت پر گولہ باری کی، اور شاہ نے پارلیمنٹ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا، عوام نے علم بغاوت بلند کیا، "رشت" اور "اصفہان" میں قوم پرست مقابلہ کے لئے اُٹھے محمد علی شاہ روس میں بھاگ کر پناہ گزین ہُوا، قوم پرستوں نے اس کے گیارہ سالہ بیٹے احمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا، اگر یہ لوگ چاہتے تو شخصی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیتے مگر ان کے مذہبی عقائد مانع تھے۔

ایران کی مالی حالت خراب تھی، قوم پرستوں کی بھی آپس میں نہ بنی، امریکہ سے ایک شخص "شوسٹر" (Shuster) نامی بحیثیت اعلیٰ مہتمم خزانہ بلایا گیا، اس نے کچھ اصلاحی کام شروع ہی کیا تھا۔ کہ روس نے دخل در معقولات دیا اور ۱۹۱۱ء میں دھمکی دی کہ اگر شوسٹر برطرف نہ ہُوا تو اعلان جنگ کر دیا جائے گا، اور ساتھ ہی روسی سپاہ قزوین تک بڑھ آئی، اور جو بھی قوم پرست ہاتھ لگا، ٹھکانے لگا دیا، امام رضا کے روضہ پر گولہ باری کی، اور اکثر مجتہدین کو بھی پھانسی دی، شوسٹر کو ایران سے نکلنا پڑا۔ اس نے اپنی کتاب (The Strangling of Persia) لکھی اور دول یورپ بالخصوص روس کی سیاسی چالوں کو بے نقاب کیا،

اگر یہی حالات اسی رفتار سے رہتے تو روس اور برطانیہ ایران کو آپس میں بانٹ لیتے لیکن "تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ" جنگ عظیم (۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء) نے دول یورپ کو

اپنی لپیٹ میں لے لیا، جرمن نے شکست کھائی، برطانیہ فتح کے نشہ میں سرشار ایک طرف ایران اور دوسری طرف عراق پر مستقل قبضہ کے منصوبے باندھنے لگا، عراق پر تو فوجی قبضہ ہو چکا تھا۔ ایران کے ساتھ ہمدردانہ معاہدہ کی یہ شرائط پیش کیں، کہ مالی اور عسکری حالت درست کرنے کے لئے اپنے مشیر عاریتاً دے گا، اور مشرکیں اور ریلوے مٹرکیں خود اپنی نگرانی میں تیار کرے گا، تمام اخراجات کا ایرانی خزانہ متحمل ہوگا مگر قرضہ برطانیہ دے گا، شاہ تو ادھار کھائے بیٹھا تھا، اس معاہدہ پر دستخط کے لئے تیار ہو گیا مگر عوام میں ہیجان پیدا ہو گیا، اور ساتھ ہی امریکہ نے سخت مخالفت کی،

ایران کے طول و عرض میں اب بد نظمی کا دَور دورہ تھا، خوش قسمتی سے سوویٹ (Soviet) روس نے خاندان زار کی شاہی کا تختہ الٹ دیا، بحیرہ خزر کے نواح میں انگریزی سپاہ اور سوویٹ کی فوج میں جھڑپیں ہوئیں، انگریزوں نے منہ کی کھائی، ۱۹۲۱ء میں ایران اور سوویٹ روس میں ایک معاہدہ ماسکو میں ہوا، اور دونوں ملکتوں میں دوستانہ تعلقات پختہ ہو گئے، اس معاہدہ کو ماسکو میں پختہ ہونے کو ابھی پانچ روز باقی تھے کہ کرنل رضاخان ایرانی سپاہ کے ساتھ قزوین سے تہران آیا۔ ۱۹۲۳ء تک وزیر جنگ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ احمد شاہ ایران سے یورپ کی طرف نہضت فرما ہوا اور پھر نہ لوٹا، قاجار خاندان کا خاتمہ ہو گیا،

اب ہم اپنے زمانہ کے حالات سے گزر رہے ہیں۔ اس کا تذکرہ ہم اس کتاب کے تیسرے حصہ میں لکھیں گے۔

سلاطین ترکیہ عثمانیہ

ہم سلطنت سلجوقیہ کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ اس کی ایک شاخ ایشائے کوچک میں حکمران تھی جس کا پایہ تخت "قونیہ" تھا، اس وقت سلطان علاؤالدین سلجوقی کی حکومت تھی (دیکھو شجرہ نسب) جب چنگیز خان نے سلطنت خوارزم شاہیہ کا خاتمہ کر دیا، اور ساتھ ہی طوائف الملوکی بھی ختم ہو گئی، تو سلیمان شاہ خاندان ترکمان کے پچاس ہزار سواروں کے ساتھ ارض روم میں آیا۔ دریائے فرات کو عبور کر رہا تھا، کہ غرق ہو گیا، ترکمان چاروں طرف سے پراگندہ ہوئے ان میں سے ایک سردار "ارطغرل" نے ایشیا کوچک میں سلطان علاؤالدین کے پاس آیا، اس کا بھائی "دُرندا" بھی ساتھ تھا، سلطان نے دونوں کو قرہ حصار اور بیکال کے درمیان بسایا، طغرل ۶۸۷ھ میں فوت ہوا، تو اس کا بیٹا "عثمان" جو جری سپاہی تھا، سلطانی لشکر کا رفتہ رفتہ سپہ سالار ہو گیا، ۶۹۹ھ میں تاتاریوں نے سلطان کو شکست دی، تھوڑے ہی عرصہ بعد سلطان لاولد فوت ہوا، عثمان نے چونکہ تتاری کے مقابلہ میں نمایاں فتوحات میں نام پیدا کیا ہوا تھا، اسے "غازی" بھی کہتے، بہت ہر دلعزیز تھا، سرداران لشکر نے اسی کو تخت پر بٹھا دیا، غازی نے مرحوم سلطان کی لڑکی سے نکاح کیا تو بیٹیا دسلطنت اور مستحکم ہو گئی۔

(شجرہ نسب اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

شجرہ نسب سلاطین روم و شام

(۱) غازی عثمان خان (سنہ ۶۹۹ھ)

(۲) آرخان اول (سنہ ۷۲۶ھ)

(۳) مراد خان اول (سنہ ۷۶۱ھ)

(۴) غازی سلطان بایزید ایلدرم
(سنہ ۷۹۱ھ)

(۵) محمد خان اول (سنہ ۸۲۸ھ)

(۶) مراد خان ثانی

(۷) غازی محمد خان ثانی (فاتح قسطنطنیہ)
سنہ ۸۵۵ھ
۱۴۵۰ء

(۸) بایزید ثانی
(سنہ ۸۸۶ھ
۱۴۸۱ء

(۹) سلیم خان (سنہ ۹۱۸ھ)

(۱۰) عظیم الشان سلیمان خان اول
(سنہ ۹۲۶ھ)

(۱۱) سلیم خان ثانی (سنہ ۹۷۴ھ
۱۵۶۶ء

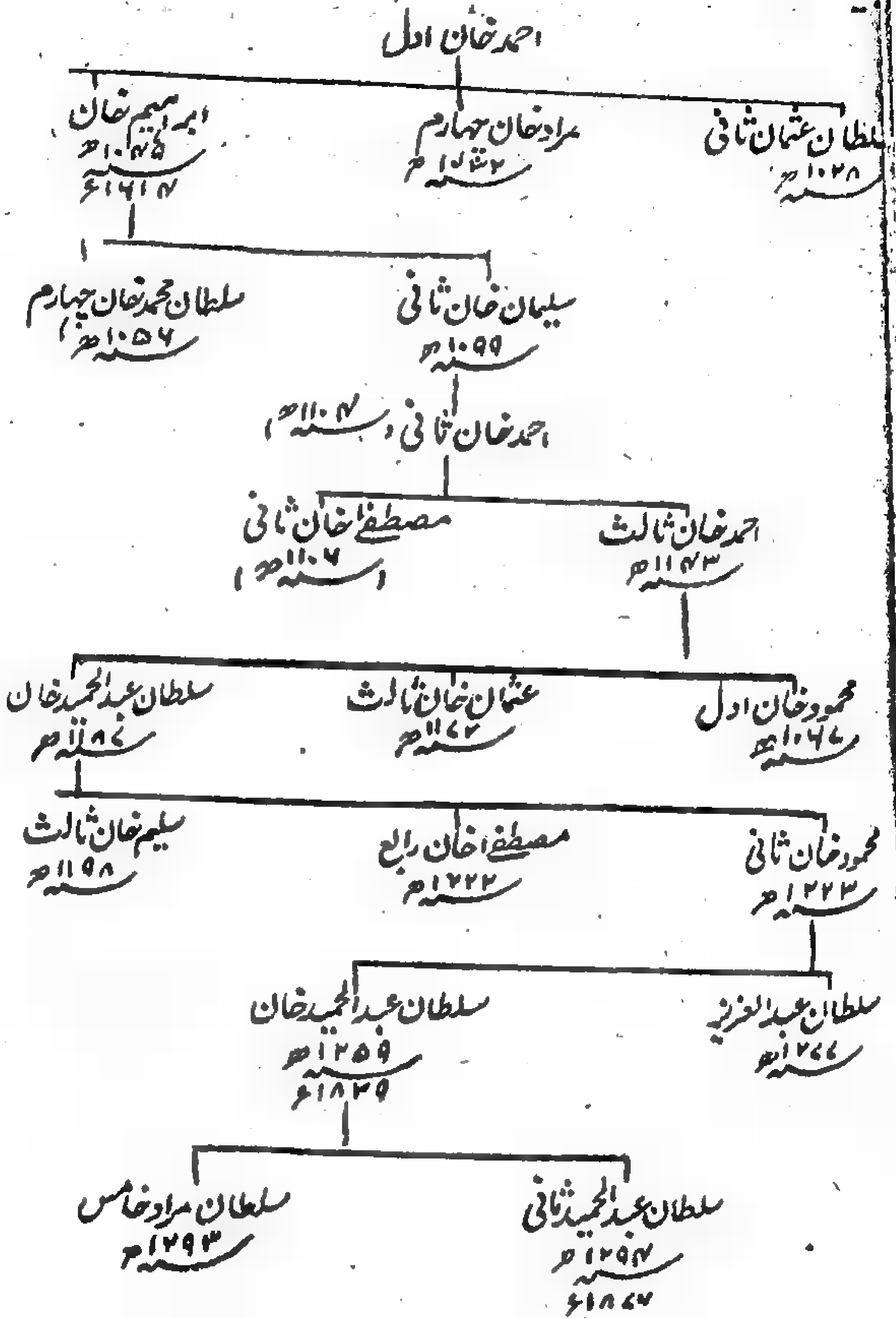
(۱۲) مراد خان ثالث (سنہ ۹۸۲ھ)

(۱۳) محمد خان ثالث (سنہ ۱۰۰۳ھ)

(۱۵) مصطفےٰ اول (سنہ ۱۰۲۶ھ) — (۱۴) احمد خان اول

(باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ صفحہ ۱۷۰)



سلاطینِ عثمانیہ کا مقابلہ عموماً دولِ یورپ سے رہا۔ اس وقت تک مسلمانوں کی حکومت ایشیا کوچک کے ایک حصہ پر تھی۔ سلاطین عثمانیہ کے تحت اب ان کا قدم یورپ کی طرف بڑھا۔ اگر تاتاریوں بالخصوص تیمور کے سر پہ وحشت سوار نہ ہوتی تو تمام یورپ پر چھا جاتے۔ خلافت امویہ اور ان کے جانشین مرابطین اور موحدین کے تحت ہم بیان کر چکے ہیں کہ شمالی افریقہ کے بعد انھوں نے ہسپانیہ اور پرتگال کو بھی لے لیا۔ اور بحیرہ شام (روم) کے جزائر بھی ان کے قبضہ میں تھے لیکن وہ اس سے آگے نہ بڑھے۔ سلاطین عثمانیہ نے یورپ کی تسخیر کا ارادہ دل سے کر لیا جو بنو امیہ اختیار کر چکے تھے۔ آبنائے باسفورس کو عبور کیا تو اب دولِ یورپ سے انہی کی مملکت کے حدود کے اندر شروع ہو گیا۔ حروب صلیبیہ کے تحت ہم لکھ چکے ہیں کہ یورپ متفقہ قوت سے اسلامی ممالک واقع شمالی افریقہ اور شام پر لشکر کشی کرتے رہے۔ مسلمانوں کا نقصان جان و مال زیادہ تر ہوتا رہا۔ اب ہلال مطلع یورپ پر طلوع ہوا۔ تو تک اہلِ یورپ کو ایشیا اور افریقہ میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

غازی عثمان خان اور اس کے ابتدائی جانشین اورخان اول اور مراد خانِ اول بایزید وغیرہ کی کوشش بھی رہی کہ قسطنطنیہ ہاتھ آئے جو یورپ کی کلید ہے۔ اگرچہ قسطنطنیہ کے قیصر رومی کہلاتے ہیں۔ اور رومیوں نے اسے ابتدا میں فتح کیا تھا۔ لیکن جب رومی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ تو شرقی حصہ کا دار السلطنت روما ہی رہا اور مغربی سلطنت کا پایہ تخت قسطنطنیہ رہا۔ یونانی الاصل قیصر حکمران ہوئے لیکن وہ اپنے آپ کو رومی ہی کہتے اور مسلم مؤرخین نے بھی انکو قیصر روم ہی کہا۔ سلاطین عثمانیہ بھی سلاطین روم ہی کہلائے۔

غازی عثمان خاں اور اسکے جانشین سلاطین نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ قسطنطنیہ کا وقوع ایسا ہے کہ جب تک اسکے قرب و جوار کا علاقہ فتح نہ ہو اس کی تسخیر سخت مشکل ہے۔ اس لئے سب سے پہلے ان کی توجہ یونان کے شمالی علاقہ اور ریاست ہائے بلقان کی طرف ہوئی۔ ان کا پایہ تخت بروصہ تھا۔ تیسرے سلطان مراد خان اول نے ادرنہ (Adrianople) مقرر کیا۔ مراد خانِ اول نے ایک کام یہ بھی کیا کہ جو عیسائی اسلام قبول کرتا اس کی اولاد مدرسہ حربیہ میں داخل کرتا۔ اس طرح نو مسلموں کی ایک نئی فوج تیار ہو گئی۔ انکو ینیک چری

کہتے، ترکی میں اس کے معنی "فوج جدید" ہیں۔ سلطان مراد خان اوّل نے "سرویہ" فتح کیا، میدان جنگ میں غنیم کی لاشوں کا معائنہ کر رہا تھا کہ ایک نیم جان نے خنجر سلطان کے پیٹ میں گھونپ دیا، سلطان جانبر نہ ہو سکا۔ اس کا بیٹا "بایزید ایلدرم" تخت نشین ہوا۔ "ایلدرم" ترکی زبان میں بجلی کو کہتے ہیں۔ قسطنطنیہ کے نواح میں تمام مسیحی بلاد میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوند گیا، اور قسطنطنیہ کو محاصرہ میں لے لیا۔ قیصر نے تیمور سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان اپنی مملکت میں طوائف الملوکی کو ختم کر چکا تھا، یہ لوگ بھی بھاگ کر تیمور کی پناہ میں آئے۔ تیمور دمشق کی تسخیر کے بعد "ایلدرم" کے مقابلے کے لئے بڑھا، ایلدرم نے ناچار محاصرہ اُٹھا دیا۔ انقرہ پر مقابلہ ہوا، تو ایلدرم اسیر ہو کر تیمور کے سامنے لایا گیا۔ چند روز حراست میں رہا۔ اسی صدمہ سے مر گیا تیمور نے لاش ایلدرم کے بیٹے موسیٰ کے حوالہ کر دی۔ بروصہ میں اپنے آبا و اجداد کے پہلو میں مدفون ہوا۔

"من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　کہ با من ہر چہ کرد آں آشنا کرد"

خلافت اسلامیہ کی تاریخ میں یہ واقعہ نمایاں نظر آئیگا۔ کہ مسلمانوں کو ہمیشہ نقصان اپنوں ہی کے ہاتھ سے ہوا، اگر تیمور سدِ راہ نہ ہوتا، تو ایلدرم اور اس کے جانشین یورپ میں ہلالی علم گاڑ دیتے۔

اب تیمور کا حوصلہ بڑھ گیا، اور ارادہ کر لیا، کہ سلطنت عثمانیہ کے مفتوحہ و مقبوضہ ممالک پر خود قابض ہو کر قسطنطنیہ فتح کرے۔ مسلمانوں میں ایک "حدیث" مشہور تھی کہ قسطنطنیہ کا فاتح کوئی غازی مرد اہل جنّت سے ہوگا۔ ایسی روایات حوصلہ افزائی کے لئے اختراع ہوا ہی کرتی ہیں، لیکن اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ ہر ایک اولو العزم فاتح کی خواہش تھی کہ یہ شرف اسے حاصل ہو۔ چنانچہ تیمور نے بھی یہی ارادہ کیا لیکن ایک طرف ایلدرم کی اولاد اور دوسری طرف خود قیصر مقابلہ کیلئے آمادہ ہو گیا، اسلئے تیمور نے خیر اسی میں دیکھی کہ وطن مالوف کی طرف مراجعت کی۔

تیمور واپس ہوا تو ایلدرم کی اولاد میں تخت و تاج کے لئے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ سلطان محمد خاں اوّل غالب آیا یہ پہلا سلطان ہے جو جنگی جہاز اور بحری سپاہ اور توپ خانہ کام میں لایا، جس سے اہل یورپ ناواقف تھے اس نے بحیرہ اسود کے اکثر علاقہ کو فتح کیا۔

محمد خاں کا جانشین اس کا بیٹا مراد خان ثانی ہوا، ایک لاکھ کی جمعیت سے قسطنطنیہ کا
محاصرہ میں لیا۔ اگرچہ شہر فتح نہ ہوا، مگر قیصر نے ایسی شرائط پر صلح کی جو اس کے حق میں ذلت آمیز تھیں
مراد خان ثانی نے کئی دفعہ "بلغراد" پر فوج کشی کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ سلطان نے اپنی زندگی میں
اپنے بیٹے محمد خان ثانی کو اپنا جانشین نامزد کیا، اور خود گوشہ نشین ہو گیا۔ محمد خاں کم عمر تھا،
اس لئے شاہ بلگیریا اور دوسری ریاستوں نے موقعہ غنیمت سمجھ کر حملہ کر دیا۔ سلطان مراد کو پھر
گوشۂ خلوت سے نکلنا پڑا، شاہ بلگیریا سے مقابلہ ہوا، تو سلطانی سپاہ بری طرح پسپا ہونے لگی
خود شاہ قلب لشکر تک پہنچ گیا، اور سلطان پر حملہ آور ہوا، سلطان فن تیر اندازی میں یگانۂ روزگار
تھا، ایک تیر شاہ بلگیریا کے سینہ پر مارا، کہ زرہ پشت کو توڑ کر نکل گیا۔ گھوڑے سے گرا اور مر گیا
اس کا سر نیزہ پر بلند کیا گیا۔ بلگیری بے سر فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔

سلطان محمد ثانی

باپ کی وفات کے بعد سلطان محمد خان ۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء میں تخت نشین ہوا
۱۴۲۹ء میں پیدا ہوا، اس وقت سلطان کی عمر اکیس برس کے
لگ بھگ تھی۔ اس لئے پھر ایک دفعہ قیصر قسطنطنیہ اور شاہانِ ریاست بلقان نے سر اٹھایا
اس دفعہ قیصر نے نہایت دور اندیشی سے کام لیا۔ ریاستہائے بلقان کے علاوہ تمام سلاطین
یورپ اور پوپ سے بھی امداد کی درخواست کی، اور ہر ایک نے حتی المقدور مدد کی۔ پھر سے
"حروب الصلیبیہ" کا نام زندہ ہو گیا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب کے لڑائی سرزمین یورپ پر ہوئی۔
۱۴۵۳ء میں سلطان بھی مقابلہ کے لئے بڑھا۔ قسطنطنیہ کے قریب قیصری لشکر سے

عـ قسطنطنیہ کا اول محاصرہ ۳۲ھ / ۶۵۲ء خلیفہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوا۔ امیر معاویہؓ سپہ سالار اس وقت والئ شام
تھا، خشکی اور تری دونوں طرف سے حملہ کیا گیا، دوسری مہم میں سپہ سالار عبد الرحمٰن ابن خالدؓ بن ولید تھا۔ اس میں بھی بحری
ہوئی۔ بحری افسر عصر بن عرفہ تھا، یہ بحیرہ ماسود تک بڑھتا چلا گیا۔ خشکی پر اناطولیہ تک مسلمان آ گئے۔ موسم سرما کی شدت
کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔ تیسری مہم کا سالار فضالہ ابن عبید انصاری تھا۔ اس نے اناطولیہ فتح کر لیا۔
دوسرے سال ۴۹ھ / ۶۶۹ء میں سفیان بن عوف العضدی سپہ سالار تھا، اس کے ماتحت یزید بن معاویہؓ، عبد اللہ
عباسؓ، عبد اللہ ابن عمرؓ، عبد اللہ ابن زبیرؓ، حضرت ابو ایوب انصاریؓ اور کئی صحابہ کرام بھی تھے۔ بحری بیڑے
افسر ابن عرفہ ہی تھا۔ چوتھی مہم سلیمان بن عبد الملک نے مسلمہ برادر خلیفہ کے تحت خشکی کے راستہ اور بحری بیڑہ امیر
البحر سلیمان بن ہبیرہ کے تحت روانہ کی۔ ان تمام مہمات میں اگرچہ قسطنطنیہ مسخر نہ ہوا، مگر مسلمانوں کا قدم پیچھے
ہٹا، شمالی افریقہ کے راستہ سے یورپ میں داخل ہو گئے۔

ٹھ بھیڑ ہوئی، تو حریف پسپا ہو کر شہر کی مضبوط اور محفوظ دیواروں کے اندر چلا گیا، سلطانی لشکر نے بڑھ کر شہر کو محاصرہ میں لے لیا۔ محاصرہ پچاس شبانہ روز رہا۔ سلطان نے ایک پیش گوئی سنی ہوئی تھی، کہ قسطنطنیہ اس وقت تک فتح نہ ہوگا، جب تک خشکی پر بحری کشتیاں نہ چلیں گی پیشگوئی تھی یا خود ہی سلطان یا اس کے وزیر اعظم اور سپہ سالار مصطفےٰ پاشاہ کے دل میں آیا کہ شہر پر بحری جانب سے جب تک حملہ نہ ہوگا شہر فتح نہ ہوگا، اس لئے بحر کی طرف سے قیصر کو برابر کمک اور سامانِ رسد پہنچ رہا تھا۔ سلطانی لشکر نے اس بظاہر ناممکن امر کو ممکن کر دکھایا۔ لکڑی کے شہتیروں پر کشتیاں خشکی پر چلائیں۔ اور بحر مارمورا میں ڈال دیں۔ محصورین یہ حیرت انگیز کارنامہ دیکھ رہے تھے۔ ان کے دل اندر ہی اندر بیٹھ گئے۔

اس معرکہ میں ایک صوفی بزرگ شمس الدین کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ آپ بغرضِ جہاد اپنے مریدوں کے ساتھ بخارا سے آکر شامل ہوئے۔ مصطفےٰ پاشاہ کا بیان ہے، کہ محاصرہ طول پکڑ رہا تھا۔ اور نوجوان سلطان محمد بیقرار تھا، مجھے بار بار طلب کرتا، اور دریافت کرتا، کہ ابھی ہماری فوج شہر میں داخل ہوئی کہ نہیں۔ میں حالات بتاتا، کہ ہماری توپوں کے گولوں سے دیوارِ شہر میں رخنے پڑ چکے ہیں، اور بحر کی طرف سے ہماری کشتیوں نے قیصری رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع کر دیا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے امید ہے کہ کوئی دن جاتا ہے اور شہر ہمارے قبضہ تصرف میں ہوگا۔ اگرچہ میں روز کوئی نہ کوئی حوصلہ افزا بات بتاتا، مگر سلطان کی بیقراری بڑھتی گئی اور اس کا اثر مجھ پر بھی ہوا، ایک روز سلطان نے حسبِ معمول مجھے طلب کیا۔ خیمہ میں تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ مگر دلی بیقراری کا یہ حال تھا، کہ تکیہ کے کبھی دائیں اور کبھی بائیں کروٹ بدل رہا تھا، مجھ سے یہی سوال کیا۔ میں نے پھر تشفی آمیز باتیں کیں، اس وقت مجھے معاً خیال آیا، کہ حضرت شمس الدین کی خدمت میں چل کر التماس کرنی چاہیئے۔ میں سلطان سے رخصت ہو کر آپ کے خیمہ کی طرف گیا۔ دروازہ پر مریدوں کا پہرہ تھا، مجھے جانتے پہچانتے تھے، مگر اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دی، میں نے خیمہ کے پیچھے جا کر ایک چوب اکھاڑ دی۔ مصمم ارادہ کر چکا تھا، کہ شاہ صاحب سے ملے بغیر نہ ٹلونگا، جب میں نے باہر ہی سے جھانک کر اندر دیکھا، تو شاہ صاحب سربسجود تھے۔ اب میں حیران تھا، کہ کروں تو کیا کروں، اتنے میں شاہ صاحب نے سر اٹھایا، اور زور سے

تکبیر کہی۔ اس کا جواب مریدوں نے بھی دیا۔ میں نے شہر کی طرف نظر کی تو دیکھا کہ ہماری فوج
داخل ہو رہی ہے میں بھاگا بھاگا سلطان کی خدمت میں آیا اور فتح کا مژدہ سنایا۔ سلطان
خود دیکھ رہا تھا، تکبیر کے نعروں نے اسے خیمہ کے باہر کھڑا کر دیا تھا۔

شہر میں سلطانی سپاہ داخل ہوئی، تو کوچہ و بازار میں سخت مقابلہ ہوا، بحر کی طرف سے
مکمل ناکہ بندی ہو چکی تھی، اس لئے قیصر اُدھر سے بچ کر نکل نہ سکتا تھا، شمشیر بکف لڑتا ہوا مارا
فتح کا سہرا جس کا شرف امیر معاویہ سے لیکر اب تک تاجداران اسلام حاصل کرنا چاہتے تھے
نوجوان سلطان محمد ثانی کے سر باندھا گیا۔ اور وہ پیش گوئی بھی پوری ہوئی، کہ فاتح قسطنطنیہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمنام ہوگا۔

سلطان نے حضرت شمس الدینؒ کو شیخ الاسلام کے خطاب کے ساتھ قاضی القضاۃ
منصب دیا۔ فتح کے بعد سلطان حضرت ابو ایوبؓ انصاری کی قبر پر آیا۔ فاتحہ خوانی کے بعد
الاسلام نے سلطان کی کمر میں اسی جگہ تلوار باندھی۔ آئندہ تخت نشینی کی رسم بھی اسی جا
ایوبی میں ہوتی رہی۔ اور فتح مبین کی یادگار اسی طرح قائم رہی کہ شیخ الاسلام ہر ایک سلطان
کی کمر میں یہاں تلوار باندھتا۔

غازی نوجوان سلطان نے اب ارادہ کیا، کہ جو کام اسکے جد امجد بایزید ایلدرم
شروع کیا تھا، اسکی تکمیل کرے۔ اہل یورپ کا حوصلہ فتح قسطنطنیہ کے بعد پست ہو چکا
یونان کی تسخیر کے بعد سرویہ وغیرہ بلاد کو فتح کرتا ہوا، اطالیہ کی طرف بڑھا، سلطان کو معلوم
کہ ممالک رومۃ الکبریٰ کی تسخیر فتح قسطنطنیہ اور شہر روما پر منحصر ہے۔ جزیرہ نما صقلیہ کے
یکے بعد دیگرے مسخر ہو رہے تھے، کہ سلطان کا آخری وقت آگیا ۱۴۸۱ء ۸۸۶ھ میں فوت ہوا۔

سلطان کے دو بیٹے بایزید ثانی اور جمشید تھے، بایزید تخت نشین ہوا محمد پاشا
چاہتا تھا، کہ جمشید کو تخت پر بٹھائے، مگر سپاہ "ینی چری" نے وزیر کو قتل کیا اور بایزید کو
پر بٹھایا۔ جمشید نے علم بغاوت بلند کیا۔ سلطانی فوج کا مقابلہ نہ کر سکا۔ مصر میں بھاگ
حج سے فارغ ہو کر سامان حرب و ضرب فراہم کیا، بایزید نے لکھا کہ بھائی اللہ نے یہ ملک
عطا فرمایا ہے۔ مناسب ہے کہ تم بھی راضی برضا الٰہی رہو۔ جمشید مقابلہ میں آیا اور شکست کھا

طرف بھاگ گیا، پوپ نے پناہ دی، مگر یہاں کس مپرسی کی حالت میں مرگیا۔

سلطان سلیم

بایزید ثانی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلیم تخت نشین ہوا۔ اسکے عہد میں خاندان صفوی کا پہلا بادشاہ شاہ اسمٰعیل تخت ایران پر جلوہ فرما ہوا خاندان صفویہ کے حالات میں ہم لکھ چکے ہیں، کہ ایک فروعی مذہبی عقیدہ کی بنا پر دونوں میں محاربہ ہوا، شاہ اسمٰعیل نے شکست کے بعد صلح کی درخواست کی۔ صلح تو ہو گئی۔ مگر دلوں سے کدورت نہ گئی۔

سلیم نے ارادہ کیا کہ شام اور مصر میں طوائف الملوکی ختم کر کے اپنا خطبہ اور سکہ رائج کرے۔ چنانچہ اس نے حلب اور حمص اور دمشق کی تسخیر کے بعد مصر پر قبضہ جما لیا۔ دولت چرکسیہ مصریہ کا آخری تاجدار ملک اشرف طومان مارا گیا۔ سلیم نے یہاں اپنا نائب السلطنت بٹھا دیا۔ یہ واقعہ ۹۲۳ھ کا ہے۔ اسی سال سلیم نے ارض حجاز کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ اب اس دعوی کے مترادف تھا، کہ سلیم خلیفۃ المسلمین ہے چنانچہ ماسوا ایران تمام دنیا اسلام نے سلیم کا دعوی تسلیم کر لیا، اس کے بعد سلاطین ترکیہ کا خطبہ منجملہ منبر پر ہمارے زمانہ تک پڑھا گیا۔ ادھر ایران میں خاندان صفویہ کو بھی یہی ہوس تھی کہ انہیں امیر المومنین خلیفۃ المسلمین تسلیم کیا جائے۔ لیکن یہ ہوس اقتدار صرف اس حد تک پوری ہوئی کہ عراق انکے قبضہ میں تھا، اور یہاں نجف اور کربلا اور کاظمین وغیرہ مقامات مقدسہ ہیں۔ اس لئے جو شخص بھی ان کی زیارات سے مشرف ہوتا اسے "حاجی" کہتے۔ ہمارے زمانہ میں بھی اکثر شیعہ حضرات حاجی کربلائی کہلاتے ہیں بعض مورخین کا خیال ہے، کہ خاندان صفویہ نے ایک سیاسی ڈھونگ کھڑا کیا تھا، لیکن دل سے قائل نہ تھے ان کا مدعا صرف اتنا تھا کہ اہل سنت والجماعت کو جو عقیدت اولاد علیؑ اور بالخصوص دوازدہ اماموں سے ہے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کل دنیائے اسلام پر چھا جائیں۔ اس کے بعد اس ڈھونگ کو ختم کیا جائے۔ لیکن ہمیں اس نظریہ سے اتفاق نہیں اور اگر یہ صحیح بھی ہو تو نفسیات اور تاریخ کا فتوی یہ ہے کہ جب ایک عقیدہ پختہ ہو جاتا ہے تو قوموں میں وراثتاً منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اور طبائع اس سے اتنی مانوس ہوتی ہیں کہ جان پر کھیل جاتی ہیں۔ مگر اسے ترک نہیں کرتیں۔ خاندان صفویہ نے

جو عقیدہ رائج کر دیا وہ تاحال اپنی پوری شان سے اعمال میں نمایاں ہے، حالانکہ یہ خاندان مٹ
گیا۔ بنو فاطمہ نے مصر میں ایسے ہی عقیدہ کی طرح ڈالی۔ مؤرخین اسے بھی سیاسی ڈھونگ سمجھتے
ہیں۔ ہم خلافت بنو فاطمہ کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ اسمٰعیل المنصور تیسرے خلیفہ فاطمیہ نے
اکثر داعیوں (Propagandist) کو یا قتل یا جلاوطن کیا، اس لئے کہ یہ بنو فاطمہ
کے نام پر عقائد کفریہ الحادیہ شائع کر رہے تھے اور اعلان کر دیا کہ جو بھی ان عقائد باطلہ کا حامی ہو
جیسے کہ "قرمطی" تھے، جہاں پاؤ قتل کر دو۔ بعض مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ یہ بھی منصور کا سیاسی ڈھونگ
ہی تھا، اصل میں وہ دنیائے اسلام میں ہر دلعزیز ہونا چاہتا تھا، بہرحال یہ عقیدہ تھا عوام کے
دل میں نقش ہو چکا تھا، صحیح ہو، یا غلط عوام کالانعام تمیز نہیں کرتے۔ ان کو کیا معلوم کہ ان کے
پیشوا کس غرض کی تکمیل کے لئے ایسی باتیں بناتے ہیں۔ فرقہ باطنیہ، کی بنیاد پڑ چکی تھی اور صوفیاء
باصفا بالخصوص خاندان صفویہ کے حلقہ ارادت میں ان عقائد کی تلقین ابتدا میں رازدارانہ اور بعد
میں جب تخت و تاج کے مالک ہو گئے علانیہ ہوتی رہی۔ اب اگر فاطمی خلیفہ منصور کی طرح ان کا یہ ارادہ
بھی ہوتا، کہ عوام اسے ترک کر دیں، تو یہ ان کے بس کی بات نہ تھی، نادر شاہ نے بھی کوشش
کی، مگر کامیاب نہ ہوا، اس کو دیوانہ مشہور کیا گیا اور قتل کر دیا۔ ان تاریخی واقعات میں ہمارے
زمانہ کے اہل علم کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے، کہ آیا وہ بحیثیت "مسلم" جس کی تعریف قرآن حکیم میں
کی گئی ہے، جس پر سب کا اتفاق ہے،
"زندہ رہنا چاہتے ہیں؟" اور جب وہ ان عبرت آموز تاریخی واقعات پر غور کریں گے، جو
اس دور میں رونما ہو رہے ہیں۔ اور جس سے ہم گذر رہے ہیں تو اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اگر یہی
لیل و نہار ہیں تو ہم زندہ نہیں رہ سکتے، اور یہ کہ ہماری بے حسی اور ذہنی جمود میں
کچھ کلام نہیں، اگر ہم فروعی باتوں کو اصول کی اہمیت دے کر لڑتے جھگڑتے ہیں، وہ واقعات
ہم اس کتاب کے تیسرے حصہ میں قلمبند کریں گے۔
سلطان سلیم کے عہد کا ایک اور کارنامہ یہ ہے، کہ اس نے ایک فرمان شائع کیا، کہ یہود و
نصاریٰ یا تو اسلام قبول کریں یا میری مملکت سے نکل جائیں۔ اس فرمان سے یہود و نصاریٰ
میں کھلبلی تو مچنی ہی تھی، علماءِ اسلام بھی مضطرب ہو گئے شیخ الاسلام علماء کا ایک وفد لیکر سلطان

کے پاس آئے اور کہا کہ یہ فرمان احکامِ اسلامی کے خلاف ہے "لا اکراہ فی الدین" سلطان نے کہا کہ خود رسول کریم نے ارشاد فرمایا تھا کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے خارج کر دو۔ شیخ الاسلام نے کہا کہ وہ برسرپیکار تھے۔ اگر آپ کی رعایا یہود و نصاریٰ بغاوت کے مرتکب ہوں تو آپ بھی سنتِ رسول پر عمل کریں۔ علاوہ ازیں جبری ایمان عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں معاشری زندگی میں ہمارے ساتھ یہود و نصاریٰ کا اختلاط غلط فہمی اور تعصب کو دور کر دیگا۔ اگر وہ دُور دُور ہی رہیں تو نفرت بڑھتی جائیگی۔ اور وہ اسلام سے بیگانہ ہی رہینگے ایک جرمن مورخ لکھتا ہے کہ جس کے فائدہ کے لئے سلطان نے یہ فرمان جاری کیا تھا انہوں نے مخالفت کی اور سلطان کو فرمان منسوخ کرنا پڑا لیکن یہی مورخ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ اسلام عالمگیر دین ہے ہم کہتے ہیں کہ ہسپانیہ میں عیسائیوں نے مسلمانوں سے کیا سلوک کیا؟ اور ہمیشہ کیا سلوک کرتے رہے اگر سلیم قصاص کے جذبہ کے تحت یہی سلوک کرتا، تو حق بجانب تھا لیکن اس نے ہارمان لی اور یہ اسلام کی شاندار فتح ہے جو کبھی مسیحیت کو نصیب نہیں ہوئی۔ حروب الصلیبیہ میں حرم شہر قدس میں جتنے مسلمان زن و مرد اور بچوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ جب غازی سلطان صلاح الدین کو قصاص کا موقعہ ملا، تو ایک عیسائی عورت کی درخواستِ رحم و کرم پر معاف کر دیا یہی حقیقت تھی، جو مجتہدین نے شاہ اسمٰعیل صفوی پر واضح کی، مگر اس نے نہ مانی اور سنیوں کے قتلِ عام کا حکم دیدیا جو اسکے خاطر خواہ ہوا، اگر وہ موعظۂ حسنہ اور حکمت سے کام لیتا۔ تو کشت و خون کی نوبت نہ آتی، نہ وہ خود اور نہ مذہب بدنام ہوتا۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسّر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

سلطان سلیمان اوّل

یہ سلطان اسم با مسمّٰی تھا، اس نے سلطنتِ عثمانیہ کی شان و شوکت کو چار چاند لگا دیئے اس لئے اس کے جاہ و حشم کے لحاظ سے یورپ کے مورخین اسے Magnificent کہتے ہیں اس نے آسٹریا اور پولینڈ تک تمام ممالکِ یورپ کے سلاطین کو نیچا دکھایا۔ ارادہ تھا، کہ تمام یورپ پر اپنا تسلط جمائے کہ ایران میں شاہ عباس نے اس کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کر لیا۔ اور وہی تیمور اور

یا بایزید یلدرم کے واقعات کو تاریخ نے پھر دہرایا۔ ایک انگریز مؤرخ لکھتا ہے کہ اس وقت سلطنت ترکیہ منتہائے عروج پر تھی، اور اس کے توپ خانہ کا جواب نہ تھا شاہِ عباس کیا مقابلہ کرسکتا البتہ یورپ نے اطمینان کا سانس لیا، اس نے ایران کو ایک سرے سے دوسرے تک روند ڈالا اس کے عہد میں بحری جنگی بیڑہ خیرالدین پاشا کے تحت بحیرہ شام کے جزائر مالٹا وغیرہ قابض ہوگیا۔ اور شمالی افریقہ کا ساحلی علاقہ بھی سلطنتِ ترکیہ میں شامل ہوگیا، سچ تو یہ ہے حضرت سلیمان کو بھی وہ مملکت اور جاہ وحشمت نصیب نہ ہوئی جو غلامانِ محمدؐ کے حصہ میں آئی اور فلسطین تو سلطان سلیمان کی سلطنت کا ایک کونہ تھا۔

سلطان سلیمان کے بعد سلاطینِ ترکیہ کی لڑائیاں ایک طرف تاجدارانِ یورپ اور دوسری طرف شاہانِ کجکلاہ ایران سے جاری رہیں ان لڑائیوں اور خانہ جنگی کا تذکرہ بیفائدہ ہے۔ چند مشہور واقعات البتہ قابلِ ذکر ہیں۔

سلطان محمد خاں رابع کے عہد میں ایک یہودی نے بیت المقدس میں دعویٰ مسیحیت کیا مؤرخین کا بیان ہے کہ بہت باتونی اور وجیہ اور شعبدہ باز تھا یہودی تو گرویدہ ہونے تھے، لاکھوں عیسائی بھی گمراہ ہوگئے۔ والئی بیت المقدس نے اس کی گرفتاری کا حکم صادر کیا تو بھاگ کر قسطنطنیہ آیا، یہاں صدرِ اعظم احمد پاشا نے قید کردیا۔ ہزارہا عیسائی اس کی زیارت کیلئے قید خانہ میں روپیہ دے کر آتے۔ اس کی اطلاع سلطان کو بھی ہوئی، اور بہ نفسِ نفیس ملاقات کیلئے آیا۔ مدعی مسیحیت نے تقریر شروع کی تھی کہ سلطان نے کہا کہ میں آیات و روایات نہیں جانتا سپاہی ہوں، چند تیر اندازوں کو حکم دیتا ہوں کہ تجھ پر تیر برسائیں، اگر تیرے بدن پر اثر نہ ہوا تو میں بھی ایمان لے آؤں گا۔ پھر یہ مسیح سلطنت تیری ہے۔

مسیح کاذب سلطان کے پاؤں پر گر پڑا اور کہا کہ مجھ میں آپ کے امتحان کی طاقت نہیں۔ اور ساتھ ہی کلمہ طیبہ پڑھا۔ "لا الٰہ الا اللّٰہ محمد الرسول اللّٰہ" سلطان بھی ہکا بکا ہو کر رہ گیا لیکن اس کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ یہود اور عیسائیوں نے اپنے پیر و مرشد کی تقلید کی اور بے شمار مسلمان ہوگئے، مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ اس مسیح کاذب کو کامیابی اسلیئے ہوئی تھی کہ سلطان کے عہد میں ۱۰۷۶ھ میں متواتر زلزلوں اور طاعون نے لوگوں کو خوفزدہ کر رکھا تھا۔ اور ہر ایک کو

...ن تھا، کہ قیامت نزدیک ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سید محمد جونپوری کے دعویٰ مہدیت کے ...بھی یہی واقعات زلزلہ و طاعون رونما ہوئے۔ فرشتہ سلطان سکندر لودھی کے حالات ...ت لکھتا ہے کہ ۹۱۱ھ میں اس قیامت کا زلزلہ آیا، کہ پہاڑ لرز گئے۔ زندوں نے قیامت ...زدوں نے حشر دیکھ لیا۔

ورنہ صدی واحدی عشر از زلزلہا گردید سواد آگرہ مرحلہا
باآں کہ نباہش بسے عالی بود از زلزلہ شد عالیہا سافلہا

...ون تو سید محمد کی زندگی ہی میں پھوٹ چکا تھا، اور باوجود اس امر کے کہ رسل و رسائل کے ...ئع عام نہ تھے۔ کوئی شہر اس موذی مرض کی تباہی سے نہ بچا۔ ۹۱۱ھ میں ہی سید محمد کا انتقال ...فراہ واقع خراسان میں ہوا۔

۱۱۰۶ھ میں سلطان مصطفےٰ خان ثانی تخت نشین ہوا، تو اعلان کیا کہ مسلمانوں نے ...نہ جہاد فراموش کر دیا ہے۔ نہایت نامناسب ہے۔ اگر گھروں میں آرام سے بیٹھیں مسیحی سلاطین ...تہ و متحدہ قوت سے مسلمانوں کے ملک پر ہجوم کر رہے ہیں، ہمارے آبا و اجداد ہمیشہ عیسائیوں ...ے برسر پیکار رہے ہیں میرا مقصد حیات بھی یہی ہے۔ اور مسلمانوں کو بھی دعوت جہاد دیتا ہوں ...ونکہ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے، کہ جب مسلمان جہاد ترک کر دینگے تو ذلیل ہو جائینگے اور ہم ذلیل ...رہے ہیں۔ اس اعلان نے مسلمانوں کو جھنجھوڑا اور خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ سلطان نے ...ادرپے روسیوں کو شکست دی۔ آسٹریا کی فوج کو ہزیمت دیکر جرمن کی طرف متوجہ ہوا، ...ن شاہان لندن اور ہالینڈ کے سفیر درمیان میں آ دھمکے اور ۱۱۱۱ھ میں صلح و صفائی ہو گئی۔ ...ن لشکر سلطانی نے اس صلح پر ناراضی کا اظہار کیا۔ اور سلطان کو قیدخانہ میں ڈالدیا۔ جہاں ...نے انتقال کیا۔ یہ سلطان نہایت نیک نہاد تھا۔ جب فوج نے بغاوت کی تو وزراء نے ...شورہ دیا، کہ اپنے بھائی سلطان احمد کو قتل کر دو، کیونکہ فوج اس کے حق میں ہے سلطان ...نے کہا کہ میں تخت و تاج سے دستبردار ہونا بدرجہا بہتر سمجھتا ہوں، بہ نسبت اس کے کہ اپنے ...ائی کے خون سے ہاتھ رنگوں اور اپنا نامۂ اعمال سیاہ کروں۔

اب سپاہ اتنی خودسر ہو گئی تھی، کہ جس کو چاہتے معزول کرتے اور جس کو چاہتے تخت پر

بٹھا دیتے ۔ چنانچہ سلطان مصطفٰے خان ثانی کو معزول کر کے احمد خان ثالث کو تخت پر بٹھا
معزول کر کے سلطان محمود اول کو بٹھا دیا۔ ان حالات میں مسیحی تاجداران یورپ دلیر
بڑھ گیا۔ فوج نے جو ینگ چری سے موسوم تھی ایک آفت برپا کر رکھی تھی کئی بادشا
ہزاروں سپاہی خانہ جنگی میں مارے گئے ۔ نادر قلی نے طہماسپ ثانی کو جو سلطان
تھا، تخت سے اتار کر برائے نام عباس ثانی کو بٹھا دیا۔ اور سلطان کو لکھا کہ ملک
جو تمہارے قبضہ میں ہے واپس کرو ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اور رسا
عبور کر کے بغداد کو محاصرہ میں لے لیا۔ پہلی مرتبہ شکست کھائی لیکن دوسری
بغداد اور عراق کے اکثر شہر مسخر کر لئے ۔

سلطان عبد الحمید کے عہد میں متواتر خانہ جنگی سے سلطنت کمزور ہو گ
روس اور جرمن کی متحدہ فوج نے حملہ کر دیا۔ اگرچہ منہ کی کھائی، مگر حوصلہ پست
کے جانشین کریم خان زند شاہ ایران نے بصرہ پر قبضہ کر لیا۔

سلیم خان ثالث کے عہد میں پھر روس اور جرمن کی متحدہ فوج سے مقا
نے معاہدۂ صلح کو مسترد کر دیا۔ اپنے شوہر پطرس ثالث ر
کی راہ دکھائی۔ قلعہ اسمٰعیلیہ پر لشکر کشی کی یہاں تیس ہزار سلطانی فوج تھی۔ تین
میدان کارزار گرم رہا، عورتوں اور بچوں نے بھی دلیرانہ مقابلہ کیا، مگر تیس ہ
ایک آدمی بچا، اگرچہ روسی لشکر کا نقصان جان بہت زیادہ ہوا، مگر وہ قلعہ پر قا
جب قسطنطنیہ میں اطلاع ہوئی، تو جوش اور غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی اور سلطا
بھائیوں کا بدلہ لینے کیلئے تیار ہی تھا، کہ انگلستان آ دھمکا اور بیچ بچاؤ کر کے صلح
چال جو انگلستان ہمیشہ چلتا رہا، اس کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ دوط
کرتا رہا اور خود ثالث بالخیر کے فرائض انجام دیتا رہا۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ تو سلطان نے فرانس کی
چاہتے تھے کہ سلطان فرانس کی دوستی ترک کر دے مگر سلطان نے سفیر انگلستان
انگریزوں نے سلطان کو مرعوب کرنے کے لئے اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ مگر محمد پاشا

یا اب انگریزوں نے پھر ثالث کے فرائض انجام دیئے اور روس اور سلطان میں صلح کرا دی
رک اٹھی اور سلطان کو معزول کر کے مصطفےٰ خاں رابع پسر سلطان عبدالحمید کو تخت پر بٹھا دیا
کے بعد اس کا بھائی سلطان محمود ثانی جانشین ہوا، تو ارادہ کر لیا، کہ "سپاہ نیک چری" کی شوریدہ
خاطرخواہ علاج کرے۔ "نیک چری" عرصہ سے سلطان گر بنے ہوئے تھے، اکابر سلطنت
نیہ مجلس میں انکے استیصال کا لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ ۱۲۴۱ھ میں انکی رہائش گاہ پر عین غفلت میں
سپاہ نے حملہ کیا، ستر ہزار نیک چری ایک ہی دن میں مارے گئے، اگرچہ ملک میں شورش کا
ب ہو گیا، مگر سلطان کی عسکری قوت کمزور ہو گئی۔ ۱۲۴۴ھ میں روس سے مقابلہ ہوا تو شکست
تاوان جنگ بھی ادا کرنا پڑا۔ محمد علی پاشا والئ مصر نے خود مختاری کا اعلان کر دیا، حلب اور حجاز
ل ہو گیا اور خلیفۂ مصر کا لقب اختیار کیا۔ سلطان کے بیٹے عبدالمجید کے عہد میں محمد علی کی بڑھتی
اقت سے انگریز بھی خائف ہو گئے۔ ہندوستان کو جہاں ان کا قبضہ تھا۔ راستہ مصر ہی سے
اس لئے محمد علی کو مرعوب کرنے کے لئے سلطان کا ساتھ دیا۔ اور پھر ثالث بالخیر کے
ل انجام دیئے۔ یہ قرار پایا، کہ محمد علی کی حکومت صرف مصر پر رہے، سلطنت عثمانیہ کا نائب
رہوگا مگر حکومت موروثی ہوگی، اس طرح "حرمین" پھر سلطان کی حفاظت میں آ گئے۔

سلطان عبدالمجید خان کے عہد کا بڑا واقعہ ۱۸۵۲ء میں روس اور ترکیہ کا جنگ ہے۔ روس نے
لطان کو یہ پیام دیا، کہ تمام عیسائی جو مملکت ترکیہ میں آباد ہیں، بلحاظ مذہب روسی رعایا، اور
کے معابد روسی املاک متصور ہوں، اور انکے تنازعات بھی روسی عدالت ہی فیصلہ کرنے کا
رکھتی ہے۔ اور ساتھ ہی "مالدیویا" اور "ایشیا" جو روسی سرحد سے ملحق تھے دبا لئے۔ انگریزوں
، دیکھا، کہ اگر روس کا قبضہ قسطنطنیہ پر ہو گیا، تو ان کا راستہ بحیرہ شام میں منقطع کر دیگا، چونکہ
ہندوستان کے شمال میں نزدیک تر سلطنت ہے، ہندوستان پر بھی قابض ہو جائیگا۔ فرانس اور
سٹریا کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس لئے کہ ان کو بھی روسی اقتدار کا خطرہ محسوس ہونے لگا۔ انگریزوں
سیاسی تدبر ہمیشہ اس امر کا تقاضہ کرتا رہا، کہ جو بھی سیاسی مقصد مد نظر ہوتا، اسکی تکمیل کے لئے
دوسری طاقتوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیتے۔ انگریزوں کا مقصد صرف اتنا تھا، کہ روس کا اقتدار بحیرہ
سود پر نہ رہے۔ اور اس طرح اس کا یہاں سے بحیرہ مارمورا کے راستہ بحیرہ روم میں داخلہ بند

کر دیا جائے۔ یہ لڑائی جنگِ کریمیا سے موسوم ہے۔ سب سے بڑی لڑائی "سیباسٹیبول" پر ہوئی جو بے شمار نقصان جان و مال کے بعد شکست ہوئی، پیرس میں ۱۸۵۶ء میں تمام دول کے وکلاء جمع ہوئے اور عہد نامہ صلح لکھا گیا۔

سلطان عبد العزیز نے بہت کچھ ملکی اور مالی امور میں اصلاحیں کیں، اس وقت ایران میں خاندانِ قاچار حکمران تھا۔ اس سے بھی اتحاد ہوا، لیکن عبد العزیز اصلاحات کی وجہ سے بدنام رہا۔ اراکین سلطنت نے اسے معزول کر کے مراد خامس کو تخت پر بٹھا دیا۔ پھر اس کو بھی معزول کر کے ۱۸۷۶ء میں سلطان عبد الحمید خان کو بٹھا دیا۔ اگرچہ یہ سلطان بیدار مغز اور سیاسیات سے خوب واقف تھا، مگر عوام کی ذہنیت پست تھی۔ ان پر ذہنی جمود اتنا چھایا ہوا تھا، کہ ہر ایک اصلاح کی مخالفت کرتے۔ ایک دفعہ پھر روس سے مقابلہ ہوا، اس لڑائی میں "پلونا" کا معرکہ مشہور ہے۔ غازی عثمان پاشا نے دو برس مدافعت کی۔ آخر پھر سلاطینِ یورپ درمیان میں آئے، انگریز صلح کے لئے بلند آہنگ تھے۔ صلح ہوئی، "مانٹی نگرو" اور "سرویہ" اور "رومانیہ" سلطنت ترکیہ سے آزاد ہو گئے۔ صوبہ "بوسنیہ" اور "ہرزگوینہ" سلطنت آسٹریا میں شامل ہو گئے۔ بحر روم میں جزیرہ "قبرص" انگریزوں نے ہتیا لیا۔ اور شمالی افریقہ میں "ٹونس" فرانس کے ہاتھ آیا۔ سلطنتِ ترکیہ تو کمزور ہو گئی، مگر روس کا خواب اقتدار بھی پریشان ہو کر رہ گیا۔ اب بلکہ بحیرہ روم کے درمیان چند اور سلطنتیں حائل ہو گئیں۔ اور انگریز مطمئن ہو گئے۔

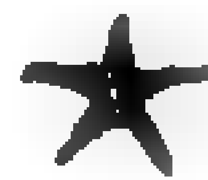
اب ہم اپنے زمانہ میں آ گئے ہیں ؏

اتحاد پریس مل روڈ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین پرنٹر چھپی ۔ ۔ ۔ ۔

خلافتِ اسلامیّہ

(حصّہ سوم)

خواجہ عباداللہ اختر
(رفیق ادارہ ثقافت اسلامیہ)



مطبوعات ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ لاہور

(پاکستان)

۱۹۵۱ء

(اتحاد پریس بل روڈ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین پرنٹر چھپی)

واقعاتِ حاضرہ

اس کتاب کے پہلے اور دوسرے حصے میں ہم نے خلافت راشدہ سے لیکر زمانہ تک وہ حالات بیان کئے ہیں جو اس وقت تک رونما ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ واقعات جاری ہے اور دنیائے اسلام جس دور سے گزر رہی ہے وہ ہمارے پیش نظر ہے۔ شکست خوردہ ذہنیت اسے دور "انحطاط" سے تعبیر کرتی ہے لیکن محقق مورخ قوموں کے عروج و نزول کی دل خراش داستان بیان کرتے ہوئے ان قوموں کو نہیں دیکھتا وہ واقعات اور ان کی رفتار کو دیکھتا ہے کہ حضرت انسان کو کہاں سے کہاں لے جا رہی ہے۔ اور کس مقصد اعلیٰ کے قریب اور قریب تر لا رہی ہے؟ اگر ہم واقعات کا اسی زاویہ نگاہ سے مشاہدہ کریں جس نظر سے اہل تحقیق دیکھتے ہیں تو واقعات حالیہ کے اسباب ماضی میں اور مستقبل کے اسباب حال میں صاف صاف میز دکھائی دیں گے۔

تا دریں محفل تامل بر بساط حال ریخت
ساغر ماضی بگردش رنگ استقبال ریخت (بیدل)

ہم سلسلہ واقعات اور اس سلسلہ کی ہر ایک کڑی کو جو ایک دوسری سے مضبوط مربوط ہے، دیکھتے ہیں لیکن تاریخ کا فتوی یہ ہے کہ تمام کائنات ایک واقعہ واحدہ ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ تاریخی واقعات بیان کرتے ہوئے فلسفہ تاریخ کی بھول بھلیوں میں نہ کھو جائیں۔ اس لئے یہی اشارات فہم و تفہیم کے لئے کافی ہیں جو ہم واقعات کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں اور بیان کریں گے۔

تاریخ اسلام میں یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دو قومیں عرب اور ترک ہی ہیں جنہوں نے آج تک نمایاں حصہ خلافت اور سلطنت اسلامیہ میں لیا۔ ان اوراق کے

مطالعہ سے واضح ہو گیا ہو گا کہ تمکین دین کے لئے دونوں نے کیا خدمت کی ہے واقعہ
حاضرہ پیشگوئی کر رہے ہیں کہ یہ خدمت ابھی کسی اور قوم کے سپرد ہو گی۔

انسانی زندگی مسلسل جدوجہد ہے۔ قوموں کے عروج میں بھی جدوجہد شامل
ہوتی ہے اور جب تک "روح جہاد" کارفرما ہوتی ہے وہ ترقی کرتی جاتی ہیں۔ لیکن ہم
کر چکے ہیں کہ ہر ایک انسان کی انفرادی اور جماعتی زندگی مختلف دوروں سے گزر
ہوئی آخر "اجل مسمی" کے کنارہ پر آ لگتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے اس لئے یہ فطری تو
ناگزیر امر ہے۔ قومیں بنتی اور بگڑتی رہیں اور یقیناً کچھ عرصہ اور بنتی اور بگڑتی رہیں گی
انسانیت مسلسل ارتقائی مرحلے طے کرتی آ رہی ہے۔ اور وہ وقت "انھم یرونہ
بعیدا، ونرٰہ قریبا" (۲۹) لاکھ دو لاکھ سال کا عرصہ کائنات بلکہ انسانی زندگی
"کالمح البصر" ہے اور اگر ہم اپنی گزشتہ زندگی کو دیکھیں اور اسی طرح گذشتہ انسانی
زندگی پر نظر کریں تو

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا!

انسانی زندگی "حال" ہے۔ "ماضی" اور "مستقبل" کا تصور "حال" ہی کے دو
ہیں۔ اور ہمارا "تذکر" کنارہ ماضی اور "تفکر" کنارہ مستقبل پر کھڑا ہو کر "حال" کو دیکھتا
ماضی معدوم، اور مستقبل موہوم اور حال معلوم، کتنا حیرت انگیز یہ نظام کائنات ہے
حال یہ امر یقینی ہے اور تاریخی واقعات کی شہادت قطعی ہے کہ "قومیت" کا تصور دن
قریب تر ہے کہ ذہن انسانی سے محو ہو جائے گا۔ "ولکل امۃ اجل" (۳۴) اور جس
یہ واقعہ رونما ہو گا وہ دن اسلام کی شاندار فتح کا ہو گا۔ نامسلمان اس کوشش میں لگے ہے
ہیں کہ یہ وقت اجل نہ آئے اور خود مسلمانوں کے ذہن سے یہ تصور محو ہو جائے۔ ان
سعی بے حاصل اور اعمال باطل ہو کر رہ جائیں گے۔

قرآن عظیم نے مسلمانوں پر "جہاد" فرض قرار دیا ہے مسلمانوں کی ظاہری نکبت
کی وجہ یہی ہے کہ وہ اسے فراموش کر چکے ہیں۔ جب روس نے ۱۹۱۱ء میں
رضا کے روضہ پر گولہ باری کی اور مجتہدین کو پھانسی دی تو ایک شکست خوردہ ذہنیت

نے "جہاد" کو جو مسلمانوں پر دینی فریضہ ہے باطل تصور قرار دیا اور اسی کی تائید ہمارے پنجاب کے ایک مدعی نبوت نے بھی کی ہے اور جہاد کو اللہ کی دشمنی سے تعبیر کیا۔

"فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

جو واقعہ بغداد پر ہلاکو خاں کے ہاتھ سے گزرا۔ اسے اس زمانہ کے مسلمان "قیامت کے آثار" سے موسوم کرتے ہیں۔ ہلاکو خاں ہلاک ہو گیا۔ اس کی اولاد حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔ عباسیوں نے بے شک شکست کھائی لیکن اسلام مظفر و منصور اس وقت بھی تھا۔ اور اب بھی ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ انسانی زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے۔ اور شکست خوردہ مایوس انسان زندہ رہنے کا حق نہیں رکھتا انسانی زندگی کا اور ہر ایک قومی زندگی کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ ہم مسلمانوں کی زندگی کا واحد مقصد "اسلام" ہے ہمیں اسی کے ساتھ جہاد زندگی جاری رکھنا چاہیئے۔ یہ ایک "فرض" ہے جو ہمیں بلا لحاظ فتح و شکست ادا کرنا چاہیئے۔

"ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین وتلک الایام نداولھا بین الناس" (۳/۵)

"اور سستی نہ کرو اور غم نہ کھاؤ تم ہی غالب آؤ گے بشرطیکہ تم ایمان والے ہو اور یہ فتح و شکست کے دن ہم لوگوں پر پھیرتے رہتے ہیں۔ ان کا اثر تمہارے ایمان کی پختگی پر نہ ہونا چاہیئے۔ کہ

کہ: "آئین جہاں گاہے چنیں گاہے چناں باشد"

اگر ہمیں دعوئ مسلمانی ہے "فلا تموتن الا وانتم مسلمون" (۱/۱۴) ہمیں اسلام کے ساتھ ہی زندہ رہنا ہے اور اسی کے نام پر مرنا ہے۔ جب ہم یقین کرتے ہیں کہ اسلام ہی دین الحق، دین الفطرت اور دین اللہ ہے۔ تو ہم مسلمان اللہ والے ہیں۔ جو حی القیوم ہے۔ اور ہم سے وعدہ ہو چکا ہے کہ دنیا و آخرت کی تمام نعمتیں اور تمام برکات "جنت تجری من تحتھا الانھار" ہماری ہیں۔ کیا یہ وعدہ ہمارے اسلاف کے حق میں پورا نہیں ہوا۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے حق میں بھی پورا نہ ہو۔ بشرطیکہ

ہم صحیح معنی میں مومن مسلمان ہوں ۔ اور انتہائی ممکن جدوجہد بحیثیت مومن مسلمان کر
اگر ہم ہمت ہار کر بیٹھے ہیں تو دین اللہ کا تو کچھ بگاڑ نہیں ہم ہی خسارہ میں رہیں گے
سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ ایک اور قوم کو ہماری جگہ لے آئے گا جو ہماری جیسی نہ ہوگی
کیا عرب کے بعد ترک نہیں آئے ؟ اور کیا یہی اقوام یورپ اور امریکہ جو اس وقت
ہلاکو کی سنت پر عمل کر رہی ہیں کچھ بعید امر ہے کہ حلقہ بگوش اسلام ہوں ؟ ان لوگوں
ترقی بحیثیت مسیحی نہیں کی ۔ ہم نے ہسپانیہ اور انہی کے ممالک میں ان کو اسلام
روشناس کیا ۔

جب ہمارا قدم یورپ میں آیا ۔ اور اقوام یورپ اسلام کے زیر اثر آ گئیں
تاجداران یورپ اور امرا نے پوپ سے شکایت کی کہ ہماری رعایا (SERFS) بے
سے مسلمانوں کا انتظار کر رہی ہے ۔ وہ دیکھ چکی ہے کہ جہاں مسلمانوں کا فاتحانہ قدم گیا و
لوگ جو ملوک اور جاگیرداروں کے ظلم و ستم سہہ چکے تھے آزاد اور خوش حال ہو گئے
میں یہی ایک کشش عوام الناس کے لئے ہے اور وہ اسلام خوشی سے اس لئے قبو
رہے ہیں کہ ہماری حکومت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں ۔ اسلام کی فاتحانہ پیشق
ایک خطرہ ہمارے لئے اور دین مسیحی کے لئے بھی ہے ۔ مسلمان صرف اپنے دین کی خا
ہیں اور ان کا دینی جوش ایک طوفان ہے جو ہمیں خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے
رہا ہے ۔ اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو مسلمان نہ صرف تمام یورپ پر قابض ہو جائیں
بلکہ یورپ اسلام قبول کر لے گا ۔ اسلام ایک عجیب دین ہے ۔ اس میں ریاست (ATE
کا تصور تو ہے مگر دینی حکومت (CHURCH) کا نہیں ۔ اس کی ریاست میں حکومت
تصور بھی عجیب ہی ہے کہ تمام حکومت ایک اللہ ہی کی ہے اور تمام کائنات جس
عالم انسانی بھی شامل ہے اسی اللہ کی مخلوق اور بندہ ہے ۔ اس لئے مسلمانوں میں
اور اخوت اور مساوات کے جذبات کارفرما ہیں ۔ بہر حال پست اور پس ماندہ لوگو
لئے اس میں ایک کشش ہے اور وہ ان کو جذب کر رہا ہے ۔

حروب صلیبیہ تو پوپ کی طرف سے ایک تحریک تھی جس کا مقصد صرف ا

پوپ کی دینی حکومت قائم رہے لیکن جب تاجداران یورپ نے دیکھا کہ پوپ کی دینی حکومت ان کو بھی اپنا غلام بنا رہی ہے تو اصلاح (REFORMATION) کی تحریک کے ذریعے ایک گونہ آزادی حاصل کر لی۔ جرمن اور فرانس میں رفتہ رفتہ "چرچ" کا خاتمہ ہو گیا۔ انگلستان نے اپنی سیاسی اغراض کی تکمیل کے لئے اسے قائم رکھا مگر پوپ سے بے تعلق ہو کر۔ آج ہم چرچ آف انگلینڈ اور امریکن چرچ کا نام سنتے ہیں۔ ان میں انگلینڈ ہی پیش پیش ہے۔ مسیحی کلیسا کی تاریخ ایک مستقل موضوع ہے اس کا مطالعہ فرانسیسی فاضل رینان (RENAN) کی کتاب میں کرنا چاہیئے۔

نام نہاد مسیحی اقوام نے بہت کچھ مسلمانوں سے سیکھا۔

کس نیاموخت علم تیر از من　　　　که مرا عاقبت نشانه نه کرد

لیکن یہ دور بھی گزر رہا ہے اور جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ اقوام یورپ اور امریکہ میں مسلسل جنگ مختلف صورتوں میں اسی وقت سے ہو رہی ہے جب ان کا تصادم مسلمانوں سے خلافت کے تحت ہوا۔ پہلے "سٹیٹ" اور "چرچ" میں جنگ تھی۔ "سٹیٹ" نے "چرچ" کو نیچا دکھایا۔ پھر "سرمایہ داری" (LISM　　　　) اور "اشتراکیت" (SOCIALISM) میں ہوا۔ سوشلزم کی ترقی یافتہ صورت "کمیونزم" (COMMUNISIM) ہے اب ان دونوں میں زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر مسلمانوں میں کچھ سیاسی تدبر ہوتا تو وہ اس جنگ کا تماشہ دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے اور اس میں عملاً حصہ نہ لیتے۔ ان کو ان کا آلہ کار نہ بننا چاہیئے ورنہ وہ انہی کے ساتھ تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ قرآن حکیم نے اس واقعہ کی خبر پیش از وقت دے کر مسلمانوں کو متنبہ کر دیا کہ یہ ہولناک جنگ ضرور ہو کر رہے گی اور جو اس سے کنارہ کش رہیں گے وہی فائدہ میں رہیں گے۔

" ان الذین سبقت لھم منا الحسنیٰ، اولئك عنها مبعدون، لا یسمعون حسیسها، وھم فی ما اشتھت انفسھم خلدون، لا یحزنھم الفزع الاکبر" (۲۱)

"تحقیق جن لوگوں سے ہمارا نیک وعدہ پہلے ہو چکا وہ اس (حرب عظیم) سے دور

ہی رکھے گئے ہیں۔ اس کو اس کی (ہلاکت آفرینی کی) بھنک بھی نہ پہنچے گی اور وہ اس میں
اپنی حسب خواہش ہمیشہ رہنے والے ہیں اور وہ اس کی (جزع و) فزع سن کر غم زدہ
ہوں گے جو بہت بڑی ہوگی"

ہمارے زمانہ کے تاریخی واقعات جہاں تک ان کا تعلق خلافت اسلامیہ
سے ہے اقوام یورپ اور امریکہ کے سیاسی اور اقتصادی اقتدار سے وابستہ
ہیں کسی ملک کی خوش حالی اور فارغ البالی اس کی تجارت پر منحصر ہے "ان
"تاریک" (DARK AGES) اور "قرون وسطیٰ" (MEDEVIAL AGES) میں کسی
قوم کے عروج کا اندازہ اس کی فتوحات ملکی سے کیا جاتا ہے۔ ان فتوحات
ان فتوحات کے ذریعہ ہمسایہ کمزور اقوام کے جان و مال پر بجبر و قہر قبضہ ہو
جاتا اور فاتح قوم لوٹ کھسوٹ کے بعد لوٹ جاتی اور کچھ وقفہ کے بعد
قتل و غارت کا بازار گرم رکھتی۔ جب تک کسی قوم میں جارحانہ حملوں کی قوت
ہے۔ وہ یہی کچھ کرتی اور اس کو بہت بڑا تاریخی کارنامہ تصور کیا جاتا۔ ان ایام
جاہلیت کو "زمانہ شجاعت" بھی کہتے ہیں۔ کہ ہر ایک قوم کی قوت کا امتحان
ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ قوموں میں ملک گیری کا خیال پیدا ہوا۔ اور یونانیوں اور رومیوں
اور ایرانیوں وغیرہم نے عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ صدیوں تک ان
لوگوں نے کوس "لمن الملک" بجایا۔

آنحضرت ص کی بعثت پہ ایک نیا دور شروع ہوا۔

"زمانہ دگرگوں آئین نہاد"

عرب میں حجاز کا وہ حصہ جسے وادی "مکہ" قدیم زمانہ میں اور اب اس کے داخلی
حصہ کو "مکہ" کہتے ہیں۔ "غیر ذی زرع" ہے۔ ان لوگوں کی ضروریات زندگی ان ہمسایہ
ممالک ہی سے مہیا ہو سکتی تھیں جو سر سبز سیر حاصل ہیں۔ اس کا ذریعہ ایک تو
ایام جاہلیت کی لوٹ گھسوٹ تھا یا تجارت۔ ان لوگوں نے "تجارت" کو ترجیح
دی۔ اس لئے کہ اس میں ہر ایک قوم کی ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں جن کے

ساتھ ان کا لین دین رہا۔ ان کی آؤ بھگت ہر ایک جگہ ہوتی۔ ان کے تجارتی قافلے ہر ایک موسم میں یمن اور شام اور مصر کے راستوں میں آمد و رفت رکھتے۔ اس لئے لوگ بہ نسبت دیگر اقوام امن کی زندگی بسر کرتے رہے اور خوشحال بھی تھے۔ مکہ قبائل عرب کا نہ صرف تجارتی بلکہ مذہبی مرکز بھی تھا۔ اور یہاں سالانہ دُور و نزدیک سے لوگ بغرض حج اکٹھے ہوتے۔ ان ایام میں بہت بڑی تجارتی منڈی بھی لگتی جسے "عکاظ" سے موسوم کرتے ہیں۔

اس کا اشارہ قرآن میں بھی ہے۔

"لایلف قریش، الفھم رحلۃ الشتاء والصیف فلیعبدوا رب ھذا البیت، الذی اطعمھم من جوع، وامنھم من خوف" (۳۰/۱۰۶)

"قریش کو تجارت کی چاٹ، جاڑے اور گرمی میں سفر سے الفت (اور مکہ کی وجہ سے ان کا احترام ایسے امور ہیں کہ) مناسب یہ ہے کہ وہ اس گھر (مکہ) کے پروردگار کی بندگی کریں جو ان کو بھوکے ہوں کھانے کو دیتا ہے اور خوف (جان و مال سے) امن میں رکھتا ہے"

اہل حجاز تجارت پیشہ تھے۔ ہم نے اہل فنیقہ کا اس کتاب کے پہلے حصہ میں ذکر ہے۔ یہ بھی اہل حجاز تھے۔ انہوں نے تجارتی مرکز سواحل شام اور افریقہ پر قائم کئے اور پہلی دفعہ جزائر برطانیہ کو متمدن دنیا سے روشناس کیا۔ اور ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی۔ جس کو اب بحیرہ شام یا بحیرہ روم کہتے ہیں۔ فنیقی جھیل سے موسوم تھی اس لئے ان کے مقبوضات نے اس کو اپنے آغوش میں لیا ہوا تھا۔ اسلامی دور دورہ میں عرب جزائر بحرالکاہل اور چین اور بحر ہند کے ساحلی علاقہ مالابار وغیرہ میں تجارت کی غرض سے وارد ہوئے اور یہاں مستقل رہائش اختیار کی۔ جنوبی ہندوستان میں "موپلا" اور "انڈونیشیا" اور جاوا اور سماٹرا اور دیگر جزائر میں بھی عرب تاجر آ کر آباد ہوئے اور چھا گئے۔

تجارت کو فروغ امن کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ اس لئے جب کسی قوم کی تجارت

کو خطرہ جان و مال ہو تو ایسی قوت بھی پشت پناہ ہونی چاہیئے جو امن کی ضمانت ہو۔ جب "دیبل" واقع سندھ پر عربوں کا ایک تجارتی جہاز راجہ داہر والئے سندھ کے لوگوں نے لوٹ لیا۔ تو حجاج بن یوسف نے جو اس وقت خلافت امویہ کی طرف سے والئے عراق تھا۔ راجہ سے نقصان جان و مال کا معاوضہ طلب کیا۔ انکار پر محمد بن قاسم نوجوان سپہ سالار نے وادی سندھ پر حملہ کیا اور مسخر کر لی۔ راجہ کو بار ہا صلح و آشتی کی دعوت دی گئی مگر راجپوتی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ دب کر مطلوبہ معاوضہ ادا کرے۔

ہر ایک قوم کا حق ہے کہ کسی غیر قوم سے تجارتی وغیرہ تعلق قائم نہ رکھے۔ لیکن ان حالات میں دو ہمسایہ اقوام امن سے نہیں رہ سکتیں۔ اور نہ وہ ایک دوسرے کی طرف سے مطمئن یا امن زندگی بسر کر سکتی ہیں۔ بالخصوص ان حالات میں جبکہ اقوام عالم کو باہمی رشتہ اقتصادیات و سیاسیات وغیرہ نے مضبوط کر دیا ہے۔ کوئی قوم ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں رہ سکتی۔ ایام جاہلیت میں ایک قوم کا دوسری قوم سے تعلق معاندانہ ہی تھا۔ مگر اس کا اثر دیگر اقوام پر نہ پڑتا۔ اب اقوام عالم ایک رشتہ میں جکڑی ہوتی ہیں کہ اس سے گلو خلاصی نہ صرف ناممکن ہے بلکہ منشاء فطرت ہی یہ ہے کہ عالم انسانی رفتہ رفتہ شرافت انسانی سے روشناس ہو کر "امت واحدہ" بنے۔ اور یہ ممکن نہیں جب تک اقوام میں رشتۂ انسانیت قائم نہ ہو۔

"آنچہ قسمت است ہم می رسد"

"ورنہ ستانی بہ ستم می رسد"

خلافت بنو امیہ کے مدنظر صرف تجارتی مفاد نہ تھا بلکہ اس پیغام امن کی تبلیغ بھی تھی جو آنحضرت ﷺ نے بذریعہ قرآن مجید عرب کو دیا تھا۔

"وکذلک جعلنکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا" (۲/۔)

"اور ہم نے تم کو اعتدال پسند امت بنایا ہے تاکہ تم اور لوگوں کے نگہبان بنو

اور رسول تم پر نگران ہو۔"

"کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ" (۳/۴)

"تم بہترین امت اقوام عالم میں ہو اس لئے کہ لوگوں کو نیکی کا امر اور بدی سے منع کرتے ہو اور تمہارا ایمان اللہ پر ہے"

چونکہ قوموں میں عالمگیر رشتہ اتحاد قائم ہونے والا تھا اس لئے ان کو عالمگیر امن اور حریت اور مساوات کے پیغام حق کی بھی ضرورت تھی جس کے بغیر یہ رشتہ خوش اسلوبی سے نبھ نہیں سکتا۔ اور اگر قومیں ایک مرکز وحدت پر متحد ہو جائیں تو ان میں "اخوت" کے پاکیزہ جذبات بھی لامحالہ کارفرما ہوں گے۔ اور یہی مقصد اعلیٰ "اسلام" کا ہے۔

خلافت دنیوی حکومت کی ایک پسندیدہ صورت ہے اور ان ایام میں جن کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ مقدم ضرورت تمکین دین کی تھی۔ یہ خلافت نے ممکن پسندیدہ طریقہ سے پوری کی۔ یہ حکومت بہرحال قومی تھی۔ اگرچہ اسلام نے قومیت کا مفہوم جو ایام جاہلیت میں نسلی امتیاز اور لسان اور الوان کی یگانگت پر مبنی تھا بالکل بدل دیا۔ اور یہ غیر فطری امتیاز غیریت مٹا کر عالم انسانی کو ایک نقطۂ وحدت پر بلحاظ انسان متحد کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ابھی تک ہمارے اپنے زمانہ میں بھی قوموں نے اپنی قومیت کو ترک نہیں کیا۔ اس لئے شرانگیز تفرقہ بھر دریں موجود ہے۔

لیکن یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اقوام عالم اب ایک ایسے رشتہ میں جکڑی جا چکی ہیں خواہ یہ کیسا ہی کسی اور وجہ سے ناخوشگوار ہو کہ اس سے گلوخلاصی کی کوشش بے حاصل ہے۔ ایک جنگ کرہ ارض کے کسی حصہ میں ہو تو ناممکن ہے کہ دیگر اقوام عالم اس سے متاثر نہ ہوں۔ اس لئے ایام جاہلیت اور قرون وسطیٰ میں جو لڑائیاں محدود رقبہ میں ہوتی رہی ہیں اب عالمگیر صورت اختیار کر چکی

ہمارے زمانہ میں دو ایسی ہی عالمگیر جنگ کا سابقہ اقوام عالم کو پڑا۔ اور آئندہ جو جنگ ہوگی اسی وسیع بلکہ وسیع تر پیمانہ پر ہوگی۔

ان واقعات میں ایک تاریخی سبق ہے کہ اقوام عالم نے ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر زندہ رہنا ہے اور یہ کہ زندگی پسندیدہ ہی ہو تو لطف زندگی ہے اور جو کچھ کا منشا ہے اس کی تکمیل بھی اسی طرح ہو سکتی ہے۔ دوسرا سبق یہ ہے کہ انسانی منشا پورا ہو کر رہے گا۔ اور اگر قومیں برضا و رغبت تسلیم نہ کریں تو "بعد از ہزار رسوائی" تسلیم کرنا پڑے گا۔ یہ جنگ و جدل اور قتل و غارت اور اس کے نتائج فطرت کی طرف سے "انتباہ" عذاب کی صورت میں ہے جس میں قومیں مبتلا ہیں۔ جوں جوں اس کا احساس انسان کو ہوگا اور وہ مجبوراً یا ضرورۃً اپنی قوت فکریہ سے کام لے گا تو خود بخود راست پر آ جائے گا۔

"کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست"

جب ایسا اتحاد مستحکم ہو جائے گا۔ تو قرآن عظیم کی اس آیہ مبارکہ کا مفہوم بھی اس پر واضح ہو جائے گا۔

"سخر لکم ما فی السموٰت و ما فی الارض جمیعا منہ، ان فی ذلک لآیات لقوم یتفکرون"

"جو کچھ بھی آسمانوں اور جو کچھ بھی زمین میں ہے ہم نے اپنی رحمت کاملہ سے سب کچھ تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس میں آیات اہل فکر کے لئے ہیں"

اور یہ کہ اس ادنیٰ زندگی کے محدود اور فانی مفاد کے لئے کیا لڑتے جھگڑتے مرتے ہو۔

"سارعوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا السموٰت والارض اعدت للمتقین" (پ۴)

"سرعت سے بڑھ کر لو اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کا ہے اور جو راستبازوں کے لئے تیار کی گئی ہے"

آیہ استخلاف سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو بھی ایسی ہی خلافت ملی جیسی کہ ان سے پہلی قوموں کو مل چکی تھی۔ اس لیئے یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ دوسری قوموں کی خلافت کا مقصد مسلمانوں کی خلافت کے منشاء سے بالکل جدا ہے اور یہ امر قوموں کی خلافت کی تاریخ کے مطالعہ سے واضح ہو سکتا ہے۔ جو کچھ مسلمانوں کی خلافت کا مقصد ہے وہی ہماری بحث کا موضوع ہے اور جو کچھ غیر مسلم اقوام کی حکومت کا مقصد ہے [redacted] اب بھی ہے۔ ان قوموں کی حکومت واضح کر رہی ہے۔

کوئی مقصد پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ جب تک اس کے مناسب ذرائع قبضہ میں نہ ہوں اور ان ذرائع کا وسیلہ آج تک خلافت ہی رہی ہے۔ اگر مقصد نیک ہو تو اس کے ساتھ اخلاق حسنہ کا تقاضہ ہے کہ نیت میں بھی خلوص ہو۔ جب اس میں فتور آجائے تو مقصد بھی فوت ہو جاتا ہے اور تاریخی سبق یہ ہے کہ وہ قوم خلافت بھی ہاتھ سے کھو بیٹھتی ہے۔

ہم نے اس مقالہ کے شروع میں لکھا ہے کہ ہمارے زمانہ میں اقوام یورپ اور امریکہ کرہ ارض پر چھائے ہوئے ہیں۔ امریکہ تو ایک "نئی دنیا" ہے اس میں نوآبادی بھی انہی اقوام یورپ کی ہے۔ ان اقوام میں سے سب سے پہلے پرتگال اور ہسپانیہ والوں نے اور اس کے بعد ولندیزیوں نے اور پھر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے اقتدار حاصل کیا۔ ان لوگوں کی اب بھی حکومت بعض بعض مقامات پر ان کے اپنے ممالک سے باہر ہے یا کم از کم ان کا سیاسی اقتدار قائم ہے۔

ان قوموں کے اقتدار کی تاریخ کا تعلق ہمارے موضوع سے اتنا ہی ہے کہ دیکھیں کہ وہ کس طرح دنیائے اسلام پر چھا گئے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ آنحضرتؐ کی بعثت کے بعد نظریہ حکومت بدل چکا تھا۔ اب قوموں میں ہر ایک رشتہ تعلق تجارت نے قائم کر دیا اگر ان قوموں کی نیت میں خلوص ہوتا تو سیاسی اقتدار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اور نہ اس عالمگیر جنگ کی نوبت آتی جو ان کی باہمی رقابت نے پیدا کی اور کر رہی ہے۔ ابتدا

میں ان کی غرض صرف اتنی تھی کہ تجارت کے ذریعہ مال و دولت کمائیں۔ نفس ان
کثرت پسند ہے۔ جب زراندوزی کی طمع غالب آئی تو زیادہ سے زیادہ کمانے کیلئے
ہر ایک ناجائز وسائل بھی استعمال کرتا ہے۔ اقوام یورپ میں اس زراندوزی کی
نے رقابت بھی پیدا کردی۔ ہر ایک قوم یہی چاہتی تھی کہ وہی تجارتی مفاد کی واحد
اجارہ دار ہے۔ جب یہ مقصد جائز وسائل سے حاصل نہ ہوا تو ناجائز وسائل کی کمی
تھی۔ ان کا جنگ وجدل تمام کرۂ ارض پر جہاں کہیں بھی وہ تھے شروع ہو گیا
ان اقوام نے اپنی اپنی حکومت کی سرپرستی میں تجارتی "کمپنیاں" بنائیں۔
مختلف ممالک میں تجارتی کوٹھیاں بھی تعمیر کیں۔ ان ممالک کے حکمرانوں سے اجارہ
کی مراعات بھی حاصل کرلیں۔ رفتہ رفتہ جہاں ان کے قدم نامبارک جے وہاں نو
کی طرح بھی ڈالی۔ پھر قدم ایسے نکالے کہ اس ملک کے سیاہ وسپید کے مالک
گئے۔ ان کی غرض محض وہ حکومت نہ تھی جو ایام جاہلیت میں ایک قوم کی دوسری
پر تھی۔ لیکن اس حکومت کی آڑ میں وہی جاہلی جذبہ کارفرما تھا بلکہ کچھ بڑھ کر کہ اس ملک
کے تمام وسائل زندگی پر قبضہ کیا جائے۔ اس ملک کی خام پیداوار اسی ملک کے باشندے
ان کے ہاتھوں سستے داموں فروخت کریں اور پختہ پیداوار اپنے کارخانہ جات
(FACTORIES) میں یہ تیار کریں اور انہی ممالک کے ہاں مہنگے داموں پر فروخت
کریں۔

اس تجارتی مفاد کے لیے جو کچھ ظلم وستم ان لوگوں نے ان ممالک باشندوں پر روا
رکھے وہ دل ہلا دینے والے تاریخی واقعات ہیں۔ مال تجارت صرف ضروریات زندگی
نہ تھا۔ بلکہ غلاموں کی تجارت پر تھوڑے سرمایہ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ منافع تھا۔ ان
کو اپنی نوآبادیات کے فروغ کے لئے مزدوروں کی ضرورت تھی مگر مزدور تو اپنی
کی اجرت کا مطالبہ کرتا ہے۔ غلام ایسے مزدور ہیں جن کو بلا معاوضہ کام پر لگایا جاسکتا ہے
مویشیوں کی جوع البقر بہت مہنگی پڑتی ہے۔ انسان روکھی سوکھی پر بھی زندہ
سکتا ہے۔

یہ حق غلاموں کو جس بخل سے دیا جاتا۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ کام تو ان سے مویشیوں کا لیا جاتا ہے اور خوراک پیٹ بھر کبھی نہ دی جاتی۔ اکثر زندہ انسانی بکتے اور ان میں اموات کی کثرت تھی۔ ولیم ہوئیٹ (WILLIAM HAWITT) اپنی کتاب نوآبادیات اور مسیحیت (COLONEZATION AND CHIECSTEAUCTY) میں اسی غیر انسانی سلوک کا جس کو وہ غیر مسیحی قرار دیتا ہے، رونا روتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:۔

"نام نہاد مسیحی اقوام کرۂ ارض کے ہر ایک حصہ میں ان ممالک کے باشندوں پر جہاں ان کا قبضہ ہے اس بربریت اور ظلم و ستم کا مظاہرہ کر رہی ہے کہ آج تک کسی قوم کی تاریخ میں کسی زمانہ میں کسی نے روا نہ رکھا خواہ یہ قوم وحشی یا نیم وحشی اور کتنی ہی خونخوار اور ناشائستہ اور غیر مہذب تھی۔"

لینڈ والوں کو ولندیز کہتے ہیں۔ اس تجارت میں وہ پیش پیش تھے۔ انگریز بڑا رحمدل واقع ہوا ہے۔ اس کی رحم دلی کا ایک واقعہ یہ ہے کہ ۱۷۶۶ء میں اس کی ایسٹ انڈیا کمپنی (EAST INDIA COMPANY) نے صوبہ اڑیسہ میں تمام فصل ایستادہ خرید لی، جب ان کے قبضہ میں آگئی تو مہنگے داموں پر فروخت شروع کی۔ قیمت روز بروز بڑھتی گئی خریدار صرف متمول لوگ ہی تھے۔ صوبہ میں سخت قحط پڑ گیا اور دس لاکھ آدمی فاقہ کش سسک سسک کر مر گئے۔ لیکن کمپنی کو توقع سے بہت زیادہ فائدہ ہوا۔ غلامی کی تجارت میں اس رحمدل قوم کا یہ حال تھا کہ امریکہ مقبوضہ ہسپانیہ میں غلام مہیا کرنے کے واحد اجارہ دار یہی تھے۔ صرف ایک "لورپول" (LIVERPOOL) کے جہاز جو غلام مہیا کرتے سنہ ۱۷۳۰ء میں پندرہ ۱۵ اور سنہ ۱۷۵۱ء میں ترپن ۵۳ اور سنہ ۱۷۶۰ء میں چوہتر ۷۴ اور سنہ ۱۷۹۲ء میں ایک سو بتیس ۱۳۲ اسی تجارت پر لگے ہوئے تھے۔ سنہ ۱۷۹۰ء میں غرب الہند کے جزیرہ مقبوضہ برطانیہ میں ہر ایک انگریز کے پاس دس۱۰ دس غلام تھے اور ہر ایک فرانسیسی کے پاس چودہ ۱۴ اور ہر ایک ڈچ کے پاس تئیس ۲۳۔ ہنری براؤمین (HENRY BROUGHAWMAN) نے اپنی کتاب "دول یورپ کی حکمت عملی دربارہ نوآبادیات کے حقائق" (AN INQUING INTO THE COLONIAL POLICY OF THE EAROPEAN POWERS-1805-VOL: II)

میں مفصل حالات لکھے ہیں۔

اقوام یورپ آپس میں دست وگریباں بھی ہوئیں۔ لیکن یہ قومیں تجارت پیشہ امن پسند عقل مند ہیں۔ ان کے اکابر نے یہ فیصلہ کیا کہ یورپ میں تو توازن قوت، (BALANCE OF POWER) جیسی کہ ہے قائم رہے۔ یورپ سے باہر دوسرے براعظموں میں اپنا اپنا حلقہ اثر تقسیم کر لیا۔ اس حلقہ میں وہ ممالک بھی تھے۔ جیسے ہندوستان جہاں ان کی حکومت بلا شرکت غیر تھی۔ ان کے علاوہ وہ ممالک جہاں ان کا اثر ورسوخ زیادہ تھا۔ افریقہ میں تو ان کی نوآبادیات تھیں اور اس کی تقسیم بھی کی گئی۔ ایشیا میں زیادہ تر ممالک اسلامی ہیں یا مشرق میں چین اور جاپان اور کوریا، بحرالکاہل کے اکثر جزائر اسی تقسیم خانگی کے ذریعہ ہر ایک کے حصہ میں بقدر جثہ آئے۔ شیر انگلستان جس کی بحری طاقت کا اس وقت جواب نہ تھا اور جو "ملکہ بحر" کے نام سے مشہور تھا۔ خدا کا سب کچھ پہلے ہی موجود تھا۔ اور وہ ممالک تھے جو نسبتاً زیادہ زرخیز تھے وہ تو صرف اتنا ہی چاہتا تھا کہ ہندوستان سونے کی چڑیا ہے وہ کسی اور کے ہتھے نہ چڑھے۔ اس لئے جزائر برطانیہ سے جو راستہ ہندوستان کو آتا ہے اس پر اس کا قبضہ ہو چنانچہ ابنائے جبل الطارق اور جزیرہ مالٹا پر اس کا قبضہ تھا۔ مصر اس کے زیر اثر گیا، نہر سویز سے اس کے جہاز "عدن" پر ٹھہرتے اور تمام ساحلی علاقہ کے شیوخ اس کے زیر اثر تھے۔ افریقہ کے مغربی ساحل پر بھی بعض اہم مقامات پر اس کا قبضہ تھا اور منتہائے جنوب کیپ ٹاؤن (CAPE TOWN) وغیرہ اس کی نوآبادی ہے۔ اس طرف سے ہندوستان کی ناکہ بندی مکمل ہو گئی دوسری طرف بحرالکاہل میں آسٹریلیا اگرچہ دوسرے دول یورپ کے حصہ میں بھی ہے مگر ساحلی علاقہ شمالی انگریزوں کی نوآبادی ہے چھوٹا سا جزیرہ "ہانگ کانگ" عدن کی طرح ان کے قبضہ میں ہے۔ نیچے سنگاپور اور اس کی بندرگاہ بہ تعلق ہندوستان اہم مقام ہے۔ برما پر بھی انہی کا قبضہ تھا۔ غرض مشرق اور مغرب کی جانب ناکہ بندی خاطر خواہ ہو گئی۔ بحری راستوں کی حفاظت اس طرح کی گئی۔ لیکن ہندوستان کا پرانا راستہ جانب شمال افغانستان کے درون سے

گذرتا ہے۔ ان دروں پر بھی افغانستان سے لڑجھگڑ کر قبضہ جما لیا۔

معاہدہ (BALANCE OF POWER) وغیرہ سے کچھ عرصہ کام خوش اسلوبی سے چلتا رہا۔ اور اس وقت تک چلتا رہا جب تک دول یورپ برطانیہ کی بحری طاقت سے خائف رہے۔ ہوائی جہازوں کی اختراع نے اس کی اہمیت کم کر دی۔ علاوہ ازیں دیگر دول یورپ للچائی ہوئی نظروں سے اس خوان نعما کو دیکھ رہے تھے جس پر قبضہ برطانیہ کا تھا۔ انگریزیں ایجاد و اختراع کی ذہنی قوت اتنی نہیں جتنی کہ فرانسیسیوں اور جرمنوں میں ہے۔ البتہ وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے کہ ایجاد خواہ کوئی قوم کرے اس کو اپنا لیتے۔ ہوائی جہاز کے علاوہ اور بھی ہلاکت آفرین ایجادات یورپ میں ہو رہی تھیں جرمنی اپنی عسکری قوت بڑھا رہا تھا۔ اور انگریزوں کے نقطہ نظر سے تمام یورپ کے لئے ایک خطرہ عظیم تھا۔ جرمن اب تمام دنیا پر چھا جانا چاہتا تھا۔ اس موضوع پر ایک کتاب "وان بیلو" (VAN BELLOW) نے بھی لکھی۔ انگریز کی سیاسی حکمت عملی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ تنہا اس نے کبھی کسی حریف کا مقابلہ نہیں کیا۔ دوسری طاقتوں کو سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ ملاتا رہا۔ اور عموماً وہی آتش حرب کا ایندھن بنتی رہیں۔ فتح کے بعد انگریز زیادہ فائدہ میں رہتے اور اتحادی منہ دیکھتے رہ جاتے۔ پہلی جنگ عظیم میں دول یورپ کے یہ ذہن نشین کیا کہ اگر خطرہ ہے اور یقیناً ہے تو فرانس اور روس اور اٹلی اور آسٹریا کو جو جرمنی کے ہمسایہ ہیں۔ برطانیہ ایک جزیرہ ہے اور فرانس کی تسخیر کے بعد ہی جرمن اس پر حملہ کر سکتا ہے لیکن برطانیہ کی بحری طاقت کا مقابلہ جرمن نہیں کر سکتا۔ اس لئے دول یورپ کی طاقت میں توازن اسی صورت میں ممکن ہے اگر وہ سب متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ برطانیہ ان کو ممکن پوری مدد دے گا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے زیادہ خطرہ برطانیہ ہی کو تھا۔ جرمن اپنا حلیف ترکی کو بنا چکا تھا۔ اور بغداد ریلوے لائن کا نقشہ بھی مرتب ہو چکا تھا۔ غرض یہ تھی کہ خلیج فارس پر اس کا قبضہ ہو جائے تو ایران میں قدم جما کر انگریزوں کو ہندوستان سے بیدخل کر دے۔ ۱۹۱۴ء

سے ۱۹۱۸ء تک یہ عالمگیر جنگ جاری رہی۔ برطانیہ نے امریکہ کو بھی اپنے س
گانٹھ لیا تھا۔ غالباً جرمن کامیاب ہو جاتے۔ مگر امریکہ کی بروقت امداد نے ا
کو فتح مند کر دیا۔

ان ایام میں ہندوستان آزادی کے لئے جدوجہد آئینی طریق پر کر رہا
کا یہ خیال تھا کہ دوران جنگ میں ہندوستانی انڈین نیشنل کانگرس (IAN -
NATIONAL CONGRESS) کے زیر تحت علم بغاوت بلند کر دیں گے۔
ہندوستان نے قریباً پندرہ لاکھ سپاہی دئے اور ہندوستانی ریاستوں
سب کچھ انگریزوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ عراق اور مصر اور گیلی پولی اور
میں ہندوستانی سپاہی ترکوں کے خلاف لڑتی رہی۔ بیت المقدس میں
جو داخل ہوئی وہ "ٹوانہ لانسر" تھی۔ یہ لوگ ضلع شاہ پور پنجاب کے مسلمان
ہیں اور زیادہ تر فوجی ملازمت اختیار کرتے ہیں۔ بغداد میں ملتانی رجمنٹ
مقدس شہر میں لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس کو قید کر کے پورٹ بلیر (کالا پانی
لایا گیا۔ (اس کتاب کا مولف وہاں بحیثیت مہتمم خزانہ موجود تھا) میں نے
کمشنر کرنل ڈگلس کو مشورہ دیا کہ مناسب یہ تھا کہ ان کے مذہبی جذبات کا
کیا جاتا اور ان کو فرانس یا یورپ کے کسی اور شہر میں بھیجدیا جاتا۔ مجھے معلوم
ہے کہ یہ لوگ وہاں دوسرے محاذ پر لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ تھوڑے دنوں کے
بعد میں وہاں سے چلا آیا مگر میرے مشورہ پر عمل کیا گیا۔

ہم نے ان واقعات کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ دنیا ءِ اسلام کی موجودہ
حکومتوں کے حالات قارئین سمجھ سکیں۔ اب ہم ان اسلامی حکومتوں کا تذکرہ
ہیں جو پہلے ہی خودمختار تھیں یا جن کو انگریزوں نے اپنی سیاسی اغراض
کے لئے کھڑا کیا۔ اس کا آغاز ہم مملکت ایران سے کرتے ہیں۔

ایران

خاندان پہلوی

اس کتاب کے دوسرے حصہ میں ہم نے خاندان قاچار کے آخری تاجدار احمد شاہ کے حالات پر ایران کا تذکرہ ختم کیا تھا۔ یہ حالات ہمارے اپنے زمانہ میں رونما ہوئے ہیں۔ لیکن سلسلہ حالات جاری رکھنے کے لئے ہم نے انہیں دوسرے حصہ میں بیان کیا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ دول یورپ کی توجہ جب تجارت کے ذریعہ زرخیز ایشیائی ممالک کی طرف ہوئی تو ان ممالک میں قدم جمانے کے لئے جگہ بھی مل گئی۔ ایران کے تجارتی تعلقات یورپ والوں سے صفوی خاندان کے دور دورہ میں شروع ہوگئے تھے۔ جزیرہ "ہرمز" میں پرتگیزوں نے قبضہ جما رکھا تھا۔ شاہ عباس ان کو بے دخل کرنا چاہتا تھا اور ولندیزوں اور انگریزوں کی رقابت بھی اسی امر کی مقتضی تھی۔ چنانچہ ۱۶۲۲ء میں شاہ عباس نے انگریزی بحری بیڑہ کی مدد سے جو خلیج فارس میں تھا پرتگیزوں کو ہرمز سے نکال دیا۔ اور انگریزوں اور ڈچ (ولندیزی) سوداگروں کو اجازت دے دی کہ بندرگاہ عباس پر اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں اور ساتھ ہی سیاسی رشتہ دول یورپ سے گانٹھ لیا تاکہ سلاطین عثمانیہ کے خلاف ان سے مدد مل سکے

ہم نے قاچار خاندان کے حالات میں بیان کیا ہے کہ برطانیہ اور فرانس اور امریکہ اور روس نے کیا کچھ مراعات سرزمین ایران میں حاصل کرلی تھیں۔ یہ بالکل ممکن تھا کہ یہ لوگ ایران کے حصے بخرے کر لیتے اور ایران بھی ان کی نوآبادیات میں تبدیل ہو جاتا یا ان کی حکومتیں اس کے مختلف صوبوں میں قائم ہوجاتیں اور ایران بحیثیت اسلامی سلطنت ختم ہوجاتا۔ لیکن عالمگیر جنگ اول نے شاطران یورپ کی بساط سیاست

الٹ دی۔ روس میں خاندان زار ختم ہوگیا۔ اور اس کی جگہ سویٹ روس -VIET
RUSSIA) نے لی)

معاہدہ ۱۹۲۱ء ۱۹۲۱ء میں "سویٹ" نے ایک معاہدہ دوستی ماسکو میں
سے کیا۔ غالباً یہ معاہدہ اپنی نوعیت کے لحاظ نہ صرف تا
ایران بلکہ تاریخ اقوام عالم میں پہلا اور شاید آخری ہے جس میں ایک قوم دوسری قوم
حقیقی رشتہ یارواداری قائم کرتی ہے۔ زار روس کے دور دورہ میں روس اور انگریز
ایران کو خوان نعما سمجھتے تھے اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کرکے اپنا اپنا حلقہ اثر قا
کر چکے تھے (" سویٹ " نے بیک جنبش قلم تمام معاہدات جو آج تک روس اور ایران
برطانیہ اور ایران میں ہو چکے تھے منسوخ قرار دئے۔ اور ایران کی آزادی اس حد
تسلیم کی کہ تمام غیر ملکی فوج کو جو اس وقت ایران کی سرزمین پر موجود تھی ایران خالی
پڑے گا۔ اور جو علاقہ بھی غیر ملکیوں نے دبایا ہوا ہے بلا توقف واگذار کرنا پڑے گا۔
پر عمل سویٹ نے کیا۔ اس عہد کی رو سے تمام بقایا قرضہ جو روس کو ایران کی طرف
واجب الادا تھا لیے باق سمجھا گیا اور تمام مراعات جو زار روس نے لے رکھی تھیں کا لعد
قرار دیں۔ اور تمام املاک جو ایران میں زار روس کی تھیں حکومت ایران کے حوا
بلا معاوضہ کردیں) ان میں "ڈسکاؤنٹ بنک آف پرشیا" DISCOUNT—
BANK OF PERSIA) ریلوے سڑک جیفہ سے تبریز تک اور بندرگاہ انزلی
(ENZELI) جس کو اب "پہلوی" کہتے ہیں اور دوسری سڑکیں اور ٹیلیگراف لائن
(TELEGRAPH LINES) شامل تھیں۔ اس معاہدہ میں ایک شق یہ بھی تھی
"سویٹ روس" کو اس امر کا خطرہ ہے کہ کوئی غیر ملکی طاقت ممکن بلکہ اغلب ہے کہ ایرا
(در روس کے اندرونی معاملات میں یا امن میں رخنہ انداز ہو تو اس کا سدباب اس ط
کیا جائے کہ کسی ملکی یا غیر ملکی ادارہ یا طاقت کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ معاہد سلطنتوں
سی وغیرہ اغراض کے لئے کسی نہج کی کاروائی کرے جو معاہد سلطنتوں کے مفاد کے
رہو۔ اور یہ ایران اور روس کا فرض اولین ہوگا کہ کسی تیسری طاقت کو اپنے اپنے ملک

خدمتہ کا لنداسر

میں گھسنے نہ دیں جو دونوں ممالک کے لئے خطرہ ثابت ہو۔ لیکن اگر کوئی تیسری طاقت اس نوع کا خطرہ سرزمین ایران میں پیدا کرے اور اس امر کا ارتکاب کرے کہ ایران کو اپنا عسکری مستقر (MILITARY BASE) سوویٹ روس کے خلاف بنائے اور خود ایران مدافعت کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بغرض دفاع یہ حق سوویٹ اپنے حق میں محفوظ رکھتا ہے کہ اس کی فوج کا داخلہ ایران میں بلا مزاحمت منجانب حکومت ایران ہوگا۔ یہ شق اہم ہے اور اس میں بھی سوویٹ روس کی طرف سے دوستی اور خیر سگالی کا جذبہ کارفرما ہے۔ اس شق کی رُو سے ایران اور سوویٹ میں کسی تیسری طاقت کے خلاف متحدہ مدافعت کا اقرار صالح ہے اس کا فائدہ دونوں معاہد سلطنتوں کو یکساں پہنچتا ہے اور زیادہ تر ایران کا فائدہ ہے۔

اس عہدنامہ پر فوری عمل شروع ہوگیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس کی باضابطہ تکمیل سے ایک ہفتہ پیشتر ہی ہوا۔ کرنل رضا خاں "قزوین" سے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ تہران دارالسلطنت پر آ پہنچا اور قابض ہوگیا۔

رضا خاں "بحیرہ خزر" (CASPIAN SEA) کے قریب "سفید کوہ" میں جو صوبہ مازندراں میں واقع ہے ۱۶ مارچ ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اور دادا ایرانی فوج میں افسر رہے تھے۔ یہ نوجوان بھی ایرانی کاسک بریگیڈ میں بھرتی ہوگیا اور خداداد قابلیت اور قوت سیرت کے بل پر ترقی کرتا رہا۔ قد لمبا، خط و خال میں درشتی ۔ انتظامی امور میں سخت اور سخت کوش تھا۔ مروجہ درسی تعلیم سے محروم رہا۔ اس کی زندگی شروع سے سپاہیانہ تھی اور سپاہیانہ تجربہ بلکہ ایران سے باہر بیرونی دنیا کا علم بھی بہت کم تھا لیکن طبیعت میں استقلال بلا کا تھا۔

تہران میں داخلہ کے وقت سید ضیاء الدین طباطبائی وزیر اعظم تھا۔ شاید رضا خاں اس کا مزاحم نہ ہوتا مگر وزیر نے رضا خاں کی اصلاحی تجاویز کو مسترد کر دیا تو ناچار رضا خاں نے اسے برطرف کر کے خود صدارت عظمیٰ سنبھال لی۔ اس کے علاوہ وہ سپہ سالار بھی تھا یہ واقعہ ۱۹۲۳ء کا ہے۔ چند ماہ بعد شاہ عالی جاہ کجکلاہ سیاحت یورپ پر روانہ ہوگیا۔

دو سال تک رضا اور رعایا واپسی کا انتظار کرتی رہی۔ بار بار شاہ کو مراجعت وطن کی دعوت دی مگر آپ نہ آئے۔ تو ۱۹۲۵ئہ میں ایرانی مجلس نے احمد شاہ قاچار کو معزول کر کے رضا خاں کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ رضا نے بہت کہا کہ اب شاہی زمانہ کے ذہنی حالات کے نامناسب ہے اس لئے مناسب ہے کہ تم بھی اپنی ذہنیت کو خارجی حالات کے مطابق بدلو۔ میرے لئے جمہوریت ایران کی صدارت ہی کافی ہے۔ لیکن مجتہدین نے یہ اعتراض کیا کہ "ہمارے مذہبی عقاید کے خلاف ہے" اس لئے چاروناچار شاہی قبول کی۔

رضا شاہ نے اپنے ہمسایہ ملک ترکی کی طرح مغرب کے نقش قدم پر چلنے کی ٹھان لی۔ بلا شبہ بہت کچھ اصلاح بھی کی۔ امور خارجہ کا جہاں تک تعلق تھا۔ ایک تو قرضہ اٹھانے کی رسم جو شاہان قاچار نے غیر ملکی طاقتوں سے جاری کر رکھی تھی یک قلم موقوف کر دی۔ برطانیہ کی ایرانی خانگی امور میں مداخلت ناقابل برداشت تھی۔ یہ بھی بظاہر نہ رہی شاہی بینک برطانیہ کے قبضہ میں تھا اور اسی کا سکہ رائج تھا اسے موقوف کیا۔ اینگلو ایرانی آئل کمپنی (ANGLO IRANIAN OIL COMPANAY) کا معاہدہ بھی منسوخ کر دیا لیکن اس کی جگہ اسی کمپنی سے ایک نیا معاہدہ کیا جس کی شرائط سابقہ معاہدہ سے ایران کے حق بہتر تھیں۔ اگرچہ "کمیونزم" کی تحریک کو دبا دیا گیا مگر سوویٹ روس سے مراسم دوستانہ قائم رکھے۔ ۱۹۲۷ئہ اور ۱۹۳۵ئہ میں روس کے ساتھ پے در پے معاہدات مختلف امور کے متعلق ہوئے۔ اس کی زیادہ تر توجہ عسکری قوت بڑھانے کی طرف لگی ہوئی تھی۔ عہد حاضر کے آلات حرب سے اس کو آراستہ کیا اور اس طرح ایران کے طول و عرض میں امن کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ جاگیرداری ختم کر دی اور امراء و شرفا کے خطابات اور رفاقت اور وقار بھی نہ رہے۔ لیکن جو اصلاحات اس کے ذہن میں تھیں ان کی عملی تشکیل میں مجتہدین سدراہ تھے۔

ڈاکٹر "ہس"[۱] (WILLIAM S. HAAS) رضا شاہ کے بارہ میں اپنی کتاب "ایران"

---

[۱] ڈاکٹر "ہس" ارمنی ہے اور امریکہ کا باشندہ ہے۔ کئی سال ایران میں دانش گاہ تہران میں کام کرتا رہا اور ایران اور ایرانیوں سے خوب واقف ہے۔

میں لکھتا ہے کہ رضاہ شاہ شیعہ مذہب کی نسبت یہ یقین کرتا تھا کہ ایران کی ترقی میں سدراہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح مسیحی کیتھولک مذہب یورپ کے ارتقا کا مانع رہا۔ اور بعض امور میں شیعہ مذہب اس سے ملتا جلتا ہے۔ جس مذہب میں ظاہری رسوم کی زیادہ ترنمائش ہو وہ نامعقول ہی ہوتی ہیں۔ اور ہر نامعقول بات بالخصوص جب اس کا تعلق مذہب سے ہو ظاہری رسم ورواج کی طالب ہوتی ہے۔ اگرچہ شاہ مذہب مٹا نہیں سکتا تھا مگر وہ اس نامعقولیت کو بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ایران کے طول وعرض میں "درویش" سفید لباس میں ملبوس، ژولیدہ مو، بلند کلاہ برسر جس پر کچھ کلمات لکھے ہوئے ہوتے، ہاتھ میں کشکول لئے بھیک مانگتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ابتدا میں یہی لوگ صحیح معنی میں درویش تھے۔ ان کی زندگی زہد بے ریا اور ریاضت اور فقر فاقہ میں بسر ہوتی اور ان کا اثر بھی عوام پر اس حد تک تھا کہ منہیات سے باز رہتے مگر اب تو محض دوکانداری رہ گئی۔ رضا شاہ نے یہ مظاہرہ درویشی کوچہ وبازار میں یک قلم بند کردیا۔ ایران سے ملحق عراق میں مقدس مقامات نجف اور کربلا وغیرہ کی زیارت کے لئے اکثر زائرین جاتے اس کا بھی سدباب کیا۔ ملاؤں کو سیدھا کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ شاہ کو خوب سوجھی، زور دیا کہ لباس مغربی وضع کا پہنیں۔ رسم تعزیہ بالکل موقوف کردی عاشورہ محرم پر واقعہ کربلا کی یاد تازہ کی جاتی۔ اور عوام جوش میں متوالے بازاروں میں جلوس کی صورت میں نکلتے۔ بعض پابجولاں اور بعض کے ہاتھوں میں چھری یا تلوار ہوتی۔ یا علی، یا حسن، یا حسین کے نعرے لگاتے اور اپنے جسم کو زخمی کرتے۔ بعض اوقات زخم گہرے بھی ہوتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مجتہدین میں بھی ایسے ہیں۔ جو ان رسوم اور اس مظاہرہ کو ناپسند ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ ایک پاکیزہ مذہب کی اس طرح سربازار رسوائی کسی طرح مناسب نہیں۔ لیکن عوام کے جذبات کو دبانا بھی خطرناک ہے۔ کم از کم شعلہ مذہب میں حرارت اور روشنی تو ہوتی ہے۔ شاہ نے پہلے تو چھریوں اور تلواروں کی ممانعت کردی۔ پھر تعزیہ کا جلوس بھی موقوف کردیا اور ان ایام میں پولیس ہر ایک جگہ متعین ہوتی کہ شاہی حکم کی تعمیل خاطر خواہ ہو۔ ابتداء میں چوک میں مرثیہ خوانی سے

تعرض نہ کیا۔ آخر اس کی بھی ممانعت کر دی۔ اب صرف لوگوں کو اتنی اجازت تھی
کہ گھروں میں اگر چاہئیں مجالس عزا منعقد کر لیا کریں اس طرح یہ رسم تعزیہ داری
بھی چند سال کے عرصہ میں جو لوگوں کے جذبات کو ابھارتی تھی موقوف ہو گئی
اس کے ساتھ ہی ملاؤں کا اثر و رسوخ جو عوام پر تھا کمزور پڑ گیا۔ شاہ نے ان
اصلاحات سے نہ صرف تعصب اور غلو فی الدین کو مٹا دیا بلکہ دنیا ء اسلام پر
یہ واضح کر دیا کہ مذہب آخر ایک عقیدہ ہی ہے اور ذہنی اور مادی ارتقاء کی
سد راہ نہ ہونا چاہیئے۔ ولی عہد (موجودہ محمد رضا شاہ) کا عقد خدیو مصر کی بہن
سے ایک اور قدم اتحاد بین المسلمین تھا۔ یہ نکاح دستور اساسی ایران کی
شق اول کی خلاف ورزی تھی جو پندرہ سال پیشتر خود منظور کر چکا تھا۔ اب
حالات اتنے بدل چکے تھے کہ کسی نے اعتراض نہ کیا۔)

یہ امر بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ یہ اصلاحات اپنی نوعیت میں
نئی نہیں تھیں۔ اس کے پیشتر صفوی شاہ عباس اعظم نے بانیٔ صفوی خاندان شاہ
اسمٰعیل کے غلو کو ترک کر دیا تھا اور نادر شاہ نے بہت کوشش کی کہ سنی اور شیعہ میں
شر انگیز تفریق ختم کر دی جائے۔ صفوی خاندان ہی نے اسے رواج دیا تھا۔ اب
جب کہ مغربی اقوام سے ایران کا اختلاط شروع ہو گیا اور دلوں میں وسعت خیال
اور آزادیٔ فکر پیدا ہو گئی تو رضا شاہ کے لئے اصلاح کچھ مشکل نہ تھی۔

(ملاؤں کی دینی حکومت جو عوام کالانعام کے دلوں پر تھی، ختم کرنے کے لئے
اس نے "اوقاف" کی طرف توجہ کی۔ تمام دنیاء اسلام میں یہ کار ثواب یقین کیا
جاتا ہے۔ "پل و مسجد و چاہ و مہمان سرا" تعمیر کی جائیں۔ یہ عمارات رفاہ عام عموماً
ان متولیوں کے قبضہ میں رہتی ہیں جو جامہ تقدس میں ملبوس ہوتے ہیں اور
تسبیح اور سجادہ ان کے تقدس کا خاص امتیازی نشان ہے۔ مسجدوں اور خانقاہوں
کے ساتھ ایسے اوقاف بھی ہوتے ہیں جو آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ غرض تو یہ ہے کہ ان کی
آمدنی مسجدوں وغیرہ پر ہی صرف ہوتی رہے۔ ملحقہ مدرسوں کے نادار طالب علموں

کو وظائف دیئے جائیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ متولیوں کی جیب میں جاتی ہے ایسے خیراتی ادارے ٹیکس سے بھی مستثنیٰ ہیں۔ نادر شاہ (سنہ ۱۷۳۶-۴۰ء) نے ان اوقاف کو حکومت کی تحویل میں لے لیا تھا۔ یہ بات ملاؤں کو جو اوقاف کے متولی تھے سخت ناگوار گذری۔ نادر کی وفات کے بعد پھر سے ان کے قبضہ تصرف میں آ گئے۔ "مشہد" اور " اماموں کے روضہ کے ساتھ اوقاف سے زرِ خطیر حاصل ہوتا تھا۔ رضا شاہ نے بیک جنبش قلم ان کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ اور ان کی آمدنی کا معتد بہ حصہ تعلیمی مصارف پر لگا دیا گیا۔ مشہد میں امام رضاؑ کے اوقاف کی آمدنی روضہ کی مرمت اور نو تعمیر شدہ ہسپتال پر صرف کی گئی اور اسی سے اور بھی رفاہ عامہ کے کام آب رسانی وغیرہ بھی سر انجام ہوئے۔ متولیوں کی تنخواہیں مقرر کی گئیں وہ اب حکومت کے وظیفہ خوار یا ملازم کی حیثیت میں آ گئے۔ ملاؤں کی دینی حکومت کا زور ٹوٹ گیا۔ مسلمانوں میں شیعہ اور سنی کی تفریق جو صفوی خاندان نے پیدا کر رکھی تھی۔ سر دست رضا شاہ کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتی تھی۔ لیکن اتنا ہوا کہ قانوناً "تبرا" ممنوع قرار دیا۔ راج دھرم "اثنا عشریہ" ہی رہا مگر اس میں غلو نہ رہا۔ احکام شریعت جن کو علماء مستقل قرار دیتے تھے تقویم پارینہ ہو گئے اور "مجلس" آئین ساز کو اختیار دیا گیا کہ خارجی حالات کے مناسب احکام اور امر و نواہی وضع کریں۔ اور ضرورۃً ان میں ترمیم و تنسیخ بھی کرتے رہیں اگرچہ رضا شاہ کے ذہن میں احکام شریعت اسلامیہ کی حقیقت واضح نہ تھی مگر اس کی حس مشترک نے بھانپ لیا تھا کہ مروجہ آئین و قوانین جن کی حفاظت کے مدعی مجتہدین ہیں خارجی حالات کے تقاضہ کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان کو بدلنا چاہیئے۔ سر دست اس کے ہمسایہ ملک ترکی کی مثال تھی۔ انہی قوانین کو رائج کر دیا۔ سنہ ۱۹۳۰ تک کسی کلیدی منصب اور عہدہ پر کوئی غیر ملکی نہ رہا۔ لیکن بطور ملازم ان کی خدمات کی ابھی تک ضرورت تھی۔ مبادلہ اشیاء کے معاہدے جرمنی اور سوویٹ روس سے بھی باندھے۔ ہزاروں میل طویل سڑکیں اور

ایران ریلوے (TRANS - IRANIAN RAILWAY) کی تعمیر نے تجارت میں ترقی اور سفری سہولت پیدا کر دی۔

یہ سب قابل تحسین کام تو کیا۔ لیکن تاج شاہی کا بھی کچھ مطالبہ تھا۔ اکثر دیہات کی ملکیت ذاتی شاہ نے اپنے لئے محفوظ کر لی اور محاصل کی بڑی مقدار شاہی جیب خرچ تھی۔ پارلیمنٹ کو اس کے سوا اور کچھ کام نہ تھا کہ جو بات شاہ کے دماغ میں آئے اسے عملی جامہ پہنائے۔ سپاہ پر اس کو کلی اختیار تھا۔ اور اس کے ذریعہ کچھ ناواجب سختی بھی روا رکھی۔ کسی شخص کا یارا نہ تھا کہ شاہ اور شاہ کے کسی عمل کے خلاف آواز بلند کرے۔ آزادیٔ خیالات آزادیٔ زبان کے بغیر بے معنی بات ہے۔ یہ بے معنی ہو کر رہ گئی۔ شاہ نے ایسے ادارے قائم کر دئے جو عوام کو شاہ کی مرضی کے مطابق ڈھالنے میں مصروف ہو گئے۔ شاہی اور جمہوریت میں ازلی بیر ہے اس لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ رضا شاہ کا زمانہ مطلق العنان شاہی کا تھا۔ بعض مفکرین کو اب شدت سے اس کا احساس ہو رہا تھا کہ رضا خاں پہلوی کرنل کی نصیحت اور مشورہ پر کیوں شروع سے عمل نہ کیا۔

عالمگیر جنگ دوم کا اعلان ہوا تو ایران نے اعلان کر دیا کہ وہ غیر جانبدار رہے گا اور تمام محاربین سے اس کے مراسم دوستانہ بدستور قائم رہیں گے۔ شاہ ایک ناممکن بات کو ممکن بنانا چاہتا تھا۔ عالمگیر جنگ کے ہوتے عالمگیر مراسم دوستانہ "کج دار و مریز" کی مثل ہے۔ علاوہ ازیں ۱۹۳۵ء سے جرمنی کی تجارت ایران سے بہت بڑھ گئی تھی اور شاہ کو "کمیونزم" سے دلی نفرت تھی۔ شاہی کا تقاضہ بھی یہی کچھ تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جرمنی نے سویٹ روس اور برطانیہ عظمیٰ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جرمنی براستہ کوہ قاف ایران میں داخل ہو کر سویٹ روس اور برطانیہ کے مواصلات کو قطع کرنا چاہتا تھا اور برطانوی روغنی زمین واقع ایران پر خود برطانیہ کے رسل و رسائل کا انحصار تھا۔ جرمنی کو ایران کی حیثیت کا صحیح اندازہ اچھی طرح معلوم تھا جو اس عالمگیر جنگ میں اس کو خود بخود حاصل ہو چکی تھی۔ جرمنی کے کارکن ایران

میں سرگرم عمل تھے۔ سوویٹ اور برطانیہ کی طرف سے یہ مطالبہ معقول تھا کہ غیر جانبداری کا تقاضہ ہے کہ حریف کو اجازت نہ دی جائے کہ ان کے خلاف مملکت ایران میں ریشہ دوانی کرے۔ رضا شاہ نے اس مطالبہ کی معقولیت اور سنجیدگی پر غور نہ کیا۔ اور اتحادیوں نے بھی سمجھ لیا تھا کہ رضا شاہ سے یہ توقع عبث ہے کہ اتحادیوں کا ساتھ دے گا جوان کے مفاد کے لئے ضروری امر تھا۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء میں سوویٹ روس کی فوج شمال کی طرف سے اور برطانوی لشکر عراق کی جانب سے داخل ہو گیا۔ برطانیہ کے بحری بیڑہ نے اچانک ایرانی بحری فوج پر گولہ باری "خورزم شہر" پر شروع کردی اور اکثر ایرانی جہاز غرق بحر ہوئے۔ اتلاف جان بھی بے اندازہ ہوا۔ ایرانی سپاہ نے کچھ یونہی سا مقابلہ کیا۔ شاہ نے خود تین روزہ جھڑپوں کے بعد فوج کو واپسی کا حکم دیا لیکن شاہ اب برطانیہ کے پنجہ میں تھا۔ تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ پہلے جزیرہ مورشیش اور پھر جنوبی افریقہ میں نظربند کیا گیا۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ اس سے کیا سلوک ہوا۔ اسی قید و بند میں جان دیدی۔ اب ایران اتحادیوں کے قبضہ میں تھا۔ محمد رضا پسر رضا شاہ کو ایران کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ وزیر اعظم جناب "فروغی"[1] ایک شاعر اور فلسفی مقرر ہوا۔ اس نے

---

[1] مرزا ابو الحسن خاں فروغی پسر محمد حسن خاں ذکاء الملک فروغی اصفہانی ۱۳۰۱ھ میں طہران میں پیدا ہوا۔ فارسی تو مادری زبان تھی۔ عربی اور فرنچ پر بھی عبور تھا۔ تاریخ و جغرافیہ و علوم ادبی و سیاسی میں بھی مہارت تھی۔ اس کی تصنیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ایک رباعی تبرکاً درج کی جاتی ہے۔

خلقی است مرا بغیبت افتادہ بہ پوست
جمعی و گرم بجس ظن مدحت گو است
صد شکر کہ آں نیم کہ می گوید خصم!
صد آہ کہ ایں نیم کہ می خواند دوست

اتحادیوں کے ہر ایک حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ ۱۹۴۲ء میں روس، برطانیہ اور ایران میں معاہدہ اتحاد ثلاثہ پر (TREPARTILE TREALY OF ALLCANCE) تینوں حکومتوں کے نمائندگان نے دستخط کر دئیے۔ اس معاہدہ کے ذریعہ اتحادیوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ ان کا موجودہ قبضہ فوجی قبضہ متصور نہ ہوگا۔ اور اختتام جنگ سے چھ ماہ کے بعد اتحادی افواج ایران خالی کر دیں گی۔)

جرمنی کے حلیف اس جنگ میں اٹلی اور جاپان تھے۔ انکو "محوری طاقت" اور برطانیہ اور اس کے حلیف دول کو "اتحادی" کہتے ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں اٹلی اور جاپان سے اتحادیوں کے سیاسی تعلقات کے انقطاع کا اعلان کیا گیا۔ اور ایران سے اٹلی اور جاپان کی قومیت کے لوگ یا نکالے گئے یا نظر بند ہوئے (۱۹۴۳ء میں ایران نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اتحادی صف میں داخل ہو گیا۔)

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اتحادی، شاہ اور ایران کے نام پر خود ہی کر رہے تھے۔

"خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ"

تہران کانفرنس

(۱۹۴۳ء نومبر کے آخر میں صدر جمہوریہ امریکہ روزویلٹ، (ROOSEVELT) اور صدر اعظم انگلستان چرچل (CHURCHILL) اور کامریڈ سویٹ روس سٹالن (STALIN) تہران میں وارد ہوئے اور طہران کانفرنس منعقد کی۔ جہاں تک ایران کا تعلق ہے "نشستند و گفتند و برخاستند"۔ البتہ ایران نے جو کچھ مدد اتحادیوں کو دوران جنگ میں دی اسے شکریہ کے ساتھ تسلیم کیا گیا۔ اور اتحادیوں کی طرف سے یہ دعویٰ کیا گیا کہ ایران کو اقتصادی مدد برابر دی جائے گی اور اختتام جنگ کے بعد تمام امور جو ایران سے تعلق رکھتے ہیں آئندہ کانفرنسوں میں زیر بحث لائے جائیں گے ایران کی آزادی اور شاہی اور ملکی حدود میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔)

غالباً اسی کانفرنس میں کچھ اور باتیں بھی ان شاطران سیاست میں ہوئی ہوں گی۔ ۱۹۴۴ء میں برطانوی اور امریکی "آئل کمپنیوں" (OIL COMPANIES) نے ایران کے جنوبی حصہ میں اور روس نے شمالی حصہ میں دوبارہ دربارہ آئل کچھ مراعات کی درخواست

لی یہ واقعہ ماہ اکتوبر کا ہے اور ماہ دسمبر میں ایک بل پارلیمنٹ ایران نے پاس کرنا تھا۔ جس کی رُو سے تمام ایرانی افسران کو منع کیا گیا تھا کہ کسی غیر ملکی طاقت سے کوئی معاہدہ مراعات کسی شے کے بارہ نہ کریں پارلیمنٹ نے دور اندیشی سے کام لیا اور درخواست مراعات اور بل کا فیصلہ اختتام جنگ کے بعد ملتوی کر دیا جبکہ چھ ماہ کے عرصہ میں تمام غیر ملکی فوج ایران خالی کر دے گی۔)

پیٹرولیم (PETROLEUM) پیٹرول بہت بڑی مقدار میں یونائیٹڈ سٹیٹ امریکہ (UNITED STATES) اور وینزویلا (VENEZUELA) اور سوویٹ روس اور ایران میں دستیاب ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ میں تیل ایران کی پہاڑیوں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلتا اور جب کبھی بجلی یا اور کسی ذریعہ سے بھڑک اٹھتا تو لوگ حیرت زدہ یہ نظارہ دیکھتے اور مرعوب ہو کر سجدہ میں گر پڑتے۔ شاید آتش پرستی کی ابتدا یہی ہو مگر آگ بہت مفید شے ہے لیکن یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ جب زرتشتی مذہب کو فروغ ہوا تو آتش کدے انہی چشموں کے قرب میں تعمیر ہوئے جہاں "ہوالالکمی" یا اگنی دیوتا کا نوری یا ناری چہرہ بے حجابانہ جلوہ نما رہتا۔ ان کے کھنڈروں میں اب بھی یہ حقیقت مشاہدہ ہو سکتی ہے۔ یہاں اب "مسجد سلیمان" ایستادہ ہے جو انہی چشموں کے درمیان واقع ہے۔ دو سو سال کا عرصہ گزرا ہے۔ یورپ سے ایک سیاح اس جگہ وارد ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ ایران کے اس طرف اس علاقہ کو مازندران کہتے ہیں۔ یہاں نفط (نفت NAPHTA) پیدا ہوتا ہے یہ در و دیوار پر رنگ کا کام دیتا ہے اور لوگ اسے بدن پر بھی ملتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جلدی بیماریوں اور ریح کا بہترین علاج ہے اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ اس سے تیل نکالتے ہیں جو جلانے کے کام آتا ہے۔

(انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں اہل یورپ کو تیل کی تلاش نے ایران کی طرف متوجہ کر دیا۔ ۱۹۰۱ء میں ایک برطانوی شہری ولیم ڈارسی (WILLIAM D,ARCY) کو حکومت ایران نے جنوبی ایران میں تیل کی تلاش کی اجازت دے دی۔ اور تیل کی برآمد پر ساٹھ سال کا اجارہ بھی دے دیا۔ ۱۹۰۸ء میں خلیج فارس کے شمالی کونہ سے ایک سو پچیس ۱۲۵

میل کے فاصلہ پر پہلا کنواں کھودا گیا اور دوسرے سال لندن میں اینگلو پرشین آئل (ANGLO PERSIAN OIL COMPANAY) کی تشکیل ہوئی۔ اور جو مراعات "ڈارسی" کو حاصل تھیں اس کمپنی نے خرید کرلیں۔ برطانوی گورنمنٹ نے ۱۹۱۲ء اس کمپنی کو مالی امداد دینی شروع کی اور تیل کی پیداوار کا باون ۵۲ فیصدی حصہ محفوظ کرلیا۔ ۱۹۳۲ء تک حالات ہی ایسے ناسازگار تھے کہ ایرانی حکومت سب ہوتے بھی خاموش تھی۔ اس سال اس نے پہلا معاہدہ اجارہ داری منسوخ کردیا میں نئے معاہدہ کی گفت وشنید ہوئی۔ نیا معاہدہ کمپنی اور ایرانی حکومت میں اس کی اہم شقیں یہ ہیں:-

(۱) یہ معاہدہ ۱۹۹۳ء تک قابل عمل رہے گا۔

(۲) رعایت اجارہ صرف ایک لاکھ مربع میل کے رقبہ میں محدود رہے گی۔

(۳) خلیج فارس تک پائپ لائن (PIPE LINES) پر صرف کمپنی کی واحد اجارہ نہ ہوگی۔

(۴) فی ٹن تیل پر خواہ ایران میں یا ایران سے باہر فروخت ہو کمپنی حکومت ایران کو چار شلنگ ادا کرے گی۔

(۵) ایک لاکھ اکہتر ہزار دو سو پچاس ۱۷۱۲۵۰ پاؤنڈ سٹرلنگ کے اوپر جو بھی منافع تقسیم ہوگا اس کا بیس فیصدی سالانہ کمپنی حکومت ایران کی نذر کرے گی۔

(۶) اس تمام ادائگی کی میزان کم از کم پچھتر لاکھ پاؤنڈ ہونی چاہیئے۔)

اس وقت خلیج فارس کے شمال میں پہاڑی علاقہ اور شمال مشرقی کونہ کے قریب چھ مقامات پر تیل برآمد ہوتا ہے۔ یہاں سے کثیف تیل مختلف پائپ لائنوں کے ذریعہ "آبادان" میں آتا ہے۔ جو خلیج پر واقعہ ہے۔ اس جگہ مشینری، پائپ لائن اور ریفائنری (REFINERY) جس سے تیل صاف ہو کر پٹرول کی صورت اختیار کرتا ہے۔ روزانہ لاکھ بیرل سے زیادہ تیل کی مقدار مہیا کرتی ہے۔

اس کمپنی میں ملازمین ساٹھ ہزار سے زائد ایرانی اور برطانوی اور ہندی وغیرہ لگے ہیں

ان کی وجہ سے ایک آباد شہر بن گیا ہے۔ ان کی صحت اور تعلیم وغیرہ کا مناسب انتظام بھی کمپنی ہی کرتی ہے۔ ۱۹۴۵ء میں کمپنی نے ۱۹،۳۹۵،۰۰۰ (انیس کروڑ انتالیس لاکھ پانچ ہزار) بیرل تیل نکالا۔ اور حکومت ایران کو رائلٹی (ROYALTY) اسی لاکھ پاونڈ سے زیادہ وصول ہوئی۔

آبادان کا تیل ارض کے مشرقی کرہ میں کمپنی تقسیم کرتی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں دو امریکی کمپنیوں نے تیرہ کروڑ بتیس لاکھ کثیف (CAUDE) تیل بیس سال کے عرصہ خرید کا معاہدہ کیا۔ غرض تیل کی برآمد اور تقسیم کمپنی کے ہاتھ میں ہے۔ تحقیقات پر معلوم ہوا ہے کہ ایران کے دوسرے حصوں میں تیل بکثرت موجود ہے۔ شمال مغربی حصہ میں نفت پائی گئی ہے۔ بحیرہ خزر کے شمال مشرقی کناروں پر بھی اس کے آثار ملتے ہیں۔ کرمان میں بھی تیل کے چشمے دریافت ہوئے ہیں۔ سوویٹ روس (USSR) اور برطانیہ اور امریکہ بھی ایرانی تیل کی طرف زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ روس شمالی صوبوں میں "ایرانی سوویٹ کمپنی" بنانا چاہتا ہے اور برطانیہ اور امریکہ ملک کے جنوب مشرقی حصہ میں زیادہ سے زیادہ تیل کی برآمد کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اس روغنی مسئلہ نے جو صورت ہمارے زمانہ میں اختیار کی اس نے سردست ایران اور برطانیہ کے تعلقات میں کشیدگی پیدا کر دی ہے۔ ایرانی عوام میں کافی سیاسی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ وہ تمام معاہدات جو حکومت ایران سے برطانیہ نے کئے ایران کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ یہ معاہدات اب ناقابل عمل ہیں۔ ایران ایرانیوں کا ہے اور اس کی پیداوار پر ایرانی قوم کا حق ہے اور تیل کے چشمے اور ہر ایک شے جو ان سے وابستہ ہے ایران کی قومی ملکیت ہے۔ ایرانی پارلیمنٹ نے یہ تجویز منظور کر لی۔

اس وقت ڈاکٹر "مصدق" صدر پارلیمنٹ ہیں۔ اگرچہ سال خوردہ ہیں۔ مگر گرم و سرد زمانہ چشیدہ گرگ باراں دیدہ ہیں۔ بہر حال انتظار ہے کہ اس گفت و شنید کا کیا نتیجہ نکلتا ہے جس میں امریکہ بھی حصہ لے رہا ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ اس روغنی مسئلہ نے کچھ ایسی سیاسی الجھنیں پیدا کر دی ہیں کہ شاید متوقع تیسرا عالمگیر جنگ ہی سلجھا

سکے۔)

اس سیاسی پیچیدگی کو سمجھنے کے لئے ان حالات اور واقعات کو بھی دیکھنا چاہئے جو ایران میں انہی چند سالوں میں رونما ہو چکے ہیں۔ ان پر تفصیلی بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ان کا تعلق تو تاریخ اقوام یورپ سے ہے۔ جہاں تک دنیاء اسلام کا تعلق ہے۔ ان واقعات میں سے قابل ذکر "کمیونزم" ہے۔ اس موضوع پر مخالف اور موافق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہم نے صرف دیکھنا ہے کہ اس کا اثر دنیاء اسلام پر کیا ہوا اور یہ بھی ہم اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

کمیونزم (سرزمین ایران کمیونزم کی اشاعت کے لئے نہایت مناسب واقع ہوئی ان کے لئے یہ کوئی نیا نظریہ یا تحریک نہیں۔ اشاعت اسلامی سے پیشتر ایرانی شہنشاہ قباد کے عہد میں حکیم مزدک نے "حریت و مساوات" کا جو نظریہ پیش کیا اور تھوڑے عرصے میں راج دھرم ہو گیا۔ بہت کچھ اصولاً کمیونزم سے ملتا جلتا ہے اس میں صنف ضعیف کی آزادی پر بہت زور دیا گیا تھا۔ منطقی نتیجہ پر اس حد تک لایا گیا کہ یہ نظریہ ہندوستان کے "وام مارگ" کی صورت اختیار کر گیا۔ ہر ایک بے حیائی علانیہ یہاں تک رواج پا گئی کہ اگر قباد کا جانشین نوشیروان حکیم بوذر جمہر کے مشورہ سے مزدک کو قتل نہ کرتا اور اس تحریک کو نہ دبا تا تو ایرانی "شہنشاہیت" پیش از وقت تباہ ہو کر رہ جاتی لیکن یہ تحریک ایرانی اخلاق پر گہرا اثر کر چکی تھی اگر اسلام ایران پر نزدیک تر زمانہ میں قابض نہ ہوتا تو ایران کے دوبارہ ابھرنے کی کوئی توقع نہ تھی۔

موجودہ "کمیونزم" "اشتراکیت کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس کا اصل اصول بھی "حریت و مساوات" ہے۔ اس نظریہ کی اشاعت ایک یہودی "کارل مارکس" (CAL-MARKS)، ارمنی اور اس کے رفیق کار "انگلز" (ANGELS) سے منسوب ہے۔ اور خصوصاً معاشیات ہی اس کا موضوع ہے۔ "مارکس" نے "علم الاقتصاد" کے نظریوں پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ "سرمایہ داری" (CAPELOLESIM) عالم انسانی کے ارتقا کی بدترین دشمن ہے۔ جب تک معاشیات کی تقسیم میں مساوات نہ ہو گی یہ "حکومتیں"

جو سرمایہ داری کے بل بوتے پر بعض سرمایہ دار" افراد" نے قائم کر رکھی ہیں ختم نہ ہوں گی اور یہ جنگ و جدل جو بحر و بر میں وسیع پیمانہ پر ہو رہا ہے، ختم نہیں ہوگا۔ یہ حقیقت ایسی واضح ہے کہ معقولیت کے ساتھ اس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ اور اسلام اس کا زبردست حامی ہے۔ ہم نے اپنے مقالات میں اس پر جو ایک مستقل موضوع ہے کافی بحث کی ہے۔ اس لئے اس مقام پر اعادہ کی ضرورت نہیں۔ لیکن "کیمونزم" کی موجودہ صورت میں کچھ خامیاں بھی ہیں اگر تلخ تجربہ کی بعد اس میں اصلاح کی کوشش نہ کی گئی تو "نمردگی" مذہب ہو کر رہ جائے گا اور اگر اصلاح ہوتی رہی تو یہ اسلام کے قریب اور قریب تر آجائے گا۔

ہمارے زمانہ میں "کیمونزم" سوویٹ روس کا راج دھرم ہے۔ اس کے لائحہ عمل میں ہوس ملک گیری نہیں۔ اور اس کی نیک نیت کا اندازہ ان معاہدات سے بھی ہو سکتا ہے جو اس نے چین اور ایران سے باندھے۔ ایک معاہدہ ۱۹۲۱ء کا جو ایران سے ہوا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ کارل مارکس نے "کیمونسٹوں" کو پیش از وقت متنبہ کر دیا تھا۔ کہ اگر" کمیونزم" نے عالمگیر مذہب کی صورت اختیار نہ کی تو "سرمایہ داری" اسے ختم کر دے گی۔ اس لئے سوویٹ روس کے لئے اس کے سوا چارۂ کار نہیں کہ اس تحریک کی اشاعت میں انتہائی کوشش کرے۔ اس میں اس کی اپنی زندگی بھی ہے۔

اس وقت چوٹی کی دو سرمایہ دار حکومتیں برطانیہ اور امریکہ ہیں۔ اور ان کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہ تحریک ان ممالک میں نہ پھیلے جو ان کے زیر اثر اقتدار ہیں۔ اور زیادہ تر یہ وہ ممالک ہیں جہاں مسلمانوں کی حکومت اور اکثریت ہے۔ جو کچھ اس وقت دنیائے اسلام کی حالت زار ہے وہ سرمایہ دار حکومتوں کی پیدا کردہ ہے۔ اس کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو سادہ لوح تاریخی واقعات سے بالکل بے خبر ہو۔ اس لئے ان کے پنجۂ استبداد سے مخلصی کی ممکن صورت صرف یہی ہے کہ اصول حریت و مساوات و اخوت کو جس کی تشریح قرآن حکیم میں ہے، ہر ایک اسلامی

حکومت کی بنیاد یا دستور اساسی بنایا جائے۔)

"لینن" (LENIN) اول صدر جمہوریہ روس اپنے ایک "لیکچر" میں کہتا ہے کہ "اسلام اصولاً کمیونزم کے اقرب ہے مگر مسلمانوں میں "خان" اور "ملا" ہیں اور اس لئے وہ کئی سو سال ترقی یافتہ اقوام کے پیچھے رہ گئے۔"

فاعتبروا یا اولی الابصار۔

(ایک حقیقت جس کی طرف کارل مارکس نے "تجدد امثال" (DIALECTICS) پر بحث کرتے ہوئے توجہ دلائی ہے یہ ہے کہ "کمیونزم" کوئی مستقل تحریک نہیں۔ یہ ایک حربہ سرمایہ داری کا سر کچلنے کے لئے ہے۔ جب سرمایہ داری کو ختم کر دے گا۔ تو یہ بھی ختم ہو جائے گا۔"

اس کے بعد اس کی کیا صورت ہوگی؟ کارل مارکس کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا لیکن اس نے اور اس کے رفیق کار نے جو اشارات بتائے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اسلام ہوگا۔ ہر ایک انسانی حکومت ختم ہو جائے گی اور تمام عالم انسانی کا اتحاد ایک نقطہ وحدت پر ہوگا اور اس کی تمام تر توجہ تسخیر کائنات کی طرف لگ جائے گی۔" ان فی ذلک لآیت لقوم یتفکرون"

محمد رضا شاہ پہلوی

شاہ پور محمد ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم سوئٹزرلینڈ میں ہوئی۔ فرانسیسی اور انگریزی زبان سے خوب واقف ہے۔ اور ورزشی کھیلوں میں بھی ماہر ہے۔ ۱۹۳۹ء میں اس کا نکاح شاہ مصر فاروق اول کی ہمشیرہ "فوزیہ" سے ہوا جس کے بطن سے ایک لڑکی شاہ ناز ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئی۔ لیکن میاں بیوی کے تعلقات زوجیت میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اور طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔

جب اس کا باپ رضا شاہ تخت و تاج سے محروم کیا گیا تو یہ ۱۹۴۱ء میں جانشین ہوا۔ اور آج بھی یہی حکمران ہے۔ امریکہ اور پاکستان کی سیاحت کر چکا ہے دونوں جگہ اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔

اس کا باپ رضا شاہ، کمیونزم کے سخت خلاف تھا۔ شاہی اور کمیونزم میں فطری دشمنی ہے۔ اگر یہ جمہوریہ ایران کا صدر ہوتا تو شاید اتنا مخالف نہ ہوتا کہ اپنے اور اپنی حکومت کے خلاف تاب سخن نہ تھی۔ لیکن کمیونزم ایران کے شمال میں جو پہلے ہی زار روس کا حلقہ اثر تھا مقبول ہو رہی تھی۔ ایران میں اور بھی سیاسی "پارٹیاں" تھیں لیکن ان میں "تودہ" (عوام) صوبہ آذربائیجان میں زور پر تھی۔ یہ پارٹی کمیونزم قبول کر چکی تھی۔ اس پارٹی نے علم بغاوت بلند کر دیا اور صوبہ آذربائیجان میں ایک خودمختار جمہوریہ قرار دیا۔ ۱۹۴۶ء میں ایران کی مرکزی حکومت نے آذربائیجان کی بغاوت فرد کرنے کے لئے فوج بھیجی۔ تودہ پارٹی کے بعض لیڈر روس میں بھاگ کر پناہ گزین ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں پارلیمنٹ کا انتخاب شروع ہوا۔ تودہ پارٹی نے اس میں کچھ حصہ نہ لیا۔ پارلیمنٹ کی کچھ ایسی ہی حالت نازک تھی کہ ایک سال کے عرصہ میں "قوام" کے بعد ابراہیم حکیمی اور اس کے بعد عبدالحسین نے قلمدان وزارت سنبھالا اور کامیاب نہ ہوئے۔ وجہ یہ ہے کہ عوام کا مطالبہ کچھ اور تھا اور اقتدار کے بھوکوں کا مقصد کچھ اور تھا۔ عبدالحسین تو مارا گیا۔ مملکت میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ عبدالحسین کے بعد محمد سعید وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا۔ یہ سب برطانوی امریکن اتحاد کے اشاروں پر چل رہے تھے۔ تودہ پارٹی پھر زور پکڑ رہی تھی اور سوویٹ روس بھی شاہ اور اس کی پارلیمنٹ کو متنبہ کر رہا تھا کہ امریکہ کو ایران میں فوجی مستقر بنانے کی اجازت دے رکھی ہے۔

۴، فروری ۱۹۴۹ء میں شاہ پر ناکامیاب قاتلانہ حملہ ہوا۔ الزام تودہ پارٹی پر لگایا گیا جو بھاگ کر جان بچا سکے وہ ایران کی حدود سے نکل گئے اور باقی قید ہوئے۔ آقائے جلال الدین ہمائی متخلص بہ "سنا" استاد دانش گاہ نے قطعہ تاریخ لکھا چند اشعار حسب ذیل ہیں۔

سپاس بار خدائے کریم منّاں را — کہ از گزند نگہ داشت تخت سلطانی
ہزار شکر کہ از سوء قصد الم ماند — سر شہنشہ اندر پناہ یزدانی
ز سال واقعہ کردم سوال ہر کس ا — کہ بود در سر او دعوئے سخندانی

نوشت کلک سنا از برائے تاریخش   نمود دست حق آن شاہ را نگہبانی

اسی ۱۹۴۹ء میں شاہ نے پاکستان اور انگلستان اور امریکہ کا سفر کیا۔ ہر ایک جگہ خوب آؤ بھگت ہوئی۔ امریکہ کے سفر میں ایک بات خاص قابل ذکر ہے۔ فیسکر کے ایک مدرسہ کا معائنہ کیا۔ اس میں ساٹھ خورد سال لڑکے طالب علم تھے جن کی عمر بارہ سال سے متجاوز نہ تھی۔ شاہ نے کرہ ارض کے نقشہ کی طرف جو وہاں آویزاں تھا اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا کہ "بتاؤ ایران کہاں ہے" کوئی بھی نہ بتا سکا۔

مدیر "دانش" اپنے ماہنامہ (نومبر ۱۹۴۹ء) میں لکھتا ہے کہ:۔

"اعلیٰ حضرت فرمودند امید دارم روزی بایران بیائید و با شاگردان ہمسال خود آشنا شوید و بہ بنید آن ہا راجع بامریکا چیزی می دانند یا خیر"

بات تو معمولی ہے لیکن شاہ کو بھی معلوم ہو گیا کہ امریکہ کس حد تک ایران کے بارہ میں دلچسپی لیتا ہے اور یہ کہ ایرانی لڑکین میں امریکہ کے حالات سے واقف ہوتے ہیں۔ یہ غرض مند ہیں اور وہ بے نیاز ہیں۔

آج کل ڈاکٹر مصدق وزیر اعظم ہے۔ اسے اپنی جان کا بھی خطرہ ہے۔ اپنے ہم وطن غداروں کی طرف سے جو برطانوی رشوت خرید کر چکی ہے۔ روغنی مسئلہ کا حل خواہ کچھ ہی ہو۔ اور برطانیہ نے خلیج فارس میں جنگی "کروزرس" سے بھی دھمکی دی اور ہر ایک ممکن ناجائز وسیلہ مرعوب کرنے کے لئے استعمال کیا۔ لیکن یہ پیر سال خوردہ جوان بہت کچھ ایسا مستقل مزاج واقع ہوا ہے کہ اگر قوم نے اسی عزم بالجزم کے ساتھ اس کا ساتھ دیا جس کی ڈاکٹر مصدق نمائندگی کر رہا ہے تو ایران کی تاریخ کا ایک نیا باب کھلے گا۔

جو واقعات ایران میں آج کل رونما ہو رہے ہیں اور جس سرعت سے ظہور میں آ رہے ہیں اگر ان کی رفتار کو دیکھا جائے تو قیاس غالب ہے کہ متوقع جنگ عظیم کا اگر ہمدردان بنی نوع انسان کے ٹالنے سے نہ ٹلے بہت عرصہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔

(ایران میں بظاہر روغنی مسئلہ مابہ النزاع ہے مگر پس منظر حقیقت کچھ اور ہے تیل کچھ ایسی شے نہیں کہ برطانیہ کو سستے یا مہنگے داموں پر نہ ملے اور صرف ایران ہی میں تیل محدود نہیں۔ بہت مقامات اور بھی ہیں۔ جہاں سے تیل ضرورت سے زیادہ برطانیہ کو مل سکتا ہے۔ یہ بھی تجارتی مال ہی ہے۔ یہ پس منظر سمجھنے کے لیے اس رقابت کو دیکھنا چاہیئے جو دول یورپ اور امریکہ اور روس بالخصوص "اینگلو امریکن" (ANGLO - AMERICAN BLOCK)۔ اور جمہوریہ روس میں کارفرما ہے۔ یہ بلاک" اور جمہوریہ روس دو مختلف نظریوں کی نمائندگی کر رہے ہیں اور یہ سرمایہ داری (CAPELOLISM) اور کمیونزم ہے۔)

سرمایہ داری اور کمیونزم ایک مستقل موضوع ہے۔ اور اس پر مخالف اور موافق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اس وقت تقریباً تمام کرہ ارض پر سرمایہ داری کی حکومت ہے اور امریکہ اور برطانیہ چوٹی کے دو سرمایہ دار بلکہ سرمایہ داری کے اجارہ دار ہیں۔ اس لئے محکوم اقوام عالم بالخصوص ایشیائی اور افریقی کبھی "فلاح" کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ جب تک ان پر سرمایہ داری مسلط ہے "کمیونزم" سرمایہ داری کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے (اس لئے جنگ ہے تو انہی دو نظریوں (IDEOLOGY) میں ہے) خواہ ان کی نمائندگی کوئی قوم کرے۔ سردست سرمایہ داری کی نمائندگی "اینگلو امریکن بلاک" اور کمیونزم کی جمہوریہ روس کر رہا ہے۔ قرآن حکیم نے کیا پتہ کی بات کہی ہے کہ بروز قیامت رباخواروں کی حالت ایسی ہوگی جیسے جنونی کی۔ "اینگلو امریکن بلاک" دراصل کمیونزم کو فنا کرنا چاہتا ہے مگر مقابلہ جمہوری روس کا کر رہا ہے۔ ان دیوانوں کو اتنی تمیز نہیں کہ کمیونزم روس سے بالکل بے نیاز ہے (اگر روس تباہ بھی ہو جائے کمیونزم تباہ نہیں ہوگا۔ اگر بغداد اور خلافت عباسیہ تباہ ہوئی تو کیا اسلام مٹ گیا؟ روس نے تو صرف کمیونزم کو اپنایا ہے۔ اور ہر ایک قوم اپنا سکتی ہے۔ اور یہ کوئی نیا نظریہ بھی نہیں البتہ اسے نئی علمی صورت میں کارل مارکس اور اس کے رفیق انگلز نے ڈھالا اور خود کارل مارکس کہتا ہے کہ ہر ایک انسانی علم و فن تغیرات (DIALECTICS) کی زد سے باہر نہیں ہو سکتا اور قانون

ارتقا کا یہی تقاضا ہے۔ اس لئے کمیونزم کوئی مستقل شے
اس لئے سرمایہ داری کو ضرور ختم کرنا ہے اور ساتھ ہی خود بھی ختم ہو جائے گی اور پھر کوئی اور
صورت ہو گی۔)

اینگلو امریکن بلاک کے زعم ناقص میں اگر روس تباہ ہو جائے تو کمیونزم بھی
ہو جائے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آج تک یہ نام نہاد مسیحی اور دجالی سرمایہ داری یہ
رہی کہ اسلام اور مسلمان ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں اس لئے اگر مسلمان تباہ حال
تو اسلام بھی تباہ ہو جائے گا۔

میں تو سمجھنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہوں کہ کمیونزم "اللہ نے اسلام
ایک حربہ عطا فرمایا ہے جو سرمایہ داری کے ساتھ سرمایہ داروں کو بھی کچل کر رکھ دے
اس کے بعد اسلام "یکسر جہاں بگیرد بے منت سپاہی"

ایران کے واقعات حاضرہ کو اینگلو امریکن بلاک اور جمہوریہ روس کا اعصابی
ہی سمجھنا چاہیئے۔ اور ان واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہم کسی قدر تفصیل کے س
واقعات گزشتہ بیان کرتے ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ خاندان قاچار کے خاتمہ پر قلمدان وزارت عظمیٰ سید ضیاء الدین
طباطبائی کے ہاتھ میں تھا۔ اور اسی نے رضا خاں پہلوی کو دعوت سلطنت دی تھی لیکن
رضا شاہ سے نہ بنی تو شاہ نے سید ضیاء کو معزول کر کے خود وزارت بھی سنبھال لی جب
اول جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور اتحادیوں نے ایران پر قبضہ کر لیا تو اختتام جنگ کے
برطانیہ اور زار روس کی حکومت نے سمجھوتہ کے ذریعہ ایران کو دو حلقہ ہائے اثر میں تق
کر لیا۔ خوش قسمتی سے زار کی حکومت کا تختہ سویٹ روس نے الٹ دیا۔ اور معاہدہ ۲۱
کے ذریعہ جمہوریہ روس اپنے تمام حقوق سے دست بردار ہو گئی۔ اگرچہ اتحادی اس ام
رضامند ہو گئے تھے کہ اختتام جنگ کے چھ ماہ بعد ان کی فوج ایران خالی کر دے گی او
کر دیا مگر برطانیہ کی حیثیت ایران میں مختلف تھی "اینگلو پرشین آئل کمپنی" کی آڑ میں ایر
پر اثر و اقتدار برطانیہ کا رہا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اس کے لئے میدان خالی تھا۔ اور جب

ل کے بعد برطانوی اثر و اقتدار و تسلط اور مستحکم ہو گیا۔ اب سویٹ روس جو کمیونزم کی
نمائندہ تھی اور برطانیہ جو سرمایہ داری کی نمائندہ حکومت تھی مقابلہ میں آگئیں۔ جمہوریہ
روس اگرچہ اپنے تمام سیاسی حقوق سے معاہدہ ۱۹۲۱ء کی رو سے دست بردار ہو گیا مگر
برطانیہ نے اپنے حقوق کے تحفظ کی گرفت اور مضبوط کر دی اس لئے جمہوریہ روس کو یہ
خطرہ بجا تھا کہ متوقع جنگ میں اینگلو امریکن بلاک اس کی ناکہ بندی ایران میں خاطر خواہ کر
سکتا ہے۔ عراق اور شام میں شریفی خاندان کی حکومت بھی برطانیہ کی قائم کردہ تھی
اور ہے۔ اور موصل کے تیل کی اجارہ داری اینگلو پرشین کمپنی کی تھی اور ہے۔ ہندوستان
تسلط برطانیہ کا تھا۔ افغانستان میں بادشاہ گری بھی تھی۔ غرض جمہوریہ روس کا ناطقہ
ناکہ بندی ہر طرف سے خاطر خواہ ہو چکی تھی۔ اب جمہوریہ روس کو اس کے سوا چارہ نہ تھا
اس ناکہ بندی کو توڑ دے۔ معاہدہ ۲۶ فروری ۱۹۲۱ء کی دفعہ چھ (ARTICLE 6) میں
اسی خطرہ کے پیش نظر کافی سدباب کیا گیا تھا کہ "کوئی تیسری طاقت غاصبانہ جدوجہد
خارجی طاقت کے بل بوتے پر ایران میں کرے اور ایسی طاقت ایرانی سرزمین کو جمہوریہ
روس کے خلاف استعمال کرنے کی خواہش کرے یا اگر کوئی خارجی طاقت یا اس کے حلیف
جمہوریہ روس کی حدود کے لئے خطرہ کا موجب ہو اور ایرانی حکومت اس خطرہ کا سدباب
کرنے کے ناقابل ہو جس کی طرف جمہوریہ روس اس کو ایک دفعہ متوجہ کرے گی تو جمہوریہ
روس کا حق ہوگا کہ ایران میں بغرض مدافعت اپنی فوج داخل کرے۔ البتہ یہ ذمہ داری
جمہوریہ روس پر ہے کہ جونہی کہ یہ خطرہ مرفع ہو جائے اپنی فوج ایران سے واپس بلالے گا۔"

یہ کوئی پوشیدہ راز نہیں کہ ایران اور شام اور عراق اور لبنان میں تو مکمل ناکہ بندی
ہو چکی تھی۔ یونان اور جمہوریہ ترکی بھی اوقیانوسی "چارٹر" (ATLANTIC CHARTER)
میں اگر شامل ہو گئی تو ایشیا میں اس طرف جمہوریہ روس کا ناکہ بند ہو جائے گا۔ اب رہا
افغانستان اور تبت اور چین اور ہندوستان یا منقسم بھارت اور پاکستان۔
چین میں اینگلو امریکن منصوبہ کامیاب نہ ہوا۔ اور اسی کی تکمیل کے لئے اینگلو امریکن
بلاک اور اس کے حلیف کوریا میں دولت مشترکہ کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔ یورپ

میں جو ممالک فرانس وغیرہ "اٹلانٹک چارٹر" میں شامل ہو چکے ہیں وہ بھی اس ناکہ بندی کے منصوبہ میں شامل ہیں۔ بھارت بساطِ سیاست پر اپنی پرانی چال چل رہا ہے اور ہر ممکن کوشش اینگلو امریکن بلاک کی طرف سے ہو رہی ہے کہ اس کو بھی اپنے ساتھ گانٹھا جائے اور ہر ایک منہ مانگی رعایت دے دی گئی۔ اور بھارت کی تشکیل کے وقت برطانیہ کو یقین تھا کہ بھارت اس کا ساتھ متوقع جنگ میں دے گا۔ لیکن بھارت زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اور علانیہ روس سے تو نہیں مگر چین سے ہمدردی کا اظہار بھی کرتا ہے۔ تاکہ اینگلو امریکن بلاک جو "یو این او" اور اس کے پٹھوؤں کی ملی بھگت ہے خائف ہو کر اسے خوش کرنے کی طرف مائل ہو۔ اس وقت جس طرح اسے خوش کیا گیا اتنا ہی "پاکستان" کو نقصان پہنچا۔ تنازعہ کشمیر کا تصفیہ ایک سیاسی ڈھونگ ہے۔ مسٹر نمیٹز، ڈکسن اور گراہم کا در اصل مطلب کچھ اور تھا۔ ابھی تک یہ سیاسی منصوبہ راز ہی میں ہے۔ شاید ارباب حکومت پاکستان اس سے آگاہ ہوں۔ اہل پاکستان اور مجھ جیسا روزانہ پرچہ نویس بھی واقف نہیں۔ لیکن ہم اتنا بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ "یو این او" کا منشا ہرگز ہرگز تصفیہ تنازعہ کشمیر نہیں۔ البتہ وہ بھارت اور پاکستان کی طرف سے جمہوریہ روس کی ناکہ بندی کی فکر میں ہے۔ اتنی بات گراہم نے بھی دبی زبان سے کہہ دی کہ میں نے پنڈت نہرو کو مشورہ دیا تھا کہ ریاست جموں وکشمیر میں اسمبلی کی کاروائی سر دست ملتوی کر دے۔ یعنی جب حالات سازگار ہوں تو اس کی بھی اجازت ہے۔ یہ بھی قیاس غالب ہے کہ بھارت کو اینگلو امریکن بلاک نے دھمکی بھی دی ہو کہ اگر نہرو کا یہی رویہ رہا کہ وہ چین کی حمایت میں علی الرغم اینگلو امریکن بلاک کی کر رہا ہے تو ہم پاکستان کو کسی فوجی اقدام سے باز نہیں رکھ سکتے جو وہ اپنے دفاع کی خاطر کرے۔ بہر حال پنڈت نہرو اینگلو امریکن بلاک کی بے بسی سے واقف ہے اور کوئی ایسی بات نہیں کہتا کہ یہ بلاک اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو کر رہ جائے۔ اس صورت میں بھی علانیہ مدد اینگلو امریکن بلاک پاکستان کی نہیں کر سکتا۔ یہ اس بلاک اور جمہوریہ روس کا سیاسی

تذبذب ہی ہے کہ علانیہ وہ ابھی تک ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئے۔ چین کی طرف سے روس کی ناکہ بندی کا منصوبہ ٹوٹ چکا ہے۔ سر دست ہم ایران کے حالات لکھ رہے ہیں۔ یہی ناکہ بندی ہے جو یہ بلاک چاہتا ہے اور اگر جنگ چھڑ گئی تو روس پر ایران اور عراق اور شام کی طرف سے بیک وقت حملہ ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان ممالک کی فوجی قوت بھی اس بلاک کے ہاتھ میں ہو۔ یعنی یہ سب اس کے آلہ کار ہوں۔ مگر صوبہ آذربائیجان جو اس مثلث کا کونہ ہے۔ جہاں عراق و شام و ایران کے اضلاع ملتے ہیں۔ جمہوریہ روس کے زیر اثر ہے۔

(اس وقت ایران میں تین پارٹیاں سرگرم عمل ہیں۔ ایک جمہوریہ روس کی طرف مائل ہے۔ اس کو "تودہ" کہتے ہیں۔ اردو میں بھی لفظ "تودہ" استعمال ہوتا ہے۔ کسی شے کی اکثریت یا ڈھیر، انگریزی میں صحیح ترجمہ (MASS) ہے۔ اس سے مراد عوام ہیں۔ دوسری پارٹی اینگلو امریکن بلاک کی حامی ہے۔ تیسری پارٹی محض یا تو ابن الوقت ہے یا وہ جو قوم و ملت کی بہبودی کے جذبہ سے خالی نہیں۔ تودہ پارٹی معناً کمیونسٹ (COMMUNIST) پارٹی ہے اور ملوکیت اور کمیونزم میں ازلی بیر ہے۔ رضا شاہ پہلوی کے عہد میں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو یہ گوشہ گمنامی میں چھپ گئے۔ اور اکثر قید و بند کی سختی جھیلتے رہے۔ لیکن ۱۹۴۱ء میں جب روسی فوج ایران میں داخل ہوئی تو ان کو بھی امان ملی۔ جنوری ۱۹۴۲ء میں اس کی باضابطہ تشکیل ہوئی۔ اس کے بانیوں میں سے رضا رستہ (جو جیل سے رستگاری حاصل کر چکا تھا) ابوالقاسم اسدی اور ایرج سکندری اور ڈاکٹر مرتضیٰ یزدی اور ڈاکٹر رضا اور جعفری پشاوری تھے پشاوری آذربائیجان میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوا۔ ہوش سنبھالی تو پُر آشوب زندگی کا آغاز ہوا۔ ایران میں اس پر عرصہ حیات تنگ ہوا تو ۱۹۰۴ء میں باکو چلا گیا۔ ۱۹۱۸ء میں سرخ فوج کے ساتھ بنام سید جعفر ایران میں آیا۔ ۱۹۲۰ء میں انقلابی گیلان جمہوریت کا وزیر امور داخلہ مقرر ہوا۔ یہ ختم ہوئی تو روس چلا گیا اور یہاں سلطان زادہ کے لقب سے شہرت پائی۔ اور کمنٹرن (COMINTERN) کے داعی کی حیثیت

سے مشرق وسطیٰ اور ابی سینیا۔ (ABYSSINIA) تک گیا۔ جہاں گیا یہ ظاہر رہا کر سوویٹ کے ظلم و ستم سے پناہ ڈھونڈ رہا ہوں۔ ۱۹۳۶ء میں پیشاوری ایران میں ہُوا۔ مگر کاشان میں نظر بند کیا گیا۔ ۱۹۴۱ء میں (AMNESTY) عام میں اسے بھی رہائی ملی۔ طہران میں آیا اور روزنامہ "اظہر" جاری کیا اور تودہ پارٹی کی تشکیل مدد دی۔

اس پارٹی کا آرگن (ORGAN) "رہبر" زیرادارت ایرج سکندری شائع ہو تھا۔ حکومت نے ضبط کیا تو روزنامہ "رزم" نے اس کی جگہ لے لی۔ ڈاکٹر کشاورز مدیر تھا۔ ان کے علاوہ "مردم" اور "رستی" اور "ظفر" اور "دیاوند" قابل ہاتھوں میں شا ہو رہے تھے جو "تودہ" کے بانیوں میں سے ہیں۔ تودہ کی عملی سرگرمی کے مرکز تبریز، اردبیل، مراغہ، رضائیہ، کوہی، مشہد، شمنان، شاہ رود، دامغان، قزوین شمالی ایران میں تھے۔ جہاں "سوویٹ" کا اثر ورسوخ بھی زیادہ تھا۔ اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے مزدوروں میں بھی کمیونزم کی اشاعت کی کوشش کی مگر برطانیہ نے کام نہ ہونے دی۔

برطانیہ کے حامی بھی ایران میں موجود ہیں۔ "ستارہ" اور "بختر" اور دوسرے روزنامے یا تو برطانیہ یا امریکہ کے زیر اثر شائع ہو رہے ہیں اور تودہ کی مخالفت میں مضامین آب و تاب سے شائع کرتے رہے۔ سید ضیاء الدین طباطبائی جلاوطن تھا ۱۹۴۳ء میں واپس ایران آیا۔ ایک شخص مظفر فیروز نے اپنی خدمات پیش کیں یہ ایک بااثر خاندان کا رکن تھا۔ سید ضیاء نے ایک روزنامہ "امروز" جاری کیا۔ مظفر فیروز ہی کے زیر اہتمام اس کا اجراء ہُوا۔ مظفر فیروز کو روپیہ کا لالچ تھا۔ سید کی خدمت میں یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو تودہ پارٹی سے جا ملا۔ ۱۹۴۶ء میں بحیثیت سفیر ایران ماسکو میں متعین ہوا مگر معلوم نہیں کہ راستہ میں کیا افتاد پڑی کہ ایسا غائب ہوا کہ آج تک اس کا سراغ نہ ملا۔

قوام الملک | قوام السلطنت شمالی ایران میں متمول شخص تھا۔ ۱۹۴۲ء میں

وزیر اعظم ہوا یہ بھی "تودہ" کی دلدہی کرتا رہا۔ بعض مخالف تو یہ کہتے ہیں کہ اس کی جائداد ووٹ حلقہ اثر میں بہت تھی۔ اس کے تحفظ کے لئے تودہ کی مدارات ضروری تھی۔ اگرچہ علانیہ تودہ میں شامل نہ ہوا مگر مخالف فریق سے ایسے ہمدردوں کو کسی وجہ سے گانٹھ لینا بھی تودہ کی فتح ہی تھی۔ تودہ کا نصب العین مغربی استعمار کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کرنا تھا اور اس طرح بالواسطہ سویٹ روس کو تقویت ملتی رہی۔

اگر "مجلس" میں ان کی نمائندگی اقلیت میں تھی مگر یہ منظم جماعت تھی اور سب یک زبان اور ہم خیال تھے۔ مخالف فریق اگرچہ اکثریت میں تھا مگر سب بھانت بھانت کی بولیاں بولتے۔ اس لئے اگر تودہ کا کوئی مطالبہ منظور نہ ہوتا تو وہ مخالف فریق کے مطالبات کو ناقابل عمل بنا دیتے۔ اگرچہ طبقہ امرا تودہ کے خلاف تھا مگر عوام کی حمایت انہیں ہمیشہ حاصل رہی۔ سودیٹ روس کو بوجہ قرب اینگلو امریکن بلاک پر فوقیت حاصل تھی۔ صرف صوبہ آذربائیجان ہی اس کا مددگار تھا۔ حکومت باہر سے مشیر (ADVISERS) اگر منگواتی۔ تودہ اس روش کے خلاف تھا۔ خواہ یہ انگریز ہوں یا امریکی یا فرانسیسی سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ تودہ پریس سختی سے اینگلو ایرانی آئل کمپنی پر حملے کرتا رہا۔ روزنامہ "رہبر" پیش پیش تھا۔ "بحرین" کو بھی ایران کی سلطنت علی الرغم برطانیہ کہتا رہا۔ تودہ اخبار کا ہدف ملامت زیادہ تر سید ضیاء الدین طباطبائی تھا۔ جو علانیہ برطانیہ کی حمایت کر رہا تھا اس کو غدار قرار دیا گیا۔ اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اسے غداری کی سزا دی جائے اور اگر حکومت قاصر ہے تو تودہ کے ہاتھ لمبے ہیں۔ کرد اور اہل آذربائیجان تو کھلم تودہ کے مددگار تھے۔ مگر تودہ نے کبھی علانیہ تسلیم نہیں کیا کہ وہ سویٹ روس کی آلہ کار ہے۔ چنانچہ ۷ مئی ۱۹۴۶ء میں روزنامہ "رہبر" نے اس الزام کی تردید کی اور لکھا کہ عام رائے یہ ہے کہ تودہ سویٹ کمیونسٹ کا آرگن ہے۔ تودہ ایرانیوں کا ہے اور ایرانیوں کی بہبودی کے لئے سرگرم عمل ہے۔ ایران کا دفاع اور ایران کی آزادی اس کا مقصد وحید ہے۔ تودہ امریکہ کی طرح ایران میں اصول جمہوریت رائج کرنا چاہتا ہے اگر ہماری پارٹی سویٹ کے حق میں مقالے لکھتی ہے تو وجہ یہ ہے کہ وہ فیسسٹ (FASCISTS) کے خلاف خوب لڑتے ہیں اور ہمیں یہ

بھی یقین ہے کہ سویٹ گورنمنٹ نہ تو ایران میں بالشویک گورنمنٹ قائم کرنا چاہتی ہے اور
اس کے کسی حصہ پر قابض ہونا چاہتی ہے۔"

لیکن ایران میں تودہ کے مخالف عناصر بھی بہت ہے۔ اول تو شاہی، جمہوریت بالخ
اشتراکیت نہ شاہی برداشت کرسکتی ہے اور نہ اشتراکیت شاہی۔ رضا شاہ کے عہد میں کم
کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ اس لئے جو بھی بغرض اصلاح اس نے چاہا کسی نے مخالفت نہ کی۔
اصلاح کے حالات ہم لکھ چکے ہیں۔ لیکن موجودہ شاہ کے زمانہ میں کمیونزم ایران کے طول و
میں شائع ہوچکی ہے اور شمالی ایران تو براہ راست اس کے زیر اثر ہے۔ رضا شاہ پہلو
کے عہد میں اوقاف بحق شاہ ضبط ہوچکے تھے اور مشائخ حکومت کے وظیفہ خوار ہوکر رہ
تھے۔ جب رضا شاہ جلاوطن ہوا تو حکومت کو تو نہ سوجھی، برطانیہ نے پھر سے مشائخ او
مجتہدین کا اقتدار قائم کردیا۔ اس لئے کہ یہ کمیونزم کے سخت مخالف ہیں۔ کمیونزم د
حکومت کی بھی ایسی ہی دشمن ہے جیسی دنیوی کی۔ اس لئے شاہ کو بھی معلوم ہوگیا کہ ملا
اور "ملوکیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شاہی کا قیام اور استقلال "ملازم" کی حمایت
ممکن ہے اور ملازم کو فروغ شاہی کی سرپرستی میں ممکن ہے۔ اس لئے دونوں بچھڑے پھ
مل گئے جو باتیں رضا شاہ نے ممنوع قرار دی تھیں پھر سر بازار روا ہوگئیں۔ اور وہی مجالس
عزاداری اور وہی ماتمی جلوس وغیرہ۔

شاہ کو مشورہ دیا گیا کہ ملک کے طول وعرض میں دورہ کرتے ہوئے کہیں کہیں تقر
بھی کیا کرے اور جہاں کہیں شورش ہو وہاں ضرور جانا چاہیئے۔ چنانچہ شاہ نے اس مشور
پر عمل کیا اور خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ سب سے بڑھ کر فوج شاہ سے وابستہ تھی اور وہ بھی
اکثر افسروں اور فوجیوں سے ملتا مگر کمیونزم اور کمیونسٹوں کے خلاف پیشوایان دین کی حما
سب سے بڑھ کر موثر ثابت ہوئی۔ رضا شاہ کے عہد میں مشہور مجتہد حاجی آغا حسین "قومی
جلاوطن ہوئے ۱۹۴۳ء میں ایران میں واپس آیا۔ مشائخ اور علماء اور ان کے زیر اثر عوام
گرم جوشی سے استقبال کیا۔ وزیر اعظم علی سہیلی خود اسے ملنے جاتا رہا۔ اور اس کی شاہ سے
بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اسی طرح دیگر علماء کو بھی باریابی کا موقعہ ملتا رہا۔ "نور دانش" ا

اسلام" اور "ظائف" بھی شائع ہورہے تھے۔ اور عوام کی توجہ زیادہ تر مذہبی امور کی طرف منعطف کی گئی۔ اور مذہب سیاسیات کا غلام ہوکر رہ گیا۔ سید ضیاء الدین نے ان کی قیادت سنبھال لی۔ اس نے ایک سیاسی پارٹی "وطن کی بھی طرح ڈالی۔ اور "یزد" نے اسے اسمبلی کے لئے اپنا نمائندہ منتخب کیا۔ ایک سال بعد "وطن" کی جگہ "ارادہ ملی" شائع ہوا۔ اور اب یہ تودہ کے مقابل پارٹی کھڑی کی گئی۔ اور دونوں میدان سیاست میں اتر آئیں۔ ادارہ ملی کی صدارت رضا قلی ہدایت نور الملک کو دی گئی۔ سید ضیاء الدین کلیدی منصب جنرل سیکرٹری پر فائز رہا۔ سوویٹ روس نے پٹرولیم کے لئے وہی مطالبہ شمالی ایران میں کیا جو برطانیہ کو جنوبی ایران میں حاصل تھا۔ تو سید ضیا الدین نے سخت مخالفت کی۔ عوام نے ساتھ دیا۔ لوگ بھول گئے کہ سید برطانیہ کا پٹھو ہے۔ عوام کی ذہنیت ہی ایسی ہوتی ہے۔

ضیاء نے اپنے اخبار میں لکھا کہ۔

"ایران میں اس وقت دو امپریلزم برطانیہ اور سوویٹ سرگرم عمل ہیں۔ برطانوی امپریلزم تو اسی پر قانع ہے جو اس کے پاس ہے اور زیادہ کی خواہش نہیں کرتی۔ مگر اس کے خلاف سوئٹ اپنا اقتدار وسیع تر کرنا چاہتی ہے۔ اگر ہماری قوم ارادہ کرلے کہ سویٹ کی مخالفت کی جائے تو برطانیہ ضرور اپنے معاہدوں کا پاس کرے گا اور ایران کی آزادی پر حملہ ہو تو مدافعت بھی کرے گا۔ اس کے خلاف سویٹ ضرور کچھ اپنے مفاد کے لئے اور بھی مطالبہ کرے گا۔ اگر شمالی صوبوں میں سویٹ کو اپنا اثر و اقتدار قائم رکھنے کی اجازت دی گئی تو برطانیہ جنوبی ایران میں یہی کچھ کرے گا۔ اور اس طرح ایران ان دونوں میں تقسیم ہوکر رہ جائے گا۔"

سید ضیاء الدین نے حکومت کو بھی یہی مشورہ دیا کہ نہ صرف برطانیہ بلکہ امریکہ سے بھی فوجی امداد ضرورۃً طلب کی جائے۔ اس میں کچھ ہتک نہیں۔ فرانس، بلجیم، پولینڈ، ناروے نے بھی تو ان سے امداد طلب کی تھی اور اپنی آزادی بحال کرلی۔ حکومت ایران کی توجہ امریکہ کی طرف زیادہ تھی۔ شاید یہ کمتر برائی تھی۔ ایرانی طلبا تحصیل علم وفنون کے لئے امریکی یونیورسٹی

میں ہی جاتے رہے۔ اور واپسی پر امریکہ ہی کے گن گاتے رہے ۱۹۴۶ء میں امریکی سفیر جارج۔وی۔ایلن (GEORGE V. ALLEN) نے ایران میں قدم رکھتے ہی ارباب حکومت ایران کو گانٹھنا شروع کیا اور یہ ذہن نشین کیا کہ دو دلی سے کام نہ چلے گا اور محض غیر جانبدارانہ پالیسی بھی مفید نہیں۔ اس وقت قوام الملک وزیر اعظم تھا۔ امریکہ کی مدد سے آذربائیجان میں اپنی فوجیں بھی داخل کر دیں۔ آذربائیجان نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر رکھا تھا۔ مگر ایران سے وابستگی بھی قائم رکھی یہاں پیشاوری صدر جمہوریہ آذربائیجان تھا۔ مگر بھاگتے ہی بن پڑی اور سوویٹ روس میں پناہ لی۔ اور آخر موٹر کے حادثہ میں باکو کے قریب مر گیا۔ ۲۲۔ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مجلس نے سوویٹ روس کے مطالبات و مراعات دربارہ پٹرولیم مسترد کر دیئے۔ اب ایران اور سوویٹ میں کشیدگی بڑھ گئی۔

سوویٹ روس ایرانی حکومت کو مطعون کر رہی تھی کہ معاہدہ ۱۹۲۱ء کی خلاف ورزی کر رہی ہے۔ امریکہ کا اثر و رسوخ بڑھ رہا ہے اور امریکہ ایرانی فوج کی تربیت اس نظر سے کر رہا ہے تاکہ کسی وقت سوویٹ روس کے خلاف بطور آلہ کار استعمال کر سکے۔

۳۱ جنوری اور پھر ۲۸ مارچ اور بعد ازاں ۸ اپریل ۱۹۴۸ء میں بار بار سوویٹ نے ایرانی حکومت کو توجہ دلائی کہ دونوں ملکوں میں دوستی اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے اگر تیسری طاقت کو ایران کے خانگی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہ دی جائے اگر ایرانی حکومت کی یہی قابل اعتراض روش جاری رہی تو سوویٹ روس سیاسی تعلقات منقطع کر دے گا۔ سوویٹ اخبار "پراوڈا" (PRAVDA) اور "ازوسٹیا" (IZESTIA) نے اپنی ۱۴ اپریل ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں یہاں تک لکھ دیا کہ امریکی فوجی مشیر اور امریکی اثر و رسوخ ایران میں "نازی سرگرمی" (NAZI ACTIVITIES) کا عملاً مظاہرہ کر رہا ہے۔ ایرانی صحافت جو اینگلو ایرانی بلاک کی حامی تھی سوویٹ کو ہدف ملامت بنا رہی تھی کہ معاہدہ ۱۹۲۱ء کی آڑ لے کر اپنی فوج ایران میں داخل کرنا چاہتا ہے نوروز کی تقریب پر ممالک خارجہ کے سفیر حسب معمول شامل ہوئے مگر سفیر سوویٹ غیر حاضر رہا

افواہیں اب خاص موضوع بحث عوام کا تھیں۔ طہران میں اس خبر نے پریشانی پھیلا دی کہ آذربائیجان کے "فدائی" (جواب تودہ کے نام سے موسوم ہیں) کثرت سے آرہے ہیں۔ اور مسلح مہاجرین سویٹ علاقہ سے بھی ایران میں داخل ہو رہے ہیں۔ ایران کے اخباروں نے یہ فقرہ بھی چست کر دیا کہ انقلابی لہر گورجان سے شروع ہو کر ماژندران اور اصفہان کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ دسمبر ۱۹۴۷ء کو قوام الملک کی جگہ ابراہیم حکیمی نے قلمدان وزارت سنبھال لیا۔ یہ بھی اینگلو امریکن بلاک کے ہاتھ میں کھیلتا رہا۔ ماژندران میں تین سو "تودہ" پارٹی کے آدمی گرفتار ہوئے۔ وزارت نے زیادہ سے زیادہ کوشش کی ایرانی اور امریکی تعلقات دوستانہ مضبوط سے مضبوط تر ہوں۔ ۲۰ جون ۱۹۴۷ء میں ایران اور امریکہ میں ایک معاہدہ ہوا جس کی تصدیق "مجلس" نے ۱۷ فروری ۱۹۴۸ء میں کی۔ اس معاہدہ کی رو سے امریکی اسلحہ کی درآمد ایران میں تیز تر ہو گئی۔ امریکی ملٹری مشن کا عملہ بڑھتا گیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۴۹ء تک اس میں کافی اضافہ ہو گیا جس میں اٹھارہ کمیشنڈ (COMMISSIONED) افسر تھے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ ایرانی حکومت خواہ کتنے ہی عذر لنگ پیش کرتی رہی معاہدہ ۱۹۲۱ء کی صریحاً خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اینگلو امریکن بلاک حکومت ایران پر چھا چکا تھا۔ ان کے ہاں گھی کے چراغ جل رہے تھے۔ ناکہ بندی کا منصوبہ خاطر خواہ مکمل ہو رہا تھا۔ سویٹ روس ان حالات سے غافل نہ تھا۔ اس کی بساط سیاست کا مہرہ حکومت نہ کبھی پہلے تھی اور نہ اب تھی۔ یہ مہرہ جسے وہ کامیابی سے ہر ایک جگہ بڑھاتا رہا "عوام" ہے جسے ایران میں تودہ پارٹی سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سرمایہ دار حکومتوں کے آلہ کار ہمیشہ نواب اور نواب زادے اور جاگیردار رہے ہیں۔ اور یہ حکومتیں ہمیشہ نواب اور جاگیردار بلکہ بادشاہ گر رہی ہیں۔ لیکن یہ چند افراد ہی ہوتے ہیں۔ جب تک عوام میں سیاسی شعور پیدا نہیں ہوتا اس طرح کام خاطر خواہ ہوتا رہتا ہے اور یہ نواب وغیرہ عوام کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں۔ لیکن ایک دفعہ جب

اکثریت عوام میں بیداری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ آلات جو سرمایہ داری گھڑتی رہتی
بے کار ہو جاتے ہیں (اینگلو امریکن بلاک حکومت ایران کو سویٹ روس کے مقا
میں لا چکا تھا۔ ادھر سویٹ روس عوام کو حکومت کے خلاف ابھار رہا تھا اور با
اینگلو امریکن بلاک کو شکست دینا چاہتا تھا۔ آخر چند چالوں کے بعد سویٹ رو
کا حریف مات کھا گیا۔ اور بُری طرح پٹ گیا۔ لیکن "دنیا بامید قائم"۔ ابھی ہاتھ پا
مار رہا ہے اور ہر ایک تنکے کا سہارا لے رہا ہے۔)

ان تاریخی واقعات نے ثابت کر دیا کہ "ختم نبوت" کا مفہوم واضح تر ہو رہا
ہر ایک حکومت خواہ دنیوی ہو یا دینی ختم ہو رہی ہے اور ختم ہو کر رہے گی۔ حکومتوں
جمہور عوام میں ہر ایک جگہ کش مکش جاری ہے۔ اور ہم ایک ایسے طوفانی د
سے گزر رہے ہیں۔ جس نے "جبال" کو متزلزل کر دیا ہے اور پستی ابھر رہی ہے
بلندی سے متصادم ہو رہی ہے۔ وقت کی آواز ہے کہ "فھل انتم مسلمون

اس بساطِ زندگی پہ کجروی اچھی نہیں
چال بیڈھنگی اگر مہرہ چلے تو مات ہے

ایران سے انگریز نکل چکے ہیں۔ مگر گفت و شنید ابھی جاری ہے۔ اور امریکہ
برطانیہ اور ایران میں ثالث کا کام سرانجام دے رہا ہے۔ ڈاکٹر مصدق آج کل ام
میں ہیں اور کھری کھری باتیں بھی سناتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک یہ ایک سیاسی غلطی
کہ ڈاکٹر امریکہ گیا۔ ممکن ہے کہ ایران کی کمزوری پر محمول کیا جائے۔ اور یہ کہ ڈاکٹر کی
موجودگی میں ایران میں برطانوی سیاست وہی چال چل سکتی ہے جو امیر امان اللہ
کی عدم موجودگی میں افغانستان میں چلی گئی۔ افغانستان میں تو مذہب کی آڑ
گئی ایران میں برطانوی ہوا خواہ غداران ملک و ملت موجود ہیں۔ اگر ان کو تقو
مل گئی تو یہ امریکی سفر رنگ لائے گا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا اسلام میں ا
حکومت کو انگلینڈ اور امریکہ میں کیا کشش نظر آتی ہے کہ ادھر ہی کھچے چلے جا
ہیں۔ کاش یہ کعبہ کی طرف رخ کرتے۔

عرب

عراق

عرب جو خلافت راشدہ اور امویہ اور عباسیہ کے تحت متحد تھا۔ ہمارے زمانہ میں یہاں طوائف الملوکی ہے۔ ان میں سے اکثر ریاستیں تو برطانیہ کی پیداوار اور برطانوی سیاست کے زیر اثر ہیں اور بعض اگرچہ خود مختار ہیں مگر ہر ایک حیثیت سے پس ماندہ ہیں۔ یہ قبائلی ریاستیں اپنے اپنے "شیوخ" کے ماتحت اتنی بات پر مطمئن ہیں کہ آزاد ہیں۔ ان کا ہاتھ ایک دوسرے کے خلاف دراز بھی رہتا ہے۔ لیکن یہ خانہ جنگی خاندانی عارضی تنازعات سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ "اتحاد عرب" کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اور وہ وقت دور نہیں جب تمام قبائل عرب پھر سے متحد ہوں گے۔ اہل عرب کی سرشت میں جذبہ حریت ازلی ہے۔ اگرچہ ترکی عثمانیہ عرب میں قائم ہو چکی تھی۔ مگر یہ ان کی آزادی میں کبھی رخنہ انداز نہ ہوئی۔ علاوہ ازیں ارض حجاز اور عراق میں مقامات مقدسہ ہیں جن کا احترام ترک بھی بحیثیت "مسلم" اتنا ہی ملحوظ رکھتے ہیں جتنا عوام کے دلوں میں ہے۔ اور ترکی حکومت نے کبھی عرب قبائل کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ ان کو انہی کے حال پر چھوڑے رکھا۔ عرب پر تسلط کسی دنیوی مفاد کے لئے ترکوں کا نہ تھا۔ بلکہ عربی قبائل کو اپنے ساتھ ملانے اور بالخصوص مقامات مقدسہ پر اخراجات کا بوجھ ان کے خزانہ پر بہت بھاری تھا۔

راقم الحروف جب پہلے جنگ عظیم کے اختتام پر ۱۹۱۹ء میں عراق میں گیا اور وہاں کے شیوخ سے ملا تو وہ اب ترکوں کو یاد کرتے تھے۔ اس وقت عراق میں انگریزی فوجی تسلط تھا اور انگریزوں نے دوران جنگ کے عرصہ کا مالیہ بھی ان سے وصول کیا۔ شیوخ نے مجھے بتایا کہ عثمانی حکومت کبھی وصولی مالیہ کے لئے سختی نہ کرتی تھی۔ اور قبائل امن و

کی وجہ سے کچھ ایسے "نادہند" واقع ہوئے تھے کہ دو تین سال کا بقایا مالیہ ترکوں کو معاف ہی کرنا پڑتا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا، جس کا اثر راقم الحروف نے بچشم خود دیکھا کہ عراق جیسا زرخیز علاقہ بھی ان ترقیات سے محروم رہا جو برطانوی مقبوضات میں عام تھیں۔ جن کا فائدہ اگرچہ برطانوی گورنمنٹ کو زیادہ تھا مگر محکوم اقوام بھی اس سے بہرہ ور ہو رہی تھیں۔ ریلوے لائن اور سلسلہ تار برقی کا کیا مذکور، سڑکیں بھی پختہ نہ تھیں۔ تعلیمی حالت اتنی پست تھی کہ میں جس سے ملا، پڑھنا لکھنا نہ جانتا تھا۔

ترکی حکومت اتنی غافل تھی کہ برطانوی حکومت کے اثر و رسوخ کے تحت عرب کے ساحلی قبائل آ چکے تھے۔ یہ سب برطانیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ جب جنگ عظیم کے شروع میں انگریزی بحری بیڑہ خلیج فارس سے "شط العرب" میں آیا تو یہ سب شیوخ انگریزوں سے آ ملے۔ اور جو بھی ترک سپاہی ملا، مارا گیا اور اس کا مال متاع لوٹ لیا۔

لیکن اب جبکہ برطانوی پنجہ کی گرفت سخت سے سخت تر ہو رہی تھی تو ان کو اپنا انجام بھی نظر آ رہا تھا۔ اور ان میں بے چینی کے آثار بھی نمایاں ہونے لگے۔

انگریزوں کا منشا تھا کہ عراق پر اسی طرح مستقل قبضہ ہو جائے جیسا کہ ہندوستان پر تھا اور ہندوستان پر قبضہ بلا مداخلت غیر اسی صورت میں ممکن تھا کہ عراق پر بھی ہو۔ لیکن یہاں ایک قوم آباد تھی۔ اور قوم جب تک غالب قوت سے فنا نہ ہو کبھی مسخر نہیں ہو سکتی جب حالات سازگار ہوں غیر قومی حکومت کا تختہ الٹ دیتی ہے۔ اہل عرب کو ترکوں سے آزادی کا سبز باغ دکھایا گیا تھا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ترک جو ان کے ہم مذہب بھی تھے نہ رہے تو ایک مسیحی یورپی حکومت ان پر مسلط ہو رہی ہے۔ تو قومی غیرت نے جھنجھوڑا۔

دوران جنگ میں صرف یمن کی حکومت "امامیہ" نے ترکوں کا ساتھ دیا۔ باوجود اس امر کے کہ ترکوں اور یمنیوں میں صدہا سال سے دشمنی تھی۔ اہل یمن فرقہ "زیدیہ" شیعہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ترک سُنی ہیں۔ لیکن اب جبکہ ترکوں کا مقابلہ مسیحی حکومتوں سے تھا۔ ان کی غیرت دینی نے گوارا نہ کیا کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اسی طرح علم بغاوت بلند کریں جس طرح سُنی شریف مکہ حسین نے کیا نہ صرف یہی بلکہ وہ انگریزوں سے لڑتے رہے اور سُنیوں نے انگریزوں کی مدد ترکوں

کے خلاف کی۔

حکومت یمن ۱۳۸۰ھ سے قائم ہے۔ اس حکومت کے حکمران "امام" سے موسوم ہیں۔ ہر ایک حکمران علم دین کا سب سے بڑا عالم اور مجتہد ہوتا ہے۔ اس لئے ان میں "امام" کا انتخاب حکمران امام کی وفات پر ہوتا رہا۔ لیکن اب حکومت وراثتاً منتقل ہو رہی ہے۔ پہلی عالمگیر جنگ میں امام سید یحییٰ حمید الدین نے جب خلافت عثمانیہ نے فتویٰ "جہاد" صادر کیا "لبیک" کہا۔ اس کی حکومت کا کچھ حصہ "عدن" تو پہلے ہی انگریز لے چکے تھے "لحج" وغیرہ بھی ہاتھ سے نکل گیا۔ یہاں انگریزوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قبائل کے شیوخ کے ماتحت قائم کر دیں۔ اور یہ سب انگریزوں کے وظیفہ خوار ہیں۔

عراق میں شیعہ آبادی کی اکثریت ہے۔ انہوں نے بھی امام یمن کی تقلید کی۔ یہاں سنی اور شیعہ اتحاد شروع ہو گیا۔ اور کسی مذہبی تقریب پر سنی شیعوں کی اور شیعہ سنیوں کی مساجد میں ایک دوسرے کی دعوت پر شریک ہوتے اور زیادہ تر سیاسی تقریریں نظم و نثر میں ان کے جذبات کو مشتعل کرتی رہیں۔ اور قوم اور ملت جس خطرہ میں مبتلا تھی اس کا احساس اب عوام میں بھی ہو رہا تھا۔ ایک جلسہ میں ایک نوجوان نے شرر افشاں تقریر کی انگریزوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ لوگ بھڑک اٹھے، بغداد کے کوچہ و بازار میں جمع ہو رہے تھے کہ انگریزی عسکری مظاہرہ نے ان کو پراگندہ کر دیا اور مارشل لاء (MARTIAL LAW) جاری ہو گیا۔

۱۹۲۰ء بہار کا موسم تھا کہ انگریز افسروں کی ازواج بھی انگلینڈ سے عراق میں وارد ہوئیں ایک کیمپ تو بغداد کے قریب اور دوسرا ایران کی ملحقہ پہاڑیوں میں کھولا گیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح دہلی اور شملہ ہے۔ اب لوگوں کو یقین ہو گیا کہ انگریز عراق میں مستقل قدم جمانا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی سپاہ کثرت سے موجود تھی۔ ۱۹۲۰ء میں ساٹھ ہزار انگریزی سپاہ عراق میں موجود تھی۔ جس میں صرف سات ہزار انگریز تھے۔ ان کے علاوہ ساٹھ ہزار اور بھی ہندوستانی تھے جو ملازمت کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے۔ ان کی موجودگی بھی عربوں پر شاق گزر رہی تھی۔ انگریز عربی سیکھ رہے تھے اور ہر ایک ہندوستانی کو بھی جو عربی میں روزمرہ بول

چال کا امتحان پاس کر لیتا ۔ دس روپیہ علاوہ تنخواہ کے الاؤنس ملتا چرچ آف انگلینڈ او
امریکن چرچ نے مدرسے کھولے ۔

اس وقت ہر ایک عرب کے پاس اپنی حفاظت کے لئے اسلحہ بھی تھے ۔ اگرچہ انگری
فوجی جمعیت میں تیس ہزار کا اور اضافہ کر دیا گیا جس میں اکثریت ہندوستانیوں ہی کی تھی مگ
ملک میں امن کی صورت ناممکن تھی ۔ جب تک عرب رعایا ہتھیار بند تھی ۔ دوران جنگ
عربوں کے ہاتھ جب عام لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم تھا ۔ بیشمار ہتھیار آ گئے ۔ اب انگریزی
حکومت نے ان کو نہتے کرنا شروع کیا ۔ مارچ ۱۹۲۰ء تک قریباً بیس ہزار "رائفل" ولا
بغداد اور بصرہ ہی میں جمع کی گئیں ۔ حکومت نے اعلان کر دیا کہ جس کسی کے پاس ہتھیا
پائے گئے سخت سے سخت سزا کا مستوجب ہو گا ۔ اب بغاوت عراق کے طول و عر
میں پھیل گئی ۔ لیکن اس میں ایک بڑی خامی یہ تھی کہ اس کا کوئی "قائد" نہ تھا ۔ اور اس لئے
منظم نہ تھی ۔

کوفہ خلافت اسلامیہ کے وقت بھی شورش کا مرکز رہا ہے ۔ اس کے قرب میں انگر
فوج پر حملہ ہوا ۔ مانچسٹر رجمنٹ کے اسی سپاہی عربوں نے قید کر لئے ، لڑائی میں بیس ۲۰ ما
گئے اور تین سو ساٹھ ۳۶۰ بری طرح زخمی ہوئے ۔ اگست میں کرنل لیچ مین ۔ COLONEL
LEACH, MAN) ۔ مارا گیا ۔ اس وقت کرنل اے ۔ ٹی ۔ ولسن (A. T. WILSON)
بغداد میں ہائی کمشنر تھا ۔ ۱۹۱۹ء میں جب وہ "قرنہ" میں ہوائی جہاز سے اترا (مجھے بھی
کا اتفاق ہوا) یہ شخص برطانوی حکومت تمام عراق میں قائم کرنا چاہتا تھا اور عربوں پر ذلت آم
سختی بھی اس کے دور حکومت میں شروع ہو گئی تھی ۔ سر پرسی کوکس (SIR PERCY COX
نے عنان حکومت سنبھال لی ۔ یہ شخص متحمل مزاج اور اعلیٰ پایہ کا مدبر تھا ۔ اس نے عربوں کو م
کیا ۔ ان واقعات کو ہم ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں ۔

بغاوت کا آغاز اصل میں شام سے ہوا ۔ اس میں "عرب مستنصرہ" یعنی مسیحی عربوں
بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔

۱۹۱۹ء میں جب میں "قرنہ" میں تھا ۔ ایک عرب مسیحی نظر بند ہو کر آیا ۔ وہ مجھے خود

آیا۔ اس کا نام "ادیب نارس تھا اور اس کا سلسلہ نسب جبلہ غسانی سے ملتا ہے۔ اپنا حسب و نسب اس نے مجھے خود بتایا۔ میں حیران ہوا کہ ایک عیسائی مسیحی حکومت کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے مجھے بتایا کہ میں عرب ہوں۔ ہم اس وقت سے مسیحی ہیں جب انگلستان کے نام سے بھی دنیا واقف نہ تھی۔ ہم انگلینڈ ہو یا فرانس یا کوئی اور غیر عرب طاقت ہو کسی کا اقتدار گوارا نہیں کر سکتے۔ اور اگر شریف حسین ذرا اپنے مطالبات پر اڑا رہا تو ان سب کو بوریا بستر باندھنا پڑے گا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ عربی زبان کی اشاعت شام میں سب عرب مستنصرو کے ہاتھ میں ہے۔ یہ نوجوان عرب عیسائی چند روز ہی "قرنہ" میں رہا۔ اس کو کسی نامعلوم مقام میں پہنچا دیا گیا۔

"قرنہ" پر فرات اور دجلہ کا قران یا اتصال ہوتا ہے۔ دونوں دریا مل کر "شط العرب" بنتے ہیں جو خلیج فارس میں گرتا ہے۔

کرنل لارنس (LAWRENCE) نے جو شام میں امیر فیصل کا مشیر تھا "لندن ٹائمز" (۳ جولائی ۱۹۲۰ء) میں ایک مقالہ شائع کیا۔ اس میں لکھا کہ ترکی حکومت عربوں کے حق میں بری نہ تھی۔ عربوں نے بغاوت محض آزادی کے لئے کی اور جنگ میں اتلاف جان اس لئے گوارا نہ کیا کہ ایک حاکم کی جگہ دوسرے حاکم کی حکومت تسلیم کریں گے۔ یہ امر کچھ تعجب انگیز نہیں کہ اختتام جنگ سے دو سال کے عرصہ میں ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ جو حکومت ہم نے قائم کی ہے وہ سرتاپا انگریزی ہے۔ چار سو پچاس انگریز امور انتظامیہ کے افسر ہیں اور ایک بھی عراقی نہیں۔ ترکی حکومت کے دور دورہ میں ستر فی صدی عراقی ہی افسر تھے۔ ہمارے ۸۰ ہزار لشکری اب پولیس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ سرحدوں پر متعین نہیں بلکہ لوگوں کے سر پر سوار ہیں۔ ترکوں کے زمانہ میں عراق میں دو آرمی کور (ARMY CORPS) میں ساٹھ فیصدی عراقی افسر تھے اور پچانوے عراقی سپاہی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہم عراقیوں کی خوش حالی کے لئے بہت کچھ کام کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں لیکن جب ترازو کے دوسرے پلڑے میں آزادی ہو تو اس خوشحالی کی کون پروا کرتا ہے۔

کرنل لارنس نے یہ بھی لکھا کہ عربی جگہ انگریزی پڑھائی جاتی ہے لیکن دفتری زبان

عربی ہی ہونی چاہیئے۔ اگر ہم حکومت کا کام عربوں ہی سے لیں تو ہماری ایک کوڑی (CENT) بھی خرچ نہ ہوگی۔"

ایک انگریز "میجر" نے "مانچسٹر گارڈین" (۲۴ جولائی ۱۹۲۰ء) میں لکھا کہ لارنس کی تجویز کے مطابق حکومت کا کام نہیں چلے گا۔ عربوں کو زیادہ تر اپنی ... کا فکر ہوتا ہے اب وہ تین گنا ٹیکس بہ نسبت ترکی ادا کر رہے ہیں۔ اس میں ... ہونی چاہیئے۔"

آخر تلخ تجربہ کے بعد انگریز اس فکر میں تھے کہ کس کٹھ پتلی کو عراق ... سپرد کی جائے جو عراقی تو نہ ہو مگر عراقی قبول کر لیں۔ قرعۂ فال امیر فیصل پر پڑا ... شریف حسین کا تیسرا بیٹا ہے اور یہ عراق کا پہلا بادشاہ ہے۔ لیکن فیصل معمولی د... دماغ کا آدمی نہ تھا۔ وہ تمام عرب قوم کو متحد کرنا چاہتا تھا۔ اپنے لئے شام کو عراق ... ترجیح دیتا۔ لیکن شام پر انتداب (MANDATE) فرانسیسیوں کا تھا۔ اور ... انگریزوں کے حلیف کو کب پسند کرتے۔ اگرچہ انگریز دل سے چاہتے تھے کہ فیصل ہی ... اور عراق کا بادشاہ ہو مگر وہ چھ خفیہ معاہدات جو دول یورپ میں ہو چکے تھے مانع ... ان خفیہ معاہدات کے ذریعہ برطانیہ اور فرانس اور روس اور اٹلی نے ترکی مملکت ... کے حصے بخرے کر لئے تھے۔ روس کو قسطنطنیہ فرانس اور روس کے معاہدہ ۱۹۱۵ء (FRANCO_RUSSIAN AGREEMANT) کے رو سے ملنا تھا۔ اور بحیرہ ... کا جنوبی علاقہ بھی مستزاد تھا۔ جس کی حدود معاہدہ ۲۶ اپریل ۱۹۱۶ء (SAZONOV_PALEOLOGUE) نے معین کر دیں۔ معاہدہ لندن TREATY OF LONDON جو اسی تاریخ اٹلی کے ساتھ ہوا اس کے رو سے اٹلی کو "عدلیہ" کا علاقہ مل گیا۔ ایک معاہدہ (St JEAU DE MAURIEVNE) جس کی تکمیل اگست ۱۹۱۷ء میں ہوئی ... کے متعلق تھا جو اٹلی کے حصہ میں آیا۔ وزیر اعظم انگلستان لائیڈ جارج (LLOYOD_GEORGE) اور صدر فرانس (CLEMENCEAU) میں جو معاہدہ ہوا اس کے ... سے موصل برطانیہ کا ہوا۔ شریف حسین ان معاہدات سے بے خبر تھا اور اس کو د...

متنبہ کیا۔ تو بہت سٹ پٹایا۔ مگر انگریزوں نے چکنی چپڑی باتوں سے رام کر لیا۔
یف کل ممالک عرب معہ شام وفلسطین کا مالک اپنے آپ کو سمجھتا تھا۔

دوران جنگ میں انگریزوں کی انتہائی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح موصل پر قبضہ
جائے۔ ان کا حلیف اور حریف روس بھی یہ چاہتا تھا کہ میں وہاں پہنچوں۔ روس تو
پہنچ سکا مگر انگریز ابھی موصل سے چھ میل کے فاصلہ پر تھے کہ اعلان عارضی صلح،
(ARMISTIC) ہوگیا۔ مگر انگریزوں نے موصل پر قبضہ کر ہی لیا۔ موصل "پٹرولیم" کی
پیداوار کی جگہ ہے۔

جنگ کے خاتمہ پر غالباً اتحادیوں میں پھوٹ پڑھ جاتی مگر امریکہ نے بیچ بچاؤ کر کے
بند کیا۔ ۲۰ مارچ ۱۹۱۹ء میں پیرس میں "چار بڑوں" کی کانفرنس ہوئی۔ روس کا نمائندہ
موجود نہ تھا۔ وہ خانگی خرخشوں میں الجھا ہوا تھا۔ جس کو "سویٹ" نے سلجھا دیا۔

شام کی حکومت کے لئے فیصل نے جدوجہد کی۔ پہلے لندن گیا۔ وہاں جواب ملا
برطانیہ کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ فرانس کا معاملہ ہے۔ پیرس میں آیا۔ ادھر سے مایوس ہوا
امریکہ کی طرف رجوع کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ ممالک متحدہ امریکہ کے تحت عرب
راء کی ایک "فیڈریشن" (CONFEDERATION) ہو اور اگر انتداب ہی منظور
ہے تو ایک طاقت کا ہو اور امریکہ کو ترجیح دی جب یہ بھی نہ ہوا تو قوم کی طرف متوجہ ہوا
۱۰ مارچ ۱۹۲۰ء میں شام اور فلسطین کے شرفا کی کونسل نے امیر فیصل کی
بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی شریف حسین کے دوسرے بیٹے عبداللہ
کو عراق کا بادشاہ نامزد کیا۔ لیکن برطانیہ اور فرانس نے یہ اعلان اور نامزدگی تسلیم
نہ کی۔ اور صاف لفظوں میں فیصل کو بتا دیا کہ ایسے امور کا تصفیہ اتحادیوں کے ہاتھ میں ہے
۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء میں اتحادیوں نے انتداب فلسطین اور عراق برطانیہ کو شام
فرانس کے حوالے کر دیا۔ فیصل دوران جنگ عظیم میں شام جنرل "ایلن بی" (ALLENBY)
کی مدد سے فتح کر چکا تھا۔ اور اس کی رہائش دمشق ہی میں تھی۔ ممکن ہے کہ دریں وہ
انگریزوں کی اخلاقی حمایت اسے حاصل ہو۔ اس نے شام پر فرانس کا انتداب تسلیم

نہ کیا۔ اور ادھر اُدھر سے فوج جمع کر کے فرانسیسی فوج کے مقابلہ کے لئے نکلا جو دمشق پر قبضہ کے لئے آ رہی تھی۔ مگر شکست فاش کھائی۔ اور یہاں سے نکلنا پڑا۔

جنرل ایلن بی کی فوج میں اکثر سپاہی اور افسر عراقی تھے اور ان میں اکثر بغدادی تھے۔ عرب ممالک میں اتحاد عرب کی لہر دوڑ چکی تھی۔ جب شام میں یہ خواب پریشان ہو کر رہ گیا تو اس تحریک کا مرکز "بغداد" بن گیا۔

عراق اور شام میں بہت فرق ہے۔ فیصل اس لئے شام کو ترجیح دیتا تھا کہ یہاں کے لوگ زیادہ تر مہذب اور متمدن اور تعلیمیافتہ ہیں اور جو منصوبہ وہ اتحاد عرب کا باندھ چکا تھا۔ اس کی تکمیل یہیں خوش اسلوبی سے ہو سکتی تھی۔ اتحاد عرب کا تصور اس کے ذہن میں اتنا ہی تھا کہ خاندان شریف کل ممالک پر جہاں عرب آباد ہیں حکمراں ہو اور اس طرح "خلافت" تمام دنیائے اسلام پر اسی خاندان کی تسلیم کی جاتی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر ایسی صورت ہوتی تو تمام دنیائے اسلام اطمینان کا سانس لیتی۔ خاندان شریف صحیح النسب سید ہے مذہباً سُنی ہے۔ لیکن سادات پرست شیعہ تسلیم کر لیتے۔

فیصل اپنے باپ کی طرح انگریزوں کے وعدوں پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ اختتام جنگ کے بعد یہ وعدے ضرور پورے کریں گے۔

دماغ بیہودہ پخت وخیال باطل بست

بغداد میں ایک ادارہ ۱۹۱۳ء سے قائم تھا جو "احد العراقی" کے نام سے موسوم تھا اس کا مقصد وحدت عراق عرب تھا۔ اس ادارہ میں چند عرب ترکی فوج میں اختتام جنگ تک افسر رہ چکے تھے۔ ۱۹۱۸-۱۹۱۷ء میں جب فیصل شام میں برطانیہ امداد کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ یہ ادارہ یا یہ عرب افسر عراق کی آزادی کے لئے سرگرم عمل تھے۔ اور ان کی غرض بھی یہی تھی کہ خاندان شریف کے تحت عراق کے تمام عربی قبائل کو لایا جائے۔ متارکہ (ARMISTICE) کے بعد فرات کے کنارہ "دیر الزور" ان کی سرگرمی کا مرکز تھا۔ شام میں بھی عراقی موجود تھے ان سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔ اور شامی بھی

ان کو انکسار ہے کہتے کہ شامیوں سے مل کر "پروپاغنڈا" (PROPAGANDA) کریں تاکہ عرب کو آزادی حاصل ہو۔

اس ادارہ نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ شام میں عرب نے بزور شمشیر اپنا حق آزادی فرانس سے حاصل کیا ہے اور اسی طرح تلوار سے ہم مجبور کر سکتے ہیں کہ عراق کا حق آزادی تسلیم کر لے۔ لیکن جب شام میں فیصل کو شکست فاش ہوتی تو ان کی سرگرمی پر بھی اوس پڑ گئی۔

۳۰ مئی ۱۹۲۰ء میں برطانیہ عظمیٰ نے اعلان کر دیا کہ عراق پر انتداب اس نے قبول کر لیا ہے۔ جس کی غرض یہ ہے کہ بتدریج عراق کو منزل آزادی پر برطانیہ کی رہنمائی پہنچا دے اس خبر گرم نے پھر سے عربوں میں ایک حرارت پیدا کر دی۔ اور "اتحاد اسلامی" کی برقی رو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ گئی۔ مذہبی مناقشات اور شرانگیز تفرقہ جو فرقہ بندی نے پیدا کر رکھا تھا "وحدت اسلامی" کے تصور نے محو کر دیا۔ سنی اور شیعہ ایک دوسرے کو گلے لگا رہے تھے۔ نجف اور کربلا اور کاظمین شیعہ مجتہدین کے مرکزی مقامات تھے۔ سب سے پہلے یہیں "وحدت اسلامی" کا وعظ مجلسوں میں کرنے لگے۔ یہ برقی رو صرف عراق میں محدود نہ تھی ایران میں بھی برطانیہ کے خلاف ایک جوش پیدا ہو گیا۔ جس کا فائدہ رضا شاہ نے ایران کو پہنچایا۔ شیعہ مجتہدین اور سنی علماء نے فتویٰ "جہاد" آب و تاب کے ساتھ شائع کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا جس کا مذکور ہم کر چکے ہیں۔

جزائر برطانیہ میں انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ شامل ہیں۔ ان ممالک متحدہ کی متحدہ طاقت کا اگر جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ تمام کرہ ارض پر انگلستان کی حکومت کا کیا راز ہے۔ یہ راز خود انگریزوں سے پوشیدہ نہیں۔ انہیں اپنی کمزوری کا بخوبی احساس ہے۔ انگلستان کا رقبہ اور آبادی ہندوستان کے ایک احاطہ بمبئی کے برابر ہے۔ غور کرنا چاہیئے کہ ایک احاطہ بمبئی تمام دنیا کیا تمام ہندوستان پر بھی حکومت نہیں کر سکتا۔ اس کے امکان کی ایک ہی صورت ہے۔ یہ تاریخی صداقت ہے کہ اقلیت متحدہ ہی اکثریت متفرقہ پر غالب آتی ہے۔ ایک ملک میں خواہ ایک قوم آباد ہو جب اس میں لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہوں تو ان کی اکثریت اقلیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

"سیلے" اپنی کتاب وسعت انگلستان (PANSION OF ENGLAND
میں لکھتا ہے کہ :۔

"ہم نے ہندوستان کو اپنی ذاتی طاقت کے بل پر مسخر نہیں کیا۔ ہمیں اس "برصغیر
پر قبضہ جمانے کا سہل گر معلوم ہوگیا تھا۔ ہم نے ہندوستانی سپاہ اور ہندوستانی مال و
دولت کو ہندوستانیوں کے خلاف استعمال کیا۔ مرہٹوں کو نظام دکن کے خلاف
اور دونوں کو ٹیپو سلطان کے مقابلہ میں لا کھڑا کیا۔ شمالی ہند کے خودمختار نوابوں
اور راجوں کو لڑایا اور اپنا الو سیدھا کیا"

ظاہر ہے کہ جہاں یہ حالات ہوں، اور ایشیائی ممالک میں یہ حالات عام تھے۔ ا
انگریزوں کی حکومت ممکن ہوگئی۔ روپیہ پیسہ جائز یا ناجائز تجارت سے وہ انہی لوگوں کی
ور مشقت سے کما رہے تھے اور انہی پر اس کا کچھ حصہ محکومی اور غلامی کی زنجیریں گھڑنے پر
کر رہے تھے۔ لیکن جب ایک دفعہ ان غلام قوموں میں سیاسی شعور پیدا ہوگیا تو اس
سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ پیٹ اور دنیوی عزت کے بھوکوں کو روپیہ سے اپنا آلہ کار بنایا جائے
اور ابنائے وطن کو نظر بند کر دیا جائے۔ اور اگر یہ تحریک زور پکڑ جائے تو وہ احساس کمزوری جو
انگریز کو لاحق ہے انہیں مجبور کرتا ہے کہ پیچھے ہٹیں اور دیکھیں کہ یہ اتحاد ایک فوری جوش کا
ہے کہ دیرپا ہے۔ بسا اوقات یہ اتحاد افراد اور قوموں میں ذاتی اقتدار پر مبنی ہوتا ہے جو اپنا
مقصد حاصل کر لیتی ہیں تو ان میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس آگ کو انگریز خود بھی ا
مفاد کے لئے ہوا دیتا ہے۔ اور بسا اوقات اس خانہ جنگی میں کمزور فریق اغیار کی امداد کا
ہوتا ہے۔ اسی وقت کا انگریز منتظر رہتا ہے۔ جب اسے مداخلت کا موقعہ مل جاتا ہے۔ تو کم
فریق کو ایک گونہ تقویت اس کے زعم ناقص میں حاصل ہو جاتی ہے وہ غالب آتا ہے۔ غالب
فریق تو نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ خود بھی انگریز کی گرفت میں آ جاتا ہے۔

انگریز کا سیاسی تدبر اس کمزوری کو شدت سے ہمیشہ محسوس کرتا رہا ہے اور جب
اس کا احساس اس روباہ مسکین کو ہے اس کی کامیابی یقینی ہے وہ کبھی تنہا کسی قوم سے جو بر
کی چوٹ ہو نہیں لڑا ہمیشہ دو تین حلیف اس کے دست دبا ور ہے اس کے سیاسی

اور یہی چاہیئے کہ ہمیشہ اپنے حلیف اقوام کے یہ ذہن نشین کرتا رہا کہ زیادہ تر انہی کے مفاد
لیئے دشمن سے لڑتا ہے۔ اس لیئے وہی انگریزوں کی لڑائی میں پیش پیش رہے اور یہ پھر
اپنا پہلو بچاتا رہا۔ اختتام جنگ کے بعد اس کے حلیف اور دشمن تو کمزور ہوتے جاتے ہیں
لیئے یہ ہر لحاظ سے فائدہ میں رہتا ہے۔ دشمن تو ختم ہو گیا۔ حلیف بھی کبھی سر اٹھانے کی طاقت
نہیں رکھتے۔

اول جنگ عظیم کے اسباب خود انگریزوں نے پیدا کیئے۔ جرمنی ہر ایک لحاظ سے ترقی
کر رہا تھا۔ برطانوی سیاسی تدبر اس کو ایک طرف نیچا دکھانا چاہتا تھا اور دوسری طرف اقوام
یورپ بالخصوص فرانس اور روس کو بھی کمزور کرنا چاہتا تھا۔ دونوں حریف تھے۔ جب ترک جنگ
عظیم میں جرمنی کے ساتھ ہو گئے تو وزراء انگلستان کا پرانا منصوبہ "ترکوں کو یورپ سے خارج
کرنا چاہیئے" اب تکمیل پذیر ہونے لگا۔ روس چاہتا تھا کہ قسطنطنیہ پر اس کا قبضہ ہو تاکہ بحیرہ روم
میں اس کا بھی دخل ہو۔ اور اٹلی گذشتہ رومی شان و شوکت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ فرانس
کچھ علاقہ "ایل سیس" (ALSASE) اور "لورین" (LORAINE) جرمنی پہلے ہی دبائے
بیٹھا تھا۔ اب اس کو اور بھی خطرہ پیدا ہو گیا۔ غرض یہ جنگ شروع ہو گئی۔

کرنل "لارنس" عرصہ سے شریفی خاندان سے ساز باز کر رہا تھا۔ اس نے علم بغاوت بلند
کر دیا۔ عربوں کی قیادت امیر فیصل شام میں کر رہا تھا۔ جنگ ختم ہوا۔ اتحادی مظفر و منصور
اب لوٹ پر ٹوٹ پڑے اور عرب منہ دیکھتے رہ گئے۔ لیکن شریفی خاندان انگریزی بساط سیاست پر
ایسا مہرہ تھا۔ اگر یہ پٹ جاتا تو انگریز بھی پٹ جاتے۔

انگریز نہایت دور اندیش واقع ہوا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ فیصل شام کے
عربوں میں ہر دلعزیز ہے۔ وہ اپنی آزادی کا علمبردار اسے یقین کرتے۔ اور خود فیصل معمولی دل و
دماغ کا آدمی نہیں۔ اور شامیوں میں سیاسی شعور پیدا ہو چکا ہے۔ فیصل کی قیادت میں وہ کیا
کچھ نہیں کر سکتے اگر ایک دفعہ عرب اتحاد ہو گیا تو "اتحاد اسلامی" (PAN ISLAMISM)
بھی مشکل نہیں۔ لیکن برطانوی بساط پر سر دست فیصل ہی ایک مہرہ تھا جس کو کرنل "لارنس" سا
شاطر آگے بڑھا رہا تھا۔ اس کی تہ میں ایک اور سیاسی غرض بھی تھی کہ اگر فرانس شام پر تابض

تو ممکن ہے کہ وہ اپنی گذشتہ عظمت حاصل کر لے۔ جس کو انگریز خاک میں ملا چکا تھا۔ اس لئے شام پر فرانس کا اقتدار بھی ایسا ہی خطرہ تھا جیسا اتحاد اسلامی۔ اس جھگڑے کو نپٹانے کے لیئے بیغرض امریکہ کا صدر "ولسن" ثالث مقرر ہوا تھا۔

ایک کمیشن امریکہ کی تحریک پر شام کا دورہ کر رہا تھا۔ اس کو کنگ۔ کرین کمیشن (KINGE-CRANE COMMISSION) کہتے ہیں۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ قبائل عرب کی کیا رائے ہے وہ کس کو اپنا قائد یا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ اس بارہ میں شام اور عراق کے عربوں کی ذہنیت کا جائزہ لیا گیا۔ فیصل نے بھی ایک عرضداشت (MEMORANDAM) پیش کی۔ جس کی تحریر میں کرنل لارنس کا ذہن رسا کارفرما تھا۔ اس کی وضاحت "رابرٹ گریوز" (ROBERT-GRAVES) نے اپنی کتاب "لارنس اور مہمات عرب" (LAWRENCE AND-ARABIAN ADVEUNTURES) میں کی ہے۔

عراق میں بغاوت پھوٹ چلی تھی۔ سید طالب شاہ "حضرت محی الدین غوث اعظم" کے متولی کے حق میں جس کو "نقیب بغداد" کہتے ہیں، بغداد اور اس کے گرد و نواح میں کر چکا تھا۔ اور اب جنوب میں دورہ کر رہا تھا۔ ہائی کمشنر نے گرفتار کر کے لنکا میں نظر بند کر دیا۔ اب فیصل کو بھی شریفی خاندان کے اقتدار میں خطرہ نظر آنے لگا۔ کئی دعوے دار کھڑے ہو سکتے تھے اور موجود تھے۔ لیکن نقیب شریف کی طرح حکومت کا بھوکا نہ تھا یہ اس وقت کونسل آف سٹیٹ (COUNCEL OF STATE) کا صدر تھا۔ "سر پرسی کاکس" ہائی کمشنر کے ایماء پر یا عوام کی خواہش کے مطابق اس نے ۲۱ جون ۱۹۲۱ء میں فیصل کی شاہی عراق کا اعلان کر دیا۔ بشرطیکہ "اعلیٰ مرتبت کی حکومت آئینی اور آئین میں محدود جمہوریت کی نمائندہ حکومت ہو" لیکن یہ چند افراد کا فیصلہ تھا جس کو برطانوی حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ اس لئے دنیا کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لیئے عام استصواب رائے کا ڈھونگ بھی کھڑا کیا۔ اور ملک کی کمیٹیوں سے دریافت کیا گیا کہ کونسل کا فیصلہ انہیں منظور ہے؟ سب کو منظور تھا۔ لفٹیننٹ کرنل فرمینٹل (LIEUTENANT COLONEL FREMENTLE) عراق میں رہ چکا تھا وہ ان حالات سے بھی خوب واقف تھا۔ اس نے دارالعوام (HOUSE OF COMMONS)

میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ :-

"سیکرٹری آف سٹیٹ نے جو روئیداد دوبارہ انتخاب اس ایوان میں پڑھ کر سنائی ہے میں نے آج تک دار العوام میں اس سے بڑھ کر لچر تقریر نہیں سنی۔ کیا اس کا مقصد یہ نہیں کہ دنیا جہاں کو یہ بتایا جائے کہ جو کچھ ہم نے کیا وہی درست ہے؟ ناخواندہ مشرق کی جانے بلا کہ اس کے گرد و پیش کیا ہو رہا ہے۔ جو کچھ ہم نے کیا وہ بہترین ہی سہی اور امید ہے کہ بہتر ہی نتیجہ ہوگا۔ مگر برائے خدا اس جھوٹ کو تو فروغ نہ دو۔ کہ یہ جمہوریت کا تقاضہ ہے۔ مشرقیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔"

(پارلیمنٹ مباحثات جلد ۱۵۱ صفحہ ۸-۱۵۹۷)

اس استصواب رائے میں "کرکوک" کے کردوں اور سلیمانیہ کے ترکوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ اگرچہ انہوں نے فیصل کی امارت تسلیم نہیں کی مگر کوئی اور دعویدار بھی پیش نہیں کیا۔ ۹۶ فی صدی رائے فیصل کے حق میں فیصلہ کن ثابت ہوئی۔

۲۳ اگست ۱۹۲۱ئہ کو رسم تخت نشینی دھوم دھام سے منائی گئی۔ کرد اور ترک شریک نہ ہوئے۔ غالباً اس لئے کہ عرب نہ تھے۔ اعلیٰ حضرت برطانیہ شہنشاہ جارج خامس کی طرف سے تار تہنیت پڑھا گیا اور شاہ فیصل نے بھی ایک فصیح تقریر کی کہ :-

"خدا کا شکر ہے کہ پھر سے اسی شہر میں جو خلافت عباسیہ کا پایہ تخت صدہا سال رہا ہے۔ بنو فاطمہ کو اپنی وراثت ملی۔"

اور حکومت برطانیہ کو یقین دلایا کہ :-

"عراق اور برطانیہ کے تعلقات اب مضبوط بنیاد پر قائم ہو چکے ہیں۔"

یہ سب کچھ ہوا۔ اور برطانیہ کی عین حکمت عملی کے مطابق ہوا۔ لیکن عراقیوں میں "چہ میگوئی" قہوہ خانوں کوچہ و بازار اور مختلف تقریبوں میں شروع ہو گئی۔ کہ انتداب (MANDATE) کیا بلا ہے؟ اور اس کے تحت برطانیہ سے ہمارے تعلقات کیسے

ہوں گے؟ ہائی کمشنر کو بھی اس نئی "سیاسی اصطلاح" کی تشریح بذریعہ اعلان کرنی پڑی کہ اس کا مفہوم وہی کچھ ہے جو عربی میں لفظ "متولی" ہے جو نابالغ کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔ اور اس کی تعلیم و تربیت بھی کرتا ہے اور اس کے مال میں اسی کے مفاد کے لئے تصرف بھی کرتا ہے جب وہ عاقل و بالغ ہو جاتا ہے تو تولیت ختم ہو جاتی ہے۔ عراق ایک طاقت و دولت کے بغیر ترقی نہیں کر سکتا۔ اور یہ طاقت برطانیہ نہیں بلکہ "لیگ آف نیشن" (LEAGUE OF NATION) ہے۔ اس کی نمائندہ عراق میں برطانوی حکومت ہے۔ اور اسی نے برطانیہ کو عراق کی تولیتی سپرد کی ہے اور برطانیہ اس اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ جب عراق اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ تو برطانوی افواج عراق خالی کر دیں گی۔ اور یہ "منڈیٹ" ختم ہو جائے گا۔ یہ منڈیٹ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک معاہدہ ہے جس کی رو سے برطانیہ نے تولیت کی خدمت اپنے ذمہ لی ہے

اگر عربوں کو یہ کہا جاتا ہے کہ منڈیٹ وہی "ذمہ" ہے اور تم مجلس اقوام متحدہ کے تحت وہی "ذمی" ہو جس سے تم پہلے ہی واقف ہو تو غالباً اس کی تشریح کی ضرورت نہ ہوتی۔

اب نابالغ عراق کو جلد بالغ اور اس کے ساتھ عاقل بننے کی فکر لاحق ہوئی تاکہ عراق سے برطانوی افواج کا انخلا جلد ہو۔ انخلاء کے بارہ میں "سر پرسی کوکس" نے اپنی رپورٹ میں وضاحت کی کہ:۔

> "انخلاء ناقابل خیال امر ہے۔ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ہم نہ صرف "منڈیٹ" سے دست بردار ہو جائیں بلکہ سات آٹھ ملین (MILLION) کا سرمایہ جو اس ملک میں لگا چکے ہیں اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔ مکمل انخلاء کی ایک ہی صورت ہے کہ ہمارے جانے کے بعد ملک میں خانہ جنگی نہ ہو اور اس صورت میں ہمیں ایک اور ڈویژن فوج کی ضرورت ہوگی جو اس کی تکمیل تک یہاں رہے۔"

۱۴ رجون ۱۹۲۱ء میں مسٹر چرچل صدر نے ایک بیان دار العوام میں دیا کہ:۔

"عراق کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ اس پر ہمارا قبضہ مقدم بلاواسطہ ہمارے دیگر مقبوضات کے لئے اہم ہے۔ ہندوستان کی مدافعت ہندوستان کی حد پر بخوبی ہو سکتی ہے۔ عراق مصر کی طرح نہیں ہے جس کو ہم نے اپنے مفاد (INTEREST) کے لئے چھوڑ نہیں سکتے۔ عراق میں ہماری حکمت عملی یہی ہے کہ اپنی ذمہ داری کے بوجھ سے سبکدوش ہوتے جائیں اور عرب گورنمنٹ سے ایسے تعلقات استوار کریں کہ وہ ہماری دوست بنی رہے اور فرانس کی بھی۔"

فرانس کی پھبتی مسٹر چرچل نے اس لئے لگائی کہ امیر فیصل کے متعلق فرانسیسی پریس شور مچا رہا تھا کہ اس کا ارادہ شام کی تسخیر کا ہے۔ اس کی تردید مسٹر چرچل نے کر دی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ "امیر فیصل کو تو اس کا بھی افسوس ہے کہ ایک ناخوشگوار حادثہ شام میں پیش آیا تھا" یہ اشارہ اس لڑائی کی طرف ہے جو امیر فیصل نے فرانس سے لڑی تھی۔

بعض انگریز مدبرین کی یہ رائے تھی کہ اگر ہم عراق خالی کر دیں تو ہمارے وقار کو کوئی ٹھیس نہیں لگے گی۔ ہم نے آئرلینڈ بھی تو خالی کر دیا تھا۔ بعض کی یہ رائے تھی کہ خلیج پر ہمارا قبضہ بالاستقلال ہندوستان کی حفاظت کے لئے ضروری ہے۔ اگر عراق خالی ہی کرنا ہے تو اس سے ایسی مفاہمت ہونی چاہیئے کہ خلیج میں ہمارے حقوق میں کوئی مداخلت نہ کر سکے۔ موصل کا تیل بہت قیمتی شے ہے۔ اس کا بھی خیال رہے۔

ایک واقف کار برٹش افسر نے ۱۹۲۲ء میں کہا تھا کہ ہر ایک تحریک جو برٹش کے خلاف ہوتی ہے۔ اس کا سرچشمہ مقدس مقامات نجف اور کربلا ہی ہوتے ہیں۔ "کربلا پر نجدی وہابیوں کے ایک گروہ نے حملہ کر دیا۔ یہ ایک ڈاکہ تھا یا فی الحقیقت وہابیوں کا مذہبی جنون کارفرما تھا ایک راز ہی رہا۔ مگر شیعہ مجتہدین اس کا انتقام لینے کے لئے جمع ہوئے اس مجلس میں یہ اعلان کیا گیا کہ یہ سب انگریزوں کی شرارت ہے وہ ہم میں فرقہ وارانہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں اور عوام کے مذہبی جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔

فساد انہی کے تنخواہ دار بیٹھو برپا کرتے ہیں اور بدنام مذہب ہوتا ہے۔ اس لیے ہر
کا فرض ہے کہ ان سے قطع تعلق کر لے۔

یہ حربہ جو ہندوستان میں ہمیشہ کارگر ثابت ہوا۔ یہاں کام نہ آیا۔ "منڈیٹ"
خلاف ملک کے طول و عرض میں غیظ و غضب کا اظہار ہو رہا تھا۔ ۲۳ راگست ۱۹۲۲ء
کو شاہ کی برسی پر "مسر پرسی کوکس" شاہ کو مبارکباد دینے کے لئے جب آستانہ قصر
سے گذرا۔ لوگوں کے ہجوم سے جو باہر جمع تھا ایک شور اٹھا "منڈیٹ کی دھجیاں
دو" شاہ انگلستان کے ایک نمائندہ کی سخت توہین ہوئی۔ فیصل نے معذرت
اور ٹھنڈا کیا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ "منڈیٹ" ختم کیا جائے اور اس
جگہ ایک عہدنامہ مرتب کیا جائے۔ نام بدلا مگر حقیقت نہ بدلی۔

ایوان حکومت میں اس مجوزہ عہدنامہ کی شرائط پر بحث کرتے ہوئے کہا
"عراق میں ہمارے مصارف دوران جنگ بعد از جنگ ....۳۵ پونڈ ہو
ہیں"

لارڈ سیسل (LORD CECIL) نے سوال کیا "اور ان وظائف پر کیا
جو شیوخ کو دیئے؟"

چرچل نے کہا کہ "اس رقم سے کم ہوتے ہیں۔ جس کا مطالبہ میں نے گزشتہ جو
میں کیا تھا۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ انسان کو سوچنا چاہیئے کہ زر سے کام لے یا
فولاد سے۔ بعض اوقات زر سے بہت کام لیتے ہیں اور فولاد سے سستا پڑتا
اور شریف حسین اور ابن سعود کی چپقلش میں زر نے وہ کام کیا جو فولاد سے ممکن نہ تھا

مسٹر چرچل نے یہ بھی کہا کہ "ہم منڈیٹ ترک کرنے میں حق بجانب نہیں
ایک عہدنامہ اگر ہو تو منڈیٹ کی غرض بھی پوری ہو سکتی ہے"

چنانچہ ایک عہدنامہ پر ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۲۲ء میں دستخط ہو گئے کہ "عراق لیگ آف
نیشن میں آجائے تو منڈیٹ ختم ہو جائے گا" اس عہدنامہ کی شرائط میں ایک
شرط یہ بھی تھی کہ عراق میں برطانیہ کا نمائندہ ایک ہائی کمشنر اور اس کا عملہ اور ضرو

فوج بھی رہے گی جو عراقی گورنمنٹ کو اندرونی اور خارجی معاملات میں مشورہ بھی دے گی اور اس کے اختیارات وہی کچھ ہوں گے جو منڈیٹ کے دوران میں تھے۔

عراقی کونسل آف سٹیٹ نے جس کا صدر اعظم نقیب بغداد تھا اس عہدنامہ کی تصدیق سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ "آئندہ انتخاب کے بعد جو کونسل مقرر ہوگی وہ جس طرح چاہے فیصلہ کرے۔ لیکن اس میں کچھ قباحت نہیں اگر آئندہ انتخاب تک اس معاہدہ کا عارضی نفاذ رہے۔"

اب نئے انتخاب کی مہم شروع ہو گئی۔ ووٹر کی فہرست قریباً مکمل ہو گئی تھی۔ مگر کربلا اور کاظمین کے مجتہدین نے متفقہ فتویٰ شائع کیا کہ "کوئی عراقی اس میں حصہ نہ لے۔" ادھر کرکوک کے کرد اور سلیمانیہ کے ترک پہلے ہی اس کے خلاف تھے یہ سب سُنی تھے۔ کمال پاشا کی فتوحات کا چرچا ہو رہا تھا اور وہ برطانیہ سے کردستان کی واپسی کا مطالبہ بھی کر رہا تھا جو اس کے ہم قوم تھے۔

عہدنامہ کی میعاد جو بیس سال مقرر کی گئی تھی اب مجبوراً برطانیہ نے میعاد چار سال کر دی۔ شاہ اور رعایا بھی مطمئن ہو گئے۔ نیا ہائی کمشنر سر ہنری ڈوبس، (SIR HENRY DOBBS) نے لوگوں کو یقین دلایا کہ "برطانوی گورنمنٹ عراقی حکومت کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دے گی بلکہ صرف دوستانہ تعلقات قائم رکھنا چاہتی ہے۔"

اب استصواب رائے کی مہم دوبارہ شروع ہو گئی۔ پھر شیعہ مجتہدین نے فتویٰ شائع کیا کہ "کوئی مسلمان اس میں حصہ نہ لے۔" کاظمین میں ایک مجتہد اور اس کے دو بیٹوں کو جلاوطن کیا گیا۔ نجف اور کربلا کے اکثر مجتہد ایران چلے گئے۔ شاہ فیصل نے مناسب خیال کیا کہ عوام کو سمجھائے کہ اس قسم کی شورش بے فائدہ ہی نہیں بلکہ حکومت عراق کے لئے مضر بھی ہے۔ "موصل" میں ایک فصیح تقریر کی اور کردوں اور ترکوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:۔

"ترک مومن مسلمان ہمارے بھائی ہیں اور ان کی خوشحالی ہماری

خوش حالی ہے متنازعہ سرحدات کا تصفیہ باہمی گفت و شنید سے بخیر و خوبی ہو جائے گا۔ تم اپنے نمائندے مجلس میں منتخب کرو تا کہ تمہارے شہری حقوق کی حفاظت ان کے ذریعہ ہو سکے۔"

کرد اور ترک راضی ہو گئے۔ دوسرا دورہ جنوب کی طرف بھی کامیاب رہا۔ شیعہ بھی مطمئن ہو گئے۔ کابینہ میں ان کو دو وزارتیں دی گئیں۔

شاہ نے مجلس کا افتتاح کیا اور اپنی تقریر میں ایک پتہ کی بات کہی کہ "قوانین شریعت اسلام میں شوریٰ کی مشاورت سے بنتے ہیں۔" وامرھم شوریٰ بینھم"

اس کا مفہوم واضح ہے کہ فقہی احکام سب وقتی اور ہنگامی، خارجی اور ذہنی حالات کے مناسب وضع ہونے چاہئیں۔ ان کا وضع اور واضح کرنا قرآن نے شوریٰ کے عقل و فہم پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ ہمیشہ ترمیم اور تنسیخ کی زد میں رہیں گے۔ اور ان کی کوئی مستقل حیثیت اسلام میں نہیں۔

معاہدہ جو حکومت عراق اور برطانیہ میں ہوا اس کی تصدیق اب مجلس نے کرنی تھی۔ اس پر گرم گرم تقریریں ہوئیں۔ مجلس کی متفقہ رائے تھی کہ شرائط دربارہ ذمہ داری ادائیگی اخراجات جو برطانیہ کے حق میں واجب الادا ہیں نہ صرف سخت ہیں بلکہ عراق کے لئے ناقابل برداشت ہیں۔ مجلس التوا ہوتی رہی۔ اور اب برطانوی سیاسی حلقوں میں یہ یقین پختہ ہو رہا تھا کہ مجلس معاہدہ مسترد کر دے گی۔ آخر جائز و ناجائز وسائل بروئے کار آئے۔ اور سینتیس ۳۷ آرائے حق میں اور چوبیس ۲۴ مخالف اور ۸ آٹھ غیر جانبدار شمار ہوئیں۔ شاہ فیصل نے ۱۰ر نومبر اور شاہ برطانیہ نے بھی ۱۲ر دسمبر ۱۹۲۴ء کو مہر تصدیق ثبت کر دی۔

موصل

دوران جنگ عظیم میں برطانیہ نے موصل پر قبضہ کر لیا تھا اور "پیٹرولیم" میں وہ کشش تھی کہ برطانیہ ہر ایک قیمت پر اسے اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اِدھر مجلس عراق میں معاہدہ پر بحث ہو رہی تھی اُدھر ترکی کو کس

قسطنطنیہ میں ترکی اور عراق حدود کے تعین کے لئے ترکی گورنمنٹ سے گفت وشنید کر رہا تھا جو بے نتیجہ رہی اور تصفیہ لیگ آف نیشن کی کونسل پر آ رہا جس نے فیصلہ عراق اور اور پس پردہ برطانیہ کے حق میں کر دیا کہ موصل عراق کی حدود میں رہے گا۔

برطانیہ" بلکہ بحر ہے اس کے "روغن سوز" بحری کشتیوں کے لئے "پٹرولیم" کی اشد ضرورت تھی۔ اپنا تفوق قائم اور بحال رکھنے کے لئے تیل کے چشموں پر اس کا قبضہ" جنت تجری من تحتہا الانہار" تھا۔ اور یہ مقامات تھے۔ ایک کا مذکور ہم ایران کے حالات میں کر چکے ہیں اور دوسرا موصل ہے۔ جنگ عظیم سے پیشتر موصل کے تیل کے لئے ابتدا میں آسٹریا کے ایک باشندے "ولیم ناکس ڈارسی" (WILLIAM KNOX D'ARCY) نے ترکوں سے کچھ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ تو ۱۹۰۹ء میں ایران میں کوشش کی اور کامیاب ہو گیا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس نے جو مراعات ایران میں حاصل کی تھیں۔ وہ آخر" اینگلو پرشین آئل کمپنی میں منتقل ہو گئیں۔

موصل میں ڈارسی کے حریف" رائل ڈچ شیل آئل کمپنی" (ROYAL DUCH SHELL-OIL CO:) - اور جرمنی تھے۔ ایک انگریز "سرارنسٹ کیسل" (SIR EREST CASSEL) جرمنی میں پیدا ہوا تھا اس لئے بلحاظ جائے ولادت اور قومیت جرمن بھی تھا اور انگریز بھی۔ اس کی سعی سے برطانیہ اور جرمنی کی ایک کمپنی کی تشکیل ہوئی جس کو "ٹرکش پٹرولیم کمپنی" (TURKESH - PETROLEUM CO:) سے موسوم کیا گیا۔ اس پر اینگلو پرشین آئل کمپنی کا ضبط و دخل رہا اس کے بارہ میں معاہدہ پر ۱۹ر مارچ ۱۹۱۴ء کو دستخط ہو گئے مگر جنگ عظیم نے ترکی کی تصدیق نہ ہونے دی۔ انگریز فتح مند دونوں کمپنیوں کا مالک رہا۔ اگر کونسل آف لیگ" موصل ترکوں کے حوالے کر دیتی تو حالات بدل جاتے۔ مگر" لیگ آف نیشن" کا تصور خواہ" جنرل سمٹس" کے ذہن میں پیدا ہوا یا امریکہ نے اسے عملی جامہ پہنایا ایک روایتی انگریزی سیاسی چال ہی تھی۔ کہ اپنے مفاد کے لئے زیادہ سے زیادہ حلیف پیدا کرے۔ اس کے مقبوضات ہندوستان وغیرہ اور نو آبادیات کو کونسل میں نمائندگی حاصل تھی اور اس لئے اکثریت اسی کے حق میں تھی۔

اس لئے یہ کہنا کچھ بے جا نہیں کہ "لیگ کی قیادت اس کے ہاتھ میں تھی۔ اور لیگ کا کوئی فیصلہ اس کے منشا کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ موصل ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر عراق میں شامل ہو گیا۔ جس پر حکومت امیر فیصل کے نام پر برطانیہ کی تھی ۔

جب اول عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا برطانیہ نے جزیرہ "آبادان" پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح تیل کے چشموں اور پائپ لائن اور ریفائنری کی حفاظت بھی ہو گئی۔ خلیج فارس میں برطانوی برطانوی بحری بیڑہ کی موجودگی ضروری سمجھی گئی ۱۹۱۵ء یعنی دوران جنگ میں "ڈچ شیل" نے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر "ہیگ" (HAGUE) سے اپنا مستقر لندن میں منتقل کر لیا۔ اب برطانیہ ہی تمام آئل کمپنیوں کا مرکز بن گیا۔ اختتام جنگ کے بعد "لنکاسٹر ہاؤس" (LANCASTER HOUSE) میں ان کے نمائندگان کی ایک کانفرنس ہوئی۔ دعوت ضیافت کی تقریب پر ۲۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو "لارڈ کرزن" نے اپنی تقریر میں کہا کہ :۔

"یہ تیل کی لہریں ہی تھیں جن پر اتحادی بہتے ہوئے ساحل مراد کے کنارے لگے ہیں "

اس لئے اگر برطانیہ کی حکومت سمندروں کی موجوں پر آئندہ قائم رکھنا مقصود تھا۔ تو اسے تیل کی شہنشاہیت پر بھی قبضہ رکھنا مطلوب تھا۔ اگرچہ تیل کے چشموں پر برطانیہ کا قبضہ بلا شرکت غیرے ہو گیا۔ اور ڈچ اور فرانسیسی بھی اس لئے مطمئن ہو گئے کہ تقسیم میں ان کو پچیس ۲۵ پچیس ۲۵ فی صدی مل گیا مگر امریکہ رضامند نہ تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ برطانیہ تیل کے چشموں کا واحد مالک بننا چاہتا ہے ۔ اب برطانیہ اور اس کے حلیف ڈچ اور فرانس ایک طرف اور امریکہ دوسری طرف تیل پر جھگڑنے لگے یہ اقتصادی جنگ تھا۔ ان واقعات کو اگر اچھی طرح ذہن نشین کیا جائے۔ تو آئندہ متوقع جنگ عظیم کے اسباب میں سے ایک "پٹرولیم" بھی سبب ثابت ہوگا۔ کئی کانفرنسوں اور طویل گفت و شنید کے بعد برطانیہ نے "ٹرکش پٹرولیم کمپنی" کے حصہ پچاس فی صدی کا نصف دے کر امریکہ کو سردست رضامند کر لیا مگر اس کا مطالبہ یہی رہا کہ ہر ایک ملک اور قوم کے لئے اس کی تجارت کا دروازہ کھلا رہے ۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں ترکی جمہوریہ کی تشکیل نے اقوام یورپ اور امریکہ میں اور بھی سیاسی الجھنیں پیدا کر دیں ۔

"لوزان" (LAU SAUNE) میں لارڈ کرزن اور عصمت پاشا نمائندہ ترکیہ میں جو جھڑپیں ہوئیں ان کا تذکرہ موجودہ ترکی کے حالات کے مناسب ہے جہاں تک موصل کا تعلق ہے "کرزن" اس بات پر زور دیتا رہا کہ "لیگ" نے عراق بشمول موصل کا "منڈیٹ" برطانیہ کے حوالے کر دیا ہے۔ عصمت کا جواب یہ تھا کہ "ترکیہ کو اس کا علم نہیں کہ "منڈیٹ" انگلینڈ کو دیا گیا ہے اور چونکہ تا حال قانوناً عراق عثمانیہ سلطنت ہی کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے کوئی معاہدہ "منڈیٹ" کے بارہ میں ترکی کے لیئے قابل قبول نہیں جو اس کی عدم موجودگی میں کیا گیا ہو۔ علاوہ ازیں کونوینٹ" (CONEVENT) کی دفعہ ۲۲ کی صریحاً خلاف ورزی ہوئی ہے کہ اس علاقہ کے لوگوں سے استصواب رائے (PLEBECETE) نہیں کیا گیا کہ وہ برطانوی منڈیٹ پر رضا مند بھی ہیں؟" کرزن کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ حق فتح کو بطور دلیل پیش کرتا۔ کہا کہ "برطانیہ چار سال سے عراق پر قابض ہے" عصمت نے زہر خندہ کرتے ہوئے کہا کہ "اس صدی میں حق فتح کو بطور برہان پیش کرنا انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تمام مہذب ممالک کی رائے عامہ اس دلیل کو جو "ہز لارڈ شپ" (HIS LORDSHIP) نے پیش کی ہے کچھ وقعت نہیں دے گی۔ اور بالفرض محال اگر اس ہی لیا جائے تو برطانیہ نے موصل کو دوران جنگ اور متارکہ کے اعلان سے پہلے فتح نہیں کیا تھا۔ اس لئے حق فتح بھی بطور دلیل پیش نہیں ہو سکتا۔"

عصمت بار بار استصواب رائے پر زور دیتا تھا اور کہتا رہا کہ "اس نواح کے لوگوں کی عام خواہش یہی ہے کہ موصل کا الحاق ترکیہ سے ہو اور برطانیہ اس سے واقف ہے اور ڈرتا ہے کہ اگر استصواب رائے ہوا تو ترکیہ کے حق میں ہوگا۔"

(پاکستان اور بھارت میں مسئلہ کشمیر بھی اسی صورت کا ہے)

"کرزن" نے قومیت کرد پر بھی بحث کی کہ وہ ترک نہیں اور آخر اقتصادی زاویہ نگاہ سے کہا کہ اس کا الحاق عراق سے ہی مناسب ہے۔" جب عصمت نے اس کا بھی معقول جواب دیا۔ تو آخر لیگ آف نیشن کی ثالثی کی تجویز پیش کی۔ عصمت نے انکار کر دیا۔ وہ لیگ کی حقیقت سے خوب واقف تھا۔ اس پر کرزن نے کہا کہ "جب دلائل سے کام نہیں چلتا تو برہان قاطع یعنی تلوار ہی فیصلہ کرتی ہے۔ اس کا سدباب دفعہ ۱۱ میں موجود ہے کہ لیگ کو جب یہ

خطرہ محسوس ہو تو امن عالم کے لئے وہ جو بھی مناسب ہو اقدام کر سکتی ہے۔ جب گفتگو
اس مرحلہ پر پہنچی تو جاپان اور فرانس اور اٹلی کے نمائندگان نے عصمت سے درخواست
کی کہ لیگ کی ثالثی منظور کر لے۔ عصمت نے صاف انکار کر دیا۔ امریکہ ترکی کے مطالبہ
کا حامی رہا لیکن "کشادہ دروازہ" (OPEN DOOR) کی حکمت عملی جس پر امریکہ زور
دیتا رہا۔ ناکام ہو کر رہ گئی۔ جب برطانیہ نے بحر الکاہل میں جہاں امریکہ کا اقتدار تھا
کا مطالبہ کیا۔ آخر برطانیہ نے لیگ کی طرف رجوع کیا۔ اور لیگ نے ترکی نما
طلب کیا۔ ایک کمیشن کا تقرر ہوا جو "قضیہ زمین برسر زمین" کا تصفیہ حالات کے
کے بعد اپنی رپورٹ پیش کریگا۔

بغداد میں کمیشن وارد ہوا تو اکابر کو شہادت کے لئے طلب کیا گیا۔ برطا
عسکری قبضہ عراق پر تھا۔ اور حکومت کٹھ پتلی تھی۔ عوام میں جوش حد سے بڑھا ہو
اور ہر ایک گواہ کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کہ اگر حکومت عراق کے خلا
کچھ کہا تو عوام تکا بوٹی کر دیں گے۔ اور اگر عوام کی خواہشات کا احترام کیا تو حکومت
نہ چھوڑے گی۔ بعض گواہوں کی حالت انتہائی قابل رحم تھی۔ دبی زبان سے ترکی کے
میں اور بلند آواز میں حکومت عراق کے حق میں رائے دی۔ شہر میں ہڑ بونگ مچی ہوئی
حکومت کی طرف سے سپاہ نے ضبط قائم کر دیا۔

(اگر مسئلہ کشمیر بھی اسی طرح حل ہوا تو ــــــ باید دید)

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں ولایت موصل میں کرد = ۴۹۴۰۰۷۔ اور عرب
۱۶۶۹۴۱۔ اور ترک = ۳۸۶۵۲۔ مسیحی = ۶۱۳۳۶۔ یہودی = ۱۱۸۹۷۔ یزیدی =
۲۶۲۵۷۔ مردم شماری ۲۴-۱۹۲۳ء کی بنا پر واضح کئے۔ کرد نہ تو ترک ہیں اور نہ
البتہ موصل میں ترک حقیقی ترک ہیں۔ ترکمان نہیں۔ جیسا کہ کرزن کا دعویٰ تھا۔
"یزیدی" کی اصل نامعلوم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم آدم کی اولاد ہیں اور باقی دنیا آدم اور
کی نسل ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ "نوح" کے بیٹے ہیں اور اس کی زوجہ یا ازواج
نسل سے نہیں۔ ان کی زبان تو کردی ہے مگر مقدس کتب عربی میں ہیں۔ وہ تو

اور انجیل اور قرآن پر ایمان رکھتے ہیں مگر تینوں سے الگ ہیں۔ یہودی نہ مسیحی نہ مسلم۔
اس کمیشن کی رپورٹ کی تفصیل ہماری بحث کا موضوع نہیں۔ مختصر یہ کہ کمیشن نے سفارش کی کہ موصل عراق کی ملکیت قرار دیا جائے۔ رپورٹ پیش ہوئی تو ووٹ لئے گئے جس میں برطانیہ اور ترکی شامل نہ تھے۔ بالاتفاق موصل حکومت عراق کے حوالہ کیا گیا کمال پاشا نے یہ فیصلہ تسلیم نہ کیا اور کہا کہ:۔

"موصل ترکی کا ہے اور سنگینیں بھی اسے ہم سے جدا نہیں کرسکتیں"

لیگ کا فیصلہ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ہوا اور اتاترک کمال پاشا نے ترکی فوجوں کو سرحد پر جمع کرنا شروع کر دیا۔ ترکی اخباروں نے لیگ آف نیشن کو برطانیہ کا پٹھو قرار دیا۔ اور لکھا کہ برطانیہ نے اس کو اپنا آلہ کار بنایا ہے"۔

روس نے کہا کہ:۔

"اگر جنگ چھڑ گئی تو روس لیگ کا ساتھ نہ دے گا۔ لیگ کو امن قائم کرنا چاہیئے تھا نہ کہ ایسے حالات پیدا کرے کہ قوموں میں جنگ چھڑ جائے"

لیکن کمال پاشا کی حکومت نے جب دیکھا کہ برطانیہ اور سیاسی چل رہا ہے تو دب گئی۔ اپریل ۱۹۲۶ء میں مسولینی طرابلس میں گیا اور برطانیہ سے وعدہ کیا کہ "اگر ترکی نے لیگ کا فیصلہ منظور نہ کیا اور موصل پر فوج کشی کی تو میں اناطولیہ پر حملہ کر دوں گا"۔ یونان کے حصہ میں تقسیم جدید کی رو سے "تھریس اور سمرنا" نامزد ہو چکے تھے۔

(یہ سیاسی چال وہی ہے جو لارڈ مونٹ بیٹن نے مسئلہ کشمیر کے متعلق اختیار کی کہ اگر پاکستان نے کشمیر پر حملہ کیا تو افغانستان پاکستان پر کر دیگا۔)

ترکوں کے ہاتھ سے موصل نکل گیا۔

عراق کے بارہ میں برطانیہ کا یہ خیال تھا کہ یہاں کے لوگ آزادی کا مطالبہ کرتے تھے اور یہ کہ ان کو مل گئی۔ ان کا اپنا بادشاہ، اپنی مجلس دستور ساز، ان کی اپنی سپاہ اور سب سے بڑھ کر لیگ کی رکنیت وہ اور کیا چاہتے ہیں۔

صدر اعظم سر عبدالمحسن بیگ نے ۱۳ نومبر ۱۹۲۹ء میں خودکشی کی۔ اپنے بیٹے کو

خودکشی کی وجہ لکھتا ہے کہ :-

"قوم مجھ سے خدمت کا مطالبہ کرتی ہے لیکن برطانوی حکومت مانع ہے - اور ہمارے مطالبات کو ٹھکرا دیتی ہے"

شاہ فیصل کا انتقال بھی ۸ ستمبر ۱۹۳۳ء میں ہوگیا - پچاس سال عمر پائی - شاطر برطانیہ کا یہ مہرہ تھا جو اس کی بساط سیاست پر کئی خانوں میں کام آیا - آخر عراق میں پٹ گیا - انیس سالہ "غازی" فیصل کا جانشین ہوا - برطانیہ نے جو کام باپ کے دور دورہ میں مکمل نہ کیا - توقع ہے کہ "پسر تمام کند"

لیکن حالات سرعت سے بدل رہے ہیں - ایک طرف مصر اور دوسری طرف ایران اور درمیان میں اتحاد عرب - دیکھئے کیا صورت اختیار کرتے ہیں - اس کا اثر عراق پر بھی پڑے گا -

قرآن میں مذکور ہے کہ ہر ایک قوم دو زندگیوں اور دو مسرتوں کے دور سے گزرتی ہے - جب ان کی کش مکش سے گذر کر آگے آتی ہے اگر سنبھلی گئی تو اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جو پہلے دو دوروں سے بالکل مختلف ہوتا ہے - برطانیہ دو دوروں سے گزرا اس لئے اسلام کے خلاف بدترین دشمنی کا مظاہرہ کیا اور ہر ایک سیاسی حربہ استعمال کیا اور روادار کرتا رہا اسلام مدافعت کرتا رہا - اب اسلام کی باری ہے -

شام لبنان فلسطین

پیشتر اس کے کہ ہم "جزیرۃ العرب" کے دیگر ممالک نجد اور حجاز اور یمن اور عسیر وغیرہم کے حالات بیان کریں سلسلۂ واقعات قائم رکھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شام اور لبنان اور فلسطین کا ذکر کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام ممالک میں "امم سامیہ" ہی قدیم الایام سے آباد تھیں جن کا مورث اعلیٰ سام بن حضرت نوح ہے۔ قبائلی تقسیم کے بعد ان ممالک کی تقسیم بھی ہوئی تھی۔ خلافت راشدہ اور اموبہ اور عباسیہ کے تحت یہ سب ایک مرکزی حکومت کے تحت آگئے۔ پایہ خلافت مدینہ منورہ اور دمشق اور بغداد تھا۔ لیکن جب خلافت قریش میں ضعف آگیا تو طوائف الملوکی نے ان ممالک کی تقسیم در تقسیم کے بعد سرداران قبائل کی خود مختار یا نیم خود مختار حکومتیں قائم کر دیں۔ آل چنگیز نے عملاً خلافت عباسیہ ختم کر دی۔ اس کے بعد ترکوں کو عروج حاصل ہوا تو ان میں سے آل عثمان نے شام اور لبنان اور فلسطین پھر سے اپنی مرکزی حکومت میں لے لیا۔ اس کا پایہ تخت قسطنطنیہ تھا۔ عرب کے ساحلی علاقہ حجاز اور یمن اور عراق پر عثمانی ترکی حکومت تھی مگر مضبوط نہ تھی۔ اندرون ملک عرب کے قبائلی نجدی وغیرہ نے برائے نام ترکی سیادت قبول کر لی تھی لیکن خود مختار تھے۔

جنگ عظیم اول کے بعد پھر سے جزیرۃ العرب اور شام اور لبنان وغیرہ میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ان میں سے اکثر کی تشکیل برطانیہ عظمیٰ کے تحت ظہور پذیر ہوئی۔

عراق کے حالات ہم بیان کر چکے ہیں۔ اب شام وغیرہ کے حالات سلسلہ وار

بیان کرتے ہیں۔

فلسطین شام ہی کا ایک ساحلی حصہ ہے۔ لیکن سیاسی اغراض کی وجہ سے اس کو علیحدہ تصور کیا گیا ہے۔ جزیرۃ العرب اور اس ملک شام بشمول فلسطین میں یہ فرق نمایاں ہے کہ موخر الذکر کا تعلق بیرونی ممالک کی اقوام سے قدیم الایام سے رہا ہے اور جزیرۃ العرب کا غیر عرب اقوام سے میل جول کبھی نہیں رہا۔ شام میں مغربی اور مشرقی ثقافت (CULTURE) کا جو اثر ہوا وہ جزیرۃ العرب میں نہ تھا جہاں قبائل اب بھی بدویانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ شام میں شام سے اہل شام کو ان کی املاک زرعی اور رہائشی نے وابستہ کر رکھا تھا لیکن عرب میں اکثر قبائل نقل مکانی کے عادی تھے۔ بصرہ اور قرنہ کے درمیان ایک مقام "دیر الراہب" ہے۔

اول جنگ عظیم کے اختتام کے بعد ۱۹۱۹ء میں میرا مقام اسی جگہ تھا۔ میرے تعلقات یہاں کے شیوخ سے دوستانہ تھے۔ ایک دن ایک شیخ "عبدالعلی" مجھے تنہائی میں ملا۔ یاد رہے کہ آبادی کی اکثریت شیعہ ہے۔ میں ان پر واضح کر چکا تھا کہ میرا تعلق کسی فرقہ سے نہیں میں سیدھا سادہ مسلم ہوں۔ ملۃ ابیکم ابراھیم وھو سمکم المسلمین۔

اس نے مجھ سے رازدارانہ کہا۔ آپ بھی مسلم ہیں میں بھی مسلم ہوں۔ تقاضاء اخوت یہ ہے کہ آپ مجھے بتائیں کہ انگریز کا کیا ارادہ ہے؟ انھوں نے ہمارے ساتھ وعدہ کامل آزادی کیا تھا مگر اب میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کی نیت میں خیر نہیں اور آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ یہ خنزیر کپتان "ملی" (اسوقت قرنہ میں پولیٹیکل ایجنٹ تھا) ہمارے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ ہم اس ذلت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں ہمارا رکھا ہی کیا ہے۔ چند کھجوروں کے باغات اور کائی کی جھونپڑیاں۔ ہم ارادہ کر چکے ہیں کہ سب کچھ چھوڑ کر اندرون ملک میں چلے جائیں۔ آپ ہمیں برادرانہ مشورہ دیں کہ ہم یہاں رہیں یا اپنے ارادہ پر عمل کریں۔

میں نے اسے واضح الفاظ میں بتایا کہ "انگریز جہاں ایک دفعہ قدم جمالیں وہاں سے پھر نہیں ہٹتے۔ لیکن مناسب یہی ہے کہ

"مرغ زیرک چوں بدام رفت تحمل بایدش"

آپ ذرا صبر اور تحمل سے کام لیں اگر آپ یہاں سے گئے تو انگریز یہاں غیر عرب اقوام کو بھی بسا سکتے ہیں۔ یہ زمین نہایت سرسبز اور آب و ہوا ہمارے پنجاب سے بھی کہیں خوش تر ہے۔ واقعات اللہ کے فضل و کرم سے کچھ ایسے رونما ہو رہے ہیں کہ اگر آپ لوگوں میں اتحاد اور اتفاق رہا تو آپ کی آزادی میں رخنہ نہ پڑے گا۔

یہ شیخ نسبتاً زیادہ املاک کا مالک تھا اور اس کا اثر و رسوخ بھی یہاں نسبتاً زیادہ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر علم سے بھی کچھ لگاؤ تھا۔ ایک دفعہ میں نے اس سے دریافت کیا۔ کہ آپ لوگوں نے ترکوں کو کیوں ترک کیا جو آخر مسلمان تھے اور غیروں سے رشتہ جوڑا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "ترک ہمیشہ ہم سے الگ ہی رہے۔ وہ اپنے آپ کو حکمران سمجھتے رہے اور ہم میں محکومی کی ذلت کا احساس تھا۔ انگریزوں کے وعدوں پر اعتبار کیا۔ اور خیال کیا کہ ان کی مدد سے ہم آزاد ہو جائیں گے۔" اس کے بعد دبی زبان میں کہا کہ "بدوز طمع دیدۂ ہوشمند۔ انگریزوں نے روپیہ یہاں پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ ہم سب ان کے وظیفہ خوار ہی تھے۔" میں نے کہا کہ "آپ دانہ پر گرے اور جال میں پھنس کر رہ گئے۔ اب تحمل سے کام لیں۔" یہ تاریخی باتیں سبق آموز ہیں۔ بالخصوص مسلمانوں کے لئے جن میں غدار عام ہیں۔

جسے "آزادی" کہتے ہیں۔ صحیح معنی میں جزیرۃ العرب کے بدوی ہی اس سے آشنا تھے۔ جسے تہذیب و تمدن سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ نا واقف تھے مگر اہل شام اس کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ شام میں عرب قوم پرست (NATIONALISTS) تھے جن کی یہ خواہش تھی کہ عرب کا وہ حصہ جو عثمانیہ حکومت کے تحت ہے خود مختار ہو جائے لیکن خود مختاری کوئی بازاری شے نہیں جس کی خرید و فروخت ہو رہی ہو۔ مناسب ذرائع سے مقصد حاصل ہوتا ہے ان میں سے بعض کی یہ رائے تھی کہ یہ مقصد اعلیٰ برطانیہ یا امریکہ کی مدد سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ دوسرے اپنے زور بازو پر اعتماد رکھتے تھے بعض کی یہ رائے تھی کہ ایک متحدہ عرب سٹیٹ (STATE) کا امکان نہیں۔ اس لئے شام اور فلسطین اور لبنان کی علیحدہ علیحدہ سلطنتیں کی جائیں ان میں تعلقات برادرانہ ہوں۔ لیکن سب کم و بیش ترکی حکومت کے مخالف تھے۔ جس نے بدقسمتی سے "اتحاد تورانی اقوام"

کا نیا ڈھونگ کھڑا کر رکھا تھا۔ اس نے اسلامی رشتہ اخوت تو منقطع کر دیا اور نسلی امتیازات کی شرانگیز تفریق پیدا دی۔

قوم پرستی کے جذبات تعلیم یافتہ طبقہ اور کاروباری آدمیوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق حکومت سے تھا موجزن تھے۔ شام میں ان کے ادارے ہر ایک جگہ سرگرم عمل تھے۔ ان میں سے "الفتات" نے دیگر عرب ممالک سے بھی تعلق پیدا کر لیا تھا۔ عراق میں "الاحد البغداد" بھی یہی کچھ کر رہا تھا۔ مصر اور امریکہ میں شامی بکثرت تھے۔ ان کے ذریعہ بھی قوم پرستی کی اشاعت ہو رہی تھی اور سب سے بڑھ کر شریفی خاندان کے سربرآوردہ شریف حسین کی حمایت بھی حاصل تھی۔ شریف حسین ارض حجاز میں مقدس مقامات کا متولی تھا۔ عبدالعزیز ابن سعود نجد میں خود مختار حکمران تھا۔ وہ بھی اس کے زیر اثر آگیا۔ لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی وہ بھی عربوں کے دوش بدوش حصہ دار بن گئے۔ مگر ان دونوں میں فرق اتنا تھا کہ عرب مسلم تو ضرورۃً برطانیہ یا امریکہ کو ترجیح دیتے تھے اور لبنانی فرانس سے وابستہ رہنا چاہتے تھے۔ لیکن دونوں شامی اور لبنانی آزادی میں مشترکہ مفاد کا احساس رکھتے ہوتے ایک دوسرے کے معاون تھے۔

بیرونی ممالک میں سے فرانس کا اثر ورسوخ شام میں زیادہ تھا بالخصوص مسیحیوں پر۔ فرانس کا سرمایہ اور مسیحی مشن، مدرسے، کیتھولک فرقہ سے روایتی تعلق اسی امر کے مقتضی تھے کہ فرانس اپنا اقتدار شام پر جمانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی شمالی افریقہ میں اس کے مقبوضات کا تحفظ بھی شام سے وابستہ تھا۔ دراصل تمام یورپ کی نظر بحیرہ روم پر لگی ہوئی تھی۔ ملکہ بحر برطانیہ کا اس پر واحد اجارہ دار تو نہ تھا مگر اقتدار اعلیٰ ضرور تھا۔ افریقہ اور شام کے ساحلی علاقہ پر قبضہ محض بحیرہ روم کے تجارتی راستہ کے لئے مدنظر تھا۔ اور یوں بھی شام سے بڑھ کر تجارتی منڈی اور کیا ہو سکتا ہے جہاں "دودھ اور شہد موج مارتے ہیں"۔ برطانیہ عظمیٰ ہر ایک قیمت پر بندرگاہ "حیفہ" کو اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہندوستان کا تحفظ عراق اور موصل اور ایران کے تیل کے اجارہ داری کے لئے کم از کم خلیج فارس اور خلیج کے عربی قبائل کی حکومتوں پر بھی دسترس

تھے۔ لیکن عراق اور شام کا ایک طرف اور شام اور مصر کا دوسری طرف چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے شام اور سویز کے دوسری طرف مصر میں کسی غیر حکومت کی مداخلت برطانیہ کے سیاسی اغراض کے منافی تھی۔ عرب پر برطانیہ اپنا اثر و رسوخ قائم کر چکا تھا۔ شامی عرب کو بھی اسی کے تحت لا رہا تھا۔

صیہونی (ZIONIST) تحریک شروع ہو چکی۔ یہود فلسطین کو اپنا گھر سمجھتے تھے اور داؤد اور سلیمان کی شان اور عظمت ان کے دل سے محو نہ ہوئی تھی۔ ان میں بعض کی یہ رائے تھی کہ یہود کرہ ارض کے مختلف اقطاع میں پھیلے ہوئے ہیں۔ قومی شیرازہ بکھرا ہوا ہے۔ ان کو ارض فلسطین کی طرف ہجرت کرنی چاہیئے۔ مال و دولت کی کمی نہیں یہاں املاک خریدیں اور کاروبار کے لئے یورپ اور امریکہ میں بھی اپنی جائداد برقرار رکھیں۔ فلسطین میں ان کی اکثریت سے صورت حال خاطر خواہ پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نظریہ پر عمل بھی شروع ہو گیا تھا یہ مفکرین عبرانی زبان کے احیاء کے بھی حامی تھے۔ لیکن ایک اور جماعت بھی تھی جو اول الذکر نظریہ کی مخالف تو نہ تھی مگر اس کا مطالبہ یہ تھا کہ یہود کے شہری حقوق کے تحفظ کی کچھ ضمانت بھی ہونی چاہیئے۔ حکومت عثمانیہ سے یہ مطالبہ کیا گیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس لئے اب ان کی نگاہ و دل یورپ اور امریکہ کی طرف اٹھی جرمنی میں یہود کا اثر زیادہ تھا اور اسی سے زیادہ توقع تھی۔ مگر جنگ عظیم نے "یہ توقعات جو جرمنی اور یہود کو ایک جیسی تھیں ختم کر دیں"

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس لئے یہود نے برطانیہ عظمیٰ سے اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔

برطانیہ اور شریف حسین میں ایشیائی عرب ممالک کے بارہ میں گفت و شنید ہو رہی تھی۔ "سر ہنری میکموہن" (SIR HENRY McMAHON) اس وقت مصر میں برطانیہ کی طرف سے ہائی کمشنر تھا۔ شریف حسین کے مطالبہ پر اس نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو لکھا کہ:۔

"میں حضرت اعلیٰ شاہ انگلستان کی طرف سے حتمی وعدہ کرتا ہوں کہ شام کے بعض حصص جو دمشق اور حمص اور حلب کے غرب میں واقع ہیں۔ ان میں ہمارے حلیف فرانس کا بھی مفاد مشترک ہے اس لئے ان کے علاوہ تمام

عرب ممالک جہاں عربی زبان بولی جاتی ہے آزاد متصور ہوں گے "
شریف کا مطالبہ قائم رہا اور آخر یہ طے پایا کہ اختتام جنگ پر ان کا بھی تصفیہ جائے گا۔ یہ تصفیہ جیسا کچھ ہوا ہم "ارض حجاز" کے تحت بیان کریں گے۔
برطانیہ کا تعلق صیہونی اداروں سے بھی قائم ہو چکا تھا۔ ان میں جو گفت وشنید ہوئی اس کا نتیجہ وہ مکتوب ہے جو خارجی سیکرٹری (FOREIGN SECRETERY) مسٹر بلفور (BALFOUR) نے جو بعد میں "لارڈ" ہو گئے۔ لارڈ روتھ شیلڈ (ROTH SCHILD) کو لکھا ہے۔ اسے اعلان بلفور (BALOUR DEELARATION) سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں اس امر کی وضاحت کی گئی کہ "برطانیہ عظمیٰ یہودیوں کے لئے ارض فلسطین میں قومی گھر (NATIONAL HOME) پسند فرماتا ہے اور اس غرض کی تکمیل کے لئے پوری کوشش بھی کرے گا۔ لیکن یہ امر بھی اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیئے کہ غیر یہود کے حقوق جو فلسطین میں ان کو ضرر کسی قسم کا نہ ہوگا۔ اور نہ اس کا اثر ان حقوق پر ہوگا جو یہود کو دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔
نومبر ۱۹۱۶ء میں شریف کی شاہی حجاز کا اعلان ہو چکا تھا۔ اس اعلان بلفور نے بدل کر دیا۔ جنگ جاری تھا اور شریفی خاندان اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا۔ شریف کا تیسرا بیٹا فیصل عرب کی قیادت شام میں کر رہا تھا۔ جنگ کا خاتمہ ہوا تو برطانیہ نو جانتا تھا کہ جنگ جس غرض سے لڑی گئی اور اس کی تکمیل جنگ کی مشکلات سے بھی مشکل تر ہے۔ اس لئے شریف حسین کو یقین دلایا گیا کہ تمام عرب دنیا کا اتحاد برطانیہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ اور عربوں کی آزادی ہی کی خاطر یہ سب کچھ ہوا اور ہو رہا ہے۔
۵ جنوری ۱۹۱۸ء میں مسٹر لائیڈ جارج صدر اعظم نے اعلان کیا کہ:-
"ہمیں ترکوں کے قومی گھر سے تو کچھ تعرض نہیں البتہ عرب اور آرمینیہ اور عراق اور شام اور فلسطین ہماری رائے میں اس امر کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ انکی علیحدہ قومیت کی شان بحال رہے "
یہ شان کس نوع کی ہوگی اس کا ذکر اعلان میں نہیں کیا گیا۔
اس اعلان کے تین دن بعد امریکہ کے صدر جمہوریہ ولسن (WILSON) کے رسوا عالم

چودہ نقاط" (FOURTEEN POINTS) میں یہ بھی مذکورہ اعلان شائع ہوا کہ:۔

"عثمانیہ شہنشاہیت موجودہ کو یقین دلایا جائے کہ اس کی سیادت،
(SOVEREIGNTY) محفوظ رہے گی لیکن غیر ترک اقوام کو جو اب تک ترکوں
کے ماتحت ہیں یہ بھی یقین دلایا جاتے کہ ان کو موقعہ دیا جائے گا کہ وہ بلا مداخلت
غیرے خود مختاری حاصل کریں۔"

اسے جنگ آزادی کہئے یا کچھ اور، شیخ سعدی کا ارشاد بالکل صحیح ہے کہ

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت

شریف حسین کو جلدی ہی معلوم ہو گیا کہ وہ جس بہشت کا خواب دیکھ رہا تھا اس نے بالآخر اسے دوزخ کے دروازے پر کھڑا کر دیا۔

ہمیں اس جنگ آزادی کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اگرچہ واقعات جنگ جسے اب شام کہتے ہیں اس کی حدود سے باہر ہی عموماً رونما ہوئے مگر اس میں شامیوں کا بھی حصہ تھا۔ ان میں سے اکثر وہ تھے جو ترکی فوج میں کام کر رہے تھے یا کر چکے تھے۔ یہ اپنے بھائی عربوں سے آملتے، قوم پرستوں نے صحرائے شام کے بدوی قبائل کو بھی برانگیختہ کیا اور اپنے ساتھ ملالیا۔ اور اس طرح اتحادیوں کے لئے شام کی تسخیر ایک سہل سی بات بن گئی ترک ان کا مقابلہ کس کس محاذ پر کرتے۔ امیر فیصل اپنی محافظ فوج کے ساتھ اکتوبر ۱۹۱۸ء میں دمشق میں داخل ہو گیا۔ اور یہاں اس کی شاہی کا اعلان بھی ہو گیا۔ لیکن یہ شاہی چند روزہ ہی تھی۔ فرانس نے ان معاہدات کا انکار کر دیا جو برطانیہ نے شریف حسین سے باندھے تھے جس میں فرانس شریک نہ تھا اگرچہ اس کو ان کا علم تھا۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ فرانس سے امیر فیصل کی جھڑپ بھی ہوئی جس میں اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا، بھاگ کر مصر چلا گیا۔ شام پر اتحادی فوجوں کا قبضہ تھا۔ یردن کے مغرب میں ارض فلسطین میں برطانیہ کے عارضی حکومت قائم کر لی۔ فلسطین کے شمالی ساحلی علاقہ میں ایسی ہی فرانسیسی حکومت تھی۔ حلب اور حمص اور حماہ اور دمشق اور شرق اردن میں عرب تھے۔ اور انہی کے بل بوتے پر امیر فیصل دمشق میں شاہ بنا۔ اس وقت اس

سے ایک سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ بیروت کی طرف پیشقدمی کی جسے "جنرل ایلن بی" نے روک د
فرانس تو شروع سے شام بالخصوص شام کے شمالی علاقہ میں آزاد عرب حکومت کے خلاف
اس کو تقویت لبنان کے مسیحیوں نے بھی دی جو عرب حکومت کے ماتحت رہنا بھی پسند
نہیں کرتے تھے۔ شامی عرب اول تو کسی غیر کا اقتدار پسند ہی نہ کرتے تھے مگر بحالت مجبور
برطانیہ کو فرانس پر اور دونوں پر امریکہ کو ترجیح دیتے تھے۔

ان واقعات کا تذکرہ جس نے دول یورپ میں سیاسی الجھنیں پیدا کر دی، ہم عر
کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

فیصل کو تو اپنا ذاتی اقتدار مطلوب تھا، قوم پرست اگر سیاسی شعور سے کام لیتے
انحادیوں میں دال جوتیوں میں بٹتی۔ اور خود بخود بٹنے لگی تھی مگر غیر جانب دار امریکہ نے بیچ
بچاؤ کر کے سب کو ٹھنڈا کر دیا۔

عرب کا مقابلہ اب ایک طرف فرانس اور دوسری طرف صیہونی تحریک سے تھا، بر
پر جو اعتماد تھا وہ بھی اٹھ گیا۔ برطانیہ یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ ترکی حکومت کی خلافت عرب
کو ملے جو بہت عرصہ نہیں گذرا تھا کہ تمام متمدن ممالک ایشیا اور افریقہ پر چھائے ہوئے تھے
شریف حسین کو سبز باغ تو بہت دکھائے مگر برطانیہ کی سیاسی لغت میں وعدہ اور معاہدہ
کے معنی محض وقتی خطرات کا سدباب اور مستقل مفاد کا ارادہ ہی ہے۔ "کرنل لارنس" شریف
کا مشیر تھا اور عبدالعزیز ابن سعود کا "فلبی" (PHILBY) تھا۔ شریف حسین کا تمام عرب ممالک
پر حق خلافت کا خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ بلکہ ارض حجاز سے جو اس کا مستقر خلافت تھا
دست بردار ہونا پڑا۔ یہ حالات ہم حجاز کے تحت بیان کریں گے۔ یہود نوازی کا مقصد اتنا
تھا کہ اس مغضوب قوم کو عربوں کے مقابل ایک ہی جگہ کھڑا کیا جائے اور ابن سعود کو حجاز اس
لئے دیا کہ شریفی خاندان اور وہابیوں میں پہلے ہی دشمنی تھی، ان کا اتحاد و الحاق نہ ہو سکے۔
اور دونوں برطانیہ کی سرپرستی غنیمت سمجھیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ امیر فیصل کی شاہی کا اعلان شامی کانگریس نے بلا مشورہ فرانس
اور برطانیہ کر دیا تھا، جسے دونوں حکومتوں نے تسلیم نہیں کیا۔ "سان ریمو" (SAN REMO)

کانفرنس میں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے ہوئے۔ یہ کانفرنس ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوئی۔ اتحادی دول میں سے شام اور لبنان جس کو بعد میں لوینٹ سٹیٹ (LEVANT - STATES) سے موسوم کیا گیا۔ فرانس کے منڈیٹ میں دیا گیا۔ اور عراق اور فلسطین برطانیہ کے حصہ میں آیا۔ شام اور عراق اور فلسطین کو "منڈیٹ اے" (CLASS A MANDATE) سے موسوم کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان ممالک کے باشندوں کی ذہنیت اتنی پختہ ہو چکی ہے یا کہ پختہ ہونے کے قریب ہے کہ حکومت خود اختیاری کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اور یہ کہ ان کو نسبتاً ان ممالک سے جو ابھی خام خیال ہیں آزادی جلدی مل جائے گی۔ شام اور لبنان اور عراق کے بارہ میں منڈیٹ میں یہ وضاحت تو تھی کہ ان کو آزادی میں برطانیہ اور فرانس زیادہ سے زیادہ مدد دیں۔ لیکن فلسطین کا ذکر خیر اس میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ برطانیہ یہود سے بھی کچھ وعدے کر چکا تھا۔ اور ان کا ایفا برطانیہ کی سیاسی حکمت عملی کے عین مطابق تھا۔ معاہدہ اور اعلان بالفور میں صرف یہود کے "نیشنل ہوم" (NATIONAL HOME) کا مذکور تھا۔ اس کی تشریح نہ تھی کہ یہ گھر "سلطنت کا ہوگا یا خدا کا یا دونوں گا"۔

حضرت داؤدؑ نے یروشلم میں بیت المقدس کا سنگ بنیاد رکھا تو اعلان کیا تھا کہ "یہ خدا اور سلطنت دونوں کا گھر ہے"۔

یہود اس روایت کو نہیں بھولے تھے اور برطانیہ ایسا ہی گھر عربوں کے گھروں کے سر پر تعمیر کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ عرب کی اکثریت فلسطین میں تھی اور خلافت راشدہ سے لے کر اب تک اس سرزمین پر حکمران اور آباد تھے۔ ان کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنا یا ان کو بے دخل کرنا آسان نہ تھا۔ اب یہ یہود کا کام تھا کہ اس موقعہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے جو برطانیہ نے دیا اور عربوں کی قوت مدافعت پر منحصر تھا کہ یہ منصوبہ پورا نہ ہونے دیں۔

اس کش مکش میں یہودیوں اور عربوں میں جو ارض فلسطین کے لئے شروع ہوئی اتحادی بشمول امریکہ یہود کے پشت پناہ تھے۔ برطانیہ اور امریکہ نے امداد میں خاص

حصہ لیا۔

ان واقعات کا مذکور مناسب مقام پر کیا جائے گا۔

برطانیہ یہ چاہتا تھا کہ اگر تمام شام نہیں تو جنوبی شام پر اسی کا اقتدار ہو۔ حالات کچھ سازگار خود بخود پیدا ہو گئے۔ کمال پاشا نے ترکی قومی حکومت کو گرتے گرتے تھام لیا اس کی حدود کا تصادم "فرنچ منڈیٹ" سے ہوا۔ یعنی شام اور لبنان میں فرانسیسی حکومت کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ ان کے تحفظ کے لئے ترکوں سے لڑنا پڑے گا۔ کمال پاشا موصل کا بھی مطالبہ کر رہا تھا۔ ادھر عرب قوم پرست مشتعل ہو رہے تھے۔ یہ دوسرا خطرہ تھا۔ اب فرانسیسیوں کو بھی معلوم ہو گیا کہ برطانیہ کے چکمے میں آ کر "منڈیٹ" اسے قبول کیا کی میعاد ہی کچھ نہیں۔ یہودی بھی مطمئن نہ تھے کہ ان کی "سلطنت کے گھر" سے شرق اردن علیحدہ کیا گیا ہے۔ اور خدا کے گھر میں یروشلم شامل نہیں کیا گیا۔ منڈیٹ جو کونسل آف لیگ نے ۲۴ جولائی ۱۹۲۲ء میں مرتب کیا۔ اور جس کی ایک ایک نقل سب اتحادیوں کو دی گئی تھی۔ اس کی بیس دفعات میں سے پہلی دفعہ ہی یہ تھی کہ مقامی حکام کے مشورہ سے تین سال کے عرصہ میں "مینڈیٹری" ایسے آئین و قوانین وضع کریں گے کہ شام اور لبنان کو جلد آزادی حاصل ہو جائے۔

فیصل کو شکست ہوتی تو اس کا بھائی عبداللہ، شریف حسین کا دوسرا بیٹا عرب فوج کے ساتھ حجاز سے شام کی طرف بڑھا۔ لڑائی ہوتی تو غالباً اس کا بھی یہی نتیجہ شکست ہوتا مگر فرانس نے شرق اردن کی حکومت شرائط "منڈیٹ" کے تحت پیش کر دی۔ عبداللہ نے بھی منظور کر لی۔ اپریل ۱۹۲۳ء میں برطانیہ نے بھی ویسی آزاد حکومت جو عراق میں فیصل کو دی تھی شرق اردن میں عبداللہ نے تسلیم کر لی۔ عربی خطرہ سر دست ٹل گیا۔ اب ترکوں سے نپٹنا باقی رہ گیا۔ ترک عرب نہ تھے۔ وہ آخر ایک منظم قوم منظم سلطنت تھی۔

اگرچہ اتحادیوں کی متفقہ قوت کے سامنے اسے جھکنا پڑا مگر اس میں ابھی اتنی سکت تھی کہ فرداً فرداً ہر ایک سے نپٹ لیتی۔

۱۹۲۱ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ترکی حکومت نے تسلیم کر لیا تھا کہ سکندرونہ

(ALEXANDRETTA) فرنچ مینڈیٹ کے تحت رہے گا۔لیکن شام سے علیحدہ رہے گا۔

۱۹۳۶ء میں فرانس اور حکومت شام میں اسی وضع کا ایک معاہدہ ہوا جیسا کہ عراق میں برطانیہ کر چکا تھا۔اس کی میعاد پچیس ۲۵ سال رکھی گئی۔اگرچہ لبنانی حکومت سے بھی اسی قسم کا ایک معاہدہ علیحدہ کیا گیا مگر تھوڑے عرصہ کے تجربہ کے بعد لبنانی پارلیمنٹ کو بھی معلوم ہوا کہ ایک چھوٹے سے قطعہ اراضی پر حکومت کے اخراجات ناقابل برداشت ہیں۔اس لئے پھر سے شام میں شامل ہو گئے۔ترکوں نے سکندرونہ کے بارہ میں شام سے شمولیت کا انکار کر دیا طویل گفت و شنید کے بعد شامی حکومت نے اتنا مان لیا کہ "منجق" کی علیحدہ حکومت ہو گی اس کے اندرونی معاملات میں شامی حکومت دخل نہ دے گی لیکن امور خارجہ شامی حکومت سرانجام دے گی۔اقتصادی اور مالی الحاق حکومت شام سے رہے گا۔"منجق" میں فرنچ ریذیڈنٹ رہے گا۔جو فرنچ گورنمنٹ نامزد کرے گی۔ترکی حکومت کو خاص حقوق سکندرونہ میں حاصل ہوں گے۔

۱۹۳۶ء میں لیگ کی کونسل کی منظوری کے بعد اور ترکی حکومت نے اس معاہدہ کی شرائط پر ایک معاہدہ فرانس سے کیا۔لیکن حکومت شام مطمئن نہ تھی اس لئے پھر سے عربوں اور ترکوں میں بدمزگی پیدا ہو گئی۔کچھ جھڑپیں بھی ہوئیں۔جس میں نقصان جان و مال بھی ہوا مگر فرانس کی سپاہ نے امن قائم کر دیا۔شامی حکومت کو یہ خطرہ بجا تھا کہ دیر سویر ترکی "منجق" کے الحاق کا مطالبہ کرے گا۔اور اگر یہ ہو گیا تو حلب اور شمالی شام کی خیر نہیں۔لیگ کا فیصلہ دربارہ سکندرونہ کہ ترکی کے حوالہ کیا جائے۔اور منجق کے لئے علیحدہ پارلیمنٹ ایسے امور تھے کہ شامی پارلیمنٹ نے مسترد کر دیئے۔ترکوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ۱۹۲۶ء کا معاہدہ جو شام اور ترکی میں ہوا منسوخ کر دیا۔اس معاہدہ کی رو سے دو ہمسایہ سلطنتوں کا فرض تھا کہ مراسم دوستانہ کے قیام کے ساتھ ایک دوسرے کی حدود کا بھی احترام ملحوظ رکھیں گے۔اگرچہ برطانیہ شامی مطالبات کا حامی تھا۔لیکن فرانس ترکوں سے بگاڑ نہیں چاہتا تھا۔"منجق" میں بدنظمی کا دور دورہ شروع ہو گیا فرانس اور ترکوں میں سمجھوتہ ہو گیا کہ ترکی اور فرانسیسی سپاہ مل کر امن قائم کریں۔انقرہ میں ۴ جولائی

۱۹۳۸ء میں فرانس اور ترکوں میں ایک نیا معاہدہ بحیرہ روم میں ایک دوسرے کی امداد کا ہوا۔ ایک دن بعد ترکی فوج منجق میں داخل ہوگئی۔ اور اسکی نگرانی میں انتخاب ممبران اسمبلی کی کاروائی کا آغاز ہوا۔ صدر بلکہ تمام ممبران ترک ہی تھے۔ منجق کا الحاق ترکی حکومت سے ہوگیا۔ شامی حکومت چیختی چلاتی رہی مگر فرانس کو اٹلی کی جانب سے شمالی افریقہ میں خطرہ تھا اور ترکوں کی امداد کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ ۲۳ جون ۱۹۳۹ء میں فرانس اور ترکی میں باہمی امداد (DECLERATION OF MATUAL ASSESTANCE) کا معاہدہ ہوگیا۔ اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ فرانس شام میں اپنے حقوق سے دست بردار کسی تیسری طاقت کے حق میں نہ ہوگا ایک ماہ بعد فرانسیسی فوج سے سکندرونہ خالی کردیا اور ترکی نے اس کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔

فلسطین میں یہود نوازی کا اثر تمام عرب قبائل پر جو شام اور لبنان میں رہتے تھے ہونا ہی تھا۔ ۱۹۳۷ء میں شام میں اتحاد عرب کی کانفرنس (SANE, ARAB — CANFERENCE) منعقد ہوئی۔ مسئلہ فلسطین تمام عرب کا مسئلہ تھا۔ مفتی اعظم لبنان میں پناہ گزین ہوا۔ اور عرب بالخصوص شام کے عرب ہر ایک جگہ جہاں تھے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دمشق میں مداخلت فلسطین کی انجمن کی تشکیل ہوئی۔

شام میں بے چینی اور بد نظمی نے جو صورت حالات پیدا کر رکھی تھی اس پر اضافہ یہ ہوا کہ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۳ء تک) نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ یورپ میں جنگ کا زیادہ زور فرانس پر تھا۔ فرانسیسی حکومت کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ جب جرمن سپاہ کا پیرس میں دخل اور قبضہ ہوگیا تو اتحادیوں کا ساتھ چھوڑ کر جرمن کی پناہ آجاتے۔ یہ حالت تو داخلی گورنمنٹ کی تھی مگر بیرونی سپاہ اور ان کے افسر اتحادیوں سے چمٹے رہے۔ ان کی قیادت جنرل "ڈیگال" کر رہا تھا۔ اس کا اثر اس علاقہ پر بھی ہونا تھا جو فرانس کے زیر انتداب تھا۔ اہل شام اور لبنان نے سمجھ لیا تھا کہ "فرانسیسی منڈیٹ" کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب انگریزوں کی بن آئی۔

جولائی ۱۹۴۰ء میں "نوری السعید" جو اس وقت عراق کا وزیر خارجہ تھا، دمشق

میں آیا۔ اور انقرہ اور بیروت میں بھی گیا۔ غرض یہ تھی کہ حکومت ترکیہ اور اکابر شام و لبنان سے دریافت کیا جائے کہ فرانسیسی منڈیٹ کا کیا بنے گا۔ مشورہ کے بعد اعلان کیا کہ :۔

" ترک اور عراق دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ شام شامیوں کا ہے ان کی خود مختار سلطنت دونوں کو قابل قبول ہے "

" مینڈیٹ " کا ڈھونگ خود بخود ختم ہو گیا۔ جب کہ کفن چور " لیگ آف نیشن " کا جنازہ بھی نکل گیا۔ جرمن اور اٹلی اور فرانس اس کے ممبر تھے۔ یہ علیحدہ ہوئے تو صرف اتحادی ہی رہ گئے یہ برطانیہ اور روس ہی تھے۔ یا ان کے حلیف تھے۔ شام اور لبنان میں ابھی تک فرانسیسی ہائی کمشنر کا نمائندہ موجود تھا۔ شامی اور لبنانی کامل آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس وقت شامی سیاسیات کا مرکز بغداد تھا۔ اور شامی عراق سے یہ توقع کرتے تھے کہ ان کو ہر ممکن مدد اسی طرف سے ملے گی۔ جواب منظم ہو چکا تھا۔ ادھر عراقیوں میں ایک جوش پیدا ہو گیا تھا۔ فلسطین سے ان کے بھائی بھاگ کر اس طرف آرہے تھے اور یہودیوں کے مظالم کے ستائے ہوئے جذبہ قومیت کو مشتعل کر رہے تھے۔

سنہ ۱۹۴۰ء اور سنہ ۱۹۴۱ء میں جرمن کا بول بالا ہو رہا تھا۔ اور برطانیہ کئی مقامات پر بری طرح پٹ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی جرمنی پراپاگنڈہ بھی سرگرم عمل تھا۔ برطانیہ نے جو روش فلسطین اور فرانس نے شام میں اختیار کر رکھی تھی اس نے عربوں کے دلوں میں دونوں کے خلاف منافرت پیدا کر دی۔ رشید علی نے عراق میں علم بغاوت بلند کر دیا مگر کامیاب نہ ہوا۔

برطانوی اور آزاد فرانسیسی فوج نے شام اور لبنان کو پھر اپنے قبضہ میں لے لیا فرانسیسی جنرل (CATROUX) نے ایک اعلان شائع کیا کہ :۔

" ہم اس ملک میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے نہیں آئے بغرض یہ ہے کہ " ہٹلر " کے ایجنٹوں کو نکالا جائے۔ تم اور تمہارا ملک بالکل آزاد

ہے۔ جیسی چاہو حکومت قائم کرلو جنگ کے اختتام پر جو ہمارے درمیان معاہدہ ہوگا۔ اس میں ہمارے آیندہ تعلقات کی تشریح فریقین کی رضامندی سے کی جائے گی " مصر میں برطانوی سفیر نے بھی اس کی تصدیق کی۔

اگرچہ شام اور لبنان پر" جنرل ڈیگال" (GENERAL DE GAULLE) کے نام اس کا نمایندہ حکومت کررہا تھا مگر فوج برطانوی تھی اور نظم ونسق سب انگریزوں کے ہاتھ میں فریخ جنرل نے شیخ تاج الدین کو نئی آزاد حکومت شام کی تشکیل کی دعوت دی۔ تاج الدین الحسینی شیخ بدرالدین کا لڑکا تھا جو دمشق میں مشہور عالم دین تھا۔ شیخ تاج نے دونوں عالمگیر لڑائیوں کے دوران میں نمایاں حصہ لیا تھا اور اتحادیوں کی طرف مائل رہا۔ دفعہ وزیراعظم بھی مقرر ہوچکا تھا۔ فریخ جنرل اور شیخ تاج نے حکومت کو تشکیل اس طرح دی حسن الحکیم کو صدر جمہوریہ شام نامزد کیا۔ کابینہ میں لبنان کی نمائندگی تھی مگر قوم پرست شا نہ ہوئے۔

اگرچہ شام اور لبنان کی آزادی کا اعلان ہوگیا مگر ابھی تک فریخ حکومت اپنے اختیا سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ اور شامی فرانسیسی مداخلت انتظامیہ امور میں مزید بدظنی کررہی تھی۔ جنوری ۱۹۴۳ء میں شیخ تاج کا انتقال ہوگیا۔ اب جنرل ڈیگال نے اعلان دیا کہ شام اور لبنان میں آئینی حکومت قائم کی جائے شام میں عطا ایوبی اور لبنان میں ڈاکٹر ایوب ثابت نے تا انتخاب عارضی حکومت قائم کرلی۔ انتخاب ہوا۔ اور صدر جمہوریہ بشر الخوری منتخب ہوا۔ ہمسایہ عرب حکومتوں نے بھی شام کی آزادی بہ نظر استحسان دیکھی یہ ظاہر تھا کہ شام میں حالات موافق و مخالف کا اثر ان ممالک عرب پر بھی ضرور پڑے گا جو برط کے تحت اقتدار تھے۔

عرب لیگ ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۴ء میں مصری وزیراعظم مصطفےٰ نحاس پاشا نے عرب حکومتوں سے عرب اتحاد کے بارہ میں گفت گو جاری رکھی۔ ا کو تشکیل دینے کے لئے ایک کمیٹی بھی مقرر ہوئی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۴۴ء میں سکندریہ میں اس کا پہلا اجلاس ہوا۔ اس میں مصری، عراقی، لبنانی، شرق اردنی، سعودی عربی اور یمنی حکومت

اور فلسطین کے عرب باشندوں کے نمائندے شامل ہوئے ۔ ایک لائحہ عمل تیار کیا گیا جس پر ان نمائندوں کے دستخط ثبت ہوئے فلسطین میں چونکہ عرب حکومت نہ تھی اس لئے اس کے نمائندے نے دستخط نہ کئے ۔عرب حکومتوں کی ایک لیگ اس طرح بن گئی جس کا مستقل مستقر "قاہرہ" قرار پایا۔ "عبدالرحمٰن عزام بے" اس کا پہلا سیکرٹری جنرل مقرر ہوا۔

واقعات جو دونوں عالمگیر لڑائیوں کے دوران اور بعد میں رونما ہوئے تقاضہ کر رہے تھے کہ ہر ایک قوم اگر زندہ رہنا چاہتی ہے متحد ہو جائے اور اپنے تمام اختلافات مذہبی وغیرہ یک قلم مٹا دے ۔ اسی حقیقت کا احساس تھا کہ "عرب لیگ" صورت پذیر ہوئی ۔یہ احساس اعلان بالفور کے بعد شدید ہوتا گیا ۔فلسطین میں عرب بے دخل ہو رہے تھے اور یہود ان کی املاک خرید رہے تھے ۔ اور دیگر جائز اور ناجائز وسائل سے ان کی اکثریت کو اقلیت میں بدلا جا رہا تھا اور یہ سب کچھ پس پردہ برطانیہ کر رہا تھا ۔جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے برطانیہ کو نہ یہود کا عشق تھا اور نہ عربوں سے دشمنی تھی ۔ وہ بحیرہ شام (روم) پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا تھا ۔ ارض فلسطین ساحل شام پر واقع ہے اور مصر اس کا آخری گوشہ ہے ۔یونان اور اٹلی اور فرانس اور ہسپانیہ اسی بحر کے کناروں پر واقع ہیں اور شمالی افریقہ میں ساحلی علاقہ طرابلس وغیرہ انہی ممالک کے زیر اقتدار ہیں ۔ برطانیہ کے پاس سوائے جبل الطارق اور مالٹا اس بحر میں کچھ نہ تھا اس کی چشم دوربین ارض فلسطین اور مصر پر تھی ۔دول یورپ سے لڑائی مول لینا نہ چاہتا تھا جن میں سے اکثر اس کے آلہ کار بھی تھے ۔ لیکن فلسطین اور مصر مسلمانوں کے تھے ۔ مصر پر عملاً اسی کی حکومت تھی ۔(مزید حالات ہم "مصر" کے تحت بیان کریں گے) اب جب کہ موصل کے تیل کی پائپ لائن "ارض فلسطین سے گذر کر بیروت کے نیچے بندرگاہ حیفہ پر ختم ہوتی تھی جو بحیرہ شام پر واقع ہے ۔ ارض فلسطین پر برطانوی اقتدار از بس ضروری تھا۔ یہود نوازی ایک سیاسی ڈھونگ تھا ۔ دراصل ارض فلسطین میں دو قوموں کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑا کر کے اپنا اُلو سیدھا کرنا مقصود تھا ۔ وہ لڑتے رہیں اور یہ امن کے نام پر مداخلت کرتے رہیں ۔ ان کی توجہ کسی اور طرف ہو اور یہ اپنا کام سرانجام دیتے رہیں ۔ لیگ آف نیشن کی کونسل نے فلسطین اور عراق کا "انتداب" برطانیہ کو دیا ۔موصل کی پائپ لائن نے دونوں کو

ملا دیا۔ جہاں تک تیل کا مسئلہ ہے وہ اینگلو پرشین آئل کمپنی کے زیر اہتمام تھی۔ اس طرح بحری جنگی بیڑہ مقیم بحیرۂ شام کو حیفہ کی بندرگاہ پر موصل اور "آبادان" بحیرہ عرب و ہند کے جہازوں کو ایرانی تیل مہیا کرنے کے اہم مقامات تھے برطانیہ کے قبضہ میں آ گئے۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ شام بشمول فلسطین میں عرب اکثریت میں تھے۔ ارض فلسطین میں ان کا زور یہود کے ذریعہ توڑا گیا۔ شریف حسین کل ممالک عرب پر حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا اگرچہ یہود نوازی نے اسے برطانیہ کی طرف سے بدظن کر دیا تھا۔ مگر دنیا بامید قائم۔ وہ جانتا تھا کہ برطانیہ کی امداد کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اور برطانیہ بھی اختتام جنگ تک طفل تسلی دیتا رہا۔ ۱۹۳۶ء تک برطانیہ کا سیاسی عروج انتہا پر پہنچ گیا تھا۔ اور اول جنگ عظیم کے بعد بحر و بر میں اسی کا طوطی بول رہا تھا کہ دوسرا عالمگیر جنگ شروع ہو گیا۔ جس سے برطانیہ کی دوبارہ زندگی اور موت وابستہ تھی۔

۱۹۳۶-۳۹ء میں عربوں نے ارض فلسطین کے طول و عرض میں شورش برپا کر دی۔ ان کو امداد ہر طرف سے مل رہی تھی۔ شام کے عرب پیش پیش تھے۔ پان عرب (PAN ARAB) کی کئی کانگریسیں قائم ہوتی رہیں۔ اس کے پہلو میں "اتحاد اسلامی" (PAN ISLAMISM) کی مجالس بھی منعقد ہوتی رہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ آخر الذکر کا آغاز ۱۹۳۱ء میں ہو چکا تھا اور اتحاد عرب اس کی ایک شاخ تھی جس نے آخر تنظیم باضابطہ عرب لیگ کی صورت کر لی۔

بنی اسرائیل

ہم بیان کر چکے ہیں کہ قدیم الایام سے دریائے نیل اور دجلہ کے کنارہ تک امم سامیہ آباد تھیں۔ مصر میں فراعنۂ مصر اور شام اور عصاریہ اور بابل میں انہی کی شاہی تھی اور یہ عظیم الشان سلطنتوں کے مالک تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اجداد غالباً ارض حجاز میں آباد تھے۔ ان میں سے ایک نے دریائے فرات کو عبور کر کے الجزیرہ میں "خالدیوں کے اُور" میں رہائش اختیار کی۔ "اُور" کے معنی شہر ہیں۔ جیسے "اُورشلم" (یروشلم) سلامتی کا شہر۔ یہ شخص جس نے فرات عبور کیا۔ "عبر" کے نام سے موسوم ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد عبرانی (HEBREW) کہلائی حضرت ابراہیمؑ

نے جب اپنی قوم سے نہ بنی تو ارض کنعان (فلسطین) کی طرف ہجرت کی۔ توراۃ میں حضرت ابراہیمؑ کے حالات میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم سے وعدہ کیا کہ:۔

"یہ زمین جہاں تو مسافرانہ وارد ہوا ہے میں ہمیشہ کے لئے تیری ذریت کو دوں گا۔"

اسے اصطلاح اہل کتاب میں "وعدہ برکت" کہتے ہیں۔ بالآخر اس وعدہ برکت میں تمام ممالک جو نیل سے دجلہ تک ہیں شامل ہو گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے۔ پلوٹھا اسمٰعیلؑ، حضرت ہاجرہ کے بطن سے جو ہمعصر فرعون مصر کی بیٹی تھی۔ اور دوسرا اسحٰقؑ، سارہ کے بطن سے جو آپ کے چچا کی بیٹی تھی۔ حضرت اسحاقؑ کے دو بیٹے تھے۔ پلوٹھا "عیسو" جس نے حضرت اسمٰعیلؑ کی بیٹی سے نکاح کیا۔ اس کی اولاد بنی "عدوم" کہلائی۔ اور ارض سینا میں آباد ہوئی۔ دوسرا بیٹا یعقوبؑ تھا۔ دونوں توام پیدا ہوئے تھے۔ یعقوبؑ کا دوسرا نام "اسرائیل" ہے۔ آپ کے بارہ بیٹے چار ازواج کے بطن سے ہوئے۔ دو لونڈیاں تھیں۔ اور دو دختران "لابن" آرامی تھیں۔ لونڈیاں بھی اسی نے جہیز میں دی تھیں۔ ان میں سے چوتھا بیٹا "یہوداہ" تھا جس کی اولاد یہودی کہلائی۔ حضرت یعقوب کی رہائش ارض فلسطین میں تھی۔ لیکن جب آپ کا بیٹا یوسفؑ مصر میں وزارت عظمیٰ پر فائز ہوا تو حضرت یعقوب اپنے خاندان کے ساتھ مصر میں آباد ہو گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے اس وقت تک مصر پر ایک عرب خاندان حکمران تھا جس کو تاریخ مصر میں "حیق سوس" (HYC - SOS) سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ فراعنہ مصر ملک کے اس حصہ میں حکمران تھے جو دریائے نیل کے "ڈیلٹا" سے سیراب ہوتا ہے، "ڈیلٹا" (DELTA) یونانی، عربی یا عبرانی حرف "دالۃ" (د) ہے۔ نیل کی شاخیں موجودہ قاہرہ کے قریب پھٹ کر کئی شاخوں میں منقسم ہو گئی ہیں۔ اور یہ زمین ان کی انتہائی شرقی اور غربی شاخ کی وجہ سے حرف دال کی صورت میں ہے۔ یہ فراعنہ مصر کئی صدیوں تک مصر پر حکومت کرتے رہے۔ آخر مصر کا پرانا خاندان جس کو "حیق سوس" نے بیدخل کیا تھا اور جنوب کی طرف چلا گیا تھا پھر زور پکڑ گیا۔ اور "حیق سوس" کو پھر سے "سوس"

(سویز) کی طرف دھکیل دیا جہاں سے ان کا خروج ہوا تھا۔

اس نئے خاندان میں ایک فرعون جس کو "رعمسیس اعظم" کہتے ہیں۔ نہ صرف کل مصر بلکہ ارض سینا اور فلسطین پر بھی چھا گیا۔ چار صدیوں میں بنی اسرائیل کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ چونکہ ان کی قرابت قریبہ فراعنہ "ہیق سوس" سے تھے اور انہی کے دور دورہ میں یہ پھولے پھلے اس لئے ان پر استبدادی حکومت کے مظالم شروع ہو گئے اور یہ غلام بنائے گئے۔ ارض سینا کے پہاڑوں میں معدنیات کی دولت تھی۔ یہاں بھی یہی غلام مصری آقاؤں کی زیر نگرانی کانیں کھودتے تھے۔ مصر میں بھی شاہی تعمیرات پر لگے ہوئے تھے۔ رعمسیس اعظم کے عہد میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے۔ آپ کی پرورش شاہی محل میں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ہیق سوس" فراعنہ مصر کے آخری تاجدار کی ایک لڑکی رعمسیس کی زوجہ تھی۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کو اپنا متبنیٰ بنا لیا۔ اگر حضرت کی پرورش اپنی قوم میں ہوتی تو غلامانہ ذہنیت ہی ہوتی۔ فرعونی حکومت ایسے لوگوں کی پرورش کر رہی تھی جو غلام قوم کے افراد ہی تھے۔ اور انہی کے ذریعہ ان محکوم قوم پر حکومت خاطر خواہ ہو رہی تھی۔ یہ حکومت کے "خطاب یافتہ" مزے کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک "قارون" بھی تھا۔ حکمران قوم کا دستور ہے کہ خزانہ یا روپیہ پیسہ کا کام محکوم قوم کے افراد سے لیتی ہے۔ صاحب حکومت فراخدل ہوتا ہے اور مالیات کا انتظام اس سے خاطر خواہ نہیں ہو سکتا۔

اکبر کے زمانہ میں ٹوڈرمل اور برطانوی حکومت ہند کے دور دورہ میں سب بنئے ہی خزانچی تھے اور ہمارے زمانہ میں یہ بنک کا کاروبار یہودی ہی چلا رہے ہیں۔ یہ کام ایسے ہی لوگوں کا ہے جو پست اور جن کی ذہنیت پست ہو۔

حضرت موسیٰؑ کی پرورش بھی اسی حکمت عملی کے تحت کی گئی کہ کسی وقت حکومت کے مفاد کا آلہ کار ہو۔

دستور یہ تھا کہ امراء وزراء کی اولاد کی تعلیم و تربیت مختلف صوبوں کے حکام کے تحت ہوتی۔ نوجوان موسیٰؑ حاکم "مجمع البحرین" کے تحت آئے یہ صوبہ مصر کا انتہائی مشرقی حصہ تھا۔ نیل

کی انتہائی شرقی شاخ جس کو یونانی حکومت مصر کے دَور دَورہ میں "پلوزیم" کہتے تھے، بحیرہ شام میں گرتی۔ اب یہ شاخ "برکتہ منزلہ" میں گرتی ہے۔ جس کے ایک طرف اسکندریہ اور دوسری طرف صعید کی بندرگاہ ہے۔

تعلیم و تربیت (TRAINING) کے بعد حکومت کے کاروبار میں بھی حضرت موسیٰؑ کا دخل ہوگیا۔ مگر جو مظالم قوم پر ہو رہے تھے اور خطاب یافتہ ہمقوم افراد کے ذریعہ بھی ہو رہے تھے اسے دیکھ کر آپ کا جی کڑھتا تھا۔ اس کا احساس اور افرادِ قوم کو بھی تھا ایک خفیہ مجلس کی بنیاد ڈالی جو آپ کے بڑے سوتیلے بھائی ہارون کی قیادت میں سرگرم عمل رہی۔

حضرت موسیٰؑ نے ایک قبطی افسر کو جو اپنے ماتحت اسرائیلیوں پر سختی کرتا تھا، اشتعال میں آکر مار ڈالا۔ یہ قتل عمداً واقع ہوا۔ مصری حکومت آئینی تھی۔ قانون یہ تھا کہ جب کوئی شخص قتل عمد کا مرتکب نہ ہو اور قتل خطا کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کو فوراً مصری حدود سے باہر نکل جانا چاہیئے اور ہمعصر فرعون مصر کی زندگی تک باہر ہی رہنا چاہیئے۔

فرعون کی وفات کے بعد اگر مصر میں واپس آئے تو قابل مواخذہ نہیں۔ یہی قانون شریعت موسوی بھی ہے کہ قتل خطا کا مجرم سردار کاہن کی زندگی تک ان چھ شہروں میں کسی ایک میں پناہ لے سکتا ہے جن کو "حرم" قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اگر فرعون مصر کی زندگی میں حدود مصر کے اندر گرفتار ہو جائے یا مصر میں واپس آئے اور مارا جائے تو جائز تھا۔

حضرت موسیٰؑ بقول مؤلف "اعمال الرسل" مصری علوم میں کامل تھے۔ مگر ملتِ ابراہیمؑ سے نہ آپ اور نہ آپ کی قوم بخوبی واقف تھی۔ چند مذہبی رسوم تھیں جو ادا ہو رہی تھیں۔ اور شریعت ابراہیمی انہی قوانین کے مشابہ تھی جو "حمورابی" شاہ بابل کے ضابطہ قوانین میں بھی ہے۔

فرار کے بعد حضرت موسیٰؑ "مدین" کے شہر "یثرب" میں آئے۔ جسے اب مدینہ منورہ کہتے ہیں۔ یہاں اسماعیلی آباد تھے۔ ان کے تجارتی قافلے شام اور مصر میں بھی جاتے تھے انہی کے ایک قافلے میں حضرت یوسفؑ بھی مصر میں پہنچے تھے۔ یثرب کے شیخ کا نام توراۃ

میں "رعوائیل" (اللہ کا گڈریا) لکھا ہے۔ "مدین" میں چونکہ ایک پیغمبر حضرت شعیبؑ بھی گزرے ہیں اس لئے بعض مورخین رعوائیل اور شعیب کو ایک ہی شخصیت سمجھتے ہیں اس شیخ کے ہاں حضرت موسٰیؑ کا قیام دس سال تک رہا۔ اور ان کی ایک لڑکی سے آپ کا عقد نکاح بھی ہوا۔ آپ اس دس سال کے عرصہ میں اپنی قوم اور مصر کے حالات سے بے خبر نہ تھے۔ آپ کا بھائی ہارون آپ کو برابر اطلاع دیتا رہا۔ آپ اپنے خسر کے ریوڑ کے ساتھ ارض سینا میں پھرتے رہے اور یہیں آپ نے اپنا لائحہ عمل تیار کر لیا۔

دس سال بعد رعمسیس اعظم مر گیا۔ تاریخ کا یہ اہم مسئلہ ہے کہ ہمیشہ ایسے اولوالعزم فاتحین کے بعد سلطنت میں ضعف آجاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جانشین اس دل و دماغ کا آدمی نہیں ہوتا۔ دوسرے محکوم قوم جس میں آزادی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے کھڑی ہوتی ہیں۔ رعمسیس کے بعد "من فتح" نامی کے عہد میں مقبوضہ ممالک میں عام بغاوت پھیل گئی۔ یہ وقت تھا کہ حضرت موسٰیؑ مصر میں وارد ہوتے۔ اور آزادی کی جدوجہد منظم صورت میں شروع ہو گئی۔

بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکلے تو ارض سینا میں آئے یہاں اسرائیلی مزدور ان سے ملحق ہو گئے۔ آپ اپنی قوم کو اس "وعدہ برکت" کی طرف متوجہ کر رہے تھے جو حضرت ابراہیم سے باندھا گیا تھا۔ لیکن قوم کی غلامانہ ذہنیت اتنی پست تھی کہ ارض فلسطین میں فاتحانہ داخلہ ممکن نہ تھا۔ چالیس سال کے عرصہ میں پرانی پود اکھڑ گئی اور ان نوجوانوں نے جو صحرا میں پیدا ہوئے آپ کی قیادت میں فلسطین پر حملہ کر دیا۔ آپ کے خلیفہ "یشوع" کے عہد میں فلسطین پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے اور مفتوحہ ملک حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کی اولاد میں جو اب بارہ قبائل تھے بارہ حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ان کو ضابطہ قوانین جس کو شریعت موسوی کہتے ہیں اور جو توریت میں مدون ہو چکا تھا مل چکا تھا۔ اسی کے مطابق بارہ قبائل کے سردار قبیلہ "لاوی" کی حسب ہدایت جو حضرت موسٰیؑ کا قبیلہ تھا ایک قسم کی جمہوری حکومت کرتے رہے۔ حضرت داؤدؑ یہودی تھے۔ آپ نے جمہوریت کو شخصی حکومت میں بدل ڈالا۔ اب بارہ قبائل ایک مرکزی حکومت کے تحت آگئے

داؤد کے بعد حضرت سلیمانؑ کے عہد میں اسرائیلی حکومت انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ تاریخ نے زوال کے واقعات کو دوہرانا شروع کیا۔

بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں پھوٹ پڑ گئی۔ دس قبائل ایک قبیلہ "یہودہ" کے تحت محکوم رہنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کے آثار حضرت داؤدؑ کے عہد میں نمایاں ہو چکے تھے اور تمام قبائل کو متحد رکھنے کے لئے آپ نے پایۂ خلافت یروشلم میں بیت المقدس کا سنگِ بنیاد رکھ دیا اور تابوت سکینہ جس میں الواح توراۃ اور دیگر تبرکات موسوی اور بزرگان دین تھے، اس میں منتقل کر دیا۔ حضرت سلیمانؑ کے عہد میں اس کی تکمیل ہوئی۔ یہ "خدا کا اور سلطنت کا گھر" قرار پایا۔ اس شان کا معبد پھر کہیں تعمیر نہیں ہوا۔ اس کو ہیکل سلیمانی بھی کہتے۔ حضرت سلیمانؑ کے دور دورہ میں دس قبائل نے ریشہ دوانی بہت کی۔ خفیہ انجمنیں بھی ملک کے طول و عرض میں قائم کیں۔ اور عوام میں سلیمان کو فسق و فجور سے متہم کیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح بنوامیہ کے خلاف بنوہاشم بالخصوص عباسیہ کے داعیوں نے "پراپاگنڈہ" کیا۔

حضرت سلیمانؑ کی وفات کے بعد عصائے حکومت کو گھن کھا چکا تھا۔ دس قبائل نے "سامریہ" میں اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی اور ہیکل سلیمانی کے بالمقابل اپنا معبد بھی تعمیر کرلیا تاکہ پھر سے یروشلم کے قبلہ کی طرف رجوع نہ ہو۔ یہ سلطنت "اسرائیلیہ" اور یروشلم میں حکومت یہودیہ کہلائی۔ بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰؑ ابن مریم مسیح "یہودی" تھے۔ اس وقت تمام شام بشمول فلسطین رومی گورنمنٹ کے تحت تھا۔

حضرت موسیٰؑ کی پانچویں کتاب "المثانی" (DEUTRONEMY) میں واضح الفاظ میں بطور پیش گوئی وہ انتباہ موجود ہے اور وہ حالات مذکور ہیں جو بنی اسرائیل پر بعد وفات حضرت موسےٰ پر گذرنے والے تھے۔ بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا تھا کہ جب تک وہ توراۃ کے احکام پر صدق دل سے عمل کرتے رہیں گے اس ارضی "جنت" شام کی برکات سے بہرہ ور ہوتے رہیں گے۔ لیکن وہ دو دفعہ سرکشی کریں گے اس کا وبال ان پر یہ ہوگا کہ پہلی دفعہ وہ اسیر ہوکر ارض معہود و برکت سے بیدخل ہو جائیں گے وہ پھر اللہ کی طرف رجوع کریں گے اور اوران کے دن پھریں گے اور پھر سے ارض مقدس پر قابض ہو جائیں گے۔ یہ پیش گوئی اس

وقت پوری ہوئی جب بابلیوں نے ارض فلسطین مسخر کرلی اور اسرائیلیوں کو اسیر کر
میں لے گئے۔ ان میں دونوں حریف سلطنتوں اسرائیلیہ اور یہودیہ کے لوگ تھے کیخسرو
نے جب بابل فتح کیا تو ان کو بھی آزادی کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔ بنی عزرا کی رہنمائی میں
نے پھر سے ہیکل سلیمانی کی مرمت کرلی۔ اور اسرائیلیوں نے سامریہ میں رہائش (کو
قوموں میں منافرت اس حد تک تھی کہ اس تباہی کے بعد بھی جو اس خمسہ درست نہ ہوئے
دوسری پیشگوئی کے پورا ہونے کا وقت بھی قریب تر آ رہا تھا۔ یہودیہ کے آخر
حضرت یحییٰؑ اور مسیحؑ قوم کو متنبہ کر رہے تھے۔ مگر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ حضرت مسیحؑ نے
کی کہ پھر سے "اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑیں" ایک راعی کے تحت آجائیں مگر اس میں
اتنی حد تک ہوئی کہ واقعۂ "صلیب" کے بعد آپ نے رہائش اپنے "نیک ہمسایہ" سا
میں اختیار کی۔ اگرچہ انجیل واقعات صلیب کے بعد خاموش ہے مگر قرآن میں اس
ہے کہ:-

"قال عیسیٰ ابن مریم للحواریین من انصاری الی اللہ قال الحواریون
انصار اللہ ، فامنت طائفۃ من بنی اسرائیل وکفرت طائفۃ فایدنا الذین
امنوا علی عدوھم فاصبحوا ظاھرین۔" (۲۸/۱۴)

"عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں کو کہا کہ کون تم میں سے میری مدد اللہ کے لئے کرے
حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ (کے دین) کی مدد کریں گے۔ پس بنی اسرائیل میں سے ایک طائفہ
(سامری) تو ایمان لے آیا اور دوسرے طائفہ (یہود) نے انکار کیا۔ تو ہم نے جو ایمان لائے تھے
ان کو تقویت دی اور وہ اپنے حریف قبیلہ پر غالب آ گئے۔"

واقعۂ صلیب سے پیشتر اور بعد یہودی اکثر بغاوت کے مرتکب ہوتے رہے
واقعہ کے بعد عام بغاوت شروع ہو گئی۔

یہودی مورخ یوسف (جوزیفس) نے ان محاربات کا مفصل تذکرہ لکھا ہے جو یہود
اور رومیوں میں ہوتے اور جس میں وہ خود بھی اپنی قوم کے ساتھ شامل رہا۔ ان لڑائیوں کا نتیجہ یہ
ہوا کہ یہودی بالکل ارض مقدس سے بے دخل ہو کر کرۂ ارض کے مختلف ممالک میں جہاں

[illegible]سینگ سمائے چلے گئے۔ دوران محاربات میں ہیکل سلیمانی آگ کی نذر ہوگیا اور رومیوں نے [illegible] کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ المثانی کی دوسری پیش گوئی بھی پوری ہوئی۔

تیسری پیشگوئی یہ تھی کہ ان واقعات کے بعد اسرائیلیوں کا واحد چارہ کار "وہ نبی" ہوگا [illegible] مثیل موسیٰ ہوگا۔ اور جو اسرائیلیوں کے بھائی (اسماعیلیوں سے مبعوث ہوگا۔ (المثانی ۱۸/۱۸)

آنحضرت نے یہود کو دعوت اتحاد دی۔ مگر اس سرکش قوم نے مسترد کردی۔ ان کی غیرت [illegible] یہ گوارا نہ کرتی تھی کہ "النبی" غیر یہود میں مبعوث ہو۔ اسمٰعیلیوں نے تو ان تمام ممالک پر [illegible] خلافت کے تحت قبضہ کرلیا۔ جس کا وعدہ حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے ہوچکا تھا۔ اور [illegible] وعدہ الٰہی ان کے حق میں نزول قرآن کے بعد پورا ہوا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح نزول تورات [illegible] بعد اسرائیلیوں کے حق میں ہوا۔

چوتھی پیش گوئی جو اہم ہے اور جس کے ایک حصہ کا ظہور ہمارے زمانہ میں اعلان بالفور [illegible] بعد ہوا۔ یہ ہے کہ:-

> خداوند تیرا خدا تجھے اس سرزمین میں جس کی نسبت میں نے تجھے کہا کہ تو پھر، (واقعات محاربات کے بعد) نہیں دیکھے گا۔ یہاں کرہ ارض کے ہر ایک حصہ سے اکٹھا کرکے لائے گا۔ اور اس راستہ سے تجھے جہازوں میں لاد کر مصر میں (جہاں سے تو نے خروج کیا) لایا جائے گا۔ اور تجھے لونڈی اور غلاموں کی طرح فروخت کیا جائے گا لیکن تیرا کوئی خریدار نہ ہوگا۔ (المثانی ۲۸/۴۸)

اعلان بالفور کے بعد یہود فلسطین میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم [illegible] دوران میں ہٹلر نے ان کو اس طرف دھکیلا اور جہاں جہاں ہٹلر کا قبضہ ہوا۔ یہ بھاگ [illegible] کر فلسطین میں آتے رہے۔ اس کے بعد جب برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے ان کے خدا [illegible] سلطنت کا گھر بن گیا تو ایک کشش نے ان کو کرہ ارض کے ہر ایک حصہ سے کھینچا۔ اس کا [illegible] اشارہ قرآن کی سورہ بنی اسرائیل میں بھی ہے کہ

"فاذا جاء وعد الاخرة جئنا بكم لفيفا" (۱۵/۱۲)

(بحوالہ المثانی) جب آخری وعدہ کا وقت آئے گا تو ہم تم کو کرہ ارض کے ہر ایک حصہ

سے اس جگہ پلیٹ کرے آئیں گے ۔

یہ وعدہ پورا ہو چکا ہے ۔ فلسطین میں یہود کی آمد عرصہ پہلے شروع ہو چکی تھی ۔ یورپ میں مسیح کے نام لیوا واقعہ صلیب کو فراموش نہیں کر سکتے تھے ۔ ان کا قتل عام ہر ایک جگہ ہوتا رہا ۔ ان کو پناہ خلافت اسلامیہ کے تحت ہی ملتی رہی ۔

ڈاکٹر مل مین (MILLMAN. D. D) اپنی تاریخ یہود (HISTORY OF JEWS) میں لکھتا ہے کہ خلافت اسلامیہ کے تحت ان کو جو امن حاصل رہا اور انہوں نے جو کچھ ترقی سے کی یہود کا عہد زریں (GOLDEN AGE) ہے ۔ یورپ بالخصوص روس میں ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا مگر دنیاوی مفاد نقل مکانی کی اجازت نہیں دیتا تھا ۔ پھر بھی ۱۸۴۵ میں یہود بارہ ہزار فلسطین میں آباد ہو چکے تھے ۔ ۱۸۸۲ء میں ان کی تعداد دگنی ہو گئی ۔ ۱۹۰۵ میں ان کی تعداد سینتالیس ۴۷ ہزار ہو گئی ۔ اور ۱۹۱۴ء میں پچاسی ۸۵ ہزار کے لگ بھگ تھی ۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۶ء تک دو لاکھ اسی ہزار یہودی فلسطین میں اور آئے ۔ اب ان کی کل چار لاکھ چار ہزار کے قریب ہو گئی ۔ یہ تیس فی صدی آبادی کا حصہ تھے ۔ ۱۹۳۶ء کے بعد لاکھ چھیاسٹھ ہزار اور آگئے ۔ اور اب ان کی آبادی تراسی ۸۳ فی صدی ہو گئی ۔ یہ سلسلہ ابھی جاری ہے ۔ یورپ کے مختلف ممالک میں یہودی انجمن "یشوع" (YISHAU) کی شاخیں سرگرم عمل ہیں اور یہود کو بالخصوص نوجوانوں اور صنعت و حرفت کے کارکنوں کو ہجرت کی ترغیب دیتی ہیں ۱۹۳۶ء میں یہود آبادی کا پچاسی ۸۵ فی صدی پینتالیس ۴۵ سال سے کم عمر لوگ تھے اور اوسط عمر سال رہی ۔

ابتدا میں یہود مہاجرین چار مقدس مقامات یروشلم، جبرون اور سعد اور طبریہ میں مقیم ہوتے رہے ۔ ۱۹۱۴ء تک چوالیس بستیاں انہوں نے آباد کیں ۔ اول جنگ عظیم دوران اور بعد ان بستیوں کی تعداد ۱۹۳۶ء تک دو سو تین تک پہنچ چکی تھی ۔ یروشلم کے علاوہ وہ ساحلی علاقہ یافہ اور حیفہ اور مشرقی "جلیل" میں صوبہ "جزریل" اور "تل ابیب" میں آباد ہو رہے تھے ۔ انجمن یشوع کے علاوہ ایک اور ادارہ "سفرویم" بھی اسی کام میں لگا ہوا اور وہ ممالک جو بحیرہ شام کے سواحل پر واقع ہیں وہاں سے یہود کو ہجرت پر اکسا رہا تھا ۔

لرد، ایرانی، بخاری اور دیگر ایشیائی ممالک کے یہود ذوق وشوق سے اس طرف
ر ہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں عرب اب بھی یہود سے پچاس ہزار سے زیادہ تھے۔"
اگرچہ المثانی میں اس وقت کا تعین نہیں کیا گیا کہ یروشلم کی تباہی کے بعد
ب یہود پھر سے یہاں آباد ہوں گے۔ لیکن قرآن میں اس کی تصریح ہے۔

" وحرامٌ علیٰ قریۃٍ اھلکنھا انھم لا یرجعون، حتّٰی اذا فتحت یاجوج
وماجوج وھم من کلّ حدبٍ ینسلون، واقترب الوعد الحقّ فاذا ھی
شاخصۃٌ ابصار الذین کفروا یویلنا قد کنّا فی غفلۃٍ من ھٰذا بل کنّا
ظلمین، انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنّم انتم لھا واردون "

(۲۱/۷)

" اور اس باعظمت بستی کے رہنے والوں پر حرام ہے کہ پھر سے اس کی طرف مراجعت
کریں۔ جس کو ہم تباہ کر چکے ہیں اس وقت تک کہ یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں
گے اور وہ ہر ایک اونچان سے دوڑتے ہوتے آئیں گے۔ سچے وعدے کا وقت قریب آ
گیا اور ان لوگوں کی آنکھیں چڑھی کی چڑھی رہ گئیں جو اس وقت کے منکر تھے۔ کہیں
گے کہ اے وائے ہم اس وقت سے غافل ہی رہے بلکہ ہم ہی ظالم تھے۔ (اب پچھتانے
سے کیا ہوتا ہے) تم اور جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے رہے۔ ایندھن ہیں جہنّم کے جس میں تم نے
وارد ہونا ہے "

صحف انبیاء (حزقیل نبی ۳۸/۲) میں واضح الفاظ میں یاجوج کو روس اور ماسکو
اور ٹوبالسک کے سردار کہا گیا ہے اور ماجوج بلاشبہ دیگر اقوام یورپ وامریکہ اور
تاتاری یا مغلیہ نسل ہے۔ جنگ عظیم اول کے بعد ان کو کھولا گیا۔ اور اعلان بالفور کے بعد
یہود کی مراجعت فلسطین میں شروع ہو گئی۔

متوقع جنگ عظیم سوم | ارشاد قرآن ہے کہ :-

" ان یاجوج وماجوج مفسدون فی الارض .... "

وکان وعد ربی حقاً، وترکنا بعضھم یومئذ یموج فی بعض
ونفخ فی الصور فجمعنٰھم جمعاً وعرضنا جھنم یومئذ للکٰفرین عرضاً الذین
کانت اعینھم فی غطاء عن ذکری وکانوا لا یستطیعون سمعاً (۱۸/۱۲)
تحقیق یاجوج اور ماجوج کرہ ارض پر مفسد لوگ ہیں.........
"اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے، اور ہم ان کو ایک دوسرے میں اس دن موج مارتے
ہوتے چھوڑ دیں گے۔ اور صور پھونکا جائے گا تو ان کو ہم پوری طرح جمع کر دیں گے اور جہنم
سامنے لائی جائے گی، منکروں کے لئے اس دن ان منکروں کے لئے جو غفلت میں
ہماری یاد دہانی سے اور جو انتباہ کی آواز پر کان نہیں دھرتے تھے"۔
ان آیات محولہ بالا میں یاجوج و ماجوج اور ان کے ساتھ یہود کی تباہی کا مذکور
اس وقت کی دنیا منتظر ہے۔
فلسطین میں اول جنگ عظیم کے بعد ۱۹۲۱ء میں برطانوی ہائی کمشنر نے "سپریم مسلم
کونسل" (SUPREM MUSLIM COUNCIL) کی طرح ڈالی۔ اس کا صدر مفتی اعظم
الحاج محمد امین الحسینی تھا۔ اس کا اثر و رسوخ فلسطین کے عربی قبائل بالخصوص فلاحین
(کاشتکاروں) میں اس حد تک تھا کہ ۱۹۳۶ء تک اس نے ان سب میں اتحاد کی روح
پھونک دی۔ ابتدا میں برطانوی گورنمنٹ نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ایسی با اثر شخصیت کو
اپنا آلہ کار بنانے میں کامیاب ہو جائے گی مگر جب دیکھا کہ اس نے برطانوی مینڈیٹ
کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا ہے تو اس کا زور توڑنے کی سوجھی۔ ۱۹۳۵ء میں
ایک عرب انجمن فلسطین میں قائم ہوئی اس کا صدر جمال الحسینی تھا جو مفتی اعظم کا قریبی رشتہ دار
بھی ہے۔ اس کے ذریعہ تحریک اتحاد اسلامی (PAN ISAMISM) مسلم ممالک میں اور
اتحاد عرب، عرب ممالک میں شائع ہو رہی تھی۔ "اتحاد عرب" سے مراد صرف مسلم عرب نہیں
اس میں وہ تمام عرب شامل ہیں جو بلحاظ قومیت عرب ہیں خواہ ان کا مذہب کچھ ہی ہو۔
مفتی کے اعلیٰ سیاسی تدبر نے عرب مستفرہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جو فلسطین کے علاوہ شام
اور لبنان اور دیگر ممالک میں بکثرت تھے۔ غرض یہ تھی ایک مضبوط حکومت قائم کی جائے

اس میں ہر ایک مذہب ملت کو نمائندگی حاصل ہو بشرطیکہ وہ بلحاظ قومیت عرب ہو
یہود کو بھی دعوت اتحاد دی گئی مگر قبول نہ ہوئی۔
اس اتحاد کو توڑنے کے لئے جو زور پکڑ رہا تھا اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ فلسطین کی تقسیم اس نہج سے کی جائے کہ یہود کی ایک علیحدہ سلطنت قائم کی جائے اور عربوں کی الگ۔ اس تقسیم کی تجویز کے خلاف عرب اٹھ کھڑے ہوئے۔ عرب کونسل یا انجمن کا یہ مطالبہ تھا کہ یہودیوں کی آمد یورپ اور امریکہ اور دیگر ممالک سے روک دی جائے۔ اس کے ساتھ ہی عام ہڑتال (STRIKE) بھی شروع کر دی۔ جس نے آخر منڈیٹ کے خلاف عام شورش اور مسلح جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ ہائی کمشنر نے شورش سختی سے دبانے کا ارادہ کر لیا گرفتاریاں قید و بند، جلاوطنی کا دور شروع ہو گیا۔ برطانیہ کا اقتدار عراق وغیرہ ممالک پر بھی تھا۔ عراق اور سعودی عرب اور شرق اردن اور یمن کے شاہان کی طرف سے بھی اخوان فلسطین کے نام یہ اعلان شائع ہوا کہ:۔

"شورش پسندیدہ نہیں۔ ہمارے دوست خیر خواہ برطانیہ کے وعدوں پر اعتبار کرو وہ انصاف سے کام لیں گے۔"

اس کے ساتھ ہی انگریزی سپاہ کی موجودگی کا یہ اثر ہوا کہ شورش سرد دست دب کر رہ گئی۔
امیر عبداللہ والئے شرق اردن تقسیم فلسطین پر رضامند تھا۔ وہ تو اس خیال میں تھا کہ اس کی سلطنت کو اور وسعت ہو جائے گی۔ اور تقسیم کے بعد جو ملک کا حصہ عرب کے ہاتھ لگے گا وہ اس کا ہے۔ اور برطانیہ کا یہ منصوبہ تھا کہ امیر کے ذریعہ اپنی گرفت مضبوط تر کر لے۔ عرب لیگ سے یہ ناپاک ارادے پوشیدہ نہ تھے جو تقسیم کی مخالف تھی۔
اتحاد عرب کونسل کے مقابلہ میں برطانیہ نے ایک اور پارٹی کھڑی کر دی جس کا صدر فخری بے تھا۔ اب دونوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ دونوں پارٹیاں اپنے آپ کو عرب مفاد کی نمائندہ قرار دیتی تھیں۔
مفتی اعظم کی گرفتاری برطانیہ کے پیش نظر تھی۔ وہ بھاگ کر اپنی جان بچا رہا تھا۔ مگر

جس انجمن کی طرح ڈال چکا تھا وہ برابر سرگرم عمل تھی۔ جنگ دوم میں برطانیہ کے خلاف جرمن امداد بھی تھی۔ مفتی پہلے لبنان پھر عراق پھر ایران پھر یورپ گیا۔ اس وقت جرمن کا پا اونچا تھا۔ جب اسے شکست ہوئی تو مفتی مصر میں آگیا۔ برطانیہ نے گرفتاری کی بہت کوشش کی مگر ہاتھ نہ آیا۔

۱۹۴۸ء میں برطانیہ اپنی انتدابی ذمہ داری سے خود بخود سبکدوش ہوگیا۔ اس وہ عرب اور یہود میں حائل تھا۔ اب دونوں آمنے سامنے ہو گئے۔ شرق اردن اور شام اور لبنان اور عراق، مصر اور سعودی عرب کی متحدہ افواج فلسطین کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جھڑپیں ہو رہی تھیں اور ہر ایک لڑائی میں یہودی بُری طرح پٹ رہے تھے۔ برطانیہ اپنی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ امریکہ آدھمکا۔ "یو۔ این۔ او" نے جو لیگ آف نیشن متوفیہ کا جانشین ہے اور جو امن عالم کے غم میں دبلا ہو رہا ہے اپنا ثالث صلیب احمر سویڈن کے صدر کاؤنٹ فاک برناڈیٹو (COUNT FOLKE BERNADOTTE) کو مقرر کیا۔ ثالث کے فیصلہ تک فریقین کو ہدایت کی گئی کہ کسی قسم کا عسکری مظاہرہ نہ لیکن متارکہ (CEASE FIRE) پر خاطر خواہ عمل نہ ہوا اور جانبین گاہے گاہے کہیں کہیں دست و گریبان ہوتے رہے۔ یہود یروشلم کا الحاق اپنی ریاست سے چاہتے تھے دوران متارکہ میں ان کی سرگرمی کا عمل اسی "خدا کے گھر" میں شروع ہوگیا۔ اور یہود دہشت پسند اس سلامتی کے شہر میں امن شکن کاروائی میں مصروف ہو گئے۔ کاؤنٹ مانع تو ان کے ہاتھ سے مارا گیا۔

دوسرے جنگ عظیم کے دوران میں عرب ریاستوں کو اسلحہ اتحادیوں نے کا تعداد میں مہیا کیا تھا۔ اب یہ اسرائیلیوں کے خلاف استعمال ہو رہا تھا۔ "ٹینک" (TANKS) "پلین" (PLANES) اور بھاری توپوں نے اسرائیلیوں کو شکست پر شکست دی۔ "تل ابیب" کی یہودی گورنمنٹ کو امریکہ سے اسلحہ کی امداد پہنچ رہی تھی اس لئے یہ ضروری تھا کہ ان کو دم لینے کی فرصت نہ دی جائے۔ کرہ ارض بالخصوص امریکہ سے یہودی رضاکار اس طرف آ رہے تھے۔ دوران جنگ دوم میں پینتالیس ہزار

یہود نوجوان عسکری تربیت برطانیہ کے تحت حاصل کر چکے تھے ۔ یہ سب کچھ تھا مگر عرب منظم فوج کے مقابلہ کی تاب نہ تھی۔

"یو این او" کی ہدایت کے تحت مقتول کاؤنٹ کے جانشین "بنچ" (BUNCHE) کی کوشش بارآور ہوتی اور جزیرہ روڈس میں فریقین عارضی صلح کی شرائط طے کرنے کیلئے اکٹھے ہوئے ۔ متارکہ پھر سے قائم ہوگیا۔ عراق اور مصری فوج نے فلسطین خالی کردیا اور اپنے اپنے ملک کو لوٹ گئیں۔ یہود کے لئے اب میدان خالی تھا۔ اس کے قبضہ میں وہ تمام علاقہ جو برطانیہ کے منڈیٹ کے تحت تھا آگیا۔ جو خلیج عقبہ پر ختم ہوتا ہے لیکن برطانوی سیاسی مہرہ امیر عبداللہ اپنی چال چل گیا۔ "جنین" سے جبرون کے جنوب تک بشمول یروشلم اپنے مملکت میں شامل کرلیا۔ اور اسے ہاشمی سلطنت یردن کے نام سے موسوم کیا۔ اسرائیلی مقبوضہ علاقہ میں پہلے عرب کی تعداد آٹھ لاکھ اُنسٹھ ہزار تھی۔ اب ایک لاکھ تیس ہزار رہ گئی۔ عرب مہاجرین ہر طرف بھاگ رہے تھے۔

(برطانوی سیاسی تدبر نے انہی ایام میں یہی کیفیت ریاست جموں اور کشمیر میں بھی پیدا کردی۔)

اب "یو این او" کے سامنے یہ سوال تھا کہ عرب مہاجرین کو پھر سے اپنے اپنے گھروں میں بسایا جائے۔ جن کی خانہ ویرانی کی ذمہ داری اس پر عاید ہوتی تھی۔ عرب ریاستوں پر مہاجرین کا ناقابل برداشت بوجھ آپڑا۔ اس کے ساتھ برطانیہ کو بھی اپنا مفاد معرض خطرہ میں نظر آرہا تھا۔ سویٹ روس اس عرصہ میں خاموش نہ تھا۔ "یو این او" کی تجویز امن میں مشکلات پیدا کررہا تھا۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ برطانیہ اور امریکہ کا اقتدار فلسطین یا اس کے کسی حصہ پر نہ ہو۔

امیر عبداللہ جولائی ۱۹۵۱ء میں نماز جمعہ کے لئے مسجد عمر میں داخل ہو رہا تھا کہ اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس کا جانشین امیر طلال دمشق میں عمان حکومت سنبھال چکا ہے۔

واقعات جن کا مذکور سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ دیکھئے کیا صورت اختیار کرتے ہیں۔

خواجہ حافظ کا ارشاد ہے کہ:

شکوہ تاج سلطانی کہ بیم جاں درو درج است
کلاہ خوش تراست اما بہ ترک سر نمی ارزد

شخصی حکومتیں ہمارے زمانہ میں سخت خطرہ میں ہیں اور یہ حکومتیں دنیائے اسلام یا پس ماند اقوام میں ہی رہ گئی ہیں۔ جمہور کی بیداری جہاں کہیں بھی ہے ان کو موت کی نیند سلا رہی ہے اس شعر میں ان لوگوں کے لئے بھی سبق ہے۔ جو محض حکومت اور شکوہ سلطانی کے دلدادہ ہیں خواہ یہ کسی جمہوریہ کے صدر ہی کیوں نہ ہوں۔ حکومت خواہ دینی لباس میں ہو یا دنیوی لبادہ میں قطعاً غیر اسلامی ہے۔ الحکم للہ۔

جمہوریہ ترکیہ

جمہوریہ ترکیہ ہمارے اپنے زمانہ میں خلافت یا سلطنت شخصی کے بعد ظہور میں آئی ہم بیان کر چکے ہیں کہ قریش کے بعد غیر قریش مسلم حکمرانوں کو سلاطین ہی کہا گیا ہے۔ جب سلطان "سلیم" نے شام اور مصر اور عرب کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ تو ماسوائے ایران جو اس وقت صفوی خاندان کے تحت تھا۔ دنیا۔ اسلام ایک مرکزی حکومت کے تحت آگئی۔ ماورائے ایران، ہندوستان وغیرہ کے حالات مختلف تھے۔ کم از کم سکہ اور خطبہ میں سلطان "سلیم" ہی کا نام ان ممالک میں رائج تھا جو براہ راست اس کے زیر حکومت تھے "خالدہ ادیب خانم" کی یہ رائے ہے کہ سلطان سلیم تمام دنیاء اسلام کو متحد کرنا چاہتا تھا۔ خلافت کا سوال بھی سلطان سلیم ہی کے عہد میں پیدا ہو چکا تھا کہ آیا غیر قریش مسلم بھی خلیفہ ہو سکتا ہے؟۔ آخری عباسی خلیفہ مصر میں ہی تھا۔ جب سلیم نے اس کا الحاق اپنی سلطنت سے کر لیا۔ عباسی خلیفہ کی دنیوی حکومت کا تو خاتمہ ہو چکا تھا۔ دینی حکومت ایسی ہی تھی، جیسی کسی واجب الاحترام شخصیت پیرومرشد کی ہوتی ہے۔ اگرچہ تاریخ میں یہ واقعہ بھی درج ہے کہ سلیم خلیفہ کو اسلام بول میں لایا۔ اور اس سے حق خلافت حاصل کیا اور خلیفہ کا وہیں انتقال ہوا اور وہیں دفن ہوا مگر یہ صحیح نہیں۔ سلیم کے زمانہ کی دستاویزی شہادت وہ اعلان ہے جو اس نے ۱۵۱۷ء میں خارجی ممالک کے حکمران کو بھی بھیجا۔ اس میں وہ بحیثیت خلیفۃ المسلمین اپنا نام نہیں لیتا۔ "حسن طودون" نے جو سلیم کی فتح مصر کے واقعات کا خود شاہد ہے۔ اور یہ واقعات قلم بند کئے ہیں وہ بھی اس کے دعوئ خلافت کا ذکر نہیں کرتا۔ البتہ اتنا مذکور ہے کہ سلیم نے علما کو جمع کیا اور دریافت کیا کہ آیا یہ صحیح ہے کہ کوئی مسلم مسلمان اس وقت تک حق حکومت نہیں رکھتا جب تک خلیفہ ہی اجازت نہ دے" علماء نے کہا کہ یہ صحیح نہیں۔

سلیم نے اس بحث کو طول نہ دیا اور خلیفہ سے بھی نہ ملا۔

سلیم حلب میں تھا کہ شریف مکہ نے اپنا لڑکا اس کے پاس مکہ و مدینہ کے مقامات مقدسہ کی کنجیاں دے کر بھیجا۔ مسجد میں جب خطیب نے خطبہ پڑھا تو سلیم کو "صاحب الحرمین الشریفین" کہا۔ سلیم نے اسی وقت ٹوکتے ہوئے کہا کہ میں "صاحب" نہیں "خادم" ہوں۔ اس کے بعد خطبہ میں اس کا اور اس کے جانشینوں کا نام "خادم الحرمین الشریفین" ہمارے زمانہ تک رہا۔ خطیب نے جب یہ لقب دہرایا تو سلیم نے اسی وقت فرش مسجد پر سجدہ شکر ادا کیا۔ خلافت کا سوال دراصل سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد میں دنیائے اسلام کی توجہ کا مرکز بنا۔

یہاں تک تو "خالدہ ادیب خانم" کے ایک لیکچر کا اقتباس ہم نے دیا ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ شروع سے یہی رہا ہے کہ خلافت وصفاً نہ کہ نسباً اور یہ کہ آیہ استخلاف میں خطاب کل دنیائے اسلام سے ہے۔ نزول قرآن کے وقت صرف قریش ہی موجود نہ تھے بلکہ دو عربی قبائل بھی تھے۔ قریش کی خلافت انہوں نے اس لئے تسلیم کی کہ اس وقت یہی اس کے اہل تھے اور انہی کے ذریعہ اشاعت اسلام عرب کے طول و عرض میں ہو رہی تھی۔ قرآن میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب ان کی اہلیت نہ رہے گی تو اللہ تعالیٰ اور قوم تمکین دین کے لئے لے آئے گا۔ اس موضوع پر ہم بحث کر چکے ہیں۔

اگر خلافت ایک خاندان میں محدود کر دی جائے تو ظاہر ہے کہ یہ شخصی ہی ہوگی مگر اعتقاد اہل سنت والجماعت نے خلافت کو اس طرح محدود نہیں کیا کہ شخصی حکومت صرف قریش یا بنو ہاشم میں محدود رہے۔ چونکہ بنو ہاشم بالخصوص بنو عباس اور بنو فاطمہ کو آنحضرت سے نسبتاً قرابت قریبہ حاصل تھی اور جو والہانہ محبت مسلمانوں کو آنحضرتؐ سے ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ ہر ایک مسلم خواہ وہ کسی فرقہ سے تعلق رکھتا ہو ان کو ترجیح دیتا رہا۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ حکومت خواہ شخصی ہو یا جمہوری یا اس کی کوئی بھی صورت ہو اسی حال میں اچھی ہے جب حالات ذہنی اور خارجی کے مناسب ہو۔ قوموں نے شخصی حکومت کے تحت وہ ترقی کی کہ جمہوری نہیں کر سکی۔ سلطنت کی کوئی بھی صورت ہو بہرحال ایک شخصیت ضرور ممتاز نظر آئے گی۔ اس لئے فقہا کا یہ فتویٰ صحیح ہے کہ مسلمانوں میں سے

تریں خلائق ہی د صفاً خلیفہ ہونا چاہیئے خواہ اس کی قومیت کچھ ہی ہے اور یہ حکومت شخصی ہو یا جمہوری سب خلافت میں داخل ہیں ۔

اسلامی شخصی حکومت میں مطلق العنانی نہیں ۔ یہی سلیم جو کئی وزراء کو جب اپنی مزاج کے خلاف دیکھتا تو قتل کرنے سے بھی نہ چوکتا ۔ شیخ الاسلام "جمال آفندی" کے سامنے جھک گیا ۔ اور اپنے اعلان دربارہ اخراج یہود و نصاریٰ کو منسوخ کرنا پڑا ۔ خلیفہ احکام شریعت کا ایسا ہی پابند ہے جیسا کہ ہر ایک مسلمان مومن ہونا چاہیئے ۔ اس لیئے خلافت اسلام کی حکومت ہے خواہ اس کا نمائندہ کوئی امیر ہو یا سلطان یا شاہ ، یا یہ بھی نہ ہو جیسا کہ شیخ الاسلام تھے ۔

ضیاء گیوک الپ

جمہوریہ ترکیہ اس وقت قائم ہوئی جب سلطنت عثمانیہ کمزور ہو چکی تھی کہ اس کے مقبوضات ایک کے بعد دوسرا ہاتھ سے نکل رہے تھے ۔ اور دول یورپ اس کو طنزاً "یورپ کا بیمار" کہتے ۔ برطانیہ جو شروع سے بدترین دشمن رہا ہے منصوبہ باندھ چکا تھا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے اسی طرح یورپ سے خارج کیا جائے جس طرح ہسپانیہ میں کیا گیا تھا ۔ اور یہ کہ اس کے ایشیائی اور افریقی مقبوضات کے بھی حصے بخرے کر کے دول یورپ میں تقسیم کر دیئے جائیں ۔ اس کا علم ترکوں کو تھا جس پر عمل اٹلی کے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان سے بھی پہلے شروع ہو گیا تھا ۔

آخر دو جنگوں نے اس منصوبہ کو اور زیادہ نمایاں کر دیا ۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک یعنی اول جنگ عظیم کے خاتمہ تک جو تاریخی واقعات رونما ہوئے ان کا اثر بعض ترک مفکرین پر بہت گہرا ہوا ۔ "بیمار روم" کی صحت کی بحالی کے کئی نسخے تجویز ہوئے ۔ ان میں سے ایک شخصیت "ضیاء گیوک الپ" ممتاز ہے ۔ یہ کرد تھا یا ترک آج بھی بحث کا موضوع ہے ۔ مگر وہ اپنے آپ کو ترک ہی کہتا ہے ۔ والدہ ضرور ایک کرد خاتون تھی ۔ یہ شخص اعلیٰ پایہ کا ادیب شاعر تھا ۔ اور اس نے نظم و نثر میں اپنی قوم کو جھنجوڑا ۔ اسلام اور خلافت یا حکومت اور بالخصوص قوانین شریعت کے بارہ میں جو اس کا نظریہ تھا ۔ وہ مصطفیٰ کمال پاشا کی عملی زندگی میں جہاں تک ان امور کا تعلق ہے نظر آتا ہے ۔ اس کے مقالے نظم و نثر میں مقامی

رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوتے رہے۔ اور کچھ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئے۔

اگرچہ ضیا گیوک الپ اعتقاداً اور عملاً پکا مسلمان تھا۔ مگر "اتحاد اسلامی" کا جو نظریہ جمال افغانی نے پیش کیا تھا۔ اس حد تک اس کا ذہن پختہ نہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ سمجھتا ہو کہ سردست اس کا امکان نہیں۔ وقتی ضرورت تو یہ تھی کہ ترک سب کچھ ترک کر کے اپنے استحکام کی فکر کریں۔ ان کی زندگی ختم ہو رہی تھی۔ اگر وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ تو بحیثیت مسلمان ترک ہی رہ سکتے ہیں کی ذمہ داری بالخصوص ان حالات میں کہ مسلمانوں کی اکثریت غیر مسلم حکومت کے زیر اثر ہے سکتی ہے اور نہ ترکوں میں اتنی سکت باقی رہ گئی تھی کہ وہ خدمات اسلام جو ان کے سلف صالح الپ ارسلان وغیرہ کر چکے ہیں ادا کر سکتے ہیں۔

ضیا گیوک الپ نے ایک تحریک شروع کی جس کو وہ "ترک چلوک" (NKISM) سے موسوم کرتا ہے۔ اس تحریک کو انتہائی عملی صورت "اتاترک" نے دی۔ اور اتنا اعتدال سے تجاوز کر گیا کہ ترکی قومیت میں ترکی زبان کے سامنے دنیا جہان کی قومیت اور زبانوں کو کچھ حقیقت ہی نہ سمجھتا تھا۔ اس میں اس حد تک غلو کیا کہ اسلام سے بھی بیگانہ ہو رہا تھا اور جو اس کی راہ میں سد راہ ہوا خواہ کتنا ہی بڑا عالم دین ہوتا اس کے حکم سے مارا گیا۔

اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا

حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں ترکوں کی تاریخ جو لکھی جاتی اس میں اس قوم کے شاندار ماضی کو یعنی زمانہ جو اسلام سے پیشتر من حیث القوم ان پر گزرا بہت سراہا جاتا۔ اور یہ ذہن نشین کیا جاتا کہ "ملا ازم" کے زیر اثر وہ تنزل میں آ رہے اور ملا ازم اور اسلام دو مختلف نام ایک ہی حقیقت کے ہیں۔ اس کا اثر بھی "ضیا گیوک" کی نظم و نثر میں پایا جاتا ہے۔ مگر وہ تو ایک مفکر تھا شاعرانہ تخیل اس کو ضرور کبھی کبھی اس وادی میں سرگرداں کرتا رہا۔ مگر اس نے اسلام کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

اتاترک ایک سپاہی تھا۔ علم دین سے کچھ بہرہ نہ تھا۔ لیکن نسلی امتیاز اور فوقیت کو عملاً اس طرح اس نے اپنی قوم کے ذہن نشین کیا۔ اس نے بے پناہ حرارت ترکوں میں پیدا کر دی وہ گرتے گرتے سنبھلے۔ جب ایک دفعہ سنبھلے تو پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ اور جس پامردی سے

ورپ کو ٹھکرایا۔ وہ تاریخ میں بالخصوص ترکوں کی تاریخ میں ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔

اگرچہ "اتاترک" "ڈکٹیٹر" تھا مگر وہ ترکی قومیت کا مجسمہ بھی تھا۔ اور اس قومیت کی کشتی کا جو منجدھار میں پھنس کر رہ گئی تھی۔ ناخدا کھیویا تھا۔ اور اسے ساحل مراد پر ان حالات میں لے آیا کہ اہل یورپ کو یقین تھا کہ موجوں کے تھپیڑے اسے پاش پاش کر دیں گے۔ اگرچہ وہ شان و عظمت اور وسعت سلطنت نہ رہی جس کا مذکور ہم کر چکے ہیں۔ مگر بحیثیت ایک اسلامی سلطنت آج بھی موجود ہے۔ اور اتنی مضبوط ہے کہ اسے بھی اور دشمنوں کو بھی یقین ہے کہ دیر تک اپنا استقلال قائم رکھ سکتی ہے۔ اس جمہوریہ ترکیہ کے حالات ہم بالاختصار بیان کرتے ہیں۔

ہم اس کتاب کے دوسرے حصہ میں بیان کر چکے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ کس عروج پر تھی۔ اور کس طرح ابتداء میں بتدریج زوال میں آگئی۔ سلطان عبدالحمید کے عہد میں زوال میں وہ سرعت تھی کہ خود ترک افسروں کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ وقت دور نہیں کہ اگر یہ لیل و نہار ہیں تو وہ صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔

مدحت پاشا نے سلطان کے اختیارات حکومت کم کرنے کے لئے تحریک شروع کر دی مجلس مشاورت (پارلیمنٹ) قائم ہوئی۔ مگر سلطان منصوبہ بندی کرنے لگا کہ توڑی جائے مدحت پاشا کو جلاوطنی کا حکم ملا۔ مگر اس کے نظریئے نوجوان طبقہ پر اثر کر چکے تھے۔ ان کی شورش سے مجبور ہو کر سلطان یہ چال چلا کہ مدحت کو واپسی کی دعوت دی اور سمرنا کی ولایت بھی پیش کی۔ وہ آیا اور گرفتار ہوا۔ اور سلطان عبدالعزیز کے قتل کا مجرم قرار دیا۔ فتویٰ موت صادر ہوا مگر سلطان نے عمر قید میں بدل دیا۔

مدحت "طایف" میں نظر بند تھا۔ ادھر عبدالحمید نے یہ ارادہ کیا کہ چپکے چپکے اسے اور اس کے رفقائے کار کو موت کی نیند سلا دے۔ چنانچہ یہ منصوبہ کامیاب ہوا۔ مدحت کے اکثر رفقاء کار یا تو مارے گئے یا جلاوطن ہوئے۔ لیکن ان واقعات نے عوام میں جوش پیدا کر دیا۔ آزادی اور حب الوطنی اور آئینی حکومت کی آواز کو دبا دیا گیا۔ مگر جوانان قوم دبنے والے نہ تھے۔ اگرچہ ٹریپولی کے ریگستان اور یمن میں اکثر نظر بند ہوئے۔

مدحت کی "تنظیمات" ترکی زبان میں شائع ہوتی تھیں۔ غیر ترکی اقوام کرد اور عرب اور

البانوی لوگوں اور روسا کو ان کا علم بھی نہ تھا۔ سلطان نے ان کو گانٹھا ٹھیک اسی طرح طرح عرب کا زور توڑنے کے لئے خلفاء عباسیہ نے ترکوں اور پارسیوں کی سرپرستی اختیار اگر صرف ملک کے اندرونی خرخشوں تک نوبت ہوتی تو سلطان شاید کامیاب ہو جاتا مگر روس نے مظالم آرمینیہ کا شاخسانہ کھڑا کر دیا۔ آرمینیہ والوں کو ہر ممکن مدد دی۔ انہوں نے میں شورش اور فساد برپا کر دیا۔ سلطان نے سختی سے دبایا تو حامیان دین مسیحی کب خاموش بیٹھنے والے تھے۔ سلطان ایک طرف تو اپنوں اور دوسری طرف بیگانوں کو ایک ہی لاٹھی سے رہا تھا۔

۱۹۰۴ء میں انگلینڈ اور روس اور فرانس نے ترکی کے حصے بخرے کا منصوبہ کیا۔ ایک جرمنی تھا جو اس میں شامل نہ تھا۔ اس لئے سلطان اس پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ سلطان نے اب اسلام کے نام پر دنیاء اسلام میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ غرض یہ تھی کہ ان ممالک کی مسلم رعایا ان کو حصے بخروں سے باز رکھ سکے۔ مگر یہ "اتحاد اسلامی" (PAN ISLAMISM) وہ بات تھی جس سے یورپ خائف تھا۔ اس لئے ترکی مقبوضات کی تقسیم ازبس ضروری تھی پہلے یونان کو اکسایا۔ وہ اٹھا تو سہی مگر ادھم پاشا نے ۱۸۹۷ء میں اسے نیچا دکھایا۔

اس وقت ترک نوجوانوں نے پیرس میں ایک پارٹی (YOUNG TURKISH PARTI) کی طرح ڈالی اور یہاں سے تحریک آزادی جاری رکھی۔ اکثر فوجی افسران کو اپنا ہم خیال بنالیا کافی تقویت ہوگئی تو اس کا مستقر "سالونیکا" میں بدل دیا۔ اس کے بعد اتحاد و ترقی کی کمیٹی (UNION AND PROGRESS COMMETTEI) کی تشکیل ہوئی۔ اور اس کی مجالس میں رازدارانہ منصوبے باندھے جاتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عسکری قوت ان کے ہاتھ میں اور اکثر فوجی افسر اس کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس آزادی کی جدوجہد میں کئی مارے گئے مگر سپہ سالار افواج ترکیہ شوکت پاشا نے اپنی مقدونی فوج کے ساتھ قسطنطنیہ کو محاصرہ لے لیا۔ فتحی بے، شکری بے، نیازی بے، انور بے اور عصمت پاشا بھی اپنی اپنی فوج ساتھ ملحق ہو گئے۔ اور سلطان کو معزول کر کے ۱۹۰۹ء میں سلطان محمد خامس (محمد رشاد) کے سر پر تاج سلطنت رکھدیا۔ عبدالحمید نظر بندی میں ۱۹۱۸ء میں جب کہ دوسرا جنگ عظیم

ہوا فوت ہوگیا۔

ترک نوجوان (YOUNG TURKISH PARTY) اعلیٰ طبقہ کے امراء کے نونہال تھے اتحاد و ترقی کی پارٹی میں ادنےٰ طبقہ کے لوگ دفتروں کے منشی متصدی اور دکاندار وغیرہ زیادہ تر شامل تھے۔

۱۹۰۹ء میں ترقی و اتحاد کی کمیٹی نے عنان حکومت سنبھال لی۔ ابتداء میں عام رائے تو یہ تھی کہ صرف مدحت پاشا کی "تنظیمات" کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ اور یہ بھی اسی حد تک کہ دستوری حکومت قائم کی جائے گی اور بس۔ لیکن کمیٹی کو نظام سلطنت کا تجربہ ہی نہ تھا اس لئے مناسب یہی خیال کیا کہ پرانے تجربہ کار سیاست دانوں سے کام لیا جائے۔ لیکن وہ نئے تبدیل شدہ ذہنی اور خارجی حالات سے عملاً ناواقف تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ موجودہ نسل کا کیا مطالبہ ہے اور خارجی حالات کا تقاضہ کیا ہے۔

مسیحی رعایا تو دل و جان سے ترکوں کے دوش بدوش اتحاد و ترقی کے لئے تیار تھی مگر ان کے مذہبی پیشوا کسی اور خیال میں تھے اور وہ اس منصوبہ کے زیر اثر تھے جو باہر تیار کیا گیا تھا کہ ترکیہ کو پیش از وقت ختم کر دیا جائے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ان کو بھی وہی شہری حقوق ویسے ہی ملنے چاہئیں جیسے ترکوں کو حاصل ہیں۔ لیکن ذمہ داری کے بوجھ سے سبکدوش ہی رہنا چاہتے تھے فوجی خدمت تو ان سے صدہا سال سے نہیں لی جاتی تھی۔ غیر ترک مسلمان، عرب اور کرد وغیرہ بھی تھے۔ وہ بھی اس نئی طرز حکومت سے مانوس نہ ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان میں سے اکثر سلطان کے وظیفہ خوار تھے اور اسی کا کھاتے اور اسی کے گن گاتے تھے۔ علاوہ ازیں ایک طبقہ رجعت پسند بھی تھا۔ اب وظائف بند ہو گئے اور مصیبت یہ آپڑی کہ سلطان نے جاسوسی کا محکمہ قائم کیا ہوا تھا۔ ہزاروں آدمی بے روزگار ہو گئے۔ ان کی رپورٹیں ان لوگوں کی سیاسی سرگرمی کے خلاف دفتر میں موجود تھیں جو اس وقت برسر اقتدار تھے ان خفیہ پرچہ نویسوں نے سمجھ لیا کہ ان کی خیر نہیں مگر نوجوان ترک پارٹی نے اس دفتر بے معنی کو نذر آتش کر دیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ یہ ابن الوقت جانتے تھے کہ ان کا ذاتی مفاد کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہ بھی پارٹی میں شامل ہو گئے۔ مگر ذہنیت نہ بدلی۔ وہ کارکن جو ہر ممکن مصائب برداشت کر

چکے تھے۔ اور قید و بند کی مشقت بھی جھیل چکے تھے جن کے عزیز و اقارب بھی دور استبداد کا شکار ہوئے اب گوشہ گمنامی میں دھکیل دئے گئے اور یہی ابن الوقت چھا گئے۔ تاریخ ایسے واقعات کا اعادہ ہمیشہ کرتی ہے۔ ان حالات میں ترقی اور اصلاح کی توقع کیا ہو سکتی تھی۔ ادھر یورپ کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ ترکی ان سے علم ہنر سیکھ کر ان کو ہی نشانہ بنائے یا کم از کم مد مقابل ہو۔ بوسنیا (BOSNIA) آسٹریا کی سرپرستی میں ۱۸۷۶ء سے تھا۔ اب اس نے اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ جزیرہ کریٹ (CRETE) یونان نے ہتیا لیا۔ اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ آسٹریا اور یونان کا معاملہ صلح و آشتی سے طے ہو گیا۔ مگر طرابلس پر اٹلی کا حملہ ترکیہ کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ کئی فوجی افسر جن میں انور پاشا بھی تھا باوجود اس امر کے کہ مصر سنگ راہ اور بحر حائل تھا اور برطانیہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہاں نہ پہنچ سکیں پہنچ ہی گئے۔ دنیائے اسلام بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں میں بھی ہیجان پیدا ہو گیا۔ مگر یہ سب کچھ ہنگامہ کا ابال تھا۔ اٹلی کا قبضہ طرابلس پر ہو ہی گیا۔ شیخ سنوسی کا نام بھی پہلی دفعہ ہندوستانیوں نے سنا۔ برطانیہ نے اٹلی کو کامیاب بنانے کے لئے ادھر ہمسایہ بدر یاستہائے بلقان کو کھڑا کر دیا۔ اکثر تجربہ کار افسر محاذ طرابلس پر لڑ رہے تھے۔ ادھر میدان خالی تھا۔ بلقانی منہ اٹھائے بڑھتے آئے۔ انور پاشا کو طرابلس چھوڑ کر گھر کی خبر لینی پڑی۔

روس میں اس وقت اعلیٰ پایہ کا سیاسی مدبر اسولسکی (ASWOLSKI) تھا۔ روس کی نظر ہمیشہ قسطنطنیہ اور آبنائے باسفورس پر رہی۔ یہ اس وقت روسی وزیر خارجہ تھا۔ اگر فرانس اور برطانیہ کبھی رضامند ہو جاتے تو یہ وقت ترکی پر ایسا آپڑا تھا کہ روس کی کامیابی یقینی تھی۔

روس کا معاہدہ دربارہ افغانستان اور تبت اور ایران ۱۹۰۷ء میں ہو چکا تھا۔ تبت اور افغانستان کے بارہ میں یہ سمجھوتہ ہو گیا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ کم از کم روس ان کے معاملات میں دخل نہ دے گا۔ برطانیہ کو کھلی چھٹی دی گئی تھی۔

ایران کو دو حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کیا گیا۔ برطانیہ سے اور زیادہ خلاملا اس سے بھی ہو گیا کہ روس نے جرمنی کو گھیرے میں لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ یہ سب کچھ روس آبنائے باسفورس کے لئے کر رہا تھا۔ مگر جو قیمت روس نے پیش کی اور پیشگی دے دی وہ برطانیہ کی نظر میں

نہ جچی۔ اب روس نے دیکھا کہ اس طرح تو کام نہ بنا، آسٹریا کو گانٹھا اس نے بوسنیا کے الحاق پر رضامندی ظاہر کی مگر یہ پخ بھی لگادی کہ بلگیریا اور رومانیہ کا بھی اپنا ئے پر حق رہے گا۔ اب روس نے ریاستہائے بلقان کو بھڑکایا۔ غرض یہ تھی کہ انگلینڈ اور فرانس جب ترکیہ ختم ہو جائے گی خود بخود روس کا مطالبہ تسلیم کریں گے۔ اب "سلافی اتحاد" (PAN- SLAVIST) تحریک شروع ہوگئی جس کی عنان قیادت روس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کی زد براہ راست آسٹریا اور ہنگری پر بھی پڑتی تھی۔ اس لئے کہ "سربیہ" کا اکثر حصہ اس کی مملکت میں تھا۔ روس نے اسی سال ایک خفیہ معاہدہ بلگیریہ سے بھی کیا جس کی پانچویں دفعہ یہ تھی کہ روس ہر ممکن امداد بلقانی ریاستوں کو جرمنی اور آسٹریا ہنگری کے خلاف جدوجہد آزادی میں دے گا۔ ۱۹۱۲ء میں ایک اور خفیہ معاہدہ بلگیریہ اور سربیہ سے روس نے ترکی کے خلاف کیا۔ اس کی اطلاع فرانس کے صدر پائینکار (POINCARE) کو بھی دی مگر رازداری کی تاکید بھی کردی۔

ترکی کو روس اور اٹلی اور ریاست ہائے بلقان نے یقین دلایا کہ وہ سب امن پسند ہیں اور ان کا کوئی ارادہ نہیں کہ ترکی کی نئی حکومت کے راستہ میں مشکلات ڈالیں۔

اٹلی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ :۔

"اگر ترکی طرابلس خود بخود پیش کرے تو اٹلی انکار کر دے گا"

یمن میں کچھ شورش تھی۔ ترکی نے اپنی فوجی جمعیت طرابلس سے یمن میں منتقل کر دی۔ جب اٹلی نے میدان خالی دیکھا تو طرابلس پر قبضہ کر لیا۔ اب ترکوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور سمجھ لیا کہ وہ منصوبہ جو دول یورپ ترکی کے مقبوضات کے بارہ میں باندھ چکے ہیں بروئے کار آ رہا ہے اور اس پر عام حملہ ہر طرف سے ہونے والا ہے۔

ترقی اور اتحاد پارٹی کا وقار جاتا رہا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ رجعت پسند ایام گزشتہ کی یاد کرنے لگے۔ عوام کی ذہنیت پر بھی اس کا اثر نمایاں ہو رہا تھا کامل پاشا پرانا تجربہ کار سیاستدان تھا۔ پارلیمنٹ ٹوٹ گئی تو وہ برسر اقتدار آ گیا۔ وہ شروع سے برطانیہ کی طرف مائل تھا۔ اور اب اسے یقین دلایا گیا تھا کہ برطانیہ جنگ کی اجازت نہ دیگا

شوکت پاشا نے فوج کی تنظیم اعلیٰ پیمانہ پر کی تھی۔ کامل پاشا نے ۱۹۱۲ء میں ستر ہزار تجربہ کار سپاہیوں کو جو سرحدات پر متعین تھے غیر مسلح کر دیا۔ لیکن جب جنگ ایک امر واقعہ بن گئی تو ترکی نے دول یورپ کو مداخلت کی دعوت دی۔ مانٹی نیگرو نے دیکھا کہ ترکی ہر ممکن مراعات دینے کے لئے تیار ہے اس لئے اعلان جنگ کر دیا۔ دوسری طاقتوں نے بھی تقلید کی۔ ترکوں کے پاس اس وقت ایک لاکھ رنگروٹ ہی تھے۔ بلگیریہ کے پاس ایک لاکھ، سربیہ کے پاس اسّی ہزار اور یونان کے پاس پچاس ہزار سپاہ تھی۔ جنگ شروع ہوا تو برطانیہ نے اعلان کیا کہ توازن (STALUSQUO) برقرار رہے گا خواہ لڑائی کا نتیجہ کچھ ہی ہو۔ برطانیہ کو یقین تھا۔ کہ ترکی دشمن کے مقابلہ میں فتح یاب ہوگا۔ لیکن جب ترکی کو شکست ہوئی تو حروب صلیبیہ کی ذہنیت کا دول یورپ اور صحافت نے مظاہرہ کیا۔ صلیب نے ہلال کو شکست دی اور اب فاتحان کو ثمر فتح کا ذائقہ شناس ضرور ہونا چاہیئے۔ نئی سرحد اور نیا توازن ان کا متفقہ مطالبہ تھا۔ مئی ۱۹۱۳ء میں لندن میں معاہدہ امن وصلح پر دستخط ہو گئے۔ خوان یغما پر اب فتح مندیل پڑے اور باہمی جنگ و جدل میں مبتلا ہو گئے۔

انور پاشا نے موقعہ غنیمت دیکھا۔ یلغار کرتا ہوا "ایڈریانوپل" (ADRIANOPLE) پر آیا اور قابض ہو گیا۔ اور اسی طرح آگے بڑھتا اور پھر سے کھوتے ہوتے علاقہ کو واپس لے لیتا۔ مگر دول یورپ درمیان میں آ گئے۔ بلگیریہ کو ترکوں نے شکست دی۔ اگست ۱۹۱۳ء میں "بوکارسٹ" (BUCHAREST) میں نیا عہد نامہ مرتب ہوا۔ آسٹریا غالباً آدھمکتا مگر انگلینڈ، فرانس اور جرمنی نے باز رکھا۔ اس لئے ایک سال کے لئے متوقع اول جنگ عظیم ملتوی ہو گئی۔

روس کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ اب اس نے بھی سمجھ لیا کہ بلقانیوں کی وساطت سے ابنا پر قبضہ نہیں ہو سکتا۔ بلگیریہ اس وقت قسطنطنیہ کے نواحی پر قابض تھا۔ اس لئے ترکی مقبوضات کے حصے بخرے دول یورپ کو براہ راست آپ ہی کرنے مناسب تھے نہ کہ مقبوضات میں عام بغاوت کے ذریعہ۔ اس کا فائدہ تو ان ریاستوں کو ضرور ہوا کہ آزاد ہو گئیں مگر دول یورپ بالخصوص روس کے کیا ہاتھ لگا؟

محمد شوکت پاشا خود عرب نژاد تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ دول یورپ میں سے کسی پر اعتماد کرنا خود فریبی ہے۔ یہ آزادی جو ترکی مقبوضات کی ریاستوں کو مل رہی ہے۔ مناسب ہے کہ عربی ریاستوں کو بخوشی خاطر دی جائے اور عربوں سے ترکوں کا اتحاد ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی یورپی طاقت سے ہو۔ جب ترک دول یورپ کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے تو عربوں کی طرف رجوع کیا۔ ان میں آزادی کا ولولہ جوش مار رہا تھا۔ شریف مکہ مقامات مقدسہ کا کلید بردار تو نسلاً بعد نسل تھا ولئے حجاز بھی بن گیا۔ اگر ترک اسی فراخدلی سے وہ کام کرتے جو برطانیہ نے اول جنگ عظیم کے بعد کیا تو غالباً ترکی تاریخ کا باب اور ہی طرح لکھا جاتا۔ ہر ایک کام کا مناسب وقت ہوتا ہے۔" کل امر مرہون باوقتہا" بے وقت کوئی کام بھی مفید نہیں ہوتا۔

جب شریف حسین والئے حجاز کو انگریزوں نے یہ سبز باغ دکھایا۔ کہ آپ کے سر پر کل اقوام عرب کے ممالک کا تاج برطانوی زرگر کا تیار کردہ رکھ دیا جائے گا۔ تو اس نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اب ترکیہ سمٹ سمٹا کر ایشیاء کوچک میں محدود ہو گئی۔ قسطنطنیہ کو دول یورپ کی رقابت نے بچا لیا۔

دوران جنگ میں اتحاد اسلامی کے نام ترکیہ نے دنیاء اسلام کی طرف رجوع کیا۔ ترکی خلافت اگر اتنا ہی کام کرتی جتنا دم میں یورپ کرتا رہا اور کرتا ہے تو اس کی کامیابی یقینی تھی مگر اس سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔ اب "فتویٰ جہاد" صادر کیا تو کسی نے لبیک تک نہ کہا۔ بلکہ عرب ہی مخالفت پر سب سے پہلے اٹھے۔ "اتحاد اسلامی" (PAN ISLAMISM) کی قیادت اس وقت انور پاشا کر رہا تھا۔ جب یہ نظریہ کامیاب نہ ہوا۔ تو اتحاد توران (PAN TURANISM) کی قیادت سنبھال لی۔ ترک سلطنت ترکی کے باہر زیادہ تر روسی حکومت کے تحت تھی۔ ان سے اتحاد، روس سے لڑائی مول لینی تھی۔ یہ جواب اتحاد سلافی (PAN SLAVISM) کا تو تھا مگر یہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ انور ترکستان میں اتحاد کی تبلیغ کر رہا تھا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہونے شروع ہوئے۔ روسیوں سے جھڑپیں بھی ہوئیں۔ آخر بخارا میں مارا گیا۔

روس نے جو ڈھونگ اتحاد سلافیہ کھڑا کیا تھا ویسا ہی جرمنی نے اتحاد نار دیہ (NARDIA) یا جرمنیہ (PAN GERMANISM) برپا کیا۔ اتحاد کی تہ میں زار اور قیصر کا مطلب کچھ اور تھا۔ اسی وضع کا اتحاد تورانیہ بھی تھا۔ غرض یہ تھی کہ موجودہ ترکی کی سیاست بحال اور قائم رہے۔ ان اتحادوں کا فائدہ برطانیہ نے اٹھایا۔ روس کو اپنے ساتھ ملا لیا کہ جرمن کا حوصلہ پست ہو۔ اور ساتھ ہی تورانی اتحاد کا خطرہ جو روس کو تھا رفع ہو جائے۔ جنگ کے آخر میں تینوں اتحاد ملیامیٹ ہو کر رہ گئے۔

اول جنگ عظیم شروع ہوا تو ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ تمام لڑائی کا زور درہ دانیال پر تھا۔ ترکوں نے اپنی روایتی بہادری کے جوہر دکھائے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ترکوں نے اس وقت تک ہتھیار نہ ڈالے جب تک اس کے حلیف جرمنی نے ہار نہ مان لی۔

متارکہ کی شرائط میں سے ایک یہ تھی کہ تمام اہم مقامات پر اتحادی فوج کا قبضہ اس وقت تک رہے گا جب تک باضابطہ معاہدہ صلح نہیں ہوتا۔ اس لئے قسطنطنیہ پر انگریزی فوج قابض ہوگئی۔ درہ دانیال اب اس کے تحت تھا۔ اور ابنا میں انگریزی بحری بیڑہ تھا۔

انگلینڈ اور فرانس اور روس میں مارچ ۱۹۱۵ء میں ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کی روسے درہ دانیال روس کے حوالہ کیا گیا۔ اس کا دیرینہ خواب پورا ہوا۔ اور غالباً تاریخ دانی کی کچھ اور ہی صورت ہوتی۔ اگر "بولشویک" تحریک زار روس کا تختہ نہ الٹ دیتی۔ اس لئے یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو کر رہ گیا۔

دوسرا معاہدہ لندن پیکٹ (LONDON PACT) پر اپریل ۱۹۱۵ء میں دستخط ہوتے۔ اس کی روسے عدلیہ کی پیشکش اٹلی کو کی گئی۔

تیسرا معاہدہ سائکس پیکٹ (SYKES - PACT) عرب ممالک کی تقسیم کے بارہ میں روس اور انگلینڈ اور فرانس اور اٹلی کے مابین ہوا۔ یہ خفیہ رکھا گیا۔ اس کا علم شریف حسین کو نہ تھا۔ لیکن جب بولشویک (BOLSHEVIKS) نے من وعن شائع

کر دیا تو شریف حسین کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔

ان واقعات کا ذکر ہم مناسب مقام پر کر چکے ہیں۔

متارکہ (ARMISTICE) کی رو سے اتحادی فوجیں اسلام بول اور سلیشیا اور چناق پر قابض ہو چکی تھیں۔ چھ ماہ تک ترکوں کو یہ غلط فہمی رہی کہ یہ قبضہ عارضی ہے۔ جوں ہی معاہدۂ صلح پر دستخط ہوئے۔ اتحادی چلے جائیں گے۔ ترک غیر مسلح ہو رہے تھے۔ اور ان کی کوئی انتظامیہ حکومت نہ تھی۔ سلطان کے نام اتحادی فرمان اور اعلان شائع کرتے رہے۔ اتحاد اور ترقی کے لیڈر ملک سے نکل گئے تھے۔ بعض کی گرفتاری درپیش تھی۔ اور وہ ادھر ادھر سر چھپائے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک مصطفےٰ کمال پاشا بھی تھا۔

اب برطانیہ کو ایک نئی تجویز سوجھی۔ روس کو تو درہ دانیال میں داخلہ کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ آسٹریا، ہنگری اور اٹلی بھی اس کے مفاد کے لئے خطرناک ہی تھے یونان کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ اتحادیوں نے مشرق قریب میں یونانی شہنشاہیت کا قیام تسلیم کر لیا۔ ان کی باہمی رقابت کا یہی واحد حل تھا۔ درہ دانیال اتحادیوں کے لئے ہمیشہ ہر وقت کھلا رہے گا۔ اور ترک اور روس اور بلگیریہ مداخلت نہ کر سکیں گے۔ اس منصوبہ میں "آرمینیہ" کی بھی ایک سلطنت بحیرہ روم سے بحیرہ اسود تک اور "سمسون" (SEM SOUN) سے بحیرہ ابیض تک کچھ ترکی اور کچھ ایرانی مقبوضات کی قطع برید کے بعد قائم کی جانی تھی۔

قلعہ بحیرہ اسود پر کاظم قارابکر پاشا منظم پندرہ ہزار کی ترکی جمعیت کے ساتھ موجود تھا شرائط متارکہ کی رو سے اتحادی فوج نے سمرنا میں اترنا تھا۔ لیکن ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو یونانی فوج اتاری گئی۔ اب ترکوں نے سمجھ لیا کہ اتحادی کیا چال چل گئے۔ انہوں نے پھر ہتھیار سنبھال لئے۔

آرنلڈ ٹون بی (ARNOLDTOYNBEE) لکھتا ہے کہ:۔

"۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو ایک تباہ کن قوت کو کھلی چھٹی دی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آتش فشاں یک دم پھٹ پڑا۔ سمرنا کے کوچہ و بازار میں نہتے زن و

مرد کا قتل عام ہو رہا تھا۔ مکان نذر آتش کئے گئے۔ دیہات میں لوٹ گھسوٹ کا بازار گرم تھا۔ نسل انسانی و حیوانی کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ فصلیں تباہ ہو گئیں۔ سمرنا اور قسطنطنیہ کے درمیان تمام رسل و رسائل کے ذرائع منقطع ہو گئے اور قتل و غارت اس سرعت سے ہو رہی تھی کہ ترکوں کو سنبھلنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔"

(یہی المیہ مشرقی پنجاب میں بھی تقسیم ہند کے بعد کھیلا گیا۔)

لیکن ترک لڑنا اور مرنا اور مارنا جانتے تھے۔ ان کی تاریخ شروع سے انہی کارناموں کا تذکرہ ہے۔ کسان اور عام مزدوری پیشہ لوگ زن و مرد جہاں جمع ہو سکے جنگ چپاول (GUERILLA) پر اتر آئے۔ فوجی افسر قسطنطنیہ سے جان بچا کر ان سے آملے اور اب انکی قیادت کر رہے تھے۔ ترکوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو اپنی آزادی پر زندگی قربان کر دیں گے۔ مگر ہتھیار دشمن کے سامنے نہ ڈالیں گے۔

جب یہ "مزاحیہ" اتحادی، ترکی زمین پر کھیل رہے تھے تو یہاں ان کی جمعیت ایک لاکھ سپاہ تھی۔ دوسری طرف کاظم قارا بکر کے پاس پندرہ ہزار اور علی فواد پاشا کے تحت بھی کچھ فوجی دستے اناطولیہ میں تھے۔ باقی چھوٹی چھوٹی جماعتیں چھاپہ مارتھیں۔ اتحادی ان سے غافل نہ تھے۔ سلطان کے حکم سے مصطفےٰ کمال پاشا بحیثیت جنرل ملٹری انسپکٹر (GENEREL — MILETARY INSPECTOR) بھیجا گیا کہ لوگوں کو غیر مسلح کر دے۔

۱۹ رجولائی ۱۹۱۹ء کا دن تھا کہ مصطفےٰ کمال اور رفعت اور علی فواد پاشا اور رؤف بے "امیسیہ" (AMASSIA) پر اکٹھے ہوئے اور ایک عہدنامہ پر دستخط کئے۔ یہی عہدنامہ آئندہ جمہوریہ ترکیہ کا سنگ بنیاد ہوا۔

اس عہدنامہ کی رو سے ۲۳ رجولائی ۱۹۱۹ء میں زیر صدارت مصطفےٰ کمال پاشا ارض روم میں اس نمائندہ جماعت کا انتخاب ہوا جس نے مدافعت اور آئندہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی تھی۔ اور عارضی مستقر اناطولیہ منتخب ہوا۔ اب اناطولیہ نام نہاد سلطان کی سلطنت سے علیحدہ ہو کر خود مختار صوبہ قرار دیا گیا۔ سلطان کی مقرر کردہ وزارت کا کام داماد فرید پاشا چلا رہا

۔اس کی نسبت بھی شبہ ہوا کہ باغیوں سے ساز باز کر رہا ہے۔اس لئے یہ کابینہ بھی توڑ دی۔
۔جنوری ۱۹۲۰ء میں رؤف بے کی زیر قیادت اسلام بول میں پارلیمنٹ کا افتتاح ہوا۔ دیگر افسران
نا میں مصطفےٰ کمال پاشا بھی تھا اناطولیہ میں ہی رہے۔ پارلیمنٹ نے بھی ایک منشور مرتب کیا
اسی کے لگ بھگ تھا جو امیسیہ واقع ارض روم میں مرتب ہوا تھا۔ اس کی ایک نقل
حادیوں کو بھی دی گئی۔ اس میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ:۔

"وہ زمین جہاں ترکوں کی اکثریت ہے اور جہاں متارکہ کے وقت اتحادیوں کا قبضہ نہ تھا۔ ترکیہ کی ملکیت رہے گی اور اسلامبول کی مناسب حفاظت کے بعد باسفورس اور درہ دانیال تجارت کے لئے کھلا رہے گا۔"

اگر اسے اتحادی منظور کر لیتے تو لڑائی جھگڑے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی۔ مگر وہ تو
ٹے بخرے کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

۱۶ مارچ ۱۹۲۰ء کو اتحادیوں نے اور زیادہ فوج اسلام بول میں داخل کر دی اور قوم
رستوں کے گھروں کی عام تلاشی شروع ہو گئی۔ ان کو بستروں سے اٹھا کر گرفتار کیا گیا۔ اور
سمول رؤف بے سب کو "مالٹا" میں نظر بند کیا۔ یہاں پہلے ہی اتحاد و ترقی کے ہوا خواہ گرفتار
شدہ ترک کثرت سے موجود تھے۔ ایک اعلان شائع ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی قوم پرست کو
پناہ دے گا تو سزائے موت کا مستوجب ہوگا۔

مسیحی رعایا کو مسلح کیا گیا اور ہدایت کی گئی کہ ان تمام راستوں پر جو اناطولیہ کو جاتے ہیں،
پہرا دیں اور کسی کو اناطولیہ میں داخل نہ ہونے دیں۔ لیکن ترک اپنے بھائیوں کی ہر طرح مدد کرتے
رہے اور اسلحہ بھی باوجود ناکہ بندی اناطولیہ میں آتا رہا۔

سلطان کے نام پر ایک طویل فہرست قوم پرستوں کی تیار کی گئی جس میں مصطفےٰ کمال پاشا
اور علی فواد پاشا اور ڈاکٹر عدنان اور خالدہ ادیب خانم کے نام نمایاں تھے۔

خانم ہی کے چشم دید حالات کا جو اس نے بیان کئے ہیں اقتباس ہم لکھ رہے ہیں۔
ستم ظریفی دیکھئے کہ شیخ الاسلام نے بھی ایک فتویٰ جاری کیا کہ ان میں سے جو شخص کسی کو قتل
کرے گا۔ انعام و اکرام کا مستحق ہوگا۔ اور یہ انعام بہشت بریں کی نعمتیں ہیں۔ کتنا بڑا کار ثواب

جہاد فی سبیل اللہ کے برابر قرار دیا گیا۔

خالدہ ادیب خانم لکھتی ہے کہ:۔

"مسلمانوں کے اخلاق کس حد تک پست ہو چکے تھے کہ ان کا شیخ الاسلام جانثاران قوم و ملت کے خلاف ایسا فتویٰ صادر کرتا ہے اور وہ بھی دشمن دین کو تقویت دینے کے لئے۔ مگر شیخ الاسلام مدت العمر اس پر پشیمان رہا"

خانم کو معلوم نہیں کہ دشمنان دین کو محض خوش کرنے کے لئے مسلمانوں میں ایسے بھی جو جہاد فی سبیل اللہ کے" فریضہ" کو خدا کی دشمنی قرار دیتے ہیں۔ مرزائی

یونانی فوج کو انیبنو (INN-EUNU) پر عصمت پاشا نے شکست فاش دی فیصلہ کن جنگ ترکوں اور یونانیوں میں سقریہ (SAKARIA) پر ہوئی۔ مصطفےٰ کمال پاشا سپہ سالار ہراول عصمت پاشا کے تحت تھا۔ فوزی پاشا چیف آف دی سٹاف (CHIEF OF THE STAFF)۔ رفعت پاشا وکیل کل قومی دفاع تھا۔ مگر فوج زیادہ تر بے سر و سامان ہی تھی یونانیوں کے پاس اسی ہزار جدید اسلحہ سے مسلح فوج تھی۔ دو سو توپیں اور بے شمار دیگر سامان حرب ترکی سپاہ پچیس ہزار تھی۔ جن کے پاس رائفلیں تھیں اور چھ توپیں۔ گولہ بارود کی بھی کمی تھی۔ جس بے جگری سے ترک لڑے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ سولہ ہزار پانچ سو میدان جنگ میں کام آئے۔ جن میں اکثر افسر بھی تھے۔

لڑائی جاری تھی کہ کاظم قارا بکر نے میدان جنگ سے مصطفےٰ کمال کو تار دیا کہ "جب تک ایک ترک بھی باقی ہے لڑائی جاری رہے گی اور کوئی لڑائی سے منہ پھیرنے کے لئے تیار نہیں" فتح قوم پرست ترکوں کے پرچم پر لہرائی۔ جو قوم باعزت زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اس آزادی کے بغیر ممکن نہیں وہ کبھی شکست نہیں کھاتی۔ اللہ اس کا حافظ و ناصر ہے۔ مگر

"مگر دزکم نامرد را خنجر نمی آید بکار"

اسی ایک لڑائی کا اثر اتحادیوں پر بھی ہوا۔ جسے تائید الٰہی سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ فرانس نے علیحدہ صلح ترکوں سے کر لی اور سلیشیا خالی کر دیا۔ اٹلی عدلیہ سے نکل گیا۔ سویٹ روس نے انقرہ کی گورنمنٹ سب سے پہلے تسلیم کی۔ کاظم قارا بکر پاشا آرمینیہ میں قارص وغیرہ کو انقرہ

کے تحت لے آیا۔ اب ترکی فوج مدافعت سے نکل کر جارحانہ حملہ پر اتر آئی۔ مصطفےٰ کمال بحیثیت سپہ سالار اب ۱۹۲۲ء میں سمرنا کی طرف بڑھا۔ اور ایسی تاریخی شکست دی جو تواریخ عالم میں بعض خاص وجوہ پر یادگار رہے گی۔ مصطفےٰ کمال کے پیش نظر اسلام بول اور باسفورس اور دره دانیال تھا۔ انگریز جنرل ہرنگٹن بری اور بحری فوج لئے سدراہ تھا مگر مصطفےٰ کمال پاشا بڑھتا گیا۔ اور جب چناق پر انگریز جنرل کو لکھا کہ "راستہ سے ہٹ جاؤ ورنہ میں توپوں کا منہ کھول دوں گا" تو انگریز جنرل نے جواب دیا کہ "میں سپاہی ہوں"۔

ترک سپہ سالار بھی سمجھ گیا اور اپنی فوج ایک میل پیچھے ہٹا لایا۔ اس عرصہ میں جنرل ہرنگٹن ہٹ چکا تھا۔ مصطفےٰ کمال کے لئے اسلام بول کا راستہ صاف تھا۔ سلطان وحید الدین اتحادی بیڑہ میں پناہ گزین ہوا۔ اسمبلی نے عبدالمجید آفندی کو بحیثیت خلیفہ منتخب کر لیا۔

لوزان کانفرنس کا افتتاح نومبر ۱۹۲۲ء میں ہوا۔ اور جولائی ۱۹۲۳ء میں ختم ہوئی ترکوں کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے گئے۔ انینو کا ہیرو عصمت پاشا جو بعد میں اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا اول صدر جمہوریہ کے بعد صدر جمہوریہ ہوا نے ترکوں کی اور لارڈ کرزن نے برطانیہ کی نمائندگی کی۔ یہاں بھی دونوں میں سیاسی جنگ جاری رہی۔ اور ترک ہی فتحمند رہا۔

ترکی اسمبلی نے شخصی سلطانی ختم کر دی اس کی جگہ جمہوریت نے لے لی۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں دعویٰ خلافت سے بھی دست بردار ہو گئے۔ شیخ الاسلام کا عہدہ یا منصب بھی اڑا دیا۔ اور امور دینیہ کا دفتر، وزارت عظمیٰ کے تحت آگیا۔ اوقاف سب ضبط ہوئے اور وزارت مال کے حوالے کئے گئے۔ تکیے اور خانقاہیں اور مدرسے سب بند ہو گئے اور زیارت قبور سلاطین اور اولیاء ممنوع قرار دی گئی۔ غرض جمہوریہ ترکیہ ایک سٹیٹ (STATE) بلا چرچ (CHURCH) رہ گئی۔ ۱۹۲۶ء میں سوئز کوڈ (SWISS-CODE) نے فقہ اسلامی کی جگہ لے لی۔ اور عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی حروف ۱۹۲۸ء میں رائج ہوئے۔ اتحاد توران تو خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ لیکن جب تک مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک زندہ رہا ترک علماء دنیا اسلام سے بیگانہ ہی رہے۔ لیکن اس کی وفات کے بعد جب عصمت انینو جانشین ہوا تو رد عمل شروع ہوا اور تا حال جاری ہے۔

آل سعود

اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں ایک شخص محمد بن عبدالوہاب نے کوشش
کہ تمام عرب قبائل کو ایک ہی علم اسلام کے نیچے جمع کرے۔ اس نے اسی سادہ زندگی
طرف متوجہ کیا جو صدر اسلام میں عربوں کا طرۂ امتیاز تھا اور محض لوجہ اللہ ان کا ہر ایک
جان ومال فی سبیل اللہ وقف تھا تاکہ پھر سے اسلام کی عظمت قائم کردیں۔ حکومت ترک
اس میں ایک خطرہ نظر آیا۔ برطانیہ کا اقتدار عرب کے ساحلی علاقہ پر تھا۔ ابن عبدالو
جان بچانی مشکل ہوگئی۔ اس نے نجد میں پناہ لی۔ جہاں محمد ابن سعود حکمران تھا۔ امیر محمد
عالم دین اور واعظ دین محمد بن عبدالوہاب کے درمیان کچھ سمجھوتہ ہوگیا کہ اول تو موعظۃ
اور حکمت سے عربی قبائل کو متحد کیا جائے اور اگر اس سے کام نہ چلے تو بزور شمشیر ہی
محمد بن سعود کی تلوار اور محمد بن عبدالوہاب کی آتش بیانی نے عرب قبائل میں حرارت دینی
پیدا کردی۔

پہلے گھر کی تبرلی۔ داریا اور ریاض میں جتنے مقبرے، مشرکانہ رسوم کے مقامات
خاک کے برابر کردئے۔ تمباکو نوشی، شراب خوری قطعاً ممنوع قرار دی۔ زنا کی سزا رجم
عملاً نافذ ہوگئی۔ قبیلہ کے بعد قبیلہ مطیع ہوتا گیا۔ اور وہابی حکومت ساٹھ سال کے عرصہ
خلیج فارس سے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ تک اور بحر ہند سے شام اور لبنان کی پہاڑیوں
چھاگئی۔ ترکی خلافت معرض خطرہ میں آگئی۔ عراق میں مقدس مقام کربلا بھی ان کی یلغار
نہ بچ سکا۔ حلب پر حملہ کیا اور بصرہ تک دہشت پھیلادی۔ حلب اور دمشق کے نواح کو
نہ چھوڑا۔ اس وقت محمد علی پاشا مصر کا والی تھا۔ خلافت عثمانیہ کے حکم کی تعمیل میں وہ عرب
ان شوریدہ سروں کی سرکوبی کے لئے آگیا۔ وہابیوں کو پے در پے شکست ہوئی۔ نجد

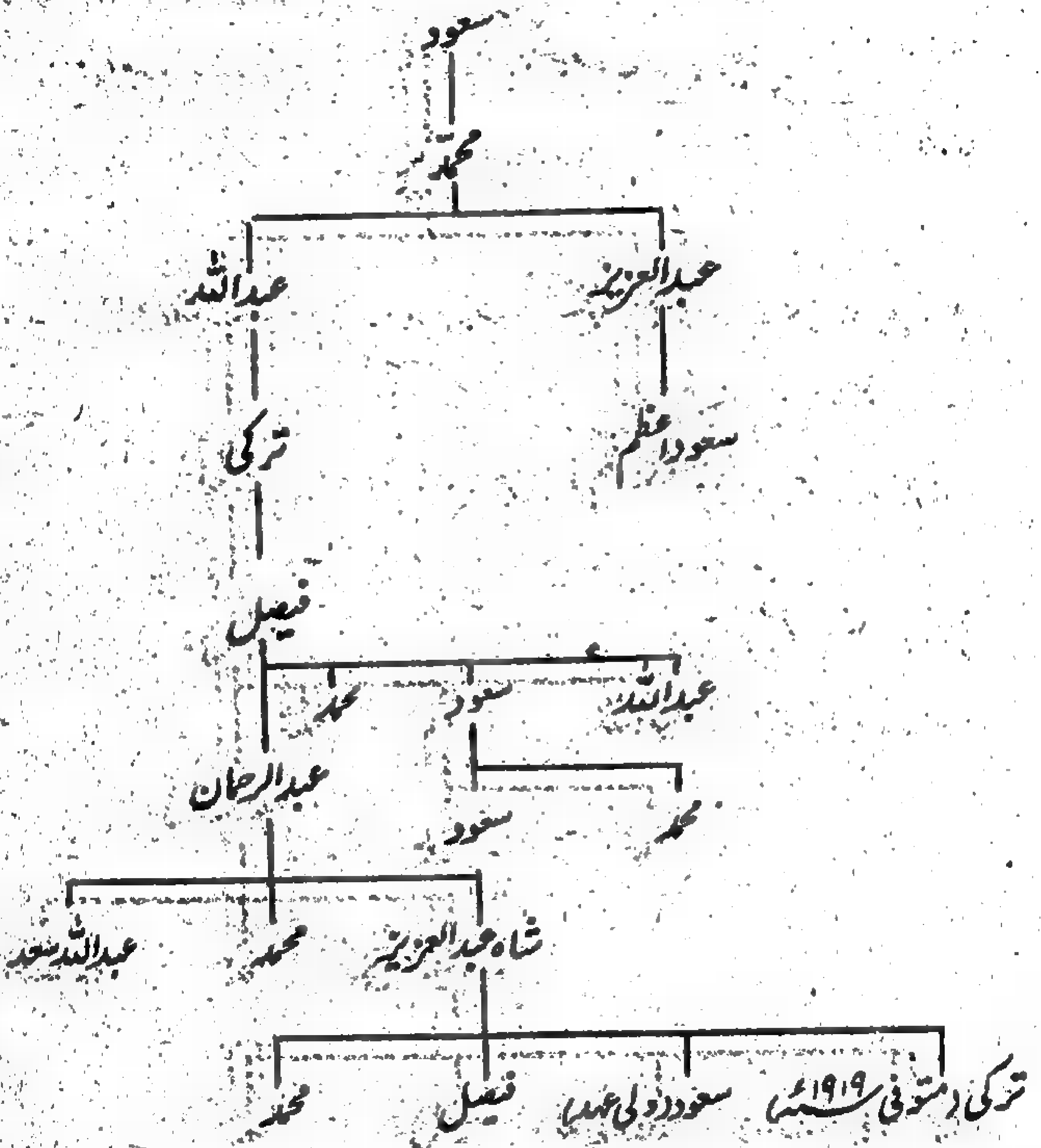
محمد علی کا قبضہ ہوگیا۔ اور وہابی امیر پا بجولاں قسطنطنیہ میں بھیج دیا گیا۔ اور یہاں قتل کیا گیا۔

اگرچہ کہیں کہیں ترکی سپاہ کی چوکیاں عرب میں اس لئے قائم کی گئیں کہ پھر شورش پیدا نہ ہو مگر آزادی کا جذبہ عرب کی فطرت میں ہے۔ اب حکومت سے تو کچھ پرخاش کی طاقت نہ تھی۔ قبائل میں روائتی خانہ جنگی کا آغاز ہوگیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے اختتام تک اسی کا دور دورہ رہا۔

نومبر ۱۸۸۰ء میں صبح صادق کے وقت امیر ریاض عبدالرحمٰن کے ہاں اس کی زوجہ سارہ کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام عبدالعزیز رکھا گیا جو بعد میں اپنے مورث اعلیٰ کے نام پہ "ابن سعود" ہی مشہور ہوا۔ عبدالعزیز کی پرورش وہابی ماحول میں ہوئی۔ اور جیسا اس کا باپ کٹر وہابی تھا یہ بھی اسی کے نقش قدم پر چلا۔

ریاض اگرچہ قلعہ بند شہر ہے مگر اس کے نواح میں بدوی قبائل ڈاکہ ڈالتے رہے شمالی علاقہ میں قبائلی شمار محمد ابن رشید جس کا پایہ حکومت "حیل" تھا متحد کر چکا تھا اور ریاض کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

شجرہ نسب خاندانِ سعود



شیخ کویت

اس خانہ جنگی کا تذکرہ بے فائدہ ہے جو رشید اور عبدالرحمان میں جاری رہی۔ عبدالرحمن کو نہ صرف نجد چھوڑنا پڑا بلکہ اس کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ ایک عرصہ تک وہ ادھر ادھر عرب قبائل میں مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر محمد شیخ کویت نے اس کو دعوت دی اور وہ کویت میں آگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ترکی حکومت رشید کی روز افزوں طاقت سے خائف تھی اور

اس کا زور آل سعود کے ذریعہ توڑنا مطلوب تھا۔ شیخ کویت کو گانٹھا اور اخراجات جو بطور وظیفہ عبدالرحمٰن کو دینے کا وعدہ شیخ نے کیا تھا ترکی خزانہ سے ادا ہوتے رہے مگر شیخ انتہا درجہ کا بخیل تھا۔ وظیفہ کا روپیہ خود ہی خورد برد کر جاتا اور عبدالرحمٰن کے مصائب میں کمی نہ ہوئی۔ جب عبدالرحمٰن کو یہ معلوم ہوا کہ ترکی حکومت کیا چاہتی ہے تو آلہ کار بننے سے انکار کر دیا۔ وظیفہ بھی بند ہو گیا۔

شیخ کا بھائی مبارک جوان مسرف تھا۔ بمبئی کی طرف گیا ہوا تھا جہاں رنگ رلیاں مچاتا رہا۔ افلاس سے تنگ آ کر پھر کویت میں آ گیا۔ بخیل بھائی کیا مدد کرتا بری بھلی زندگی بسر کرتا رہا۔ عبدالعزیز بن سعود اور وہ دوست بن گئے۔ عبدالعزیز کی عمر اس وقت سترہ سال تھی۔ ایک دن مبارک شیخ کے محل میں گیا اور بھائی قتل کر دیا۔ لوگ بھی شیخ سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ مبارک شیخ کویت ہو گیا۔ اب ابن سعود کی توقعات جاگ اٹھیں۔ دو دفعہ ریاض پر لشکر کشی کی اور دونوں دفعہ کامیاب نہ ہوا۔

"کویت" جو خلیج فارس کے سر پر واقع ہے اور اس کی اہمیت دول یورپ بالخصوص جرمنی اور برطانیہ کے نزدیک جیسی کچھ تھی اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ قیصر جرمنی ترکوں سے مل کر قسطنطنیہ سے براہ حلب بغداد ریلوے لائن کی تعمیر کا منصوبہ تیار کر چکا تھا جو "کویت" پر ختم ہوتی تھی۔ برطانیہ ایران میں تیل اور ہندوستان کے تحفظ کے لئے خلیج فارس اور ساحلی علاقہ پر اپنا اقتدار چاہتا تھا اور یہ گوارا نہ تھا کہ یہاں کسی اور یورپی طاقت کی مداخلت ہو۔

جب جرمنی کو یہ معلوم ہوا کہ مبارک برطانیہ کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے اور بغداد ریلوے لائن کے منصوبہ میں سد راہ ہے تو ترکوں کو اکسایا کہ مبارک کو معزول کیا جائے یہ برادر کش اس لائق نہیں کہ شیخی بھگاتا پھرے۔ لیکن انگریز اس کی پشت پناہ تھے۔ اس لئے علانیہ تو کچھ نہ کیا۔ رشید کو اکسایا کہ مبارک کی خبر لے جس نے اس کے دشمن آل سعود کو پناہ دے رکھی ہے۔ رشید کے منہ میں بھی پانی بھر آیا کہ اگر کویت ہاتھ آ جائے تو تمام وسط عرب پر اس کا تسلط بیٹھ جائے گا۔ ترکوں کا خیال تھا کہ اس خانہ جنگی

میں انگریز دخل نہ دیں گے۔

مبارک کی اپنی فوج نہ تھی اس نے قبائل عرب کو جو گردونواح میں واقع تھے ابھارا وہ بھی لوٹ کی طمع پر اکٹھے ہو گئے۔ مبارک یہ چاہتا تھا کہ بیشتر اس کے رشید حملہ کرے اس کا دوست عبدالعزیز بن سعود ریاض پر حملہ آور ہو۔ لیکن باپ کو مبارک سے ایک گونہ نفرت تھی۔ وہ تمباکو نوش ہے اور ریشمی لباس پہنتا ہے اور امیرانہ ٹھاٹھ سے رہتا ہے۔ اس کے مکان میں یورپ کا سامان آرائش بالخصوص عورتوں کی تصویریں اور کیا کچھ نہیں۔ مگر ابن سعود ریاض کے لئے بیقرار تھا۔ مبارک سے خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہیں آخر دس ہزار کی جمیعت سے ریاض کی طرف بڑھا۔ قبائل نجد بھی شامل ہوتے گئے ریاض تک مزاحمت نہ ہوئی۔ مگر یک لخت خبر ملی کہ رشید اور مبارک میں لڑائی ہوئی اور مبارک کو شکست ہوئی۔

اس خبر وحشت اثر نے ابن سعود کی سپاہ پر یہ اثر کیا کہ چپکے سے کھسکنے لگے۔ رشید خود ان کی مزاج پرسی کے لئے ادھر آرہا تھا۔ ابن سعود چند جانثاروں کے ہمراہ دل شکستہ کویت میں واپس آیا۔ رشید بھی تعاقب میں تھا۔ کویت ہاتھ سے جارہا تھا کہ برطانیہ کے جنگی جہاز آپہنچے اور رشید کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

ابن سعود نے پھر ایک دفعہ کوشش کی کہ کچھ مدد مل جائے۔ انگریزوں سے ملا۔ مگر وہ ٹال گئے۔ آخر مبارک کو بھی ہوش و حواس نے مدد دی کہ ممکن ہے کہ رشید پھر حملہ کرے۔ اگرچہ باپ نے منع کیا مگر ابن سعود کے استقلال میں فرق نہ آیا۔ مبارک اس سے زیادہ کیا کر سکتا تھا کہ چند اونٹ اور کچھ سپاہی اور کچھ زر سرخ (ریال) دے کر ابن سعود کو رخصت کیا۔ اسے یہ توقع تھی کہ عربی قبائل کو ساتھ ملالے گا۔ مگر مایوس ہونا پڑا۔ اب اسے ایک اور تدبیر سوجھی۔ چند وفاداروں کے ہمراہ لے سروسامانی کی حالت میں ریاض کی طرف چل پڑا۔ رات کے وقت سفر کرتا رہا۔ آخر رات کے وقت جبکہ بستی خواب خرگوش میں تھی داخل ہو گیا۔ صبح کے وقت جب قصر امیر کا دروازہ کھلا یہ بھی بے تکلف داخل ہو گئے۔ محافظ بوکھلا اٹھے۔ اب دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ قلعہ میں آتش

آدمی تھے کچھ تو گھبراہٹ میں بھاگے کچھ مارے گئے۔ ابن سعود قلعہ پر قابض ہوگیا۔ اس کے پاس اس وقت صرف تیس آدمی تھے۔ شہر میں اعلان کیا گیا کہ "ابن سعود پھر سے قلعہ پر قابض ہوگیا" ریاض کے لوگ رشید سے سخت تنگ تھے۔ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ رشید کے جتنے آدمی جہاں ملے مارے گئے۔

ابن سعود اب ریاض کا مالک تھا۔ عبدالرحمان بھی ریاض پہنچ گیا۔ اور لوگوں نے گرم جوشی سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ چند روز بعد اس نے علماء دین اور اکابر کو جمع کیا اور کاروبار سلطنت ابن سعود کے ہاتھ دے کر گوشہ نشین ہوگیا۔ رشید نے دو تین دفعہ انتہائی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا اور نجد پر مکمل قبضہ آل سعود کا ہوگیا۔

خلافت عثمانیہ آل سعود کے اقتدار کو گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ ابن سعود شیخ کویت کا دوست تھا۔ اور انگریزوں سے بھی مراسم دوستانہ تھے۔ جرمنی اور ترکی کا اتحاد ہو چکا تھا۔ اس لئے عرب بالخصوص نجد پر عثمانیہ حکومت کی گرفت مضبوط ہونی چاہیئے۔ ترکوں نے رشید کو آگے بڑھایا۔ ایک دستہ فوج اور کچھ توپیں بھی دیں۔ اس لڑائی میں ابن سعود زخمی ہوا اور پسپا ہونا پڑا۔ دوسری لڑائی میں ترکوں اور رشید کو پیچھے ہٹنا پڑا شیخ کویت کے ذریعہ ترکوں سے صلح ہوگئی۔ ابن سعود تمام نجد کا والی تسلیم کیا گیا برائے نام ترکی سیادت قائم رہی۔ اب رشید اور ابن سعود کا مقابلہ تھا۔ لڑائی میں رشید مارا گیا۔ ابن سعود نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ اس وقت اس کی عمر ستائیس سال تھی۔

اس وقت قسطنطنیہ انقلاب کی زد میں تھا۔ انور بے اور اس کے رفقاء ترک پارٹی (YOUNG TURKISH PARTY) نے سلطان عبدالحمید کو معزول کر دیا اور پھر سے عثمانیہ سلطنت کی گذشتہ عظمت قائم کرنا چاہتے تھے۔ دمشق سے مدینہ تک ریلوے لائن تیار ہوگئی تاکہ عرب پر کامل تسلط رہے۔ حسین ابن علی شریف مکہ کو والئے حجاز مقرر کیا۔ وہابی سلطان ابن سعود اور سنی شریف والئے حجاز کے مذہبی اختلاف نے دونوں میں دشمنی پیدا کردی۔ شریف حسین اب شریف مکہ نہ تھا بلکہ حجاز کا والی بھی تھا۔

۱۹۱۱ء میں طرابلس پر اٹلی نے حملہ کر دیا اور ترکوں نے بغداد اور بصرہ وغیرہ
فوج جمع کی مگر شکست کھائی۔ بلغاریہ نے ترکوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور قسطن
پر بڑھ رہا تھا۔ بلقان اور ترکوں کی لڑائیوں کا مذکور مناسب مقام پر ہوگا۔ ابن سعود نے
اور جوف پر قبضہ کر لیا۔ اور کویت تک اس کا تسلط ہو گیا۔ ترکوں کے لئے اب اس کے
چارہ نہ تھا کہ ابن سعود کو تمام نجد اور حسا کا سلطان تسلیم کریں۔ نام نہاد سیادت
ابن سعود کو بھی اعتراض نہ تھا۔ اب خلیج فارس پر دو بندرگاہ ابن سعود کے قبضہ میں تھے
لئے اس کی اہمیت انگریز بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

برطانیہ اور جرمن کی رقابت زوروں پر تھی۔ ان کے ایجنٹ شیوخ عرب کے پاس
شروع ہوئے۔ ابن سعود کے پاس شیکسپئر (SHAKESPIER) آیا۔ مدینہ اور بصرہ سے
اور جرمن ایجنٹ آئے۔ ابن سعود سب کی سنتا رہا۔

۱۹۱۴ء میں اول جنگ عظیم شروع ہو گیا۔ ترکوں نے جرمن کا ساتھ دیا۔ ابن سعود
مناسب خیال کیا کہ بالکل غیر جانبدار رہے۔ لیکن پرانے دشمن رشید نے ترکوں کی موافق
کے بعد نجد پر حملہ کر دیا۔ انگریزی ایجنٹ شیکسپئر اس لڑائی میں موجود تھا مارا گیا۔ اور ابن سعود
کو بھی شکست ہوئی۔ خیر گذری کہ فتح مند دشمن نے تعاقب نہ کیا۔ دوسری لڑائی میں ابن
بھائی سعد بھی کام آیا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ابن سعود انگریزوں کا ساتھ دے
اب بغداد کی طرف بڑھ رہے تھے ان سے معاہدہ ہو گیا اور ابن سعود نے مان لیا کہ انگریز
کے دشمن کی مدد نہ کرے گا اور ضرورت ہوئی تو انگریزوں کی مدد کرے گا۔ سر دست انگریز
کو اتنی ہی ضرورت تھی کہ ابن سعود خاموش رہے۔ پانچ ہزار پونڈ ماہوار وظیفہ مقرر ہو گیا۔ سینٹ
جان فلبی (st: JOHN PHILBY) ابن سعود کا مشیر مقرر ہوا۔ یہ شخص پنجاب میں سول
سروس میں تھا۔

راقم الحروف نے ایک تقریب پر سرگودہا میں اس کو دیکھا تھا۔ نوجوان وجیہہ آدمی
جنگ شروع ہوا تو اس نے اپنی خدمات ادھر منتقل کر دیں۔

شریف حسین والئی حجاز کو بھی انگریزوں نے اپنے ساتھ گانٹھ لیا۔ اس کا مشیر کرنل لا

شریف حسین سے وعدہ ہو چکا تھا کہ جنگ کے بعد تمام عرب قبائل کی موتمر بنا دی جائیگی۔ اس کا صدر شریف حسین ہو گا۔ لیکن ابن سعود سے نہ کبھی پہلے بنی اور نہ اب بننے کی توقع دونوں انگریزوں کے حلیف تھے۔ وسط عرب پر ابن سعود کا قبضہ تھا۔ اس نے قبائل کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ ان کی موتمر کا نام "اخوان" تھا۔

شیخ کویت مبارک فوت ہو چکا تھا۔ اس کا بیٹا جابر جانشین ہوا۔ لیکن دوسرا بیٹا مدار المہام تھا۔ آل شمر کی لڑائیوں میں شیخ مبارک نے سالم کو ابن سعود کی مدد کے لئے بھیجا تھا مگر وہ دشمن سے مل گیا۔ اور ابن سعود کو شکست ہوئی۔ اس لئے ابن سعود پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ کیونکہ کویت انگریزوں کی حمایت میں تھا اور انگریزوں سے اس کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ ادھر شریف حسین نے تمام عرب پر اپنی شاہی کا اعلان کر دیا اور ابن سعود کو بھی لکھا کہ میری شاہی تسلیم کرو اور ظلیفہ کے علاقہ سے دست بردار ہو جاؤ۔ اب ابن سعود کو بھی معلوم ہوا کہ اب سو بر شریف سے لڑائی ٹھن جائے گی۔ اس کے لئے تیاری شروع کر دی اور علماء کو تمام عرب میں تبلیغ وہابیت کے لئے بھیجدیا۔ شریف ان سے ٹیکس یا خراج وصول کر رہا تھا۔ جب ابن سعود کے ایجنٹ آئے تو غنیمت سمجھا کہ ایک سے تو خلاصی تو ہوئی۔ ابن سعود کو توقع سے بڑھ کر کامیابی ہوئی۔ "خرما" کے لوگوں نے حسین کے نمائندوں کو قصبہ سے نکال دیا اور صاف جواب دے دیا کہ شریف کو ایک کوڑی بھی نہ دیں گے۔

خرما ایک اہم مقام ہے۔ یہاں تجارتی منڈی بھی ہے حجازی اور نجدی سوداگر اسی منڈی میں اپنا مال فروخت کرتے اور اس مقام کو جہاں تک وسط عرب کا تعلق ہے۔ حجاز کی کلید سمجھا جاتا۔ اب یہ مقام ابن سعود کے ہاتھ میں چلا گیا۔ شریف حسین اس مقام کی اہمیت سے واقف تھا۔ آٹھ سو سوار دوبارہ قبضہ کے لئے روانہ کئے۔ یہاں زیادہ تر حبشی موالی (آزاد غلام) رہتے تھے۔ وہ اور گرد و نواح کے قبائل مقابلہ پر آئے اور شریفی بری طرح پٹ گئے۔

اخوان کا ایک وفد ابن سعود کے پاس آیا اور کہا کہ شریف مشرک ہے اور نا واجب ہے کہ مقدس مقامات اس کے قبضہ میں ہوں۔ اس لئے ہمیں اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیئے ابن سعود نے کہا کہ سچ کہتے ہو میں بھی اسی فکر میں ہوں۔ جب مناسب وقت ہو گا تمہاری خواہش

پوری ہو جائے گی۔

حسین نے ایک اور فوج خرما کی تسخیر کے لئے روانہ کی۔ یہ بھی پٹ گئی۔ ابن سعود نے
ایک احتجاجی مکتوب حسین کو لکھا۔ اس نے مکتوب کو یونہی بغیر پڑھے واپس کر دیا اور قاصدوں کی
زبانی کہا کہ:-

"تیار رہے میں آ رہا ہوں اور اس کے کافر وہابیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا کر رہوں گا۔"
اس کے ساتھ ہی شریف نے والئی کویت اور رشید سے معاہدہ کر لیا کہ متحدہ افواج کے ساتھ
ریاض پر حملہ کیا جائے۔

ابن سعود کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ شریف اور میں دونوں انگریزوں
حلیف ہیں اور انگریز دونوں کو روپیہ اور اسلحہ سے مدد دے رہے ہیں اور شریف کی باگ
ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے۔ فلبی سے اکثر گفتگو ہوتی وہ بھی کہتا کہ ہمارے محکمے مختلف ہیں اور
ایک کا تعلق مختلف حلیفوں سے ہے۔ البتہ انگریز ابن سعود کو رشید سے لڑنے کے لئے اکسا
رہے تھے۔ جو ترکوں کا حلیف تھا۔ گفت و شنید کے بعد فلبی نے اپنی حکومت کی طرف سے وعدہ
کیا کہ اگر شمر قبیلہ سے لڑائی ہوئی تو شریف اور شیخ کویت کو روک دیا جائے گا کہ وہ اس کی مدد نہ کریں
ابن سعود نے اپنے بڑے بیٹے ترکی کو اخوان کی فوج کے ساتھ اس قبیلہ کی سرکوبی کے لئے بھیج دیا
رشید نے شکست کھائی اور صلح پر لڑائی ختم ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم ختم ہو گیا۔ عبداللہ ابن شریف حسین نے پھر خرما کی طرف رخ
کیا۔ قاہرہ میں انگریز مدبرین کی ایک کانفرنس ہو رہی تھی بظاہر وہ دونوں کو صلح صفائی سے
رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ مگر برطانیہ کے سیاسی تدبر سے یہ بعید تھا کہ کم از کم تمام جزیرہ نما عرب
پر ایک واحد شخصیت حکمران ہو اور ایک مرکزی عربی حکومت قائم ہو جائے۔ جو بحیرۂ قلزم اور
خلیج فارس دونوں مقامات میں ان کے مفاد کے لئے ایک مستقل خطرہ بھی ہو۔ اس کانفرنس
میں جو کچھ طے ہوا وہ ان واقعات نے الم نشرح کر دیا جو شام اور حجاز اور عراق اور عرب میں
رونما ہوئے۔

عبداللہ خرما کی طرف بڑھ رہا تھا اسے معلوم نہ تھا کہ ابن سعود اس کے استقبال کے لیے پہلے

ہی تیار ہے۔

اخوان نے شبخون مارا تو خواب غفلت میں حجازیوں کو ٹھکانے لگا دیا عبداللہ بات کے لباس میں بمشکل جان بچا کر مکہ میں پہنچا۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ چار ہزار منظم سواروں میں سے بمشکل ایک سو جان بچا کر لے گئے۔ انگریزوں کی دی ہوئی رائفلیں اور مشین گنیں (MACHINE - GUNS) خیمہ و خرگاہ اور سامان رسد وغیرہ اخوان کے ہاتھ لگا۔ اس ایک لڑائی نے شریف حسین کی کمر توڑ دی۔ اس کی سپاہ کا بہت بڑا حصہ تباہ ہو گیا۔ طائف اور مکہ جہاں غیر ممالک کے حاجی تھے بھاگ رہے تھے۔ شریف نے عبداللہ کو محل سے نکال دیا۔ اور انگریزوں سے فوری امداد کی درخواست کی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ سب کچھ انہی کا کیا کرایا ہے۔

اب ابن سعود اور اس کے اخوان مکہ کی طرف بڑھنے لگے۔ لیکن انگریزوں نے متنبہ کر دیا کہ ابھی وقت نہیں۔ اس لئے واپس ریاض کی طرف لوٹ گیا۔ اب اسے معلوم ہو گیا کہ ترکوں کی جگہ اب انگریزوں سے نپٹنا ہے۔ انگریز دراصل یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ابن سعود حسین کی جگہ ارض حجاز کا مالک ہو۔ وہابیوں سے سابقہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی۔ آل رشید ہی موزوں سیاسی آلہ کار تھی۔ اگرچہ وہ دوران جنگ میں دشمن کی طرف دار تھی مگر سیاسیات ان جذبات سے مبرا ہے۔ رشید نے شریف حسین کی پناہ پہلے ہی لے رکھی تھی۔ اب انگریزوں کی حمایت میں آ گیا۔ امیر فیصل پسر شریف حسین دمشق میں بادشاہ تھا۔ ابن سعود سر پرسی کاکس" عراق کے ہائی کمشنر سے ۱۹۲۰ء میں ملا اور پوچھا کہ "دو ٹوک بات کرو۔ کیا ابھی تک مجھے اپنا حلیف سمجھتے ہو؟ باتیں تو بہت ہوئیں مگر ابن سعود مطمئن نہ ہوا۔ فیصل کو فرانسیسیوں نے دمشق میں ٹھہرنے نہ دیا۔ انگریزوں نے اسے شاہ عراق بنا دیا۔ اور عبداللہ اس کا بھائی شرق اردن کا امیر ہو گیا۔ بحیرہ قلزم کے ساحلی کنارہ حجاز سے عسیر تک سب انگریزی اقتدار کے تحت تھا۔ وہ چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا۔ وہ ان سے نپٹ سکتا تھا مگر انگریز ان کے پشت پناہ تھے۔

تبلیغ وہابیوں کا فرض تھا۔ اس وقت ایک اور شیخ عبدالوہاب بھی ریاض میں موجود تھا

مبلغین شمر قبائل میں پھیل گئے۔ اکثر لوگوں نے وہابیت قبول کی۔ اور ابن سعود کو رشید پر ترجیح دی۔ انگریز اگرچہ فتح مند تھے مگر ہندوستان اور ہر ایک جگہ سیاسی شورش برپا تھی۔ رشید کے قبیلہ کے لوگ ابن سعود کی طرف مائل تھے۔ اس نے لڑائی چھیڑ دی۔ شریف اور فیصل نے انگریزوں کے ذریعہ رد کنے کی کوشش کی مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ ان کا ایک سیاسی منصوبہ تکمیل پذیر ہو رہا تھا۔ ابن سعود کو بھی معلوم ہو گیا کہ انگریز کیا چاہتے ہیں۔ انگریز نے شریف حسین اور فیصل کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ دو قبائل کی خانہ جنگی ہے اور دیرینہ ہے اس میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ابن سعود نے بسہولت اس علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ دشمن قبیلہ کے کچھ لوگ بھاگ گئے ان کو عراق نے پناہ دی کہ ممکن ہے کسی وقت کام آئیں۔ باقی مطیع ہو گئے۔ اب اخوان شام اور فلسطین کی سرحد تک پہنچ گئے۔ اور انگریزوں کو بھی ہوش آئی۔ اخوان ایک طرف عراق اور دوسری طرف کویت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ "ناصریہ" پر فیصل کے شتری دستہ فوج کو شکست دی۔ مگر انگریزوں نے پھر بزور روک دیا۔

ابن سعود "سر پرسی کاکس" سے ملا۔ دونوں میں کئی دن گفتگو جاری رہی۔ ابن سعود کو مفتوحہ علاقہ بھی دیا گیا اور نجد کی حدود بھی متعین ہو گئیں۔ مگر شریف حسین پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ والئی شرق اردن عبداللہ نے "سرحان" پر پھر سے قبضہ کر لیا۔ اور حسین حجاز اور "طیبہ" کے قریب فوج جمع کر رہا تھا۔ "اخوان" نے وادی "سرحان" پھر لے لی۔ اور اب شریف حسین کی مزاج پرسی کے لئے بڑھے۔ انگریز پھر درمیان میں آ گئے۔ پھر ایک کانفرنس ہوئی۔ سر پرسی کاکس کی جگہ نیا ہائی کمشنر نہیں جانتا تھا کہ ابن سعود سے کیونکر نپٹے۔ ادھر کانفرنس ختم ہوئی ادھر شریف حسین نے پھر سے خرما اور طرابہ پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ اور فیصل نے بھی باپ کو مدد دی۔ اب نجد پر ان کے حملے شروع ہو گئے۔ اب انگریزوں کی آنکھیں کھلیں کہ جو بات وہ نہیں چاہتے تھے آل شریف کی متحدہ طاقت بسہولت پیدا کر سکتی ہے۔ اور حسین زور دے رہا تھا کہ جو وعدے اس سے کئے گئے ہیں جلد ایفا ہوں۔ شریف حسین سے ایک سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ دو سال گذشتہ وہابیوں پر حج کا راستہ بند کر رکھا تھا اور وہ کام کیا جو قرامطہ نے کسی وقت کیا تھا۔ اس لئے اس کے خلاف ...

کی لہر نجد میں دوڑ گئی۔ ابن سعود نے ایک دانش مندانہ چال یہ چلی کہ ممالک اسلام پر اپنا "پراپاگنڈہ" شروع کر دیا اور شریف حسین کے اعمال کی وہ سیاہ تصویر پیش کی کہ دنیائے اسلام کی نظریں ابن سعود پر لگ گئیں۔ ہندوستانی مسلمانوں نے متفقہ ابن سعود کو اسلام کا علمبردار تسلیم کیا۔ اس کا مشیر حافظ "وہبہ" مصری دنیائے اسلام کے حالات سے واقف تھا۔ اس نے زور دیا کہ اب وقت ہے کہ شریف حسین پر حملہ کر دیا جائے۔ ابن سعود نے کچھ فوج عراق اور کچھ شرق اردن کی سرحدوں پر مدافعت کیلئے بھیجی اور دونوں بھائیوں کا راستہ رسل و رسائل جس کے ذریعہ وہ باپ کی مدد کر سکتے تھے منقطع کر دیا۔ اور مکہ اور جدہ پر بیک وقت حملہ کے لئے سپاہ روانہ کی۔ شریف کا بیٹا علی طائف میں تھا۔ اخوان نے معمولی جھڑپ کے بعد طائف پر قبضہ کر لیا۔ اور پھر مکہ کی طرف بڑھے یہاں بھگدڑ مچ گئی انگریزوں نے شریف حسین کو مشورہ دیا کہ اپنے بیٹے علی کے حق میں دست بردار ہو جائے کیونکہ جب تک وہ شاہ ہے دشمن سے کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے انگریزوں پر لعنت کی اور کہا کہ میں دست بردار نہ ہوں گا۔ مکہ میں لوگ جمع ہوئے اور شریف حسین کو مشورہ دیا کہ شہر چھوڑ کر جان بچائے۔ اہل مکہ میں سے بعض اس کا خزانہ لوٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ اب حسین نے بھی خیر اس میں ہی دیکھی کہ راہ فرار اختیار کرے۔ محل شاہی میں ایک درجن موٹریں تھیں ان پر اپنی دنیوی دولت بار کی۔ ایک کار پر اس کے خاندان کے لوگ تھے دوسری پر آپ سوار ہو کر جدہ کی طرف بھاگا۔ یہاں اپنی کشتی پر سوار ہوا۔ اثنا سفر میں مال و دولت کے مقفل صندوق بھی ساتھ تھے ان کی گنتی روزانہ شمار کرتا عقبہ سے جزیرہ سائپرس (CYPRUS) میں وارد ہوا۔

ادھر ابن سعود کو اخوان کی کامیابی پر حیرت تھی۔ اس کی توقعات سے بڑھ کر کامیابی ہوئی۔

حسین تو گیا مگر علی اس کا بیٹا مکہ میں تھا۔ انگریزوں سے مدد طلب کی۔ جواب ملا کہ یہ مذہبی جنگ ہے اور کسی مذہب میں دخل دینا ان کے اصول سیاست کے خلاف ہے۔ علی نے اب ابن سعود کی طرف رجوع کیا اور صلح کی درخواست کی۔ ابن سعود نے ٹکا سا

جواب دیا اور کہا کہ "جب تک تمام خاندان شریفی ارض مقدس حجاز خالی نہ کر دے صلح کی گفت و شنید ممکن نہیں"۔ ساتھ ہی اپنی فوج کو بڑھنے کا حکم دیا اور متنبہ کیا کہ لوٹ کھسوٹ سے باز رہیں اگر کسی سے بے اعتدالی ظہور میں آئی تو سخت سزا دی جائے گی۔

علی بھی جدہ میں پناہ گزین ہوا اور اخوان مکہ میں اس طرح داخل ہوئے جس طرح آنحضرت داخل ہوتے تھے۔ مگر شہر خاموشاں پر زلزلہ گرا۔ اخوان نے مقبروں کو خاک کے برابر کر دیا۔ ان کے عقیدہ کے مطابق یہ بھی بُت تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے توڑے تھے۔

ابن سعود اس وقت تک ریاض میں تھا۔ فتح مکہ کی بشارت سنی تو عمرہ کے لئے چل پڑا۔ راستہ میں احرام باندھا۔ اور وہ اور اس کے ہمراہی "لبیک لبیک" کرتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے۔

انگریزوں کا خیال تھا کہ شریف حسین اور ابن سعود میں جنگ طول پکڑے گی مگر جب سنا کہ چند دنوں میں اس کا فیصلہ ہو گیا اور کہیں بھی لڑائی سوائے طائف نہیں ہوئی۔ تو سخت حیران ہوئے۔ جلدی جلدی انہوں نے خلیج عقبہ پر قبضہ کر لیا تاکہ سویز کی طرف سینا میں راستہ کھلا رہے۔ اور شرق اردن کا بھی تحفظ ہو جائے۔

اس کے بعد سر گلبرٹ کلیٹن (SIR GILBERT CLAYTON) ابن سعود کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جدہ اور مکہ کے درمیان "بحرہ" پر دونوں کی ملاقات ہوئی۔ ابن سعود نے فیصل اور عبداللہ دونوں بھائیوں کے اتصال کو قطع کرنے کے لئے شام اور عراق کے درمیان ایک قطعہ زمین پر قبضہ کر کے نجد کی سرحد بڑھائی تھی۔ "کلیٹن" چاہتا تھا کہ ابن سعود دست بردار ہو جائے۔ ابن سعود نے بھی مناسب سمجھا کہ انگریزوں سے لڑائی کون مول لے۔ مان گیا۔ "عقبہ" کا مسئلہ آئندہ گفت و شنید پر ملتوی ہو گیا۔ انگریزوں نے ارض حجاز اور نجد کا سلطان ابن سعود کو تسلیم کر لیا۔ جس میں وادی سرحان اور ملحقہ علاقہ بھی شامل تھا۔

ابن سعود نے تمام دنیائے اسلام کو دعوت دی کہ حج کے ایام میں اپنے نمائندے

کر لیں بھیجیں تاکہ آئندہ ایک لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔ "اتحاد اسلامی" کا جذبہ اس میں کارفرما تھا مگر فضا ساز گار نہ تھی۔ اس کے دعوت ناموں پر چند ممالک کے نمائندے ہی شامل ہوئے۔ مگر بے فائدہ بحث میں وقت ضائع کیا۔ اگرچہ ابن سعود عالم دین نہ تھا۔ مگر قرآن اور حدیث سے واقف تھا۔ اس نے اپنے خطبہ میں مندوبین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:-

"قرآن کا واضح حکم ہے کہ "لا تفرقوا" اور یہ تفرقہ ہی ہماری شکست کا موجب ہے اس لئے اسباب تفرقہ کو مٹا دو۔ اور "اعتصام بحبل اللہ" سے بنیان مرصوص بن جاؤ۔"

ہندوستانی مندوب کی یہ تجویز تھی کہ مقامات مقدسہ پر تمام ممالک اسلامی کی ایک نمائندہ جماعت کا انتظام ہو۔"

ابن سعود نے کہا کہ:-

"تجویز تو نیک ہے اور میری بھی یہی خواہش ہے۔ لیکن آزاد ممالک ہی حجاز کی آزادی کو قائم رکھ سکتے ہیں۔ ہندوستان انگریزوں کے قبضہ میں ہے۔ اور کوئی ملک ایسا نہیں جس پر دول یورپ یا امریکہ کا اقتدار نہ ہو۔ انہی نمائندگان کے ذریعہ وہ اس سرزمین میں بھی سیاسی جال پھیلا دیں گے۔ خدا کے فضل و کرم سے سر دست میں یہاں آزادی کا ضامن ہوں۔"

عبرت شریف حسین نے مکہ معظمہ کو اپنا پایہ تخت قرار دیا۔ اور اسی غلطی کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔ ارشاد قرآن ہے کہ

"ان الذین کفروا و یصدون عن سبیل اللہ والمسجد الحرام الذی جعلنہ للناس سواء ن العاکف فیہ والباد ومن یرد فیہ بالحاد بظلم من عذاب الیم" (پ ۱۷)

"جن لوگوں نے کفر کیا اور راہ خدا اور مسجد الحرام (حج کعبہ) سے لوگوں کو روکا جس کو ہم نے خواہ وہ باہر سے آتے ہوں یا یہاں کے رہنے والے ہوں مساوات کا گھر بنایا ہے جو کوئی گمراہی کی وجہ سے اس میں رخنہ انداز ہو دردناک عذاب کا مزہ چکھا دیں گے۔"

آنحضرتؐ کے بعد عبداللہ بن زبیرؓ نے مکہ اپنا پایہ خلافت بنایا اور عذاب الیم کا مزہ چکھ لیا۔ اس کے بعد شریف حسین نے بھی اپنا انجام دیکھ لیا۔ شریف حسین نے دو سال اہل نجد کو حج سے باز رکھا اور ظاہر ہے کہ جب مکہ کسی سلطنت کا پایہ سلطنت ہو تو وہاں مساوات قائم نہیں رہ سکتی اور نہ جنگ و جدل کا سدباب ہو سکتا ہے۔ مکہ معظمہ "حرم" ہے۔ "من دخلہ کان امنا" (۹۷) اس لئے یہ پایہ سلطنت کا قیام نہیں ہونا چاہیئے۔ ساحل بحر احمر پر جدہ اور دیگر مقامات موزوں ہیں۔ "طائف" بہت مناسب مقام ہے۔

عسیر

حجاز کے جنوب میں بحر احمر کے کنارہ پر "عسیر" واقع ہے چونکہ پہاڑی و دشوار گذار ہے اس لئے اس کو "عسیر" (تنگی) سے موسوم کیا جاتا ہے یا اس لئے کہ زمین قابل زراعت تھوڑی ہے۔ اس لئے عسرت رہتی ہے۔ غالباً یہ نام "یمن" کی ضد ہے۔ "یمن" میں یمن و برکت ہے۔

ہم نے اس کتاب کے پہلے حصہ میں "بنو فاطمہ" کے تحت خلافت "ادریسی" کے حالات لکھے ہیں جو "مراکش" واقع شمالی افریقہ میں تھی۔ اسی خاندان کی حکومت "عسیر" پر ہے یہ سادات حسنی اہل سنت والجماعت ہیں۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ احمد بن ادریس ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں "عرایش" واقع مراکش میں پیدا ہوا۔ علماء اور مشائخ صوفیہ کی صحبت میں برسوں رہا۔ سید محمد تازی سے بھی روحانی فیض حاصل کیا۔ ان کے زہد و تقویٰ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور حلقہ ارادت وسیع تر ہوتا گیا۔ یمن میں سید عبدالرحمٰن مفتی آپ کا مرید ہو گیا اور آپ کا داعی بن گیا۔ سید احمد عرب کے مختلف شہروں میں گئے اور جہاں گئے ہزاروں مرید ہو گئے۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں "صبیا" واقع یمن میں وفات پائی۔

ان ایام میں عسیر چھوٹی چھوٹی قبائلی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس کے ایک حصہ پر ابراہیم پاشا پسر محمد علی پاشا خدیو مصر کا تسلط تھا۔ اہل عسیر اس حکومت سے بیزار تھے اور اکثر شورش کرتے۔ برطانیہ کی گذرگاہ بحر احمر ہے اور ہندوستان کی حفاظت کے لئے یہ ضرور تھا کہ اس کے ساحلی علاقوں پر برطانوی اثر و رسوخ و اقتدار ہو۔ ۱۸۴۰ء میں "لندن کانفرنس" ہوئی۔ وزیر اعظم انگلستان "پامرسٹن" نے محمد علی پاشا خدیو مصر کو مجبور کیا کہ اپنی فوج بحیرہ احمر کے ساحلی علاقہ سے نکالے

اس طرح خدیو کو "تھامہ" اور "عسیر" سے دست بردار ہونا پڑا۔

امراء عرب میں سے شریفی خاندان میں محمد بن عون شریف مکہ اور شریف حسین بن علی حاکم ابی عریش اور امام یحییٰ والئی یمن "عسیر" کے دعوے دار تھے۔ ابراھیم پاشا نے انہی دعوے داروں میں عسیر کی تقسیم کر دی۔ شریف حسین بہت جابر تھا۔ رعایا تنگ آگئی۔

۱۸۴۹ء میں توفیق پاشا "حدیدہ" میں آگیا اور شریف حسین کو نکال دیا۔ حدیدہ کے بعد تھامہ اور تھامہ کے بعد صغا پر ترکوں نے قبضہ کر لیا۔ مگر آزاد قبائل کی شورش دبا نہ سکے ان ایام میں خاندان ادریس کے داعی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور آتش شورش کو ہوا دیتے تھے۔ آخر عسیر پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ پہلا امام سید محمد بن علی بن سید احمد ادریسی ہے۔

۱۹۱۲ء میں جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا تو ترکوں کی توجہ ادھر لگ گئی۔ اٹلی نے اس عربی علاقہ میں جس میں عسیر بھی تھا۔ بغاوت پھیلا دی۔ برطانیہ پس پردہ یہ سب کچھ کھیل رہا تھا۔ ۱۹۱۵ء کے معاہدہ کی رو سے "عسیر" خاندان ادریسی نے جنگ عظیم میں ترکوں کے خلاف انگریزوں کی مدد کی۔ انگریزوں نے روپیہ اور اسلحہ سے تقویت دی۔ اور ادریسی سلطنت حدیدہ تک وسیع ہو گئی جو پہلے امام یحییٰ والئے یمن کے قبضہ میں تھا۔ امام یحییٰ انگریزوں کے خلاف تھا۔

انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی ہمیشہ یہ رہی ہے کہ جہاں ان کا براہ راست تسلط نہیں لیکن مفاد وابستہ ہے وہاں کے حکمرانوں کی حدود پر تنازعہ مستقل قائم رکھتے ہیں۔ حدیدہ عسیر اور یمن کی حدود پر واقع ہے۔ اور دونوں میں تنازعہ اس قطعہ اراضی کے لئے ایک مستقل صورت اختیار کر چکا ہے۔

(پاکستان اور بھارت میں مسئلہ کشمیر بھی اسی نوع کا ہے)

انگریز اس تنازعہ کو ختم ہونے نہیں دیتے اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں فریق اس کی مدد کے محتاج رہتے ہیں اور اس کو بھی مداخلت کا موقعہ ملتا رہتا ہے اور ممکن ہے کہ کسی وقت اسی تنازعہ کے سبب دونوں اس کی گرفت میں بلا واسطہ آجائیں۔

"حدیدہ" میں استصواب رائے بھی ہوا۔ عوام نے ترکی حکومت کے حق میں رائے دی

لیکن یہ آرزو محال تھی۔ اس لئے دوبارہ استصواب ہوا تو نصر کے حق میں ہوا۔ یہ بھی ہوا تو ان کے خلاف عرضی ادریسی خاندان کو دیدیا۔

سید محمد ادریسی کی وفات کے بعد آپ کا بیٹا سید علی جانشین ہوا۔ شریف حسین حکومت ترکیہ کی طرف سے والئی حجاز تھا۔ اس نے عسیر کو اپنی ولایت میں شامل کرنا چاہا، مگر ابن سعود نے پیش دستی کی اور مشرقی حصہ کو نجد میں ملا لیا۔ سید علی ادریسی کی وفات کے بعد حسن جانشین ہوا۔ شریف حسین حجاز سے بے دخل ہو چکا تھا اور یہاں ابن سعود کی حکومت تھی۔ امام یمن نے جنوب کی طرف سے عسیر پر حملہ کر دیا۔ سید حسن نے ابن سعود سے امداد کی درخواست کی چنانچہ بر وقت مدد کا یہ نتیجہ ہوا کہ امام یمن کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور عسیر سعودی حکومت کے سایہ عاطفت کے تحت آگیا۔

یمن

یمن عرب کا سرسبز حصہ ہے۔ اس کی اپنی تاریخ ہے اور قدیم زمانہ میں یمنی حکومت تمام عرب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس حکومت کے بادشاہ امام کہلاتے ہیں۔ ان کا تعلق زیدی شیعہ فرقہ سے ہے جو زید بن علی زین العابدین سے منسوب ہے۔ اگرچہ ان میں سے بعض امامیہ بھی ہیں اور امام منتظر کے قائل ہیں مگر اکثر کا یہ عقیدہ ہے کہ امام حاضر ہی مستحق خلافت ہے۔ چنانچہ جو حسنی یا حسینی ان اوصاف سے متصف ہو جو "امامت" کے واجبات ہیں اسی کو اپنا امام منتخب کرتے رہے۔ اس لئے ان میں تمام امام جید عالم دین اور صاحب زہد و ورع ہوئے۔ بعد میں اختلاف پیدا ہوا تو فرقہ "جارودیہ" نے نسب علی کی بھی شرط اڑا دی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت علی وصفاً امام ہیں نسباً نہیں۔ اس لئے جس مسلمان میں حضرت علی کے اوصاف ہیں وہ مستحق خلافت ہے۔ فرقہ "سلیمانیہ" ایک قدم اور آگے بڑھا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ امامت کا انتخاب شوریٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور ہر صالح مسلم امام ہو سکتا ہے۔ جمہور کا مذہب وہی زیدی ہے۔ ان کی فقہ شافعی سے ملتی جلتی ہے۔

جب ۱۹۱۱ء میں ترکوں اور اٹلی میں طرابلس پر جنگ چھڑی عزت پاشا والئی یمن تھا اس نے امام یحییٰ کو کامل آزادی دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ عربی قبائل میں سے یہی ایک قبیلہ ترکوں کا مددگار رہا۔

یمن میں اماموں کی حکومت کا آغاز تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتا ہے۔ چونکہ امام کا انتخاب ہوتا رہا اس لئے کسی ایک خاندان میں حکومت محدود نہیں رہی۔ اب اس نے شخصی حکومت کی صورت اختیار کر لی۔

یمن میں معدنیات کی بہت کانیں ہیں۔ چاندی سونا تانبا اور پیٹرول اور قیمتی پتھر بھی دستیاب ہوتے ہیں "صنعاء" یمن کا پایہ خلافت ہے چونکہ اہل یمن مذہبًا نہایت متعصب واقع ہوئے ہیں۔ اور بالخصوص یہود ونصاریٰ سے ان کا سلوک سخت مذموم ہے اس لئے کسی انگریز کو بھی بلا اجازت امام اور وہ بھی فوجی پہرہ کے ساتھ یمن میں چلنے پھرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ انگریزوں نے بھی یمن کی سخت ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ عدن پر ان کا قبضہ ہے۔ حدیدہ ادریسی حکومت کے حوالہ کر رکھا ہے جو یمن ہی کا اہم بندرگاہ اور تجارتی مرکز ہے۔

لحج دو سو سال پیشتر لحج حکومت یمن کا ایک حصہ تھا مگر آبادی کی اکثریت شافعی سنی تھی ۱۱۲۴ھ میں یمن کی طرف سے جو والیٔ لحج مقرر ہوا اس نے سنی مذہب اختیار کر لیا۔ اور رعایا کی مدد سے خود مختار حکومت قائم کر لی۔

سلاطین لحج میں سے اٹھارویں صدی کے شروع میں سلطان محسن بن فضل پر انگریزوں نے ڈورے ڈالے مگر نہ بنی۔ سلطان فضل بن علی بن محسن کے تعلقات انگریزوں سے اچھے رہے۔ اس کی وفات پر سلطان احمد بن فضل بن محسن تخت نشین ہوا۔ اس شخص نے "اتحاد عرب" کی تبلیغ کی اور چاہتا تھا کہ تمام عرب قبائل متحد ہوں۔ اور ایک مرکزی مؤتمر قائم ہو جائے۔ اور تمام فرمانروایان عرب کے نام دعوت نامے بھی بھیجے۔ لیکن کامیاب نہ ہوا۔ حالات سازگار نہ تھے۔

سلطان محسن مذکور کے عہد میں انگریزوں کا دخل عدن میں ہو گیا تھا۔ بالآخر مستقل قبضہ ہو گیا۔

موجودہ سلطان عبدالکریم فضل پر ترقی یافتہ زمانہ کے حالات کا گہرا اثر ہے۔ اور یہ بھی عرب اتحاد کا حامی ہے۔ لحج میں اگرچہ حکومت ایک ہی خاندان میں محدود ہے۔ مگر

مگر انتخاب کی رو سے عوام جس کو چاہیں اپنا سلطان تسلیم کریں اس لئے مسئلہ ولی عہدی ایک سیاسی گتھی بن کر رہ گیا ہے۔ سلاطین لحج کو حواشب بھی کہتے ہیں جو ایک عرب قبیلہ ہے۔

ان چھوٹی چھوٹی عربی قبائلی حکومتوں کا تذکرہ بے فائدہ ہے جو ساحل عرب پر ہیں اور سب انگریزوں کے وظیفہ خوار ہیں۔ اور بقدر اثر و رسوخ وغیرہ کے لحاظ سے تین ہزار پونڈ ماہوار ان کو ملتا ہے۔

بحرین خلیج فارس میں اہم مقام بحرین ہے۔ اس کی اہمیت دول یورپ کے نزدیک جیسی ہے اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اسے بھی ہندوستان کی کلید سمجھا گیا ہے۔ سب سے پہلے پرتگیزوں نے مسقط پر قبضہ کر کے ہرمز اور بحرین کو بھی اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا۔ حریف ایسٹ انڈیا کمپنی نے شاہ عباس صفوی کی مدد سے پرتگیزوں کو یہاں سے بیدخل کر دیا۔ اب یہ صفوی حکومت کے تحت آگیا۔

۱۷۸۲ء میں شیخ احمد فاتح آل خلیفہ نے یہاں آزاد حکومت قائم کر لی۔ آل خلیفہ قبیلہ "عتبہ" کی ایک شاخ ہے جو جزیرہ بحرین کے بالمقابل ساحل پر آباد ہے۔ ان کا اصلی وطن نجد ہے۔ مورث اعلیٰ کا نام شیخ خلیفہ تھا جس نے نجد سے کویت میں نقل مکانی کی۔ موتیوں کی تجارت کی وجہ سے یہاں آل خلیفہ بہت مالدار تھے۔ بحرین میں اکثریت شیعہ ہے اور عناد مذہبی کی وجہ سے سنیوں سے اکثر جھڑپیں رہتی تھیں۔ ایک دفعہ ایک شیعہ نے آل خلیفہ کے ایک خادم کو مار ڈالا۔ آل خلیفہ نے اپنے آدمیوں کو مسلح کیا اور بحرین پر ہلہ بول دیا۔ یہاں شیخ نصر ایران کی طرف سے والی تھا۔ مقابلہ ہوا مگر شکست کھائی۔ وہ تھوڑی سی جمعیت کے ساتھ ابو شہر کی طرف چلا گیا۔ میدان خالی تھا۔ شیخ احمد بن شیخ بن شیخ خلیفہ قابض ہو گیا۔ اب اس جگہ اپنا نائب چھوڑا اور خود "قطر" اپنے مستقر کی طرف مراجعت کی۔

شیخ احمد کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شیخ سلیمان جانشین ہوا۔ ان ایام میں سعود نے نجدی حکومت میں "احساء" شامل کیا جس کا مذکور ہو چکا ہے۔ اور سلیمان

بات نہ تھی جو اس کے باپ میں تھی۔ بحرین میں کچھ بدنظمی پیدا ہو چکی تھی۔ سلطان مسقط نے مداخلت کی اور اپنے بیٹے سعید کو بحرین میں والی مقرر کر دیا۔ ابن سعود کی مدد سے سعید نکلوا دیا۔ مگر ابن سعود کی طرف سے ابراہیم عسیفان خود بحرین پر قابض ہو گیا۔ مگر آل خلیفہ نے اس کو تھوڑے سے عرصہ بعد بے دخل کر دیا۔ اب ابن سعود اور آل خلیفہ میں جنگی حالات پیدا ہو گئے۔

انہی ایام میں ابراہیم پسر محمد علی پاشا نجدیوں کی سرکوبی کے لئے آ رہا تھا۔ اس نے آل سعود کو بحرین سے دست بردار ہونا پڑا۔ شیخ سلیمان کے بعد اس کا بھائی عبداللہ نشین ہوا۔ پینتالیس سال خانہ جنگی میں ہی گزرے اور آخری شکست کے بعد مسقط میں پناہ گزین ہوا اور یہیں وفات پائی تو شیخ محمد جانشین ہوا۔ اس وقت آل خلیفہ میں اس حد تک پھوٹ بڑھی کہ دو حریف فریق بن گئے جو آل عبداللہ اور آل سلیمان سے موسوم ہیں۔ انگریزوں کو مداخلت کا موقعہ مل گیا۔

اس وقت بحرین پر ایرانیوں اور انگریزوں اور ترکوں کی نظر تھی اور قبائلی خانہ جنگی نے بھی شیخ محمد کو پریشان کر رکھا تھا۔ بوشہر کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا شیخ محمد نے بھی ان کی دوستی غنیمت سمجھی۔ ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے ہر ایک بحری حملہ کی مدافعت انگریزوں نے اپنے ذمہ لے لی۔ شیخ محمد کے پاس اپنا بحری بیڑہ تھا اس لئے اسے توڑ دیا گیا کہ ضرورت نہ تھی ان کی جگہ برطانوی بحری جنگی جہازوں نے لے لی۔ بحرین کا قلعہ بھی انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ اتفاق سے قطریوں کے ساتھ خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شیخ محمد نے انگریزی مدد طلب کی مگر مدد وقت پر نہ پہنچی اور شیخ محمد نے اپنے بھائی شیخ علی کو بحرین میں چھوڑا اور کویت میں آ گیا۔ انگریزی بیڑہ آ پہنچا اور قلعہ پر گولہ باری کی اور بالکل خاک کے برابر کر دیا۔ شیخ علی کو بحرین کا حاکم تسلیم کر لیا۔ اب بھائیوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شیخ علی مارا گیا۔ شیخ محمد اگرچہ کامیاب ہوا مگر انگریزوں نے اسے چند غداروں کے ذریعے حراست میں لے لیا۔ بمبئی میں نظر بند رہا پھر عدن میں۔ آخر مکہ جانے کی اجازت مل گئی اور یہیں ۱۳۰۷ھ میں وفات پائی۔ انگریزی تسلط بحرین پر ہو چکا تھا مگر

ان کی حکمت عملی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ کسی نہ کسی پٹھو کو تخت پر بٹھادیا کرتے ہیں۔

ایمپرر نپولین اول نے سچ کہا تھا کہ "تخت وتاج بھی انگریزوں کا تجارتی مال ہے" پہلے بحرین کے لوگوں سے استصواب رائے کیا۔ انہوں نے مقتول شیخ علی کے بیٹے شیخ عیسےٰ کے حق میں رائے دی۔ چنانچہ شیخ صاحب ۱۲۸۷ھ مطابق ۱۸۷۰ء میں مسند نشین ہوئے۔ انگریزوں نے سلطنت دی اور عوام نے رائے دی۔ اس لئے وہ عوام کے ہر ایک مطالبہ کو تسلیم کرتا رہا۔ اور اس پر عملی کاروائی بھی ہوتی رہی۔ آخری مطالبہ یہ تھا کہ ایسی حکومت قائم کی جائے جو صحیح معنی میں اسلامی شریعت کے مناسب ہو۔ سلطان نے یہ مطالبہ منظور کرلیا انگریزوں نے مسترد کردیا۔ کیونکہ اس کی زد پولٹیکل ایجنٹ کے غیر محدود اختیارات پر پڑتی تھی۔ شیخ عیسےٰ کو معزول کر کے شیخ حمدان کو مسند پر بٹھادیا۔

بحرین موتیوں کی تجارت کے لئے دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کے موتیوں کی آب دلآویز ہے۔ قرآن عظیم میں بحرین کا خاص ذکر ہے۔

"مرج البحرين يلتقيان بينهما برزخ لا يبغيان فبأي آلاء ربكما تكذبان يخرج منهما اللؤلؤ والمرجان فبأي آلاء ربكما تكذبان وله الجوار المنشئت في البحر كالاعلام فبأي آلاء ربكما تكذبان كل من عليها فان ويبقى وجه ربك ذو الجلال والاكرام" (۲۷/۱۱)

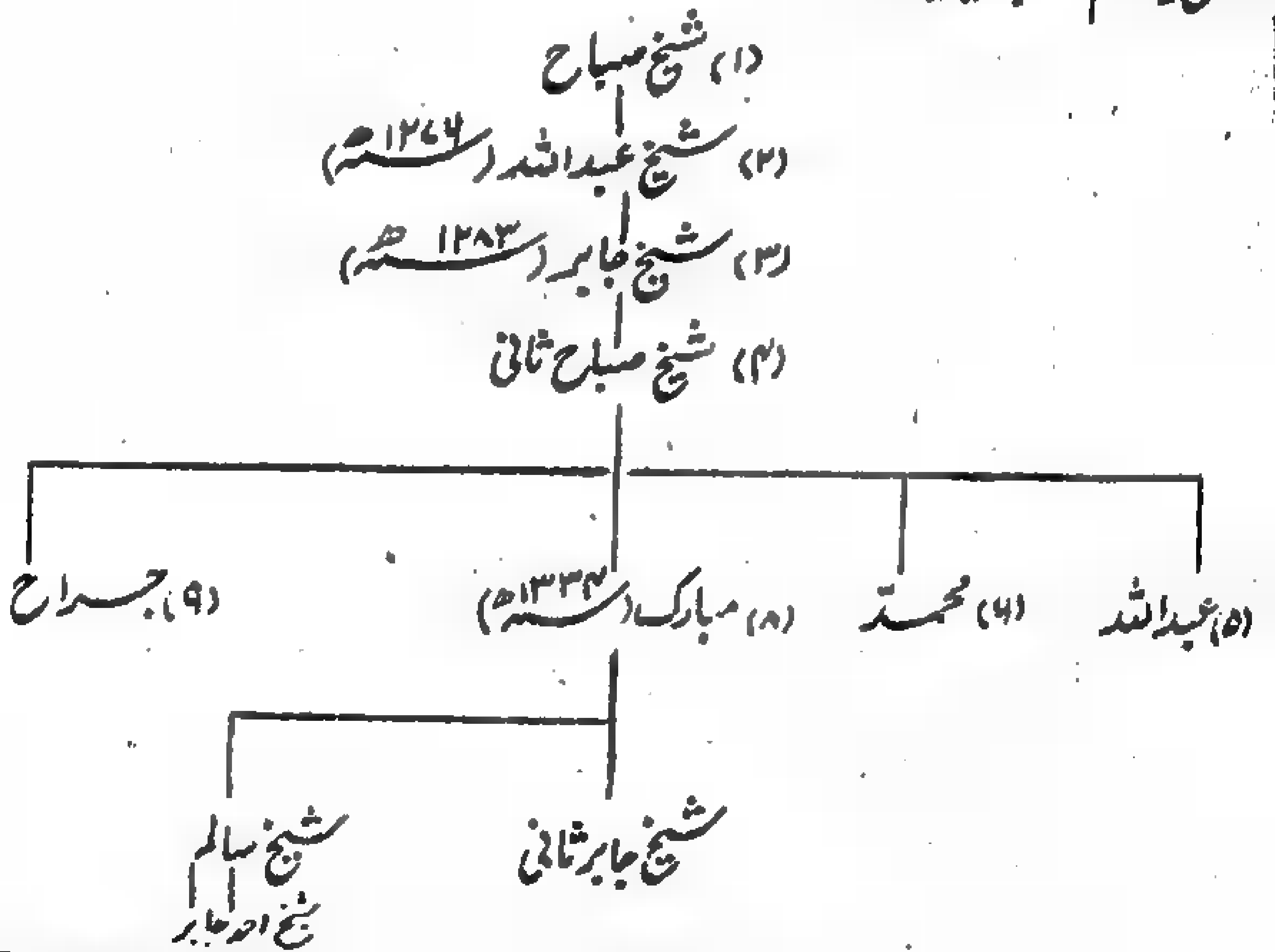
"دو بحر (ایک فرات جس کا پانی میٹھا خوشگوار اور دوسرا شور تلخ) چلا دئے۔ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے درمیان برزخ ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے۔ پس اللہ کی نشانیوں میں سے کس کو جھٹلاؤ گے۔ ان دونوں میں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں۔ تم اللہ کی نشانیوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے۔ بحر میں جہاز ہیں چلنے والے جیسے پہاڑیاں۔ تم اللہ کی نشانیوں میں سے کس کس کو جھٹلاؤ گے۔ ہر ایک شئے فنا ہونے والی جو اس بحر پہ ہے۔ پس تیرے پروردگار کی ذات صاحب جلال واکرام ہی باقی رہے گی۔

ان آیات میں "مرج البحرین" کا نظارہ حیرت انگیز ہے۔ سمندر کے آب شور کے نیچے سطح سے ۱۲ ہاتھ نیچے آب شیریں کی سطح ہے۔ لوگ غوطہ لگا کر مشکیزوں میں پانی بھر لیتے ہیں۔ بحا

جزر آب شیریں سطح پر بھی آجاتا ہے۔ ان آیات میں ایک زبردست پیش گوئی بھی ہے جو آخری آیت میں بیان کی گئی ہے کہ وقت بھی آنے والا ہے جب دول یورپ بالخصوص ملکہ بحری بحری قوت فنا ہو کر رہ جائے گی۔ ہم نے اس کتاب کے پہلے حصہ میں "عدن" اور "فردوس" پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان سے مراد "ایران" اور "عراق" ہیں بحرین[ا] جزیرۃ العرب کے شرق عراق کے جنوب میں واقع ہے۔ یہ بھی خلافت کے حصہ میں آیا اور "جنّٰت تجری من تحتھا الانہار" کا وعدہ پورا ہوا۔

کویت

اس کے حالات ہم آل سعود کے تحت لکھ چکے ہیں۔ یہاں کے حکمران مشہور قبیلہ ربیعہ کی شاخ اسد سے تعلق رکھتے ہیں۔ گیارھویں صدی ہجری میں اس خاندان نے جو "آل صباح" سے موسوم ہے کویت میں رہائش اختیار کی اور اس خاندان کا مورث اعلیٰ یہاں کا شیخ یا حاکم منتخب کیا گیا۔



[ا] "بحرین" میں پٹرول کے چشمے ہیں اور یہ بہت بڑی دولت ہے۔ جس نے شیخ بحرین کو مالامال کر دیا۔ اور اہل بحرین کی ترقی میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پٹرول کے لئے کنوئیں کھودے گئے تو آب شیریں کے چاہات بھی بہت بن گئے

۱۲۱۳ھ میں مبارک نے اپنے بھائیوں محمد اور جراح کو قتل کر کے حکومت خود سنبھال لی۔ مبارک کے انتقال کے بعد شیخ جابر تخت نشین ہوا۔ ۱۳۳۵ھ میں اس کا انتقال ہوگیا۔ تو اس کا بھائی شیخ سالم جانشین ہوا جو ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں فوت ہوا تو اس کا لڑکا شیخ احمد جابر بیٹھا۔

عمان

عمان بحر عمان کے ساحل پر جزیرۃ العرب کے انتہائی جنوبی حصہ حضر موت کے ساتھ واقع ہے۔ اس کا مشہور شہر "مسقط" ہے۔ اس علاقہ کے مسلمان سب "خارجی" فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں "جبل اخضر" کی بلندی سطح زمین سے دس ہزار فٹ ہے علاقہ بہت سرسبز اور شاداب ہے۔ معدنیات اور میوہ جات اور خوشبو دار لکڑی اور مویشی بکثرت ہوتے ہیں۔ بحر عمان سے بھی اعلیٰ قسم کے موتی برآمد ہوتے ہیں۔

مسلمانان ہندوستان کو خوارج کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ اس فرقہ کی ابتدا حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں ہوئی۔

اس کا مفصل تذکرہ ہم نے اپنی کتاب "دمشق" میں کیا ہے۔ مختصر یہ کہ جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ اور حضرت علی کے درمیان تنازعہ پیدا ہوا اور امیر معاویہ اور حضرت علیؓ کا آمنا سامنا "صفین" پر ہوا۔ اس وقت یہ جماعت جو بعد میں خوارج سے موسوم ہوئی حضرت علیؓ کی پرجوش ہوا خواہ تھی۔ ان میں سے اکثر حافظ قرآن بھی تھے۔ جب مسئلہ خلافت حکمین کے سپرد بغرض تصفیہ ہوا۔ تو اس جماعت نے اعتراض کیا کہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ قرآن کی رو سے تصفیہ کیا جائے گا۔ لیکن حضرت علیؓ نے غلطی کی کہ فیصلہ دو شخصوں کی رائے پر چھوڑ دیا۔ یہ جماعت حضرت علیؓ سے علیحدہ ہوگئی۔ اس لئے "خارجی" کہلائی۔ یعنی حضرت علیؓ کی جماعت سے خارج ہوگئی۔

ان کی تعداد بڑھتی گئی۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ امیر معاویہ اور حضرت علیؓ اور بعد ازاں بنو ہاشم میں تنازعہ خلافت نے ایسی فضا مکدر کر دی کہ عوام دونوں سے برگشتہ ہوگئے۔ جب تک حضرت علیؓ کی خلافت رہی خوارج سے آپ کی اکثر لڑائیاں

جاری رہیں۔ اور ایک خارجی عبدالرحمٰن ابن ملجم کے ہاتھ سے آپ کی شہادت بھی واقع ہوئی۔ جب تمام دنیائے اسلام پر اموی خلافت چھا گئی تو خوارج کا مقابلہ اموی خلافت سے رہا۔ یہ لڑتے رہے اور اکثر شکست کھاتے رہے اور عرب کے جنوب کی طرف چلتے گئے بعض بھاگ کر شمالی افریقہ میں چلے گئے۔ شمالی افریقہ کے حالات کے ضمن میں ہم نے ان کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمارے زمانہ میں یہ لوگ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ جنوبی عرب میں ہیں اور یہاں ان کی اپنی سلطنت بھی ہے۔ اس کے علاوہ "زنجبار" میں بھی ان کی سلطنت ہے۔ دونوں حکومتوں میں برادرانہ تعلقات ہیں۔

مسلمانوں میں یوں تو بہت فرقے ہیں۔ لیکن دراصل تین ہیں باقی سب ان کی شاخیں ہیں۔ ایک اہل سنت والجماعت جن کو "سُنّی" کہتے ہیں۔ دوسرے شیعانِ علی جن کو شیعہ کہتے ہیں۔ اور تیسرے "خارجی"۔

اگر ان کے عقاید کا جائزہ لیا جائے تو جہاں تک اصول اسلام یا ارکان اسلام کا تعلق ہے، تینوں متفق ہیں۔ لیکن ان کے سیاسی عقائد میں فرق ہے بلکہ مخالفت ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تینوں فرقوں کی بنیاد سیاسیات ہی ہیں۔ شیعہ پہلے تین خلفاء کو غاصب سمجھتے ہیں اور ان کی خلافت اعتقاداً تسلیم نہیں کرتے۔ خارجی پہلے دو خلفاء کو برحق سمجھتے ہیں۔ تیسرے اور چوتھے یعنی حضرت عثمان اور حضرت علی کی خلافت اسی طرح تسلیم نہیں کرتے جس طرح شیعہ پہلے تین کی تسلیم نہیں کرتے۔ سنی چاروں کو برحق مانتے ہیں جس طرح شیعہ اول تین خلفاء کے حق میں "تبرا" (بیزاری) اور "سب" استعمال کرتے ہیں اسی طرح خوارج "تبرا" اور "سب" آخری دو خلفاء کو ان کا ہدف بناتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ تینوں فرقوں میں تفریق سیاسیات کی پیدا کردہ ہے اور سیاسیات ہی کا کرشمہ ہے کہ قوموں میں جنگ و جدل جاری ہے۔ اس لئے یہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ ان تینوں میں شرانگیز تفرقہ کیوں ہوا جبکہ وہ "وحدت" میں متحد ہیں۔ یہ خوبی اسی وحدت کی ہے کہ جب کفار و مشرکین سے ان میں سے کسی ایک کا مقابلہ ہو تو "دگر عضو ہا را نماند قرار"

سلاطین "عمان" عبداللہ بن عباد کے متبعین میں ابن عباد ایک مشہور خارجی قبیلہ کا بانی

ہے۔ سلاطین عمان "امام" کہلاتے ہیں۔ سلاطین یمن کی طرح یہ بھی جید عالم دین ہیں
۱۶۹۸ء میں سیف بن سلطان امام عمان نے پرتگیزوں کا زور مشرقی افریقہ میں توڑ دیا
اور ان کو "کلوا" اور "ممباسہ" اور "پمبہ" سے خارج کر دیا۔ "عبادی" زنجبار پر قابض ہو گئے
ان کا اثر شمالی افریقہ میں خلافت امویہ کے وقت سے ہے۔ مشرقی افریقہ میں بھی فتوحات
کے ذریعہ بڑھ گیا۔

خارجیوں کا عقیدہ دربارہ خلافت یہ ہے کہ "امیر المومنین بہترین خلائق بلحاظ تقوی
چاہیئے۔ اور اسی کا انتخاب بھی ہونا چاہیئے جو بلحاظ تقوی دیگر مسلمین سے بڑھ کر ہو۔ لیکن
یہ عہدہ موروثی نہیں جیسا کہ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ خلافت کا حق اولاد علیؓ میں موروثی ہے۔ اگر
خلیفہ نااہل ثابت ہو تو اس کا عزل بھی واجب ہے۔" یہ عقیدہ سنیوں کے خلاف ہے
۱۷۴۱ء میں احمد بن سعید کا انتخاب بحیثیت "امام" ہوا اور ال بوسعید خاندان
کا بانی ہوا جو اس وقت عمان اور زنجبار پر حکمران ہے۔ ۱۸۳۲ء میں احمد کا پوتا سید سعید
پایہ سلطنت مسقط سے زنجبار میں منتقل کر لیا۔ سعید کے بعد اس کا بیٹا "برغش" ۱۸۷۰ء
سے ۱۸۸۸ء تک حکمران رہا۔ عمان اور زنجبار کی تواریخ علیحدہ علیحدہ ہیں۔ مگر یہ بھی برطانیہ
کے زیر اقتدار ہیں۔

مصر

نہر سویس

مصر کے شمال میں بحیرہ شام (روم) ہے اور جانب مشرق نہر سویس ہے جو بحیرہ شام کو بحیرہ احمر (قلزم) سے ملاتی ہے۔ مصر کی تاریخ حالیہ میں انہی دونوں کا مذکور ہے۔ یعنی واقعات حالیہ کا تعلق بالواسطہ یا بلا واسطہ انہی دونوں سے ہے کہ نہر سویس دول یورپ کے تجارتی اور جنگی جہازوں کی گذرگاہ ہے۔ اور ایشیائی ممالک عرب اور ایران اور ہندوستان تا حد چین کا نزدیک تر راستہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مشرق و مغرب کو یہی نہر ملاتی ہے۔

۲۔ مصر کی قدیم تاریخ کے متعلق جو کچھ معلومات "پلاتنی" اور "سٹریبو" سے حاصل ہوتی ہیں ان میں نہر سویز کا بھی مذکور ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ولادت مسیح ؑ سے ڈیڑھ ہزار سال پیشتر یہ نہر موجود تھی۔ لیکن قدیم جغرافیہ مصر سے جو ڈاکٹر برغش بے ارمنی نے اپنی تاریخ مصر میں لکھا ہے واضح ہوتا ہے کہ فراعنہ مصر کے دور دورہ میں مصر نو صوبوں میں منقسم تھا اور انتہائی مشرقی صوبہ "نہر پلوزیم" پر واقع تھا۔ جو نیل کی انتہائی مشرقی شاخ ہے اور بحیرہ شام میں اس مقام پہ گرتی ہے جس کے قریب بندرگاہ صعید واقع ہے۔ اب یہ شاخ "برکتہ منزلہ" میں گرتی ہے۔ اس لئے یہ قیاس غالب ہے کہ پلوزیم کے شمال مشرقی حصہ کو نہر سویس تصور کیا گیا ہو جس کے شکم پر سے نہر سویس گزرتی ہے۔

ہم نے ان فراعنہ مصر کا بھی ذکر اس کتاب میں کیا ہے جن کے دور دورہ میں حضرت ابراہیم ؑ یہاں آئے اور حضرت یوسف ؑ آباد ہوئے۔ ان کو کتبوں میں "حیق سوس" لکھا ہے "سوس" یہی سویس ہے۔ "حیق" عربی میں کمر بند کو کہتے ہیں۔ ان ایام میں نہر پلوزیم ہی عرب کے اس حصہ کو جو سینا سے ملحق ہے اور سویس کہلاتا تھا مصر سے جدا کرتی۔ لیکن تاریخی زمانہ میں

اس کا پتہ نہیں ملتا کہ بحیرہ شام اور احمر کا بھی اتصال کبھی تھا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ نہر سویس کی تعمیر کا تصور پرانا ہے۔ خلیفہ ہارون الرشید کو بھی تھا کہ اگر نہر تعمیر ہو جائے تو تجارت وغیرہ میں سہولت پیدا ہو جائے گی اس کی ایک وجہ یہ ہے مصر سے جو راستہ فلسطین کو جاتا ہے مصر کے شمال میں واقع تھا وہ خطرناک دلدل جھیلوں اور شام کے درمیان سے گزرتا ان میں سے ایک جھیل میں شاہ ایران کا ایک لشکر غرق ہو گیا تھا وہ مصر کو مسخر کرنے کے لئے اس طرف آرہا تھا۔ اور اسی میں لشکر فرعون بھی غرق ہوا۔ جب حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس کو "سربن" کہتے ہیں۔

(نہر سویز کی تعمیر کا تصور فرانسیسی ہے۔ ۱۶۷۱ء میں لوئیس چہار دہم کے عہد میں فر انجینیروں نے اس کا ایک خاکہ مرتب کیا۔ اور والئے مصر شیخ علی بے سے اجازت ا مراعات بھی حاصل کرلیں مگر اس منصوبہ کی تکمیل نہ ہو سکی۔ یورپ کے معاملات نے ... کو ادھر ہی الجھائے رکھا۔

نپولین برطانیہ کے اقتدار کو خاک میں ملانا چاہتا تھا۔ اور نزدیک ترراستہ یہی تھا۔ ج ہندوستان کو یورپ سے جاتا۔ اس لئے اس نے بھی بحیرہ شام اور احمر کو ملانے کی تجویز اپنے کے سامنے رکھی۔ ۱۸۴۶ء میں فرانس کے ایک انجنیر نے ایک کمپنی کی طرح ڈالی اور قاہرہ میں فرانسیسی نائب قونصل کے ذریعہ ترکی والئے مصر سعید پاشا نے ۱۸۵۴ء میں اس سے ایک معاھدہ بھی کرلیا۔ جس کی تصدیق باب عالی نے بھی کر دی مگر برطانیہ سخت مخالف تھا۔ لار "پامرسٹن" وزیر اعظم برطانیہ کا خیال تھا کہ مشرق بعید میں فرانس کا اثر و رسوخ بہت بڑھ جائے گا اور برطانوی تجارت کو بھی نقصان پہنچے گا لیکن فرانس نے حصص فرانسیسی سرمایہ داروں کے پاس فروخت کر دئے اور کمپنی کی تشکیل ہو گئی۔ ہر ایک حصہ کی قیمت ایک سو بیس پونڈ تھی حصہ دار خدیو مصر اسمٰعیل پاشا بھی تھا۔ اسی کے ہاں بیس سال تک ڈاکٹر برعش بے ارمنی ملازم رہا اور کتبوں سے تاریخ مصر کا مواد فراہم کیا۔ HISTORY OF EGYPT FROM — MONAMEUTS) اب انگریزوں کی بھی آنکھیں کھلیں۔ خدیو مصر نے یورپ والوں کی مہمان نوازی کا حق پورا بلکہ بڑھ چڑھ کر ادا کیا۔ اس لئے اس داد و دہش کی وجہ سے روپیہ کی بہت ضرورت

ی اپنے خرید کردہ حصص برطانیہ کے وزیر ڈزرائیلی (اسرائیلی) کے ہاتھ بعوض چالیس لاکھ پونڈ فروخت
کر دیئے ۔ اس طرح کمپنی کے چالیس فی صدی حصے برطانیہ کے ہاتھ لگ گئے ۔
مصر میں فرانسیسی قونصل "ڈی لیسپ" تھا۔ کمپنی کا صدر بھی یہی تھا۔ معاہدہ حکومت مصر
و اسی کے درمیان ہوا تھا۔ اس کے وثاکو آمدنی کا ایک حصہ اب بھی ملتا ہے ۔ فرڈی نینڈ ڈی
لیسپ اور سعید پاشا کے درمیان جو معاہدہ ہوا اس کی اہم شرط یہ ہے ۔ کہ :۔

• ۹۹ سال بعد یعنی ۲۰ر نومبر ۱۹۶۹ء کو نہر سویز کے حقوق ملکیت حکومت مصر کے نام منتقل ہو جائیں گے ۔ تب تک کمپنی کی صدارت کسی فرانسیسی کے لئے محفوظ ہے :

کمپنی کا صدر دفتر پیرس میں واقع ہے ۔ ۳۲ ڈائریکٹروں میں اٹھارہ فرانسیسی اور دس
انگریز اور دو مصری اور ایک امریکن اور ایک ڈچ ہے ۔ ۱۹۴۹ء میں حکومت مصر نے مطالبہ
کیا کہ نصف نشستیں مصر کو دی جائیں ۔ یہ معاملہ ہیگ کی بین الاقوامی عدالت میں بھی پیش ہوا
لیکن بے نتیجہ ہی رہا ۔
چونکہ میعاد معاہدہ کے اختتام کو چند سال ہی رہ گئے ہیں اس لئے کمپنی نے ۱۹۰۹ء
میں مصری حکومت سے درخواست کی تھی کہ میعاد میں توسیع مزید ۹۹ سال کی جائے ۔ حکومت
نے درخواست مسترد کر دی ۔
۱۸۸۸ء میں قسطنطنیہ میں ایک کنونشن (CONSTENTIONOPLE CONVENTION)
میں مختلف ممالک کے نمائندہ شامل ہوئے تھے ۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا تھا ۔ کہ یہ بین الاقوامی گذرگاہ
ہے اس لئے ہمیشہ سب کے لئے کھلی رہے ۔ چونکہ برطانیہ کا سیاسی وغیرہ تعلق ایران اور
ہندوستان وغیرہ سے گہرا ہے اس لئے اس کو خاص مراعات بھی حاصل ہوگئیں ۔ ان میں سے
ایک یہ ہے کہ "برطانیہ کو اس نہر کے تحفظ کے لئے یہاں اپنی فوج رکھنے کا بھی حق ہے" ۔ اس کی توثیق
معاہدہ ۱۹۳۶ء نے کر دی جو حکومت مصر سے باندھا گیا ۔ اس وقت برطانیہ منتہائے عروج پر تھا
جو چاہتا منوا لیتا ۔ اس لئے ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کو غیر مساوی قرار دیا گیا ۔ اور برطانیہ خود اسے غیر
مساوی تسلیم کرتا ہے ۔ لیکن یہ بھی کہتا ہے کہ معاہدات ایسے ہی ہوا کرتے ہیں ۔ اس معاہدہ کی

میعاد اکیس ۲۱ سال ہے یہ ۱۹۵۶ء میں ختم ہو گا۔ اگر کسی وجہ سے یہ معاہدہ منسوخ نہ بھی ہوتو چھ سال کے بعد غالباً مصر اس کی تجدید نہ کرے گا۔ اب تنازعہ مصر اور برطانیہ کے درمیان صرف اتنا ہے کہ یہ معاہدہ کالعدم قرار دیا جائے اور برطانیہ اپنی فوج نہر سویز سے ہٹا لے۔

غالباً قارئین کے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہو گا کہ وہ کیا اسباب ہیں کہ ایک طرف ایران پٹرولیم اور ہر ایک شے جو اس سے وابستہ ہے اپنی قومی ملکیت قرار دیتا ہے اور دوسری طرف مصر نہر سویز کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔

یہ اسباب برصغیر ہندوستان کی تقسیم میں ملیں گے۔ بھارت اور پاکستان کی تشکیل کے بعد برطانیہ کی حکومت کا اقتدار ہندوستان پر نہ رہا۔ اور یہی بد قسمت ملک تھا جس کے بل بوتے پر برطانیہ ایشیائی ممالک بالخصوص دنیائے اسلام پر چھایا ہوا تھا۔ لاکھوں ہندوستانی سپاہی اس کے ایک اشارہ پر ایران اور مصر اور عرب وغیرہ ممالک کو مرعوب کرتے رہے۔ اب یہ رعب اٹھ گیا۔ اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ہندوستان کی تقسیم کا فائدہ ممالک اسلامیہ کو پہنچا۔ اگر یہ ذرا سیاسی تدبر سے کام لیں تو ممکن مکمل فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہندوستان سے کلیۃً دستبردار ہونا خواہ برطانیہ کے زعم میں عارضی ہو۔ ایک ایسی سیاسی غلطی تھی جس نے اس کی کمزوری کو واضح کر دیا۔ یہ کمزوری جس کا ذکر ہم ان صفحات میں کر چکے ہیں۔ اس کے سیاسی تدبر نے اب تک پوشیدہ رکھی مگر اب پول کھل گیا۔

ایران اور مصر میں چونکہ سیاسی بیداری نسبتاً زیادہ ہے۔ اس لئے وہ برطانوی کمزوری کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ برطانیہ ابھی تک اس لئے اڑا ہوا ہے کہ نہر سویز اور برطانوی پرشین آئل کمپنی میں، فرانس اور امریکہ کا مفاد بھی شامل ہے اس لئے وہ انہی کے سہارے پر کھڑا ہے ورنہ کبھی کا چلتا پھرتا نظر آتا۔ فرانس کو برطانیہ کی شراکت بہت مہنگی پڑی۔ دونوں عالمگیر جنگوں میں اس کا کچومر نکل گیا۔ البتہ امریکہ تو دولت ہے۔ دل دونوں کے پھٹے ہوتے ہیں۔ دونوں سرمایہ دار ملک کیمونزم کی اشاعت سے خائف ہیں۔ اس لئے بظاہر مشترکہ مفاد ان کو جدا ہونے نہیں دیتا۔ واقعات کی رفتار اگر یہی رہی تو قریب تر زمانہ میں متوقع جنگ عظیم سرمایہ داری کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دے گی اور اس کے ساتھ ہر

ایک ملکی اور غیر ملکی حکومت کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔" لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار۔ (۲۴/ے)

(رفعت بے ڈائرکٹر جنرل وزارت تعلیم مصر اور قاہرہ میں پروفیسر تاریخ تھا یہ خود مصری ہے اور مصر کے حالات سے خوب واقف ہے۔ اس نے اپنی کتاب "بیداری مصر" (THE AWAKENING [redacted] MODERN EGYPT) میں مصر کی بیداری کا وہ وقت بتایا ہے جب "نپولین بونا پارٹ" (NAPOLEAN BONAPARTE) مئی ۱۷۹۸ء میں بندرگاہ سکندریہ کے قریب اپنی تیس ہزار سپاہ کے ساتھ اترا۔ اس وقت مملوک مصر پر حکمران تھے۔ دو تین لڑائیوں کے بعد انھوں نے شکست کھائی۔ نپولین نے اپنے اعلان میں مصریوں کو یقین دلایا کہ "فرانسیسی اس جگہ اس غرض سے نہیں آئے کہ ان کے ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کریں۔ ہم جمہوریت پسند ہیں اور تمام بنی نوع انسان کو حریت اور مساوات سے روشناس کرتے ہیں اور آپ کو بھی خود شناسی کا سبق دیتے ہیں جو آپ کو آنحضرت ﷺ نے دیا اور آپ فراموش کر چکے ہیں۔ بہت عرصہ تک یہ مملوک جو قاف اور چارجیا کے رہنے والے تھے غلام تھے۔ آپ پر ظالمانہ حکومت کرتے رہے۔ ان کے استبداد سے آپ کو ہم نے نجات دلائی۔ آیندہ یہ آپ کا کام ہے کہ اپنا ملک سنبھالیں اور سلطنت کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لیں۔ جو علم و حکمت اور تقوی میں آپ میں سے بڑھ کر ہے اس کی اطاعت کریں۔ کیا یہ مملوک خدا کے ہاں سے حکومت کا پٹہ لکھوا کر لاتے ہیں۔ اگر ان کے پاس ہے تو دکھائیں۔ اللہ تعالیٰ رحمٰن اور رحیم اور عادل ہے۔ اس کی تقدیر یہی ہے کہ ان کی حکومت کا خاتمہ ہو۔ خوشحال وہ ہیں جو اس کار خیر میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور وہ بھی جو غیر جانبدار ہیں کیونکہ جلدی ہی وہ ہمارے نیک ارادوں سے واقف ہو کر ہمارا ساتھ دیں گے۔ مگر وہ انتہائی بدقسمت ہیں جو ہمارے خلاف مملوک کی حمایت میں ہتھیار اٹھائیں۔ [redacted] ہلاک ہوں گے اور ان پر رحم نہ کیا جائے گا۔

مصریو! ہمارے اور تمہارے بدخواہوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ ہم آپ کا دین مٹانے کے لئے آئے ہیں۔ حاشا و کلا۔ ان کو بتا دو کہ ہم ایک اللہ واحد لاشریک کے پرستار ہیں

اور آنحضرت ﷺ اور صحیفۂ قدسیہ قرآن کا ایسا ہی احترام کرتے ہیں جیسا کہ ایک مسلمان کے شایاں ہے۔

۸۰ اے شیخان ازہر اور قاہرہ! ان کو واشگاف لفظوں میں بتادو کہ ہم فرانسیسی صدق دل سے مسلمان ہیں۔ اس کا ثبوت ہم دے چکے ہیں۔ ہم نے مسیحیت کے گڑھ روم پر حملہ کیا اور پوپ کو نکال باہر کیا جو اسلام کے خلاف حروب صلیبیہ کا وعظ کرتا رہا۔ جزیرہ مالٹا (MALTA) سے مسیحی نائٹ (KNIGHTE) سے خالی کرایا۔ اور ہمیشہ سے ترکی سلطان خلد اللہ ملکہٗ کے دوست رہے ہیں۔"

۸۱ (نپولین بوناپارٹ اس وقت مغلیہ شہنشاہ اکبر اعظم کے بہروپ میں ظاہر ہوا۔ مسلمانوں کے مذہبی تیوہار دھوم دھام سے مناتا رہا۔ لباس بھی شیخوں کا پہننا۔ مساجد میں بھی جاتا اور لوگ جوش مسرت سے نعرے لگاتے "السلطان الکبیر بوناپارٹ"۔

ادھر بوناپارٹ سلطان سے دوستی کا دم بھرتا تھا۔ ادھر سلطان اور انگریز اور روس متحد ہو رہے تھے۔ کہ فرانس کو نیچا دکھائیں۔ مصریوں کے دل و دماغ پر جس چیز نے زیادہ اثر کیا وہ "سائنس" کا کرشمہ تھا جو اب یہاں فرانسیسی دکھا رہے تھے۔ چھاپہ خانہ عربی حروف میں اشتہار اور اعلان شائع کر رہا تھا۔ ہسپتال اور تفریح کے سامان تھیٹر (THEATRE) تعمیرات جہاز کا کارخانہ اور دوسری مشینیں ان کو حیرت اور استعجاب میں ڈال رہی تھیں۔ ان کی بھی آنکھیں کھلیں کہ جس دنیا جہالت میں وہ اب تک رہے اس کے باہر جہاں اور بھی ہے۔

انگریز امیر البحر "نلسن" (NELSON) نے "ابوکبیر" کی کھاڑی میں فرانسیسی بحری بیڑہ کو تباہ کر دیا۔ مصریوں نے سنا کہ ترکی سلطان خلیفۃ المسلمین بھی مصریوں کو فرانسیسیوں کے چنگل سے چھڑانے کیلئے آ رہا ہے۔ عام بغاوت ہو گئی۔ ترکی فوج کو فرانسیسی جنرل "کلیبر" (KLEBER) نے "عین شمس" (HELI-POLIS) پر شکست دی۔ بغاوت تو دب گئی مگر جامعہ ازہر کے ایک طالب علم نے فرنچ جنرل کلیبر کا کام خنجر سے تمام کر دیا اس کا جانشین "مینو" (MENOU) ہوا۔ علانیہ مسلمان ہوا۔ اسلامی نام عبداللہ رکھا۔

آخر ترکوں اور انگریزوں کی متحدہ فوج نے فرانسیسیوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ صلح کی گفت و شنید کے بعد ۱۸۰۱ء میں فرانسیسی اپنا بوریا بستر سنبھال کر مصر سے چلے گئے۔ انہی ایام میں ایک فرانسیسی "بوکارڈ" ([redacted]UCHARD) کو وہ مشہور پتھر ملا جسے "سنگ روزیٹہ" (ROSETTA STONE) کہتے ہیں۔ یہ پتھر انگریزوں کے ہاتھ پڑا۔ اور یہاں سے لندن کے عجائب خانہ میں آیا۔ ۱۸۲۲ء تک یہ صرف فتح کی یادگار ہی سمجھا جاتا رہا۔ آخر ایک فرانسیسی "شمپولین" (CHAMPOLLIAN) نے اس کا مطالعہ شروع کیا۔ اس پر تین زبانوں کے حروف ابجد کی عبارت تھی۔ ایک یونانی جس کو سب جانتے تھے۔ دوسرے عام مصری رسم الخط جو قدیم زمانہ میں بھی رائج تھا۔ تیسرے مصری "ہیروغلف" (HIEROGLYPHIC) آخر الذکر تحریر مستور تصویری حروف میں ہے۔ جو عام مصری رسم الخط کے ساتھ جو تحریر مستور کا ہی اختصار ہے۔ قدیم تر زمانہ کے مصری کتبوں میں اب بھی دکھائی دیتی ہے۔ یونانی حروف کی مدد سے مصری حروف کی ابجد دریافت ہوئی۔ اس کے بعد کتبوں کا مطالعہ شروع ہوا۔ اور پیدائش مسیح سے دس ہزار سال پیشتر تاریخی واقعات روشن ہو گئے۔

فرانسیسی قبضہ سے پیشتر مملوک کی موروثی حکومت مصر پر تھی۔ سلطنت عثمانیہ کے برائے نام ماتحت تھے۔ لیکن حکومت ترکیہ نے ارادہ کیا کہ مملوک "بے" کو بالکل علیحدہ کر دیا جائے۔ اور اپنے نامزد گورنر مقرر کرے۔ ادھر مملوک بھی اڑ گئے۔ خانہ جنگی شروع ہو گئی تو عوام ہی زیادہ تر نقصان اٹھا رہے تھے۔ اب فرانسیسیوں کو یاد کرتے کہ وہی بہتر تھے

محمد علی پاشا

مصر میں سلطنت عثمانیہ کے البانوی دستہ کا ایک افسر محمد علی بے تھا۔ یہ شخص "کویلا" (CAVALLA) واقع مقدونیہ میں ۱۷۶۹ء میں اسی سال پیدا ہوا۔ جس سال نپولین بوناپارٹ کی ولادت ہوئی۔ نجومی تو دونوں کو صاحب اقبال کہتے ہیں۔ ۱۸۰۲ء میں جب فرانسیسی مصر سے رخصت ہوئے۔ ترکی گورنر کے تحت محمد علی کام کرتا رہا۔ ترک اور مملوک باہم دست و گریبان ہو رہے تھے محمد علی سیاسیات سے واقف تھا۔ کبھی مملوک کی در پردہ حمایت کبھی ترکوں کا علانیہ

خیر خواہ ملازم۔ غرض لباس کا کوئی رنگ نہ تھا جو اس کے بدن پر زیب نہ دیتا ہو۔ اور جس کی طرف
لوگوں کی نظریں نہ اٹھتی ہوں۔ مملوک زور پکڑ رہے تھے۔ اور آخر پھر مصر پر چھا گئے۔ خورشید پاشا
مصری گورنر عاجز آگیا۔ تو محمد علی نے مارچ ۱۸۰۳ء میں ان کو شہر بدر کر دیا۔ کچھ دن محمد علی
کے حسب منشا کام چلتا رہا۔ عوام میں "ٹیکس" کی بھرمار کی وجہ سے عوام میں بے چینی پھیل گئی
اب محمد علی اپنے اصلی رنگ میں سامنے آگیا۔ وہ وقت شناس واقع ہوا تھا۔ عوام کی قیادت
جامعہ ازہر کے شیوخ اور روساشہر کر رہے تھے۔)

قاضی القضاۃ کی عدالت میں استغاثہ خورشید پاشا کے مظالم کے خلاف پیش کیا۔
قاضی نے پاشا کو جواب دہی کے لئے طلب کیا۔ پاشا نے طلبی کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شہر میں
عام ہڑتال اور شورش تھی۔ سب نے محمد علی کی طرف رجوع کیا۔ وہ اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس
جگہ ایک مجلس منعقد ہوئی اور قاضی صاحب نے بالاتفاق رائے (ترکی پاشا کو ایک فتویٰ کے
ذریعہ معزول کر دیا) جب محمد علی نے پوچھا کہ خالی جگہ کو کون پر کرے گا تو (سب نے بالاتفاق محمد علی
کو منتخب کیا۔ شیخ جامعہ ازہر اور سید عمر مکرم نے خلعت پہنایا اور عام اعلان کیا گیا کہ محمد علی
آئندہ مصر کا شاہ ہے۔ خورشید پاشا کو بھی قاضی کے فتویٰ سے مطلع کیا گیا۔ مگر اس نے تعمیل سے
انکار کر دیا اور باب عالی کے حکم اور مدد کا انتظار کرنے لگا (باب عالی نے وقت کی نزاکت کا
کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے محمد علی کو خورشید پاشا کی جگہ دے دی۔ دو سال بعد محمد علی کا تقرر بحیثیت
گورنر "سالونیکا" (SALONICA) ہوا۔ محمد علی بھی سمجھ گیا کہ یہ تبادلہ معزولی کے مترادف ہے
مملوک تو ترکی حکومت کے حامی تھے۔ مگر "فلاحین" یعنی عام کاشتکار اور شہری تجارت پیشہ
وغیرہ محمد علی کے حق میں تھے اور مشائخ بھی اس کے ساتھ تھے۔ اب مصری قومی تحریک
شروع ہو گئی جس کی قیادت محمد علی کر رہا تھا۔ اس کو انگریزوں کی حمایت بھی حاصل تھی اور
اس کا اثر باب عالی پر بھی پڑ رہا تھا۔

اتفاق حسنہ ہی کہنا چاہیئے کہ سلطان روم اور فرانس میں مراسم دوستانہ قائم ہو گئے
انگریزوں کو ناگوار گذرا تو بحری بیڑہ درہ دانیال میں بھیج دیا جس کو ہٹنا پڑا۔ اس کا انتقام لینے
کے لئے مملوک مصر کو گانٹھا اور بحری بیڑے کا رخ اسکندریہ کی طرف ہو گیا۔ انگریزوں کا

مصمم ارادہ تھا کہ مصر پر مستقل قبضہ کیا جائے۔ اب مملوک بھی ساتھ ہو گئے۔ علماء مصر اور شیخ جامع ازہر نے فتویٰ شائع کیا اور بتایا کہ "انگریز فرانسیسیوں سے بھی بدتر ہیں۔ فرانسیسی لامذہب سہی مگر حریت و مساوات کے قائل ہیں اور انگریز متعصب مسیحی ہیں اور حروب صلیبیہ زندہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"الفی بے" جس نے انگریزوں کو دعوت دی تھی، مر گیا۔ فتویٰ میں تشریح تھی کہ جو بھی مسلمان کفار کی مدد کرے گا۔ "فھو منھم" وہ بھی خارج از اسلام تصور ہو گا۔ یہ فتویٰ جہاد تھا مملوک سب مصری قومی فوج سے آملے۔ بحری بیڑہ کی مدد سے سکندریہ پر انگریزوں کا قبضہ آسانی سے ہو گیا۔ بلکہ بلا مزاحمت ہوا۔ شہر روزیٹہ میں بھی کچھ مزاحمت نہ ہوئی اور انگریز بے تکلف شہر میں پھر رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا تمازت آفتاب نے سایہ میں پناہ لینے پر مجبور کیا۔ یک لخت لوگوں کے گھروں کی کھڑکیوں اور در و دیوار سے ہر طرف سے گولیاں کا مینہ ان پر برسنا شروع ہو گیا۔ دریا کے دونوں کناروں پر مصری سواروں نے حملہ کر دیا۔ "الحماد" پر انگریزوں کو شکست ہوئی۔ اور بھاگ کر الگزینڈریہ میں پناہ لی۔ روزیٹہ میں انگریز اکثر مارے گئے اور بہت اسیر ہوئے۔ جن میں ان کا جرنیل فریزر (FRAZAR) بھی تھا۔

یورپ میں نپولین اور زار روس "الگزینڈرا" (ALEXANDERA) میں گفت و شنید ہو رہی تھی۔ اب برطانیہ کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ مصر کا خیال چھوڑ کر گھر کی خبر لے جنرل فریزر کے ذریعہ شرائط صلح طے ہوئیں۔ انگریز مصر سے نکل گئے اور محمد علی واحد مالک ارض فراعنہ کا ہو گیا۔ باب عالی نے بھی تحسین و آفرین کی۔ اس کا بیٹا بطور یرغمال قسطنطنیہ میں تھا اسے واپس کر دیا اور خطابات و تحایف بھی بھیجے۔

اب محمد علی نے اصلاح کا کام شروع کیا۔ ادھر سے فراغت ہوئی تو باب عالی کی دعوت پر اپنے بیٹے "طوسون" کو وہابیوں کی سرکوبی کے نجد کی طرف روانہ کیا۔ نجدیوں نے جان توڑ مقابلہ کیا۔ کمک کی درخواست پر محمد علی خود ۱۸۱۳ء میں آیا اور یہ علاقہ اور مقامات مقدسہ مکہ و مدینہ بھی اس کے قبضہ میں آ گئے۔ مگر ۱۸۱۵ء میں محمد علی کو پتہ لگا کہ نپولین جزیرہ "البا" سے فرار ہو گیا جہاں انگریزوں نے اسے نظربند کر رکھا تھا۔ اس لئے اسے مصری فوج کے

ساتھ پھر مصر کی طرف لوٹنا پڑا۔ ۱۸۱۶ء میں اس کے بیٹے طوسون کا انتقال ہو گیا۔ وہابیوں نے پھر سر اٹھایا۔ اب کے دوسرا بیٹا ابراہیم اس مہم پر گیا۔ عبداللہ بن سعود گرفتار ہو گیا۔ اور قسطنطنیہ میں قتل کیا گیا۔ ابراہیم ۱۸۱۹ء میں مصر کی طرف لوٹا۔

محمد علی نے اپنے تیسرے بیٹے اسمٰعیل کو سوڈان کی مہم پر بھیجا۔ اس کا ارادہ تھا کہ بحر احمر اس کی سلطنت کی جھیل بن جائے۔ عرب کے ساحلی کنارہ پر اس کا سکہ بیٹھ چکا تھا۔ سوڈان کی فتح سے یہ خواب پورا ہو سکتا تھا۔ اگرچہ اسمٰعیل نے فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا مگر ایک فریب کا شکار ہو گیا۔ نمیر حاکم "شندی" نے ضیافت پر مدعو کیا۔ جس جگہ ضیافت کا اہتمام تھا اس کے اردگرد چاروں طرف خشک گھاس اور لکڑی کے انبار تھے۔ خطرہ سے بے خبر وہ کھانا کھا رہے تھے کہ یک لخت چاروں طرف سے آگ نے گھیر لیا۔ سب جل کر راکھ ہو گئے۔ کسی نے نکلنے کی کوشش کی تو نمیریوں نے تیر اور نیزوں پر رکھ لیا۔ اگرچہ اس کا انتقام لیا گیا مگر نمیر بچ کر نکل گیا۔

نپولین کے خاتمہ پر فرنچ جرنیل بھی پراگندہ ہو گئے۔ کچھ ایران اور پنجاب میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ملازم ہو گئے۔ کچھ محمد علی کے منظورِ نظر بنے۔ انہی کے تحت محمد علی نے مصری فوج مرتب کی۔ یہ کرنل سولیس (SEVES) تھا۔ جو بعد میں سلیمان بے اور سلیمان پاشا کے اسلامی نام سے مشہور ہوا۔ چند سال کے عرصہ میں محمد علی کے پاس ۱۸۳۹ء میں دو لاکھ تربیت یافتہ سپاہی تھے۔ جن میں سے ایک لاکھ تیس ہزار منظم ہو چکے تھے۔ بحری بیڑہ بھی تیار کر لیا۔ اور یورپ کے بیڑہ سے کسی حیثیت میں کم نہ تھا۔ بقول ڈاکٹر "باؤرنگ" (DR: BOWRING) صرف وردی کا فرق تھا۔

سلطان روم محمود ثانی سے بگڑ گئی تو اپنے بیٹے ابراھیم کو شام پر حملہ آور ہونے کے لئے بھیجدیا۔ "عکہ" لے لیا تو سلطان کا ایلچی محمد علی کے پاس آیا۔ محمد علی نے کہا کہ "اگر سلطان حملہ سے دست بردار ہو تو میں آگے نہ بڑھوں گا ورنہ عکہ کے بعد دمشق اور دمشق کے بعد اللہ کریم ہی خوب جانتا ہے کیا ہو گا۔"

"بیلان" کی لڑائی میں ترکوں کو شکست فاش ہوئی اور ابراہیم کوہ طورس تک بڑھ

یا۔ اس کے دامن میں دوسری طرف ایشیا کوچک تھا۔ ۱۹ر دسمبر ۱۸۳۲ء میں قونیہ کے میدان پر بھی ترکوں کو شکست ہوئی۔ سلطان نے شرائط صلح پیش کیں۔ محمد علی نے مسترد کردیں۔ اب اس کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا اور وہ قسطنطنیہ پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ روس درمیان میں آگیا۔ روس نے اپنا بحری بیڑہ الگزینڈریہ پر بھیج دیا۔ محمد علی نے شرائط صلح منظور کرلیں
اب آسٹریا اور فرانس اور برطانیہ کو اپنی فکر لاحق ہوگئی۔ سلطان سے روس کے مطالبات ایسے تھے کہ ان سب کی خیر نہ تھی۔ سلطان اور محمد علی میں یہ طے پاچکا تھا کہ محمد علی موروثی خدیو مصر رہے گا اور شام کا ایک ساحلی علاقہ بھی اس کے قبضہ میں رہے گا۔ پانچ دول یورپ نے متفقہ یادداشت میں باب عالی کو اس معاہدہ کی تنسیخ پر مجبور کیا اب دول یورپ محمد علی کے خلاف متحد ہوگئے۔ اور محمد علی کو عکہ چھوڑنا پڑا۔ دول یورپ کی سیاسی بھول بھلیاں سے محمد علی خوب واقف تھا۔ اس کا فائدہ اسے آخرکار یہ ہوا کہ مصر میں اس کا خاندان سلطنت کا مالک ہوگیا۔ سلطان اور دیگر دول یورپ سے بھی صلح صفائی ہوگئی۔ محمد علی ۱۸۴۱ء کے بعد اسلام بول گیا اور اس کا بیٹا ابراہیم لندن کی طرف نہضت فرما ہوا۔ ہر جگہ باپ بیٹے کی آؤ بھگت ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں ابراہیم کا انتقال ہوگیا۔ جس کا صدمہ ضعیف باپ کو اس حد تک ہوا کہ ۲ر اگست ۱۸۴۹ء میں محمد علی بھی فوت ہوگیا۔ اس کا پوتا عباس جانشین ہوا۔ جولائی ۱۸۵۸ء میں کسی نے اس کا کام بھی تمام کردیا۔ قاتل کا پتہ نہ ملا۔ عام رائے یہ تھی کہ مملوک کی سازش کا شکار ہوا۔ عباس کا چچا سعید جانشین ہوا۔ اس کے ہاں فرانسیسی سفیر فرڈی نند لیسپ (FERDENEND DE — LESSEPS) تھا جس کا ذکر ہم نے شروع میں نہر سویز کے تحت کیا ہے۔ سعید جنوری ۱۸۶۰ء میں فوت ہوا۔ اس کا برادر زادہ اسمٰعیل پسر ابراہیم جانشین ہوا۔ جس نے سوڈان فتح کر کے مصر میں شامل کرلیا۔ باب عالی نے "خدیو مصر" کا لقب عطا فرمایا۔
انگریز مصر پر مستقل قبضہ کا ارادہ رکھتے تھے۔ فرانس سد راہ تھا۔ آخر دونوں کا اتفاق ہوا تو ۱۸۷۹ء میں اسمٰعیل کو تخت مصر سے اپنے بیٹے توفیق کے حق میں دستبردار ہونا پڑا۔

اب حکومت گو شخصی تھی مگر جمہوریت کی صورت اختیار کر رہی تھی اور دستوری (PARLIMENTERY) بن چکی تھی۔ تمام اختیارات وزراء کے ہاتھ میں تھے۔ خدیو عفو معطل تھا۔ عربی پاشا وزیر حرب عملاً مصر پر چھایا ہوا تھا۔ بے کسی کے عالم میں خدیو نے سلطان کی طرف اور یہاں سے مایوس ہو کر دول یورپ کی طرف رجوع کیا۔ سب نے کنارہ کیا۔ انگلینڈ نے دخل دیا اور کامیاب ہوا۔ عربی پاشا باغی قرار دیا گیا۔ مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ اور "سیلون" میں جلاوطن کیا گیا۔ عربی پاشا نے حکم سن کر کہا کہ:۔

"جد امجد جنت سے نکلے تو اسی جگہ وارد ہوئے تھے"

اب انگریزوں کا قدم مصر میں جم چکا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کب اور کیسے مصر خالی کریں۔ فرانسیسی مطالبہ کرتے تھے کہ یہاں مستقل رہائش ہی رکھو مگر اس میں نصف کے حقدار ہم بھی ہیں۔ لیکن برطانیہ کو اپنی طاقت پر بھروسہ تھا ٹکا سا جواب دیا۔ قدم تو جم گئے۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ کتنی فوج مصر اور بالخصوص نہر سویز کے تحفظ کے لئے درکار ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے کہ اس کا حل آج تک تسلی بخش نہیں ہوا۔

مصر پر خدیو اور اس کی پارلیمنٹ ہی کی حکومت ہے مگر مشیر اور وزیر انگریز ہے خدیو ایک دفعہ کچھ اکڑا تو کرومر (CROMIER) نے کہا کہ:۔

"آپ کا باپ اسمٰعیل اسلامبول میں موجود ہے۔ آپ نہیں مانتے تو وہ ضرور مانے گا"

۱۹۰۶ء میں "کرومر" تو مصر سے رخصت ہوا۔ سعد زاغلول پاشا نے وزارت عظمیٰ سنبھال لی۔ اور یہی قومی لیڈر مصریوں کا ہوا۔ توفیق کے بعد فواد اور فواد کے بعد فاروق خدیو مصر کے عہد میں جمہور اپنے لائق نمائندگان وزراء کے تحت اس لائق ہو گئے کہ آج برطانیہ سے مطالبہ یہ ہے کہ مصر خالی کر دو۔ یہ گفت و شنید ایسے مرحلہ پر پہنچ چکی ہے کہ برطانیہ کو نہر سویز سے ہٹنا پڑے گا۔)

اگر ہم ان واقعات کو ان حالات سے جو ایران میں رونما ہو رہے ہیں بنظر عمیق دیکھیں تو برصغیر ہندستان کی تقسیم میں ہمیں خدائی ہاتھ نظر آ رہا ہے اس تقسیم سے تمام دنیا اسلام کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

پاکستان

پاکستان ہندوستان کی تقسیم کے بعد ظہور میں آیا ہے۔ ابھی چار سالہ طفل ہے اور یہی چار سالہ واقعات ہیں جو اس کے مستقبل کا پتہ دیتے ہیں۔ اس کے ظہور کے فوراً بعد ہم نے اس کی روزانہ سرگذشت قلم بند کرنے کا ارادہ کر لیا چنانچہ قلم بند کرتے رہے۔ اس کو من وعن ہم شائع کرنے سے معذور ہیں۔ البتہ یہ سرگذشت محفوظ رہے گی اور اگر اللہ کو منظور ہوا تو آیندہ نسلیں اپنے بزرگوں کے کارنامے یا نامۂ اعمال کا مطالعہ کریں گی۔ تمام ارباب حل وعقد کو یہ پختہ یقین ہونا چاہیئے کہ

"ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید وجاءت سکرۃ الموت بالحق، ذلک ما کنت منہ تحید" ($\frac{۲۶}{۱۹}$)

"اس کے منہ سے کوئی بات ایسی نہیں نکلتی جو فوراً محفوظ نہ کر لی گئی ہو۔ اور موت کی بے ہوشی نے آلیا اور یہ وہ یقینی چیز ہے جس کی طرف تیری توجہ ہی نہ ہوتی تھی"

"نظم ونسق جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے انہیں یقین ہونا چاہیئے کہ ایک دنیا کی نظریں ان پر ہیں ان کا ہر ایک قول اور ہر ایک فعل "ریکارڈ" ہوتا رہتا ہے۔ یہ کہیئے کہ ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہوتا رہتا ہے۔ اگر زندگی میں کسی وجہ سے نہیں تو ان کی موت کے بعد یہ تاریخی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ آیندہ نسلیں مطالعہ کرتی ہیں۔ اس لئے دانش مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ اپنے پیچھے نیک مثال اور نیک نام چھوڑیں۔ ادبیہ تو تاریخ کے ہر ایک طالب علم کو معلوم ہے کہ بہت فرعون گذرے ہیں جن کے نام کے ساتھ لعنت کی دُم بھی لگی ہوتی ہے۔

تواریخ عالم کا مطالعہ کرو ہر ایک قوم کی تاریخ میں اس کی ابتدا میں ایک بے پناہ

جوش اور ولولہ اور عزم راسخ اور ہمت بلند نظر آئے گی۔ اسی کے ساتھ وہ اپنا مقصد حاصل کر لیتی ہے۔ اس کی بربادی کی دل خراش داستان اس کے عیش ونشاط کی محفلوں اور رنگ رلیوں پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن جس قوم کی ابتدا ہی عیش عشرت سے ہو۔ اس کا اول ہی اس کا آخر یقیناً ہے۔ وہ آیندہ نسلوں کے لئے جو انہی کی اولاد ہے۔ غلامی کے سوا کچھ اور ورثہ میں نہیں چھوڑتے۔ ہندوستان میں ایک ہزار سالہ حکومت کے بعد ہم دوسو سال غلامی کی بدترین زندگی بسر کرتے رہے۔ جو ہم کو آبا و اجداد سے ورثہ میں ملی۔ موجودہ نسل غلام اور غلام زادہ ہے۔ اور غلامی کے مناسب پست ذہنیت جو اس کو ورثہ میں ملی۔ اگر فاقہ مستی کے ساتھ اسے عیش وعشرت کی سوجھے تو

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبرؔ — ہمیں تو ان کی بہبودی سے ہے یاس

مایوسی کفر ہے اگر ہم صحیح معنی میں مسلمان ہیں یا بننے کی کوشش کریں تو یاس کی کوئی وجہ نہیں۔ لیکن موجودہ نسل سے یہ توقع عبث ہے۔

بنی اسرائیل کا تاریخی واقعہ قرآن حکیم نے محض ایک قصہ نہیں جو بیان فرمایا ہے۔ یہ قوم مصر میں چار سو سال غلامانہ زندگی بسر کرتی رہی۔ حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں خروج کیا۔ تو ارض مقدس جس سے "وعدہ برکت" وابستہ تھا سامنے تھی۔ حضرت موسیٰ نے کہا کہ بڑھو اور لے لو۔ جواب دیا کہ موسیٰ جا تو اور تیرا خدا بڑھے۔ فتح کے بعد ہم قبضہ کر لیں گے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ چالیس سال تک ان پر ارض معہود حرام کی گئی۔ جب یہ نالائق سب مر کھپ گئے اور نئی پود اس عرصہ میں جوان ہوئی جو مصر اور مصری چاٹ سے واقف نہ تھی بڑھی اور فلسطین مسخر کر لیا۔ دو سو سال غلامی کے بعد بیس سال درکار ہیں کہ وہ جواں مرد پیدا ہوں جو برطانوی عہد کی غلامی سے ناآشنا ہوں گے۔ ان سے توقع ہے کہ وہ کام کے آدمی ہوں گے۔ ان اشارات یا یہ کہیئے کہ انتباہ کے بعد ہم پاکستان کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔

وجہ تسمیہ "پاکستان" کا تصور تو ہر ایک مسلم مفکر کے ذہن میں تھا۔ لیکن نام تجویز کردہ چوہدری رحمت علی ایم اے، ایل ایل بی بار ایٹ لا کا ہے۔

یہ ان صوبوں کے نام کے پہلے حروف کا مجموعہ ہے جہاں مسلم اکثریت ہے یا تھی چودھری صاحب نے کئی ایک نام تجویز کیے تھے مثلاً "بنگستان" اس سے مراد صوبہ بنگال ہے جہاں مسلم اکثریت تھی۔ پاکستان سے ان کی مراد وہ صوبہ جات ہیں جن کو اب مغربی پاکستان کہتے ہیں اور بنگستان کا مشرقی حصہ مشرقی پاکستان بن گیا۔ چوہدری صاحب نے ہندوستان کو کئی "شاخوں" میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اور ان سب کو مسلم حکومت کے تحت لانا چاہتے تھے۔ اسے بسا آرزو کہ خاک شد۔ "عثمانستان" کا انجام ہم نے دیکھ لیا۔

تقسیم کے بعد اصولاً مسلمانوں کو ہندوستان کا چوتھا حصہ ملنا چاہیئے تھا چالیس کروڑ آبادی میں ان کے دس کروڑ نفوس کا یہی مطالبہ تھا۔ اور اسی نسبت سے ہندوستان کی دولت کی تقسیم بھی ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن ان کو چوتھے حصہ کا بھی نصف ہی ملا۔ اور دولت میں چند خالی عمارتیں ہی ہاتھ لگیں۔ چودھری صاحب کا خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔ آپ اس وقت کیمبرج ۱۶۰ مانٹیگو روڈ انگلینڈ میں مقیم تھے اور وہیں بیٹھ کر پمفلٹ شائع کرتے رہے۔ آپ قائد اعظم محمد علی جناح پر برس پڑے۔ ایک پمفلٹ انگریزی زبان میں شائع کیا۔ اس کا عنوان ہے۔

"THE GREATEST BETRAYAL"

"HOW TO REDEEM THE MILLET"

اس کتابچہ کا مفہوم یہ ہے کہ قائد اعظم نے ۱۵ اگست کا برٹش پلان منظور کر کے مسلمانوں میں انتشار پیدا کر دیا۔ چودھری صاحب انگلینڈ میں تھے۔ اگر وہاں برطانوی سیاست کا بغور مطالعہ کرتے اور ہندوستان کے حالات بالخصوص مسلمانوں کی پست ذہنیت کا مطالعہ کرتے تو قائد اعظم کو مجبور و معذور ہی سمجھتے۔

میں نے ایک خط میں جو ہوائی ڈاک میں ارسال کیا ان حالات کی طرف توجہ دلائی اور لکھا کہ

"اگر آپ نے تنقید ہی کرنی تھی تو برطانیہ کی سیاسیات پر کرتے جو اس انتشار کا کلھم ذمہ دار ہے"

اور مشورہ یہ دیا کہ

"جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب مناسب ہے کہ یا تو انگلستان میں بیٹھ کر "ملت" کی خدمت کیجیے۔ یا پاکستان میں آکر قائد اعظم کا ہاتھ بٹائیے۔ ضرورت وقت کا یہی تقاضہ ہے"

یادش بخیر! چودھری صاحب وفات پا گئے۔ لیکن تاریخ پاکستان میں ان کا نام زندہ رہے گا۔ "بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"۔ یہ نام کچھ الہامی سا معلوم ہوتا ہے۔ شاید کسی وقت اس زمین پاک میں پاک لوگ آباد نظر آئیں۔ بہر حال اتنا تو ابھی ہے بظاہر کفر و شرک سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک قدوس شاید یہاں بھی قدوسی پیدا کر دے۔ اور اس کی حمد و تقدیس سے یہ زمین پاک بھر جائے۔

پاکستان کو تمام ممالک اسلامیہ میں ایک خصوصیت حاصل ہے۔ عرب میں عرب اور ایران میں ایرانی اور افغانستان میں افغانی اور علیٰ ہذا القیاس ہر ایک قوم نسلی اعتبار پر آباد ہے۔ لیکن پاکستان میں خالص مسلم آبادی بلا لحاظ لسان والوان و قومیت ہے اس لحاظ سے یہاں اسلام کی وہ شان نظر آتی جو صرف ایام حج میں مکہ معظمہ میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ بھی خاص ہے۔

دو قوموں کا نظریہ

یوں تو ہندوستان میں دنیا جہان کی قومیں آباد ہیں۔ اور بھانت بھانت کی بولیاں بولتی ہیں۔ لیکن اکثریت دو قوموں کی ہے۔ جن کو ہندو، مسلم سے موسوم کیا گیا ہے۔

لفظ "ہندو" کی تعریف آج تک کسی سے نہ ہو سکی۔ ہندوستان سے باہر اقوام ہم سب کو انڈین، ہندی ہی کہتے۔ لیکن ہندوستان میں اس کا مفہوم کچھ اور تھا۔ آریہ ہندو ہی اپنے آپ کو خالص ہندو سمجھتے رہے۔ یہاں کے اصلی باشندے جن کی تعداد اب بھی سات آٹھ کروڑ ہے "شودر"۔ اور دوسری قومیں پارسی وغیرہ، بلحاظ مذہب بھی، سکھ جو زیادہ تر پنجاب میں محدود ہیں اور جن کی تعداد بمشکل بتیس لاکھ ہوگی۔ ایک علیحدہ قوم ہے، بدھ اور جینی جن کی بیخ کنی میں ویدک ہندوؤں نے کوئی کسر

اٹھا نہ رکھی ۔ بلحاظ نسل زیادہ تر ہندو ہی ہیں ۔ سیاسی نقطہ نظر سے آریہ ہندوؤں نے لفظ ہندو کے مفہوم میں وسعت دی ۔ اور اس میں وہ تمام قومیں شامل ہوگئیں جو ہندوستان میں آباد ہیں مگر غیر مسلم ہیں ۔ اس لئے یہ کہنا چاہیئے کہ سوال تقسیم کے وقت مسلم اور غیر مسلم کا تھا ۔ ان میں نسبت ایک اور تین کی تھی ۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر ایک جگہ ہر ایک قوم مسلمانوں ہی کو اپنا غیر سمجھتی رہی اور سمجھتی ہے ۔ عرب میں جو بھی شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لاتا برادری سے خارج کیا جاتا ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ :۔

"لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ" (۲۵/۴)

"میں تم سے تبلیغ رسالت کا کچھ اجر تو مانگتا نہیں ۔ حالانکہ یہ تمہارے ہی فائدہ کی بات ہے ۔ لیکن یہ درخواست ضرور کرتا ہوں کہ اپنے ہم قوم، ہم قبیلہ اور خاندان کے افراد سے قطع تعلق نہ کرو اور اس فطری رشتہ کو نہ توڑو جو ازل سے موجود ہے"

نتیجہ یہ ہوا کہ خارج شدہ اشخاص کی تعداد اور قوت بڑھ گئی اور آخر تمام عرب نے اسلام قبول کر لیا ۔ انہی تاریخی واقعات کا اعادہ ہندوستان میں بھی ہوا ۔ مسلمان، جینی اور بدھ نہ تھے ۔ یہاں اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی اس لیے ان کو برادری سے خارج تو کیا مگر ان کے جان و مال محفوظ تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تعداد دس کروڑ تک پہنچ گئی اور پاکستان کا امکان پیدا ہوگیا ۔

اب آریا ہندو کا سیاسی شعور بیدار ہوا ۔ اور شور مچایا کہ بلحاظ نسل ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت آریا ہے اور جو باہر سے عرب اور مغل اور پٹھان آئے وہ بھی یہاں آباد ہو چکے ہیں ۔ ہم سب ایک قوم ہندو ہیں ۔ اس لئے ہم سب پہلے ہندوستانی بعد میں کچھ اور ہیں ۔ مسلمانوں نے جواب دیا کہ ہم اول و آخر مسلم ہیں ۔

"ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائی ماست"

بات یہ ہے کہ آریا ہندو قومیت کے لحاظ سے سخت متعصب واقع ہوا ہے اور جو بھی آریا مسلمان ہوا وہ جذبہ تعصب کو اپنے ساتھ لایا ۔ وہ آریا برادری سے خارج ہوا تو مسلم متعصب

بن گیا۔ اس لئے دو قوموں کا نظریہ آریا ہندو نے خود ہی اختراع کیا تھا حقیقت
ہوا اور پاکستان بن گیا۔

یہ حقیقت بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ گوسالہ پرستی اور چھوت لازم و ملزوم ہیں۔ ح
موسےٰؑ نے سامری کو اسی چھوت کی سزا دی تھی۔ ہندو بھی گوسالہ پرست ہے اور ج
ایک متعدی بیماری یقین کرتا ہے۔ غیر آریا کا کیا مذکور ہے۔ اس کے اپنے بھی بیگل
ایک ذات دوسری ذات سے بھی چھوت روا رکھتی ہے۔ اس لئے ہندو دھرم فا
اور ادنیٰ اور اعلیٰ کے امتیازات پر قائم ہے اور عقیدہ تناسخ نے یہ خیال پختہ کر دیا ہے
ایک شخص پیدائشی ادنیٰ و اعلیٰ ہے ان کے عقیدہ سیادت اور ذہانت میں ہزار سا
عرصہ میں غیر ملکی حکومت کے تحت بھی فرق نہ آیا۔ رسی جلی پر بٹ نہ گیا۔

بھارت اور پاکستان

پاکستان امت واحدہ ہے۔ بھارت میں دیا
کی قومیں آباد ہیں۔ جن میں چار کروڑ مسلم آبادی
اس لئے بلحاظ قومیت اور مذہب ان میں اتحاد ممکن نہیں۔ آریا ہندوؤں کے غالب
کی وجہ سے وہ ضرور دبے رہیں گے۔ مگر اپنے حقوق کا مطالبہ بھی کریں گے۔ اگر ایک دو کو ن
بھی حاصل ہوگئی تو یہ ان کو مطمئن نہیں کر سکتی۔ علاوہ ازیں برطانوی دور دورہ میں ہندو
میں پانچ سو چھیاسی ریاستیں تھیں۔ جن کے راجے اور نواب اب عملاً معزول ہیں۔
ہے کہ ایک واحد شخص کو کوئی حق حکومت شخصی نہیں لیکن جس عجلت سے بھارت نے
وہ سیاسی تدبر سے بعید ہے۔ پاکستان نے اپنے ہاں کی ریاستوں کو نہیں چھیڑا۔

"تعدیل بہر امر کمال عرفانست"

معزول شدہ راجوں اور نوابوں سے کوئی دل سے پوچھے کہ ان پر کیا گذرتی ہے اگر حالات
ہوں تو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیا کچھ نہیں کریں گے۔ اس لحاظ سے بھارت کا مستقبل
اور پاکستان کا روشن ہے۔

بھارت میں کئی سیاسی پارٹیاں ہیں ان میں سے دو، ہندو مہا سبھا اور کانگرس
ہیں۔ کانگرس میں ہر ایک قوم و ملت کا آدمی داخل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس پر ہمیشہ آریا ہندو

...ب رہی۔ اور برطانوی عہد میں جہاں کہیں کانگرس منسٹری قائم ہوئی۔ اس میں اُیسا ہندو ہی
...ل رہے اور ہندو ذہنیت کا مظاہرہ اس حد تک کیا کہ ان کے مہاتما گاندھی بھی چیخ اٹھے
...جب کبھی کوئی ایسا سوال مرکزی اسمبلی میں پیش ہوتا جس میں مسلم مفاد کی جھلک نظر آتی
...انگرسی ممبر سخت مخالفت کرتے۔ اگرچہ بھارت نے کانگرس کے منشور کے مطابق اعلان
...ر رکھا ہے کہ ایک غیر مذہبی حکومت جمہوریہ ہے لیکن عملاً وہ ہندو ہے اور دوسری قومیں اس
...مطمئن نہیں۔

...سید احمد خاں غفرلہٗ

بانیان پاکستان میں سے سب سے اول نام سید احمد خاں غفرلہٗ کا ہے۔ سید ۱۸۱۷ئہ میں دہلی میں پیدا ہوا۔ آبا و اجداد
...مغلیہ حکومت کے اکثر و بیشتر ملازم رہے۔ لیکن خوش قسمتی سے سید نے برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی
...کی ملازمت اختیار کر لی۔ اور جج (منصف) کے عہدہ پر تھا کہ ۱۸۵۷ئہ میں وہ واقعہ رونما ہوا۔
...جسے "غدر" سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس ایک واقعہ نے مغلیہ سلطنت کا چراغ جو لال قلعہ دہلی میں
...ٹمٹما رہا تھا گل کر دیا۔ انگریزوں اور ان کے بال بچوں پر جو کچھ ظلم و ستم وحشی باغیوں نے ڈھایا
...وہ بھی دیکھا اور بغاوت فرو ہوگئی۔ تو کچھ ردعمل ہوا اور انگریزوں نے جس بربریت سے
کام لیا وہ مشاہدہ کیا۔

جب انگریزوں پر ظلم ہو رہا تھا سید نے ہر ممکن کوشش ان کو بچانے میں کی اور جب
دور ردعمل شروع ہوا تو ہندوستانیوں کو بچایا۔ ۱۸۵۷ئہ میں اس نے ایک رسالہ لکھا جس
میں اسباب غدر پر مفصل بحث کی اور وہ بات لکھی جس کی جرأت اس وقت کوئی شخص نہیں
کر سکتا تھا۔ اس رسالہ میں اس نے گورنمنٹ کو یہ مشورہ دیا کہ وائسرائے کی دستور ساز کونسل
(THE VICEROY'S LEGISLATIVE COUNCOL) میں ہندوستان کو بھی
نمائندگی حاصل ہونی چاہیئے۔ ان ہندوستانی ممبروں کے ذریعہ گورنمنٹ کو ہندوستانیوں کی
خواہشات اور مطالبات اور دیگر امور سے واقفیت ہوتی رہے گی۔ اور بہت کچھ غلط فہمی کا ازالہ
ہو جائے گا جو حاکم اور محکوم میں جذبات مغائرت و منافرت پیدا کرتی ہے۔ اور ایسے واقعات
کا ظہور ناگزیر ہے۔ جیسا کہ ۱۸۵۷ئہ میں رونما ہوا۔ یہ پہلا قدم حکومت خود اختیاری کی طرف

تھا اور حقیقت یہ ہے کہ سید کی مساعی جمیلہ کا اثر تھا جس نے آگے چل کر جذبہ آزاد کو ابھارا۔

۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بعد ہندوستان کی حکومت براہ راست برطانوی گورنمنٹ کے ہاتھ میں آگئی۔ چونکہ آخری تاجدار مغلیہ مسلمان تھا اور دہلی اور لکھنؤ اور ان دونوں کے نواح میں بغاوت محدود تھی۔ اس لئے برٹش گورنمنٹ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھی کہ بغاوت کے سرغنہ زیادہ تر مسلمان ہیں جو پھر سے مسلم راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا ازالہ بھی سید نے ایک اور مقالہ میں کر دیا۔ "وہابی" تحریک جس کا آغاز پنجاب میں سکھوں کی چیرہ دستی کی وجہ سے سید کے ہمنام سید احمد بریلوی اور مولوی محمد اسمٰعیل کی زیر قیادت ہو چکا تھا اور جس نے "غدر" کی آگ کو بھی کچھ ہوا دی تھی۔ برٹش گورنمنٹ کی آنکھ میں کھٹکتی تھی۔ یہ فرقہ باغی قرار دیا گیا اور ہر جگہ جس پر شبہ ہوتا گرفتار ہو کر پھانسی پاتا یا جلاوطن پورٹ بلیر میں کیا جاتا۔ سید نے گورنمنٹ کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔ سید دوران غدر میں اپنی وفاداری عملاً ثابت کر چکا تھا۔ کتنی اخلاقی جرأت اس میں تھی کہ ان ایام میں جب کہ کوئی شخص دم نہ مار سکتا تھا اور عام دہشت دلوں پر چھائی ہوئی تھی اس نے ڈنکے کی چوٹ کہا کہ میں خود وہابی ہوں۔

۱۸۶۹ء میں سید پہلی دفعہ انگلینڈ گیا تاکہ بلا وساطت غیری انگریزوں کی سیاسیات کا مطالعہ بہ تعلق ہندوستان بالعموم اور بہ تعلق مسلمانان ہند بالخصوص کیا جائے۔ اسے معلوم ہو گیا کہ ہندوستانیوں کی انتہائی پست ذہنیت اسی لائق ہے اور انگریزوں کے اعلیٰ اخلاق بلحاظ تعلیم و تربیت اسی امر کا تقاضہ کرتے ہیں جو ہر ایک انگریز یقین کرتا ہے کہ ہندوستانی بلا امتیاز وحشی یا نیم وحشی لوگ ہیں اور اسی سلوک کے سزاوار ہیں جو ایسے لوگوں سے جائز ہے۔ سید اس پختہ یقین کے ساتھ ہندوستان میں واپس آیا۔ بلا تعاون برطانیہ مسلمان جو قعر پستی کی طرف سرعت سے جا رہے تھے۔ ہندوستان میں من حیث القوم زندہ نہیں رہ سکتے ہوشی کی پرورش اور تعلیم و تربیت شاہی گود میں ہونی چاہیئے۔ لیکن سد راہ خود مسلمان علماء تھے چوٹی کے علماء دین کچھ تو غدر کے بعد چن چن کے مارے گئے یا جلاوطن ہوئے۔ جن کی قبر کا نشان

بھی مجھے فاتحہ خوانی کے لئے ملا۔ جب پورٹ بلیر میں (۱۶-۱۹۱۱ء) بحیثیت مہتمم خزانہ مقیم تھا۔

باقیات الصالحات جو تھے وہ سید کے سخت مخالف تھے اس لئے کہ وہ انگریزوں کی وفاداری اور مغربی علوم اور حکمت مسلمانوں میں شائع کرنا چاہتا ہے۔ ان کی اصطلاح میں سید مسلمانوں کو "کرستان" بنانا چاہتا ہے۔ مذہبی عقاید کے لحاظ سے سید اور اس کے ہم عقیدہ مسلمانوں کو "نیچری" کا خطاب ملا۔

اس وقت ہندوستان میں مدرسے یا تو ہندو پاٹھ شالہ تھے یا مساجد سے ملحق مکتب۔ مسیحی مشنریوں نے بڑے بڑے شہروں کلکتہ وغیرہ میں سکول کھولے۔ جن میں انجیل بھی لازمی مضمون تھا۔ ہندو ذوق شوق سے ان میں تعلیم حاصل کرتے اور مسلمان دُور دُور ہی رہے۔ انگریز تجارت پیشہ تھے اور مسلمان حکومت کے دور دورہ میں بھی بنئے مہاجن ہندو ہی اکثر اسی میں لگے ہوتے تھے۔ برطانوی عہد کے شروع میں بھی تجارت کی طرف ان کی توجہ لگ گئی۔ اور انگریزوں سے اختلاط تجارت کے ذریعہ بھی ان ہی کا زیادہ تھا یہ متمول بھی تھے اور مقرب بھی اور مسلمان راندہ درگاہ حکومت۔

سید نے ایک ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ مضامین کا موضوع زیادہ تر اصلاح قوم تھا۔ اس کے مقابلہ میں ایک عالم دین نے "نورالافاق" شائع کیا۔ سرسید نے دیکھا کہ مخالفت کے جذبات مذہبی عقاید کی بنا پر زیادہ مشتعل ہو رہے ہیں۔ اس لئے مولوی صاحب سے سمجھوتہ ہوگیا۔ دونوں بند ہوگئے۔

سید کی زندگی کا بہت بڑا کارنامہ "محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج"

(MUHAMMADAN ANGLO ORIENTAL COLLOGE)

کا افتتاح ہے۔ چونکہ سید کی زندگی کا مقصد یہی تھا کہ مسلمان ہر لحاظ سے ترقی کریں اور حالات حاضرہ کا تقاضہ تھا کہ اس کا ایک یہی ذریعہ برطانیہ سے اختلاط و اتحاد ہے اس لئے اس کالج کا مادہ تاریخ بھی اٹھارہ سو پچھتر ہے۔ اور بحساب جمل ۱۲۱۰ھ مطابق ۱۸۷۵ء بھی ہے۔ سید نے سمجھ لیا تھا کہ حکومت وقت سے امداد صرف اتنی ہی مل سکتی ہے جتنی

کہ دیگر اقوام کو مل رہی ہے۔ اس ملک کے طول و عرض میں دَورہ کیا۔ چندہ کی اپیل مؤثر ثابت ہوئی۔ سب سے بڑھ کر کامیابی پنجاب میں ہوئی۔ چنانچہ خواجہ الطاف حسین حالی سید کو ایک نظم میں مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے۔

خدا کی برکتیں پنجاب اور پنجاب والوں پر
جنہوں نے ہر سفر میں تجھ کو آنکھوں پر بٹھایا ہے!

ایک دفعہ سید علی گڑھ کے ڈپٹی کمشنر کے پاس چندہ مانگنے کے لئے گیا۔ غرض یہ تھی کہ اس کے اثرورسوخ سے کچھ مل جائے گا۔ ڈپٹی کمشنر نے کچھ حیرت کا بھی اظہار کیا کہ بات کیا ہے کہ "آپ جب کبھی مجھ سے ملے بلا امتیاز ہندو مسلم کی بہبودی اور ترقی پر ہی گفتگو کرتے رہے۔ آج صرف مسلمانوں کا ہی نام لیتے ہیں" سید نے پہلی دفعہ ایک انگریز حاکم کے سامنے "دو قوموں" کا نظریہ پیش کیا۔ اور افسوس کے ساتھ کہا کہ:۔

"دونوں کا مفاد الگ الگ ہے۔ ہندوستان میں جو بھی قوم آئی۔ اور بہت قومیں مختلف حیثیت سے آئیں اور جذب ہوگئیں۔ وہ یہاں فاتحانہ آئے مگر مسلمانوں کو ایک ہزار کے طویل عرصہ میں بھی ہندوستان جذب نہ کرسکا بلکہ جو ان کے نزدیک آیا وہ اسلام میں محو ہو کر رہ گیا۔ میں مسلمان ہوں اور سید بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر برطانوی حکومت مسلمانوں سے نفور اور مسلمان دور دور ہی رہے تو دونوں ناقابل تلافی نقصان اٹھائیں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب ہندو تو ہندوستان کی اقلیت پر چھا جائیں گے اگر اس کا سدباب آج نہ کیا گیا تو مسلمان آج جس درد سے گذر رہے ہیں اور حکومت سے زیادہ ہندوؤں کی دستگیری کے محتاج ہیں۔ تو میری قوم محض ایک ہندو منصوبہ کا آلہ کار بن کر رہ جائے گی۔ اس وقت برطانوی حکومت بھی آنکھیں کھولے گی مگر بے فائدہ"

ڈپٹی کمشنر نے حیران ہو کر پوچھا کہ:۔

"کیا آپ کے خیال میں ایسا وقت آنے والا ہے؟ اور اگر ایسا ہو تو بد قسمتی

ہوگی۔" سید نے کہا کہ

"یقیناً ایسا وقت آنے والا ہے۔ اور شاید آپ دُور سمجھتے ہوں۔ میں نزدیک دیکھ رہا ہوں۔"

یہ وقت آیا۔ برطانیہ نے سید کی پیش گوئی کے مطابق اپنا انجام دیکھ لیا۔ اور اگر سید مسلمانوں کو اس وقت کے مقابلہ کے لئے تیار نہ کرتا تو اکھنڈ ہندوستان کا خواب جو سیواجی مرہٹہ نے دیکھا تھا اور جس کو احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں پریشان کر کے رکھ دیا تھا آج شرمندۂ تعبیر نہ ہوتا۔

قرآن عظیم کا ارشاد ہے کہ:۔

"الحمد للّٰہ فاطر السمٰوٰت والارض، جاعل الملٰئکۃ رسلا اولی مثنی و ثلٰث وربٰع، یزید فی الخلق مایشاء۔ ان اللّٰہ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔"

"حمد تمام اللہ ہی کے لئے خاص ہے جو آسمانوں اور زمین کے پوشیدہ امکانات کھولنے والا ہے۔ (جو مخلوق بالخصوص انسانی ترقی کے ذرائع ہیں) اس نے ملائکہ کو رسول بنایا جو دو دو تین تین چار چار بازوؤں والے ہیں۔ اور اللہ ہر ایک شے پر قادر ہے۔ چاہے تو اس سے بھی زیادہ دست و بازو پیدا کر دے۔ ($\frac{۲۲}{۱۲}$)

بعض مفسرین ان آیات سے خلافت راشدہ وغیرہ کی پیش گوئی اخذ کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک اصل اصول بیان کیا گیا ہے کہ اللہ جس شخصیت کو کامیاب بنانے کا ارادہ فرماتا ہے اس کے دست و بازو بھی ایسے قدسی صفات لوگ بن جاتے ہیں جن کا مقصد حیات بھی وہی ہوتا ہے جو اس شخصیت کا الہامی تصور ہوتا ہے۔ اس کی مثال آنحضرتؐ اور خلفاء راشدین اور اصحاب رسول اللہ ہیں۔ جن کی اس خاص ایمان میں ان کی نفسانی اغراض کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کے ارباب حل و عقد اور بالخصوص وزیر اعظم کے لئے اس میں ایک سبق ہے کہ ایسے ہی مقدسین کو اپنا دست و بازو بنائیں جن کو ان آیات میں ملائکہ سے موسوم کیا گیا ہے۔ جو بے غرض پاکستان کی خدمت کر سکیں۔ پاکستان کی کامیابی کا تصور فکر محال ہے۔ اگر

ارباب نظم ونسق اہل ہوا وہوس ہوں۔

سید کو اللہ نے کامیاب بنایا اور "عشق" محسن الملک اور وقار الملک جیسے دست بازو دے دیئے۔ تلث اور ربع اور "یزید فی الخلق" کے تحت حافظ نذیر احمد خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہم جیسی شخصیتیں آتی ہیں۔

سید کی حیات جاوید کا مطالعہ حالی مرحوم کی کتاب میں کرنا چاہیئے۔

سید امیر علی

سرسید احمد خان غفرلہ کے پیش نظر دو اصلاحی کام تھے ایک تو قوم کے متعلق تھا اور دوسرا مسیحی متعصب پادریوں نے یورپ کی آنکھوں میں اسلام کی نہایت سیاہ مکروہ صورت پیش کر رکھی تھی۔ سید نے سر ولیم میور (صوبہ جات متحدہ ہند کا گورنر بھی تھا) کی کتاب "لائف آف محمد" (حیات محمدؐ) کا جواب "خطبات احمدیہ" میں دیا۔ اور اس کا انگریزی ترجمہ[1] اپنے ذاتی خرچ سے شائع کیا۔ سید اس وقت لندن میں تھا اور اپنے دوست محسن الملک سے بار بار روپیہ کا مطالبہ کر رہا تھا۔ محسن الملک نے تنگ آکر لکھا کہ "روپیہ کہاں سے آئے؟" جواب میں لکھا کہ:-

"میرا مکان دہلی میں ہے فروخت کردو۔ کل بروز حشر اپنے نانا سے تو کہہ سکوں گا کہ تیرے عشق میں میں نے سب کچھ لٹا دیا۔"

اِدھر علماء دین سید پر کفر کے فتوے مکہ سے منگوا رہے تھے اور اُدھر اس کا یہ حال کہ ایک تحریر میں لکھا کہ:-

"سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیسا کفر ہے کسی کو حاجی اور کسی کو ناجی بنا دیا۔"

سید کی ایک غزل کا شعر ہے۔

خدا دارم دل بریاں ز عشق مصطفےٰ دارم
ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

یہ تو سید کے حسب حال شعر تھا۔ میں نے بھی اپنے اور قوم کے حالات کے مناسب

---

[1] مترجم ڈیون پورٹ ترجمہ کرتے وقت مسلمان ہوگیا۔

ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر ہے

باستقبال ماضی می رود گامے کہ بر دارم
بشرحے می نگارم حال امکانے کہ من دارم

سید امیر علی (۱۸۴۹ء - ۱۹۲۸ء) بیرسٹر ایٹ لاء کلکتہ ہائی کورٹ کا جج تھا۔ آخر برٹش پریوی کونسل کا ممبر ہو گیا۔ ملازمت مانع تھی کہ سیاسیات میں حصہ لے۔ ۱۹۰۹ء میں سیکرٹری آف سٹیٹ لارڈ مورلے (LORD MORLEY) کے پاس ایک وفد مسلمانوں کا گیا۔ قیادت سید امیر علی نے کی اور دو قوموں کا نظریہ پیش کرتے ہوئے مسلمانوں کے لئے علیحدہ حق انتخاب کا مطالبہ کیا۔

سید امیر علی نے تصانیف کے ذریعہ وہ کام مکمل کیا جو سر سید نے ادھورا چھوڑا تھا۔ سر سید اردو میں لکھ سکتے تھے۔ سید امیر علی کو انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ "سپرٹ اسلام" (SPIRIT OF ISLAM) میں روح اسلام بول رہا ہے۔ "ہسٹری آف سیریسن" (HISTORY OF SARACENS) میں خلافت اسلامیہ کی تاریخ کے ضمن میں شان دار علمی وغیرہ ترقیات کا مذکور ہے جس نے یورپ کے دماغ کو روشن کر دیا۔

سر محمد اقبال

ڈاکٹر محمد اقبال (۱۸۷۳ء - ۱۹۳۸ء) سیالکوٹ میں پیدا ہوا۔ عالم گیر شہرت کا مالک ہے۔ اقبال اور اقبالیات پر اہل الرائے اور اقبال کے دوستوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور اس سے کہیں زیادہ لکھا ہے جو اقبال نے نظم و نثر میں لکھا ہے خوش قسمتی سے وہ پنجاب میں پیدا ہوا اور "زندہ دلان" کے ماحول میں اس کی پرورش ہوئی۔ کشمیری تھا اور کشمیری پنڈت "سپرو" ذات۔ اس نے اپنی ولولہ انگیز نظموں کے ذریعہ جوانان پنجاب میں زندگی کی روح پھونک دی۔

سر سید مسلمانوں کو برطانیہ اور مغربی فلسفہ کے اس قدر قریب لا چکا تھا کہ اس کا اثر وہی کچھ ہوا جس کا مقابلہ حجۃ الاسلام امام غزالی وغیرہ کو کرنا پڑا۔ اقبال نے بھی یہی کام کیا علاوہ ازیں وہ برطانوی سرمایہ دار حکومت کا سخت مخالف تھا۔ "مؤسنی" مصری علوم و حکمت سے خوب واقف ہو گیا۔ اب اسی کے ذریعہ قوم کی آزادی کا مطالبہ کرنے لگا۔ سر سید نے مغربی علوم سے مسلمانوں کو روشناس کیا۔ اقبال نے درس آزادی دیا۔ ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبہ صدارت

میں اس نے کہا کہ

"میں چاہتا ہوں کہ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے اور اس کو سیلف گورنمنٹ برطانوی حکومت کے تحت یا بلا برطانوی حکومت ملے۔"

اس میں دو قوموں کا نظریہ بھی ہے اور پاکستان کا تصور بھی کارفرما ہے۔ دو سال بعد اقبال نے گیا۔ گول میز کانفرنس (ROUND TABLE CONFERENCE) سے مایوس ہو کر قوم کو آل انڈیا مسلم کانفرنس" میں مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ

"نہ ہندوؤں کے وعدوں پر جاؤ اور نہ برطانیہ پر اعتماد کرو بلکہ جو کچھ لینا چاہتے ہو زور بازو سے لو۔ پہلے لوگوں میں سیاسی بیداری پیدا کرو اور انہی کی متفقہ قوت پر بھروسہ کرو۔"

تعلیم یافتہ طبقہ نے ابھی تک عوام کی قوت کا صحیح اندازہ نہیں کیا تھا۔ اقبال نے رہنمائی کی اد عوام سے اختلاط (MASSCONTACT) وہ حربہ تھا جس کو چند سال بعد قائداعظم محمد علی جناح موثر ثابت کر دکھایا۔ اقبال کو اب ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو مسلمانوں کی قیادت کا اہل ہو۔ اکابر سب فوت ہو چکے تھے۔ اور مسلمانوں میں قحط الرجال تھا۔ نواب اور نواب زادے جاگیردار اور خطاب یافتہ تو بہت تھے۔ ان میں سے ایک بھی کام کا آدمی نہ تھا۔ نگاہِ انتخا مسٹر محمد علی جناح پر پڑی۔

قائداعظم محمد علی جناح

محمد علی کی ولادت کراچی میں ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ اجد بمبئی میں متمول تجارت پیشہ تھے۔ والد کا کاروبار کچھ مدھم پڑ گیا تو کراچی میں قسمت آزمائی کی۔ تقدیر نے یاوری کی۔ سولہ برس کی عمر تھی۔ محمد عل انگلینڈ گیا۔ اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ بمبئی میں اپنا کام شروع کیا اور چند دنوں میں مشہور ہو گیا۔ طبیعت سیاسیات کی طرف مائل تھی۔ ان ایام میں اعتدال پسند پارسی سیاسی لیڈ نوروجی دادا بھائی اور مسٹر گھوکھلے آسمان" کانگرس" کے درخشندہ ستارے تھے اور شاہراہ آزا پر ہندوستانیوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ محمد علی نے انہی کی صحبت اختیار کی۔ ۱۹۰۹ء میں

ورنر جنرل کی دستور ساز کونسل میں مسلمانان بمبئی کی طرف سے نمائندہ ممبر منتخب ہوا۔ اگرچہ
محمد علی جناح کانگرسی تھا۔ مگر جب مسلم لیگ منصۂ شہود پر آئی تو ۱۹۱۳ء میں اس کی رکنیت بھی
قبول کرلی۔

انڈین نیشنل کانگرس

جب انگریزوں کا قدم بذریعہ تجارت ہندوستان میں آیا اور رفتہ رفتہ قدم بڑھتا گیا تو ان کی تجارت کا مرکز بمبئی اور مدراس اور کلکتہ بن گیا۔ ان میں سے کلکتہ کو خاص اہمیت حاصل رہی جب حکومت قائم ہوگئی تو کلکتہ ہی پایہ سلطنت قرار پایا۔ حکومت کا قرب بنگالیوں کو حاصل تھا۔

۱۸۳۴ء میں "میکالے" نے جس طرز حکومت کا اپنے ہم وطنوں کو مشورہ دیا۔ اس میں انگریزی زبان کو نمایاں حیثیت دی کہ رفتہ رفتہ ذریعہ مبادلہ خیالات ہو جائے گی۔ کلکتہ میں ہر ایک شے پر انگریزیت چھاگئی۔ البتہ ان کے لباس میں فرق نہ آیا۔ بنگالی انگریزی کے ساتھ انگریزوں کی سیاسی چالوں سے بھی واقف تھے۔ اور ان کے بین الاقوامی سیاسی تعلقات بھی ان کی تاریخ میں مطالعہ کر رہے تھے۔ اور ان سیاسی نظریوں سے بھی آشنا تھے جو "مل" (JOHN STUART MILL) اور "ٹام پین" (TOM PAINE) اور "میزنی" (MAZZINI) جیسے مفکرین پیش کر چکے تھے اور یورپ کی سیاسیات میں انقلاب پیدا کر رہے تھے۔

الغرض ان کو علم تھا کہ یورپ بالخصوص برطانیہ دستوری (PARLIMENTARY) اور عوام کی نمائندہ حکومت پسند کرتا ہے۔ خود تاج برطانیہ کی طرف ۱۸۵۷ء کے "غدر" کے بعد ۱۸۵۸ء میں اعلان ہو چکا تھا کہ ہندوستانی رعایا کو بلالحاظ نسل و ملت ہندوستان کی انتظامیہ حکومت میں زیادہ سے زیادہ نمائندگی بلحاظ تعلیم و قابلیت دی جائے گی۔ بنگالی اسی میں پیش پیش تھے دفتروں میں یہی بابو چھائے ہوئے تھے اب اعلیٰ عہدوں اور مناصب کا بھی مطالبہ جاری تھا۔

۱۸۶۱ء اور ۱۸۶۲ء میں انڈین کونسلز ایکٹ (INDIAN COUNCILS ACT) نے دستور ساز کونسل کا دروازہ نامزد ارکان کے لئے کھول دیا۔ اور اسی ایکٹ کے تحت میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ جو گورنر جنرل لارڈ "رپن" (LORD RIPON) نے ۱۸۶۲ء میں قائم کئے

اپنے نمائندے دستور ساز کونسل میں بھیجنے شروع کئے ۔ ۱۸۷۰ء کے بعد سول سروس میں کا امتحان پاس کر کے ہندوستانی بھی آ گئے ۔

یہ حالات تھے کہ مسٹر ہوم (A. O. HUME) نے جو بنگال میں برٹش سول سروس تھا، "جذبہ اصلاح" رسوم معاشرت کے تحت اور بہ نظر خیر خواہی ہندوستان" انڈین نیشنل کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ اس وقت کانگرس کا سیاسی عقیدہ تاج برطانیہ کی وفاداری تھا۔ اس کے اولین بیس صدر انگریز ہی تھے۔ سر سیّد احمد خاں مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ او مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ کانگرس سے بالکل علیحدہ رہیں۔ یہ مفکر اعظم بھانپ گیا تھا کہ اگر مسلما اس میں شریک ہوئے تو اس لئے کہ ہر لحاظ سے پسماندہ ہیں ہندو اکثریت کا آلہ کار بن کر جائیں گے۔ اور جب ایک دفعہ ہندو اکثریت چھا جائے گی تو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دے گی۔ بنگال اور بمبئی کے مسلمانوں پر تو سرسید کے معرکۃ الآرا لکچروں کا اثر بہت کم ہوا۔ پنجاب، زندہ دلان پنجاب نے میدان عمل میں سید کی قیادت بہ طیب خاطر قبول کی۔ سرسید مسلمانوں کو کانگرس سے علیحدگی پر ابھار رہا تھا۔ ادھر مدراس کی کانگرس کے سالانہ تیس اجلاس کی کرسی صدارت پر ایک ممتاز مسلم شخصیت بدرالدین طیب جی براجمان تھے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں ایسے واقعات رونما ہوئے کہ کانگرس کا پول کھل گیا اس کانگرسی مسلمانوں کی بھی آنکھیں کھلیں اور معلوم ہو گیا کہ جو کچھ سید کا ارشاد تھا حقیقت تھی۔ سوا دیانند اور سوامی دیویکانند جیسی شخصیتیں مہاتمی لباس میں ملک کے طول و عرض میں دورہ کر رہی تھیں۔ سوامی دیانند مورتی پوجا کے خلاف اور دیویکانند مورتی پوجا کے حق میں دھم فرما رہے تھے۔

بات یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب سے جو چند رسوم کا مجموعہ ہے بیزار ہو رہا تھا۔ مغربی علوم و حکمت کا یہ اثر ہوا کہ یا اسلام کی آغوش میں آ رہے تھے یا حکومت کا مذہب مسیحی قبول کر رہے تھے۔ مورتی پوجا کے جو مخالف تھے ان کو سوامی دیانند مہاراج نے تھام لیا اور جو اس کے حق میں تھے ان کو سوامی دیویکانند نے سنبھال لیا۔ اور جو زیادہ آزاد خیال تھے اور اسلام کے نظریہ توحید کے سامنے جھک چکے تھے۔ ان کو "برہمو سماج" نے روک لیا جس کی طرح راجہ

رام موہن رائے ڈال چکا تھا۔ اور کیشب چندر سین جیسی شخصیت نے اسے بنگال میں شائع کیا۔

برہمو سماج اسلام کے اقرب ہے اگر ہندو قومیت کا جذبہ مانع نہ ہوتا تو یہ بھی مساجد میں مسلمانوں کے دوش بدوش کھڑے نظر آتے۔ سوامی دیانند نے توحید تثلیث نما پیش کی۔ یہ مسیحی مذہب کا جواب تھا۔ عوام کے ذہن نشین یہ کیا گیا کہ اسلام ہو یا مسیحیت دونوں کا جامع ہندو مذہب ہے۔ جو شے گھر میں موجود ہے اس کے لئے غیروں کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ برہمو سماج ہمیشہ مذہبی مباحثہ سے کنارہ کش رہا لیکن "آریہ سماج" نے مسلمانوں سے مقابلہ کی ٹھان لی۔

پنڈت بال گنگا دھر تلک نے مرہٹہ روایات کو زندہ کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں دودھاری تلوار تھی۔ ایک طرف تو مغربی حکومت پر وار کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف اسلام دشمنی کو کانگرس کی ذہنیت میں ٹھونس دیا۔ غرض یہ سماجیں اور مرہٹہ عزم کانگرس پر قابض ہو گئیں۔ بنارس ہندو مذہبی مرکز ہے۔ ۱۹۰۵ء میں اسی مقام پر کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا تو سات سو چھبیس نمائندگان یا مندوب (DELEGATES) میں صرف سترہ مسلمانوں نے شرکت کی اور یہ بھی [redacted] تھے جو کسی نہ کسی وجہ سے ہندوؤں کے محتاج تھے۔

ان ایام میں لارڈ کرزن وائسرائے گورنر جنرل ہند تھا۔ اسی ۱۹۰۵ء میں اس نے تقسیم بنگال کی اور ساتھ ہی پنجاب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ شمال مغربی صوبہ سرحد پنجاب سے اور جسے اب مشرقی پاکستان کہتے ہیں بنگال سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ اس کا صدر مقام ڈھاکہ قرار پایا۔ اس تقسیم نے بھی سرسید کے "دو قوموں" کے نظریہ کو عملی تقویت دی بنگالیوں نے تقسیم بنگال کے خلاف زمین آسمان ایک کر دیئے۔ تقسیم بنگال میں مسلمانوں کا فائدہ تھا۔ اس لئے بارگاہ الٰہی میں سجدہ شکر بھی کیا۔ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مشرقی بنگال میں غالب اکثریت تھی۔ پنجاب میں بھی یہی کیفیت تھی۔

لارڈ کرزن کے سیاسی منصوبہ کی زد براہ راست مسلمانوں کے مفاد پر پڑ رہی تھی بنگالی ہندوؤں نے اسے اپنے خلاف خیال کیا۔ مسلمان خاموش رہے۔ اس لئے کہ عوام میں

سیاسی شعور نام کو بھی نہ تھا۔ کرزن مسلمانوں کی اکثریت کو چھوٹے چھوٹے رقبہ میں محدود کرنا چاہتا تھا۔ اور ان کو ہندوؤں سے علیحدہ رکھ کر اس احساس کو بیدار کرنا چاہتا تھا کہ ان کا مفاد علیحدگی ہی میں ہے۔

"عدو شود سبب خیر گر خدا خواھد"

دو قوموں کا نظریہ اب عملی صورت اختیار کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے انگلینڈ میں لبرل گورنمنٹ برسر اقتدار آ گئی۔ یہ سب واقعات ۱۹۰۵ء میں رونما ہوئے۔ ہندو شورش زوروں پر تھی۔ وائسرائے ہند لارڈ منٹو (MINTO) تھا۔ دہشت بھی پھیل رہی تھی اور قتل و غارت کی وارداتیں زیادہ تر بنگال میں رونما ہو رہی تھیں۔ مسلمان گورنمنٹ برطانیہ کا حق وفاداری ادا کر رہے تھے۔ ہز ہائی نس آغا خاں کی قیادت میں ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے کی خدمت میں اپنے سیاسی معروضات پیش کر رہا تھا۔ اس میں دو قوموں کے نظریہ کے تحت علیحدہ حق انتخاب (ELECTORATE) کا مطالبہ کر رہا تھا۔ جو میونسپلٹیوں سے لے کر کونسلوں تک حاوی تھا۔ لارڈ منٹو نے اصولاً تسلیم کر لیا اور ۱۹۰۹ء کی "اصلاح" میں جو "مورلے منٹو" (MORLEY-MINTO) سے موسوم ہے۔ اس نے جگہ حاصل کر لی۔

اب اکابر یہ ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ مسلم عوام کی ایک سیاسی جماعت نمائندہ ہو۔ تعلیمی مرکز علی گڑھ میں تھا۔ سرسید کے بعد محسن الملک اور محسن الملک کے بعد وقار الملک سیکرٹری ہوئے۔ اس سیاسی تحریک کا بانی بھی نواب وقار الملک تھا۔ اسی ۱۹۰۶ء میں نواب وقار الملک اور نواب ڈھاکہ نے ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ اس کے مقاصد بھی وہی تھے جو ابتداء میں کانگرس کے تھے۔ تاج برطانیہ سے وفاداری، مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی نگہداشت اور وہ بدمزگی جو ہندوؤں نے پیدا کر رکھی تھی رفع کرنا۔

اس وقت مسلم لیگ صرف مسلم اکابر کی ایک چیدہ جماعت تھی۔ اگرچہ مسلمانوں کی نمائندہ تھی مگر عوام میں سیاسی شعور نہ تھا اس لئے وہ اس میں دلچسپی نہ لیتے تھے۔ اس کے اجلاس "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کے پہلو میں ہوتے رہے۔ یہ کانفرنس خالص تعلیمی تھی اور اس کا مرکز علی گڑھ تھا۔ سالانہ اجلاس ہندوستان کے ان بڑے شہروں میں ہوتے

جو کانفرنس کو دعوت دیتے۔ مسلمانوں کی پستی اور پس ماندگی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اکثر اجلاس علی گڑھ میں ہی ہوتے رہے۔

امرت سر میں اجلاس ہوا۔ نواب ڈھاکہ سلیم اللہ خاں کشمیری اصل تھے۔ امرت سر میں کشمیریوں کی اکثریت تھی۔ جس جوش و خروش کا مظاہرہ ان کشمیریوں نے استقبال کرتے ہوئے کیا اور دوران اجلاس میں کیا اس کا اثر ہندوستانی مسلم مندوبین پر بھی ہوا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد جو بعد میں سیکرٹری ہوئے بار بار اپنے ہمراہیوں کو اس بے پناہ جوش کی طرف متوجہ کر رہے تھے اور یہ بھی کہہ رہے تھے کہ "کام کے آدمی زندہ دلان پنجاب ہی ہیں"۔

اگر ہماری موجودہ حکومت پاکستان اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے۔ تو اس کی کامیابی یقینی ہے۔ اس حقیقت کو انگریز بھانپ گیا تھا۔ اور مسلمانوں کی طرف سے خائف تھا جو بحیرہ ادقیانوس سے بحر الکاہل تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس لئے پنجاب میں اس کی اکثریت توڑنے کے لئے صوبہ سرحد کو علیحدہ کر دیا جو تعلیم کے لحاظ سے پست ترین صوبہ تھا اس تقسیم کے بعد بھی ستاون ۵۷ فیصدی مسلم آبادی تھی۔ مگر اقتصادی لحاظ سے پست تر قوم تھی۔ یہ زیادہ تر مزدور تھے اور سرمایہ دار ہندو۔

امرت سر میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلو میں لیگ اجلاس ہو رہا تھا۔ خطبہ صدارت علی امام نے پڑھا۔ مولانا محمد علی جوہر آکسن اور دیگر اکابر بھی موجود تھے۔ حاضرین کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ نواب وقار الملک کے قریب ہی ایک کرسی پر راقم الحروف بھی بیٹھا ہوا تھا۔ ان کی وضع قطع اور لباس کی سادگی دیکھ کر سلف صالحین کی یاد تازہ ہو گئی۔ "ریزولیوشن" پیش ہو رہے تھے اور نواب وقار الملک بار بار کہہ رہے تھے کہ "تقسیم بنگال" کی بھی خبر لو۔ مولانا محمد علی جوہر بلند قامت کی شخصیت نمایاں نظر آ رہی تھی۔ کھڑے ہو کر کرسی صدارت کے قریب آئے۔ گلا بیٹھا ہوا تھا مگر آواز بلند تھی۔ فرمایا کہ

"تقسیم بنگال ایک سیاسی خطا (BLUNDER) تھی۔ اب اس کی تنسیخ بڑھ کر سیاسی خطا ہے"۔

بحالی تقسیم کی تجویز تو بالاتفاق رائے تقسیم ہوئی۔ مگر ۱۹۱۲ء میں "کنگ ایمپرر" کی آمد پر

لارڈ ہارڈنگ (LORD HARDINGE) وائسرائے نے شاہی اعلان کونسل میں سنایا اور تقسیم منسوخ کی گئی پنجاب کی تقسیم بحال رہی مسلمانوں کو صدمہ ہوا یا نہ ہوا اس کا اندازہ لارڈ منٹو کی تقریر سے ہو سکتا ہے جو آپ نے دارالامراء میں فرمائی۔

"ہم نے مسلمانوں کو کہہ دیا تھا بلکہ یقین دلا دیا تھا کہ تقسیم ایک امر واقعہ ہے اور یہ کہ بار بار تاکیداً کہا کہ فی الواقع بحال رہے گی۔ ہم نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ان کی وفاداری کو ہم بنظر استحسان دیکھتے ہیں اور مصمم ارادہ دربارہ مسلم حقوق کا کر چکے ہیں۔ میری رائے ہے کہ شاید ہی کوئی سول سرونٹ ہو گا جس کا یہ عقیدہ نہ ہو کہ تنسیخ ناممکن ہے۔"

مسلم لیگ کے چھٹے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے نواب ڈھاکہ نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ

"تقسیم بنگال نے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور ان میں قومیت کی روح جاگ اٹھی۔ ہمیں یقین تھا کہ مشرقی بنگال کے لوگ بالعموم اور مسلمان بالخصوص اس ہمدردانہ حکومت کی وجہ سے جو تقسیم کے بعد ظہور میں آئی زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے۔ لیکن ہمارے بدخواہوں کو یہ بات نہ بھائی۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ مسلمانوں کے حقوق جو عرصہ سے پامال ہو رہے تھے تقسیم کے مد نظر ہیں۔ اگرچہ ہمیں ہمارا حق کبھی نہیں ملا۔ لیکن جو تھوڑا سا بھی دیا گیا انہوں نے اپنا نقصان تصور کیا۔ تنسیخ سے بنگالی ہندوؤں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ اور انہوں نے سمجھ لیا کہ حکومت بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو سکتی ہے اگر شورش کے ساتھ تھوڑی سی دہشت بھی ہو۔ تنسیخ نے حکومت کا وقار ہندوؤں نے خاک میں ملا دیا اور مسلمانوں کے دلوں سے اعتماد اٹھ گیا۔"

مسلمان حکومت کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اس لئے برادران وطن سے کیوں بگاڑیں "نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ" کی کیفیت سامنے تھی۔ اتفاقات ہیں زمانے کے

ایسے واقعات ظہور میں آئے کہ مسلمان خود بخود کانگرس کی گود میں چلے گئے۔ مسلمانوں کو معلوم نہ تھا کہ یہ واقعات جو ہندوستان میں ان کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے ایک منصوبہ تھا جس کا تعلق ہندوستان سے باہر دنیائے اسلام سے تھا۔

ہم "شام" اور "لبنان" کے تحت بیان کر چکے ہیں کہ دول یورپ نے مل کر سمجھوتہ کر لیا تھا کہ یورپ کا بیمار (SIEKMAN OF EUROPE) یعنی سلطنت ترکی نزع کی حالت میں ہے۔ شاید دم توڑنے میں بھی کافی وقت لگے۔ لمبی مدت سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر دیا جاتے اور ترکیہ کے حصے بخرے بھی کاغذی معاہدوں پر کر لئے۔ برطانیہ اور فرانس اور اٹلی اور روس اور ریاست ہائے بلقان اس میں شریک تھیں۔ جرمنی کو شامل نہ کیا گیا یا اس نے شامل ہونا نہ چاہا۔ امریکہ کے پاس خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ وہ بے نیاز تھا مگر اخلاقی حمایت اس منصوبہ کو حاصل تھی۔

۱۹۱۲ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور ترک ادھر متوجہ ہوئے تو بلقان کی ریاستوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ اب یہ حقیقت سامنے آ رہی تھی کہ اسلام کا نام و نشان یورپ اور مشرق وسطیٰ میں مغربی استبداد مٹا رہا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کا اخبار "کمریڈ" (COMRADE) اور ابو الکلام کا "الہلال" مسلمانوں کی حالت زار پر مسلمانوں کی توجہ دلا رہا تھا۔

محمد علی جوہر مولانا محمد علی ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں وفات پائی علی گڑھ اور آکسفورڈ میں تعلیم مکمل کی۔ پہلے بڑودہ ریاست میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۱۰ء میں ملازمت چھوڑ کر مسلمانوں کی خدمت کے لئے زندگی وقف کر دی۔ ہفتہ وار "کامریڈ" جاری کیا جس کی اشاعت بیس ہزار تک پہنچ گئی۔ لگی لپٹی کے بغیر جو دل میں ہوتا اگل دیتے۔ انگریزی پر اتنے قادر تھے کہ اہل زبان بھی رشک کرتے۔ آپ کا یہ عقیدہ تھا کہ سیاسیات منافقانہ روش ہے۔ راست بازی کا تقاضہ ہے کہ جو بات حق یقین کرتے ہو صاف صاف لفظوں میں کہو۔ کانگرس کو صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ:

"جہاں حکم الٰہی ہے وہاں میں مسلم اول و آخر ہوں۔ جہاں وطن کا حکم ہے وہاں

ہندوستانی اوّل و آخر ہوں گے

آپ کے ایک مضمون (CHOICE OF TURKS) نے مسلمانوں میں ہیجان پیدا کر دیا بر پر جو نسبتاً لے دے کی۔ اس لئے حکومت نے نظر بند کر دیا۔

آپ کانگرس میں بھی شریک تھے۔ اس وقت کانگریس کی قیادت مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں تھی۔ محمد علی اور اس کا بھائی شوکت علی دونوں مہاتما کے دست و بازو تھے۔ ۱۹۲۴ء میں کانگرس کی صدارت کا انتخاب بھی محمد علی کے حق میں ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس ہوئی۔ مہاتما گاندھی اور کٹر متعصب مدن موہن مالویہ اور مولانا محمد علی بھی شریک ہوئے۔ ہندوؤں کی ذہنیت سے آپ واقف ہو چکے تھے۔ لندن میں تھے اور فرشتۂ موت دور کے بعد روح قبض کر کے لاش کو بیت المقدس میں لے جانے والا تھا۔ کہ آپ نے ایک طویل مکتوب انگلینڈ کے وزیر اعظم کو لکھا کہ

"علی الرغم گاندھی جی میں مسلم حقوق کے لئے لڑوں گا۔ اور جب تک مسلمانوں کا مطالبہ پورا نہیں ہوتا ہندوستان خانہ جنگی کی گرفت سے نکل نہیں سکتا۔"

احمد ابوالکلام آزاد مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت سے ہر ایک شخص واقف ہے جب وہ چھ سال کانگریس کے صدر رہے اور اب جب کہ آپ وزیر تعلیم سرکار بھارت ہیں اور اسلامی ممالک ترکیہ اور مصر اور ایران میں بھی گئے۔ دنیائے اسلام کافی واقف ہو چکی ہے۔ لیکن میں اس وقت کا ذکر کرتا ہوں جب آپ امرتسر کے روزانہ وکیل کے نائب مدیر تھے۔ ذاتی تعارف کا موقعہ مجھے نہیں ملا۔ اجداد اگرچہ ابتداً پنجاب کے ایک گاؤں میں رہتے تھے مگر بعد میں دہلی میں نقل مکانی کی۔ آزاد کی مادری زبان عربی اور پدری دہلی کی ٹکسالی اردو ہے۔ دونوں زبانوں پر کافی عبور ہے۔ اور اردو میں آپ کی تحریر اور تقریر کا مقابلہ ہندوستان میں کوئی نہیں کر سکتا۔ سیاسی نقطہ نگاہ سے مولانا محمد علی جوہر اور آزاد میں یہ فرق ہے کہ جوہر کا اول اور آزاد کا آخر اور جوہر کا آخر آزاد کا اول ہے۔ جوہر ابتداء میں کانگرسی تھا۔ آخر میں علی الرغم گاندھی جی مسلم حقوق کے تحفظ کے لئے "دو قوموں" کے نظریہ کا حامی ہو گیا۔ آزاد شروع میں دو قوموں کے نظریہ کا حامی تھا مگر آخر

ں ایک ہندوستانی رہ گیا۔

آزاد نے کئی بہروپ بدلے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اس کا بہت بڑا احترام بالخصوص ان ایام میں تھا جب "البلاغ" اور "الہلال" آپ کے زیر ادارت شائع ہو رہے تھے۔ آپ شیخ ہند بنے۔ ان ایام میں آپ عربی لباس میں اکثر نظر آتے۔ ایک مضمون کی وجہ سے نظر بند ہے رہائی کے بعد حالات اتنے بدل چکے تھے کہ آزاد کو بھی اپنی ذہنیت بدلنی پڑی۔ اور ایسی بدلی کہ اس وقت تک اس میں فرق نہ آیا۔

آزاد مسلمانوں کی عام حالت سے خوب واقف تھا وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ قوم سرعت سے پستی کی طرف جا رہی ہے اور ہندو اکثریت کا غلبہ ہے۔ اسے یقین تھا کہ یہی غالب رہے گی انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا۔ ہندو راج ہی قائم ہو جائے گا۔ اس رائے کا اظہار وہ علامہ محمد اقبال سے بھی کر چکا تھا۔ اور منہ پر صاف لفظوں میں کہا کہ:۔

"یہ جو اسلام آپ لئے پھرتے ہیں چند روزہ مہمان ہے"

گفتگو جو آزاد اور ڈاکٹر اقبال میں ہوئی مجھے میرے دوست شیخ محمد نصیب بیرسٹرایٹ لا نے سنائی۔

امرت سر میں جب مجھے آزاد سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تو میں دیکھ رہا تھا کہ اس میں قومی جذبہ تو ہے مگر اس کو بھی ذریعہ روزگار بنانا چاہتا ہے اور بنا کر رہا۔ افیون کا رسیا تھا۔ اب تو وہ تمام شیخیت "غرق مے ناب اولیٰ" ہو چکی ہے۔ بحیثیت مسلم اس کی زندگی اس وقت ختم ہو گئی جب وہ گاندھی جی کا چیلہ بنا۔ امرت سر نے دفتر وکیل سے پچاس روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ اس سے کیا بنتا ہے۔ کانگرس نے امارت کا جلوہ دکھا دیا۔

چہ خوش است اگر بود آں قدر ہوس بلندی منظرت
کہ بر آں مکاں چو قدم نہی نم گردشے نخورد سرت

ہم نے ان دو شخصیتوں کا تذکرہ ضمناً کیا ہے۔ اب سلسلہ واقعات جاری رکھتے ہیں حکومت ہند یا برطانیہ مسلمانوں سے خائف تھی۔ سر سید احمد خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مشہور تقریر میں کانگرس سے علیحدگی کی وجہ یہ بھی بیان کی تھی کہ:۔

"بنگال کی زن صفتی گورنمنٹ کو خوب معلوم ہے۔ ان کے قلم کی گھس گھس اور منہ کی بک بک کا اثر حکومت پر کچھ نہیں ہوگا۔ لیکن تم اے مسلمانو! ابھی تھوڑا عرصہ ہوا یہاں حکمران تھے۔ تمہارے دماغ سے ہوا حکومت ابھی نہیں نکلی تم بہادر اور بہادروں کی اولاد ہو۔ اگر تم کانگریس میں شامل ہوئے تو گورنمنٹ ہندوؤں سے ممکن نرم سختی کہے گی لیکن تم کو کچل کر رکھ دے گی۔"

تیس ۳۰ سال تک مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہے۔ لیکن اب واقعات نے مجبور کر دیا کہ گورنمنٹ کے خلاف کانگریس کا ساتھ دیں۔ لیگ جیساکہ ہم بیان کر آئے ہیں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک سیاسی شاخ تھی۔ عوام سے بیگانہ رہی اب اس کے اجلاس کانگرس کے سالانہ اجلاس کے پہلو میں ہونے لگے۔ مسلمان دونوں میں شرکت کرتے رہے اور دونوں کے ریزولیوشن ملتے جلتے ہوتے۔ کبھی کبھار علیحدہ حقوق کی آواز بھی سنائی دیتی۔

۱۹۱۴ء کے اول عالمگیر جنگ کے بعد ترکی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ مسئلہ خلافت نے مسلمانان ہند میں ہیجان پیدا کر دیا۔ غیر اقوام بالخصوص برطانیہ تو جانتی تھی کہ مسلمانوں میں قومیت کا رشتہ دین اسلام نے قائم کر رکھا تھا۔ اس لئے ہندوستان میں انتہائی کوشش یہ رہی کہ مسلمان اسلام سے بیگانہ ہوتے جائیں۔ اور اس قدر بیگانہ ہو چکے تھے کہ تعلیمیافتہ طبقہ اس کا مضحکہ بھی اڑاتا۔ مگر تحت الشعور قومیت کا احساس تھا۔ اتنا شعور تھا کہ ان کی قومیت اسلام سے وابستہ ہے۔ لیکن اسلام سے ناواقف تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ رومی ہو یا حبشی عربی ہو یا عجمی ہماری طرح مسلمان ہے اور مسلمان برادری میں شامل ہے۔ ترکیہ اسلامی خلافت کی نمائندہ تھی۔ جب برطانوی سیاست نے اس کا خاتمہ کر دیا تو براہ راست زوال کے دین پر تھی۔

مہاتما گاندھی کا سیاسی تدبر اس موقعہ کو ہاتھ سے کب جانے دیتا۔ مسئلہ خلافت کانگرس کے لائحہ عمل میں شامل کر لیا۔ مسلمان جوق در جوق کانگرس میں داخل ہو گئے۔ بڑے بڑے علماء دین، دیوبندی اور فرنگی محلی نے بھی استخاروں اور خوابوں کی تعبیر یہی کی کہ اس کی آغوش میں چلے گئے اب کانگرس نے متحدہ قومیت کا محاذ قائم کر لیا۔ اس کی بے پناہ قوت کے سامنے جو محض

مسلمانوں کی شمولیت سے پیدا ہوئی حکومت نے بھی گھٹنے ٹیک دیئے۔ اور مسلمان من حیث القوم ختم ہو رہے تھے۔

اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافت کی گتھی خود ہی سلجھا دی۔ اس کے دعویٰ سے دست بردار ہو گئی۔ خوش قسمتی ہی سمجھنی چاہیئے کہ مسلمانوں کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اور ان کو پھر ایک دفعہ اپنی حالت کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا۔

محمد علی جناح ابھی تک کانگرس کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ اور اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ دونوں قوموں میں اتحاد قائم رہے آزادی اسی سے مل سکتی ہے۔ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں ہندو مسلم اکابر جمع ہوئے اور کانگرس اور لیگ نے "لکھنؤ پیکٹ" (LUCKNOW PACT) پر دستخط کر دیئے۔ یہ جناح کی کوشش کا نتیجہ تھا اور ہندوؤں نے جناح کو اتحاد کا اوتار کہہ کر سر پہ اٹھا لیا۔ اس سمجھوتہ کے ذریعے مسلمانوں کے لئے نمائندگی پنجاب میں پچاس، صوبہ جات متحدہ میں تیس، بنگال میں چالیس، بہار میں پچیس، ممالک متوسط میں پندرہ اور پندرہ ہی مدراس میں اور ۲۳ د ۲ بمبئی میں نشستیں مخصوص کی گئیں۔ تمام صوبہ جات اور مرکز میں مسلمانوں کو علیحدہ حق انتخاب دیا گیا۔ مسلمانوں کو اس سمجھوتہ کے ذریعے ۱/۳ نشستیں ملیں۔

۱۹۱۹ء میں منٹیگو چیمسفورڈ ریفارم (MONTEGU CHALMISFORD - REFORM) نے مسلمانوں کو لکھنؤ پیکٹ سے بہت ہی کم نشستیں دیں مگر کانگرسی حکومت کے اختیارات بھی کم کر دیئے۔ دونوں مطمئن نہ ہوئے۔

جہاں تک ترکی کا تعلق تھا۔ سرسید کئی سال پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ:۔

"مسلمانوں کی کوئی بھی سلطنت ہو اس کی تباہی نے ہمارے دلوں کو غم سے بھر دیا۔ اب جبکہ تھوڑی رہ گئی ہیں۔ اب تھوڑے کا بھی غم زیادہ ہے۔ اگر ترکی کا خاتمہ ہو گیا تو ہمارے رنج و اندوہ کی کوئی انتہا نہ ہو گی۔ کیونکہ باقیات الصالحات کی یہی ایک یادگار ہے۔ ہماری حالت آوارہ گرد یہودی کی ہو جائے گی جس کا کوئی گھر ہے نہ گھاٹ۔"

سید کی اس تقریر کا اقتباس "سر تھیوڈر موریسن" (SIR THEODORE - MORISON) - نے اپنے بیان میں دیا تھا۔

"عدم تشدد" اور "عدم تعاون" کی مہم کا آغاز گاندھی جی نے کر دیا۔ برطانوی مال کا مقاطعہ اور حتی الوسع انگریزی ملازمت سے علیحدگی نے بھی گورنمنٹ کو پریشان کر دیا تھا۔ مطالبات دو تھے۔ خلافت کی بحالی اور "ہوم رول" (HOME RULE) ۔ خلافت کی گتھی جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اتاترک نے خود ہی سلجھا دی۔ اب "ہوم رول" رہ گیا۔ "عدم تشدد" جو گاندھی جی کا مذہبی عقیدہ تھا "چوری چورا" پر اس کی حقیقت واضح ہو گئی۔ لوگ تشدد پر اتر آئے اور گاندھی جی نے سر دست اسے بھی ختم کر دیا۔ اس کے بعد چند سال ہندو مسلم اتحاد کو خود ہندوؤں نے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی مسلمان اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ہندو پٹ رہے تھے۔ وہ اتحاد اور "پیکٹ" جس کا تذکرہ ہوا خواب پریشان ہو کر رہ گیا۔

۱۹۲۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان ہندو اور مسلمانوں میں جو خانہ جنگی ہوتی رہتی تاریخی واقعات ہیں۔ سرکاری رپورٹوں اور غیر سرکاری بیانات میں ان فرقہ پرستانہ لڑائیوں کے وجوہ اور اسباب جو کچھ بیان کئے گئے ہیں کسی حد تک صحیح ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہیگل نے ہندو ذہنیت کی نسبت سچ کہا ہے کہ

"بحالت محکومی منافقانہ خوشامد اور چاپلوسی اس کی عادت ہے اور جب حاکم ہو تو "جابر و جرگر" بن جاتا ہے۔"

"رچرڈ سائمونڈ" (RICHARD SYMONDS) اپنی کتاب "پاکستان کی تشکیل" (MAKING OF PAKISTAN) میں لکھتا ہے کہ

"مارچ ۱۹۳۱ء میں چار پانچ سو آدمی کانپور میں مارے گئے۔ احاطہ بمبئی میں فروری ۱۹۲۹ء سے اپریل ۱۹۳۸ء تک فرقہ وارانہ فسادات دو سو دن ہوتے رہے پانچ ساڑھے پانچ سو مارے گئے اور ساڑھے چار ہزار زخمی ہوئے بنگال میں ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک تیس ہزار عورتیں اغوا ہوئیں جعفری

قتل و غارت عام تھی۔ لوگوں کے گھروں کو آگ لگا کر خاندان کے خاندان
زندہ جلا دیئے گئے۔"

ایسے دل ہلا دینے والے واقعات ان انسانیت سوز واقعات کے سامنے ہیچ ہیں جو ۱۹۴۷ء
میں رونما ہوئے۔

تحریک خلافت کے خاتمہ پر "عدم تعاون" بھی ختم ہو گیا۔ اگرچہ کانگرس نے فیصلہ کیا کہ ۱۹۱۹ء کی ریفارم کے تحت جو نئی لیجسلیٹو کونسل بنی اس کے انتخاب میں حصہ لیا جائے۔ مگر "سوراج" پارٹی کی قیادت "سی، آر، داس" اور پنڈت موتی لال نہرو (جواہر لال کا والد) کر رہے تھے۔ اور محض ہڑ بھونگ مچانے کے لئے انتخاب لڑے مسلمانوں میں محمد علی جوہر اور ابو الکلام آزاد نے تو کانگرس کا ساتھ دیا۔ لیکن محمد علی جناح نے ایک خالص آزاد مسلم پارٹی کی قیادت کی۔

۱۹۳۷ء میں کانگرس اور لیگ انتخاب کے میدان میں اتر آئیں۔ گیارہ صوبہ جات میں سے پانچ پر کانگرس چھا گئی۔ اور دو اور صوبوں میں اس کی اکثریت تھی۔ کانگرس منسٹری بمبئی، مدراس، صوبہ جات متوسط اور متحدہ، بہار اور اڑلیسہ اور شمال مغربی سرحدی صوبہ میں بن گئی۔ بنگال اور پنجاب میں مسلم اکثریت تھی۔ لیکن یہاں لیگ کی منسٹری قائم نہ ہو سکی۔ پنجاب میں سر سکندر حیات خاں نے یونینسٹ (UNIONESTS) پارٹی کی طرح ڈالی۔ بنگال میں اگرچہ وزارت عظمیٰ پر مسلمان فائز تھا مگر وزارت مخلوط تھی۔ اب جبکہ کانگرس کا ہر طرف بول بالا ہو رہا تھا اور حد ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ جہاں مسلم اکثریت ۹۲ فیصدی ہے کانگرس منسٹری کے تحت آ گیا۔ تو خداوندان کانگرس نے لیگ کو تعاون کی دعوت دی اور ایسی شرائط پیش کیں جو کسی خوددار کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتیں۔ مسلم لیگی کابینہ میں اس شرط پر لئے جا سکتے ہیں اگر لیگ کانگرس میں محو ہو جائے۔ اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ کانگرس کا کوئی رکن کسی غیر کانگرسی سیاسی پارٹی کا رکن نہیں ہو سکتا۔ اب ان مسلم لیگیوں کے لئے دوگونہ عذاب تھا جو کانگرسی بھی تھے اور لیگی بھی۔ ایک سے کنارہ کش ہونا پڑا۔ جہاں کانگرس منسٹری تھی۔ اب وہاں "رام راج"

رنگ لایا۔ گورنمنٹ عمارات پر کانگرس کا پرچم لہرانے لگا۔ مدرسوں میں مسلمانوں لڑکوں کو "بندے ماترم" کا گیت گانے پر مجبور کیا گیا۔ گائے کے گوشت کی فروخت ممنوع قرار دی اور فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے تو پولیس نے نہ صرف چشم پوشی کی بلکہ ہندو چیرہ دستی کو تقویت دی۔ سرکاری ملازمت کا دروازہ مسلمانوں پر بند کیا گیا۔ یہ واقعات ۱۹۴۷ء کے واقعات کے سامنے قابل ذکر بھی نہیں ہیں۔ مہاتما گاندھی بھی کانگریسیوں کی پست اور گندہ ذہنیت کی مذمت کر رہا تھا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے مسٹر جناح کو لیگ کی قیادت سنبھالنے کے لئے اپنے مکتوبات میں زور دیا۔ محمد علی جناح نے قیادت سنبھالی اور نیم مردہ میں جان پڑ گئی۔ جان پڑی تو کانگرس کی بنیادیں ہلا دیں۔ محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ

"ہندوستان میں اسلام خطرہ میں ہے۔ اگرچہ ابھی برطانوی حکومت ہندوستان میں ہے اور ہندوؤں کو حکومت میں تھوڑا ہی حصہ دیا گیا۔ لیکن اس تھوڑے میں تھوڑے دنوں نے اپنی ذہنیت کا جو کچھ مظاہرہ کیا اور کر رہے ہیں۔ یہ اعلان اس بات کا ہے کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔ کانگرس ایک بہروپ ہے۔ اس نقاب کی تہ میں خالص ہندو ذہنیت ہے۔"

محمد علی جناح نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو متحد رہنے کی اپیل کی۔ ٹیگور اپنے مشہور ناول "گورا" میں لکھتا ہے کہ

"تعجب ہے کہ مسلمانوں میں بے شمار مذہبی فرقے ہیں لیکن جب غیر مسلم اقوام سے مقابلہ ہوتا ہے تو سب متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ہندوؤں میں نہیں۔"

ڈاکٹر سر رابندر ناتھ ٹیگور نے مسلمانوں کی نسبت تو بالکل صحیح بات کہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصولاً ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ فروع میں ایسا ہی ہے جیسے ایک درخت کے دو پتے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہندوؤں میں اختلاف اصولی ہے۔ پنڈت جواہر لال بھی ہندو ہے خواہ "ناستک" ہے۔ وہ بھی ہندو ہے جو ویدوں کو نہیں مانتا۔ وہ بھی ہندو ہے جو زنار بند نہیں چوٹی نہیں رکھتا۔ لیکن ان میں نسلی احساس ہے اور مذہب خواہ کچھ

ہو جز و قومیت ہے مسلمانوں میں صرف ایک رشتہ اسلام ہے۔ ہندو اتحاد نسلی احساس پر مضبوط تر ہے۔ اور کانگرس نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں "ہندوازم" کے نام پر اس اتحاد کو وہ صورت دی کہ مسلمانوں میں بھی نہیں۔ ان کی جمعیۃ العلماء ہند کانگرس کا کلمہ پڑھتی ہے۔ وہ مسلمان ضرور ہیں مگر بیکار بیروزگار جماعت ہے۔ ابوالکلام بھی اسی تھیلی کا بٹہ ہے ان میں فاسق و فاجر بھی ہیں جو نام کے مسلمان ہیں۔ مسلمان مفلس ہے اور اس کا دین و ایمان خریدا جا سکتا ہے۔ اور کانگرس نے خریدا مگر قائداعظم محمد علی جناح کو وہ تو کیا برٹش گورنمنٹ بھی نہ خرید سکی۔ وہ ابوالکلام کی طرح "شیخ الہند" نہ تھا۔ اور حسین احمد مدنی کی طرح عالم دین بھی نہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی طرح مجتہد عصر شیخ جامعہ ملیہ "بھی نہ تھا۔ مگر اس میں ایک بات تھی جو ان حضرات میں نہ تھی۔ آنحضرتؐ جب کسی سے توحید باری تعالیٰ پر بیعت لیتے تو ایک شرط یہ بھی ہوتی کہ مسلمانوں کی خیر خواہی پر اپنا ذاتی مفاد قربان کرنا ہوگا۔ (صحاح ستہ) یہ وہ بات تھی جس نے مسلمانوں کو "بنیان مرصوص" بنا دیا تھا۔ "جناح" میں روح اسلام مضطرب تھا۔ اس کا شعور ابتدا میں اسے بھی نہ تھا۔ لیکن جب کانگرس کی چیرہ دستی اور مسلمانوں کی مظلومیت سامنے آتی یہ شعور ایسا بیدار ہوا کہ عامۃ المسلمین کو جھنجوڑا اور بیدار کر کے چھوڑا۔ ہندو جو اسے کسی وقت ہندو مسلم کے اتحاد کا دیوتا کہتے ہوئے نہیں تھکتے تھے اب "فرقہ پرست" اور فرقہ پرستی کا اوتار کہنے لگے۔ جناح کے آئینہ میں وہ اپنی بھونڈی شکل دیکھتے تھے۔ اور ایک مکروہ صورت کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ آئینہ میں خرابی ہے۔ آئینہ کو توڑنا چاہتے تھے کہ یہ قبیح شکل پھر نظر نہ آئے۔ آخر وہ اپنا سا منہ لے کر گئے۔

جب شملہ میں "ویول" کانفرنس ہوئی اور کانگرس اور لیگ کے اکابر وہاں جمع ہوئے مجھے پہلی دفعہ یہاں قائداعظم کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ انجمن اسلامیہ شملہ نے اپنے سالانہ جلسہ کی تقریب پر قائداعظم کو مدعو کیا۔

جلسہ کی صدارت خواجہ ناظم الدین جو قائداعظم کی وفات کے بعد پاکستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ فرما رہے تھے۔ قائداعظم تشریف لائے

تو نعرۂ تکبیر، اور قائدِ اعظم زندہ باد کے جوش و خروش سے آپ کا استقبال کیا
قائدِ اعظم تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک فقرہ اردو میں کہا:۔

"چاوی (چابی) تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم متحد ہے تو کامیابی ہے ورنہ کچھ نہیں"

اتفاق سے میں قریب بیٹھا ہوا تھا۔ جناح "اتنا کہہ کر بیٹھ گئے۔ حاضرین نے اس خیال سے کہ آپ اردو میں اپنا مافی الضمیر ادا نہیں کر سکتے شور مچایا کہ "انگریزی میں" آپ پھر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ" میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اردو نہیں سمجھتے "۔ اس پر کرسئ صدارت سے لے کر حاضرین میں قہقہہ بلند ہوا۔ آپ نے اسی فقرہ کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور پھر بیٹھ گئے۔ حاضرین جو لمبی چوڑی تقریر سننے کی توقع رکھتے تھے سخت مایوس ہوئے۔ مگر مجھے یقین ہو گیا کہ جناح باتونی نہیں۔

"مثل فرہاد یکے گوید و شیریں گوید"

بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ "مسٹر جناح" ضدی آدمی تھا جس بات پر اڑ جاتا اور جما رہتا اور کوئی طاقت اسے جنبش نہ دے سکتی"۔ ان حضرات نے قائدِ اعظم کے "استقلال مزاج" کی غلط تعبیر کی ہے۔ یہ مفکر تھا۔ جب ایک دفعہ اسے کوئی سچی بات سوجھ جاتی۔ تو وہ حق پر اڑ جاتا۔ وہ صاف گو آدمی تھا اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتا۔

وائسرائے ہند "ویول" نے جب "انٹریم" گورنمنٹ کی تجویز پیش کی تو کانگرس نے فوراً منظور کر لی۔ "جناح" کو کچھ تذبذب تھا۔ ویول نے وعدہ کیا کہ مسلمان جو بھی گورنمنٹ میں لیا جائے گا لیگ کا نامزد ہو گا۔ لیکن "ویول" اس پر قائم نہ رہا۔ انٹریم گورنمنٹ کا مقاطعہ جناح نے کر دیا۔ ویول کچھ اور کہنا یا سمجھانا چاہتا تھا۔ چائے پر قائدِ اعظم کو دعوت دی۔ یہ قائدِ اعظم ہی تھا جس نے دعوت مسترد کرتے ہوئے کہا کہ

"میں تجھ سے بے ایمان آدمی کے ساتھ کوئی سوشل تعلق نہیں رکھنا چاہتا"

لارڈ ویول کو جھکنا پڑا۔

دو سو سال گذشتہ کے عرصہ میں برطانیہ نے مسلمانانِ ہند کو جس طرح کچلا اور ہندوؤں

کو ابھارا۔ اس کا نتیجہ صاف نظر آ رہا تھا۔ مسلمانوں کا قومی شیرازہ بُری طرح بکھر چکا تھا۔ کئی دفعہ تنظیم کی کوشش ہوئی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ اس پریشان حالی کو دیکھتے ہوئے ابوالکلام کو یقین ہو چکا تھا کہ ہندوستان میں اسلام چند دن کا مہمان ہے۔ چونکہ ہیٹ اور عزت کا بھوکا تھا اور یہ ٹکڑہ کانگرس کے دروازے پر ہی مل سکتا تھا اور مہاتما گاندھی کو بھی ایک ایسے ہی باثر دریوزہ گر شیخ الہند کی ضرورت تھی، خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اس کے ساتھ جمعیۃ العلماء ہند کی شمولیت نے مسلمانوں میں انتہائی انتشار پیدا کر دیا۔ کانگرس تو کانگرس تھی خود مسلمانوں کے ذہن کی پستی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ گول میز کانفرنس لندن میں ہو رہی تھی۔ چودھری رحمت علی (مرحوم) "پاکستان" کا پراپاگنڈہ اور منڈو بین میں پمفلٹ تقسیم کر رہا تھا اور یہ مضحکہ اڑاتے تھے۔ چودھری ظفر اللہ جو اس وقت وزیر خارجہ ہیں، کا ارشاد تھا کہ:-

"جہاں تک میں نے غور کیا ہے تو یہی سمجھ میں آیا کہ پاکستان کا نظریہ امر موہوم اور ناممکن العمل ہے"

ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے فرمایا کہ:-

"شاید اتنا کہنا کافی ہو گا کہ کسی نمائندہ جنٹلمین یا ادارہ نے یہ تجویز نہ سوچی سمجھی اور نہ پیش کی"

لیکن پست فطرت مسلمان جو کچھ تھے، تھے۔ تعجب ہے کہ برطانوی گورنمنٹ اس کی اہمیت خوب سمجھتی تھی۔ اور گول میز کانفرنس میں گورنمنٹ کی طرف سے ہی سوال پیش ہوا۔ ہندو تو اسے "بازیچہ طفلاں" کہہ کر خاموش ہو گئے۔ مسلمان اکابر نے بھی در خور اعتنا نہ سمجھا اور اس پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔

"جوہر مسلمانوں کے حقوق کے لئے گاندھی سے بھی ٹکر لینے کے لئے تیار تھا، مگر اتنا نہ سمجھا کہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ایک ایسی مرکزی حکومت کے تحت جس پر ہندو چھائے ہوئے ہیں ناممکن ہے۔ اور پاکستان ہی واحد ضامن ہو سکتا ہے۔ مسلمان کتنا سادہ لوح واقع ہوا ہے۔ ہندوؤں نے چودھری رحمت علی کے خلاف یہ الزام لگائے کہ

"انگلینڈ میں بیٹھا ہوا ہے۔ امیرانہ ٹھاٹھ ہے۔ بظاہر کوئی سبیل آمدنی کی بھی نہیں۔ آخر یہ روپیہ پاکستان کے پروپاگنڈا کے لئے آتا کہاں سے ہے۔؟
انڈیا آفس (INDIA OFFICE) پس پردہ اس پتلی کو نچا رہا ہے"

اب جبکہ خود برطانیہ کی طرف سے پاکستان کے بارہ میں سوال پیش ہوا مسلمانوں کو بھی یقین ہوگیا کہ پاکستان ہندو مسلم اتحاد توڑنے کا ایک منصوبہ ہے۔ اور یہ منصوبہ برطانیہ کی اختراع ہے۔ شاید اس میں بھی کچھ صداقت کی جھلک ہو۔ لیکن اب جب کہ پاکستان بن گیا ہمیں یہی کہنا چاہیئے کہ "عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد"

پاکستان کا صحیح تصور چودھری رحمت علی کے سوا کسی مسلم کے ذہن میں نہ تھا۔ ۲۶ مارچ ۱۹۴۰ء کے اجلاس میں جو لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کا منعقد ہوا پہلی دفعہ یہ ریزولیوشن پیش کیا گیا کہ

"ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ جہاں مسلمانوں یا ہندوؤں کی اکثریت ہے بشرطیکہ وہ جغرافیائی لحاظ سے ملحق ہو ان کی حد بندی کی جائے۔ اور یہاں اُن کی خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں اور جہاں دونوں قوموں کی اقلیت ہے وہاں ان کے حقوق کا تحفظ قانوناً کیا جائے۔"

۱۹۴۱ء میں مدراس کے اجلاس میں "جناح" نے کہا کہ

"ہم کسی حالت میں آل انڈیا مرکزی حکومت کی حمایت نہیں کریں گے مسلمانانِ ہند ایک علیحدہ قوم ہے اور دوسری قوم کا غلبہ پسند نہیں کر سکتی۔ اور اگر ایسی صورت ہوتی تو ہم مزاحمت کریں گے۔"

ابھی تک پاکستان کا صحیح تصور قائداعظمؒ کے ذہن میں بھی نہ تھا۔ دو قوموں کا نظریہ تو سرسیدؒ نے پہلے ہی پیش کر دیا تھا اور اسی پر اکابر مسلمان زور دے رہے تھے مگر محض تحفظ حقوق کی خاطر۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگرس کا پروپاگنڈا اس قدر زبردست اور موثر تھا کہ مسلمان یہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے کہ "پاکستان" کا امکان بھی ہے۔ مسلمان اقلیت میں تھے۔ غالب اقلیت ان کی تھی۔ مگر "امت واحدہ" نہ تھے۔ مسئلہ "انٹریم گورنمنٹ" نے قائداعظم کو مجبور کیا کہ اس کا

تعالیم کیا جائے ہندوؤں نے گورنمنٹ سنبھال لی۔ اس میں مسلمان ممبر کانگرس نے نامزد کئے۔ یہ وقت قائداعظم کے سیاسی تدبر کے امتحان کا تھا۔

حیرت یہ کہ جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں لیگ نسبتاً زیادہ کمزور تھی۔ بلوچستان میں زمیندار طبقہ لیگ کا حامی تھا اکثریت "وطن پارٹی" کے تحت مخالف تھی۔ جموں اور کشمیر میں نیشنل کانفرنس کی قیادت شیخ عبداللہ کر رہا تھا۔ یہ بھی کانگرسی تھے۔ شمال مغربی صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خاں نے کانگرس منسٹری قائم کی ہوئی تھی۔ اگر چند پیر اپنے اثر ورسوخ سے کام نہ لیتے اور خود گورنمنٹ خدائی خدمت گاروں کو "ڈیفنس آف انڈیا رولز" — (DEFENES OF INDIA RULES) کے تحت جیل میں بند نہ کرتی تو صوبہ سرحد پاکستان میں شامل نہ ہوتا یہاں پیروں اور برطانوی گورنمنٹ کے صدقے لیگ منسٹری قائم ہوئی۔ سندھ میں خان بہادر اللہ بخش (مرحوم) نے نیشنلسٹ پارٹی (NATIONEUST PARTY) کی بنا رکھی تھی۔ گورنمنٹ نے غیر آئینی حربہ سے کام لے کر وزیراعظم کو مستعفی ہو جانے پر مجبور کیا۔ ورنہ لیگ یہاں بھی شکست کھا جاتی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی اگرچہ کانگرسی نہ تھی لیکن لیگی بھی نہ تھی اور اس صوبہ میں لیگ کی شکست کانگرس ہی کی فتح تھی۔ مسلمان ممبر سب یونینسٹ ہی تھے اور سب ابن الوقت تھے۔ بنگال میں بھی گورنمنٹ نے غیر آئینی طور پر وزیراعظم کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا پرجا پارٹی جو پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے ساتھ تھی چھائی تھی۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت کا قیام گورنمنٹ اور یورپین اور اچھوتوں کے ساتھ تھا۔

یہ تو ان صوبوں کا حال ہے جہاں مسلم اکثریت تھی یا ہے۔ اقلیت کی حالت ناگفتہ بہ ہے وہاں کانگرس منسٹری من مانی کارروائی کھلے بندوں کر رہی تھی۔

کانگرس کے زیر اثر مسلمانوں میں ایسے ادارے قائم ہو چکے تھے جو لیگ کی شکست پر تلے ہوئے تھے۔ ان میں سے جمعیت العلماء ہند اور احرار اور خاکسار، مومن انصار، آزاد مسلم کانفرنس، آل انڈیا مسلم مجلس۔ ان کے خلاف ہندوؤں میں بھی بے شمار ادارے تھے۔ مگر سب کا نصب العین ہندو اتحاد ہی تھا اور کانگرس کو تقویت دے رہے تھے۔

ان حالات میں قائداعظم کا اعلان در بارہ "ڈائرکٹ ایکشن" (DIRECT ACTION)

دھمکی ہی دھمکی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب انٹرم گورنمنٹ پر کانگرس چھا گئی تو مس میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ لیگ سے مایوس ہو کر کانگرس کے گن گانے لگے۔ اور قریب تھا میں انٹرم گورنمنٹ میں لیگ حصہ نہ لیتی تو ختم ہو چکی تھی۔ قائداعظم مسلمانوں کے انتشار اور حالی سے خوب واقف تھا۔ ہندوؤں کا مقابلہ ہر ایک شہر، ہر ایک قصبہ، ہر ایک گاؤں کرنے کے لئے تیار تھا اور یہی کچھ اس نے "ایڈورڈ تھامپسن" (EDWARD THOMPSON) کو بھی کہا تھا لیکن گورنمنٹ کا مقابلہ مسلمان نہ کر سکتے تھے۔ کانگرس کا آلۂ کار بن کر انہوں نے جانی اور مالی نقصان ضرور اٹھایا۔ مگر لیگ کی قیادت کا وہی حال تھا جو ہم بیان کر چکے

رسوائے عالم خضر حیات کی منسٹری نے جب لیگ کی شکست و ریخت کا مصمم ارادہ لیا۔ میں اس وقت جہلم میں تھا۔ چند مخلص کارکن تو شروع میں جیل میں گئے۔ باقی لیگ ممبر گھروں میں دبک کر بیٹھ رہے۔ ان میں سے اکثر تجارت پیشہ آدمی تھے، الحق!۔

"قل ان کان اباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعش
واموال ن اقترفتموها وتجارة تخشون كسادها ومسكن ترضونها احب ا
من الله ورسوله وجهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی الله بامره لا ی
القوم الفسقین" (پ ۱۰)

"ان کو بتا دو کہ اگر اللہ اور اس کے رسول جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر تمہیں اپنے با اور بیٹے اور بھائی اور ازواج اور قبیلہ اور کنبہ اور مال جو کماتے ہو اور تجارت جس کے مند کا تمہیں خوف ہے اور مکان جو پسند ہیں بہت پیارے ہیں، تو انتظار کرو کہ اللہ اپنا لے آئے اور اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں فرمایا کرتا۔"

البتہ عورتوں کے جلوس برقعہ پوش اور بچوں کا شور و غوغا جاری رہا۔ دیہات سے پانچ پانچ دس دس آدمیوں کو لایا جاتا۔ وہ بازاروں میں گشت لگاتے اور ایک کہتا کہ مر گیا۔ باقی جواب دیتے "خضر"۔ یہ مضحکہ خیز کارروائی ایک ماہ جاری رہی۔ لاہور اور گ اور سیالکوٹ اور گوجرانوالہ اور امرتسر جیسے بڑے شہروں میں بلاشبہ بہت جوش و خروش تھا مگر جہلم جیسے علاقہ میں عام بے حسی تھی۔

جنگ عظیم دوم کا آغاز ہوا۔ وائسرائے نے ہندوستان کی طرف سے محوری طاقتوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ کانگریس منسٹری جہاں کہیں تھی۔ سخت برافروختہ ہوئی کہ وائسرائے نے ان کے مشورہ کے بغیر اعلان کر دیا۔ اس لئے مستعفی ہو گئی۔ مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ قائداعظم نے "یوم نجات" ملک کے طول و عرض میں منایا۔ ادھر گاندھی جی نے "سول نافرمانی" (CIVIL DISOBEDIENCE) کی مہم شروع کر دی۔ پٹیل، نہرو، آزاد، گاندھی اور کانگرسی اکابر سب جیل میں ٹھونس دیئے گئے۔ "کانگرس ورکنگ کمیٹی" (مجلس عاملہ) اگست ۱۹۴۲ء سے جون ۱۹۴۵ء تک جیل میں نظر بند رہی۔ مہاتما گاندھی ۱۹۴۲ء سے مئی ۱۹۴۴ء تک نظر بند رہے۔ اب لیگ کے لئے میدان خالی تھا۔ بنگال اور پنجاب اور سندھ اور سرحدی صوبہ اور آسام میں لیگ منسٹری قائم ہو گئی۔ دیگر صوبہ جات میں انتظام برطانوی گورنمنٹ کے ہاتھ میں براہ راست تھا۔

جب وائسرائے نے مسلم پریمئرز کو "نیشنل ڈیفنس کونسل" (NATIONAL DEFENCE COUNCIL) میں ممبر بنایا تو قائداعظم نے اعلان کر دیا کہ کوئی اس کونسل کا ممبر نہ ہو کیونکہ لیگ کی منظوری کے بغیر وائسرائے نے یہ حرکت کی ہے۔ بنگال میں فضل الحق اگرچہ وفادار لیگی خواجہ ناظم الدین اس کا جانشین ہوا۔ خضر حیات نے قائداعظم کی سخت مخالفت کی اور مسلمانان پنجاب کی حمایت کھو بیٹھا۔

جنگ کے خاتمہ پر برطانوی گورنمنٹ ڈومینین سٹیٹ (DOMINION STATES) ہندوستان کو دینے کے لئے تیار تھی۔ اگر برطانوی حکومت نہ جھکتی تو اس کے حق میں بہتر تھا۔ آج جن مشکلات کا سامنا اسے ایران اور مصر میں ہے اس کا حل اسی میں تھا کہ ہندوستان سے اس کا سیاسی تعلق قائم رہتا خواہ یہ برائے نام ہی ہوتا۔

مشہور برطانوی مدبر سر سٹفورڈ کرپس (SIR STAFFORD CREPIS) اپریل ۱۹۴۲ء میں ہندوستان میں یہی پیشکش لے کر آیا مگر ناکام واپس گیا۔ کانگرس نے تجویز مسترد کر دی کیونکہ فوری ذمہ دارانہ حکومت کا ذکر اس میں نہ تھا۔ "انڈین یونٹی" (INDIAN UNETY) کے مخالف تھی۔ لیگ نے اس لئے قبول نہ کی کہ پاکستان کا تصور اس میں نہ

تھا۔ راج گوپال اچاریہ نے اصولاً پاکستان تسلیم کر لیا مگر کانگرس نے قبول نہ کیا ۱۹۴۴ء
میں گاندھی اور جناح میں گفت و شنید شروع ہوئی۔ گاندھی جی سرے سے یہ تسلیم ہی نہ کرتے
تھے کہ مسلمان ہندوستان میں ایک علیحدہ قوم ہیں اور یہ کہ لیگ اس کی واحد نمائندہ
ہے۔ گاندھی جی کا اس گفت و شنید کے انقطاع کے بعد یہ ارشاد تھا کہ

"جناح صاحب گو ضرور ہے مگر بھارت ماتا کی تقسیم کا تصور دیوانگی کی حد تک ہے۔"

جناح کہتا کہ

"مہاتما جی "اہنسا" کے اوتار اور پجاری تو ہیں مگر مجھے لڑائی کی دھمکی بھی دیتے ہیں۔ مجھ جیسے معمولی فانی انسان کا ان کی اندرونی آواز کے سامنے ٹھہرنا ممکن نہیں۔"

جنگ کے اختتام پر کانگرسی جیل سے رہا ہو کر نکلے اب صوبائی اور مرکزی مجالس کا انتخاب ہوا۔ لیگ سنٹرل اسمبلی میں کل مسلم نشستوں پر قابض ہو گئی۔ صوبائی مجالس میں چار سو پچانوے مسلم نشستوں میں سے چار سو چھیالیس پر لیگ کے نمائندے کامیاب ہوئے۔ اب ثابت ہو گیا کہ لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے

۲۴ اگست ۱۹۴۶ء میں وائسرائے کی کونسل کی تشکیل ہوئی۔ تمام کانگرسی ممبر کونسل تھے۔ وائسرائے پریذیڈنٹ اور پنڈت نہرو وائس پریذیڈنٹ۔ "ڈائرکٹ ایکشن" کا اعلان قائد اعظم کی طرف سے ہوا۔ فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا۔ کلکتہ میں چار ہزار اور بہار میں پانچ ہزار اور مشرقی بنگال میں پچاس ہزار خاندان بے خانماں ہو گئے۔ آخر گورنمنٹ سے سمجھوتہ ہو گیا۔ مرکز میں پانچ لیگی ممبر بشمول ایک اچھوت خاں لیاقت علی خاں کی قیادت میں انٹرم گورنمنٹ (INTERIM GOVERNMENT) میں شامل ہوئے۔

۳ جون ۱۹۴۷ء کو برٹش گورنمنٹ نے لارڈ مونٹ بیٹن (MOUNTBETTEN) کا "پلان" منظور کر لیا۔ اس میں ہندوستان کی تقسیم کی وضاحت کی گئی تھی۔ جسے لیگ اور کانگرس نے بھی تسلیم کر لیا۔ پنجاب دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ مشرقی حصہ بھارت

دیا گیا۔ یہی کیفیت بنگال میں ہوئی۔ صوبہ سرحد میں استصواب رائے ہوا جہاں کا نوے فی صدی مسلم آبادی ہے۔ استصواب لیگ کے حق میں ہوا۔ تعین حدود کے لئے فریقین نے "سر سائرل ریڈ کلف" (SIR CYRIL REDCLIFFE) کی ثالثی منظور کر لی۔ پاکستان کا پہلا گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح اور بھارت کا لارڈ مونٹ بیٹن شاہ انگلستان نے منظور فرمائے۔

ریڈ کلف نے حدود کا تعین کر دیا۔ اعلان سے چھ گھنٹہ پیشتر وہ ایک ہوائی جہاز کے ذریعہ ہندوستان سے پرواز کر گیا۔ یہ باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ تعین حدود ریڈ کلف نے نہیں بلکہ خود لارڈ مونٹ بیٹن نے ریڈ کلف کے نام پر کیا۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں جو ریڈیو پر نشر ہوئی اسے انتہائی غیر منصفانہ اور خلاف دیانت قرار دیا۔ مگر "خود کردہ را علاج نیست"۔ پارلیمنٹ میں ایک ممبر کہہ چکا تھا کہ

"ہم مسلمانوں کو پاکستان دیں گے مگر بمنزلہ صفر ہوگا"

ایک نہیں بلکہ دو صفر ملے جو مشرقی اور مغربی پاکستان سے موسوم ہیں۔

مارچ ۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے کہ خضر حیات خاں وزیراعظم پنجاب مستعفی ہو گیا۔ اس نے ایک مخلوط وزارت مرتب کر رکھی تھی۔ سکھوں اور ہندوؤں کی حمایت اسے حاصل تھی۔ اب اسے اپنی جان کا خطرہ تھا۔ "سر ایون جنکنز" (SIR EVAN JENKINS) گورنر تھا۔ خدا جانے اس نے ماسٹر تارا سنگھ کے کان میں کون سا شبد گرو گوبند سنگھ کا پڑھا کہ اس استعفا کے بعد اس نے ایوان حکومت میں "کرپان" لہراتے ہوئے "پاکستان مردہ باد" کا جیکارہ لگایا۔ ہندوؤں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت عرصہ پہلے ایک منصوبہ تیار ہو چکا تھا کہ پنجاب کو بزور کرپان" سکھ لے لیں۔ قائداعظم کو قتل کر دیں۔ اس میں پنجاب گورنمنٹ کی حمایت بھی شامل تھی اور اس منصوبہ کا علم پنجاب گورنمنٹ کو تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ امرتسر میں جو سکھوں کا مذہبی مرکز ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کا آغاز ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے۔ تارا سنگھ نے گورنر پنجاب سے دو گھنٹہ کی مہلت مانگی۔ اس عرصہ میں سکھ جو کچھ بھی کریں ان کو کھلی

چھٹی دی جائے۔

تارا سنگھ نے پٹیالہ اور دیگر ریاستوں سے آدمی اور اسلحہ دربار صاحب میں کیا۔ پچاس ہزار سکھ مع اسلحہ دربار صاحب اور ملحقہ کشادہ باغ میں جو "گورو کا کہلاتا ہے، جمع تھے۔ اس کے علاوہ سکھوں کی آبادی شہر میں کافی تھی اور کرپان قانوناً ان کو بہت عرصہ پیشتر مل چکا تھا۔ نہری نوآبادیات لائل پور وغیرہ میں سکھ خفیہ ہدایات مل چکی تھیں کہ جب اشارہ ہو کھڑے ہو جائیں اور تمام مسلمان آبادی کو کرپان کے گھاٹ اتار دیں۔

"راشٹریہ سیوک سنگھ" شمالی پنجاب میں ہندوؤں کو منظم کر رہا تھا۔ ان کے پاس اسلحہ اور آتش گیر سامان کافی موجود تھا۔ سکھ اور ہندو ڈپٹی کمشنر سکھوں ہندوؤں کو بلا تکلف اسلحہ کا لائسنس دے رہے تھے۔ وسط پنجاب میں سکھ اور ہندو اپنے آپ کو غالب فریق سمجھتے تھے۔ مگر شمالی پنجاب میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ یہاں ہر ایک ہندو اور سکھ کا مکان قلعہ کی صورت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ کافی مقدار میں غلہ ذخیرہ کیا گیا۔ اسلحہ کی کمی نہ تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ ان اضلاع میں جب سنیں کہ خالصہ جی نے امرتسر کا مورچہ سر کر لیا ہے تو ہر ایک مقام پر نکل آئیں اور قتل کا بازار ایک ہی وقت پنجاب کے طول و عرض میں گرم کر دیں۔

میرے دوست مہر عیر الدین پہلوان نے مجھ سے بیان کیا کہ

"جب کلکتہ اور بہار میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہوا تو اسے یقین ہو گیا کہ امرتسر کی باری بھی آنے والی ہے۔ کچھ سکھوں کی باتوں اور حرکتوں سے بھی بھانپ گیا۔ کہ یہ وقت دور نہیں۔

حکیماں والے دروازہ کے اندر مسلم آبادی کی اکثریت ہے۔ اور اس کڑہ کے نوجوان ورزش کے بہت شوقین ہیں۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسی کڑہ میں رستم ہند غلام پہلوان کا گھر اور دروازہ سے ملحق اس کے بھائی کلو پہلوان کا اکھاڑہ ہے۔

میرے دوست نے اپنے سب دوستوں کو جمع کیا اور آنے والے خطرے سے آگاہ کیا۔ اس کٹڑہ میں چند مرکز مقرر کئے گئے۔ یہاں عسکری تربیت کے لئے ہر ایک کا حاضر ہونا فرض تھا۔ اسی کٹڑہ کے ملحق دوسرے کٹڑہ میں مسلمان "آتش باز" بھی تھے ان کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ میرا دوست خدا کے فضل سے خود متمول آدمی تھا۔ اس کے تین بھائیوں نے پچاس پچاس ہزار روپیہ خرید اسلحہ کے لئے چندہ دیا۔ اس کٹڑہ میں چند اور مسلم لاکھ پتی بھی تھے۔ خیرالدین نے ان کے سامنے بھی دست سوال دراز کیا مگر ایک پیسہ بھی نہ ملا۔ اس جواں مرد و جواں ہمت نے چند ماہ کے عرصہ میں خاطر خواہ تنظیم کر لی۔

اب سکھ دربار صاحب میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ دن رات "ست سری اکال" کے جے کاروں سے امرتسر کی فضا گونج رہی تھی۔ آخر مارچ ۱۹۴۷ء میں سکھوں اور ہندوؤں کا مشترکہ پہلا "جتھہ" جے کارے لگاتا ہوا دربار سے نکلا اور کٹڑہ جیمل سنگھ سے ہوتا ہوا فرید کے چوک کی طرف بڑھا۔ مسلمان غافل تھے۔ یہاں مسلم آبادی کی اکثریت تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بعض دکانوں پر بیٹھے خوش گپی میں مصروف تھے کہ جے کاروں سے چونک پڑے۔ "مسو" پہلوان نے دیکھا کہ کوئی دم میں حملہ ہوا چاہتا ہے۔ مسلمانوں نے شور سنا تو گھروں کی کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھا۔ ان سب کو معلوم تھا کہ سکھوں کا ارادہ کیا ہے۔ مگر یقین نہ تھا کہ انگریزی راج کے ہوتے ایسا اندھیر کیسے ہو سکتا ہے۔ مسو پہلوان نے پچیس جوانوں کو جمع کیا ان کے پاس بھالے اور چھریاں تھیں۔ پہلوان نے کہا کہ پیچھے نہ ہٹنا ورنہ نہ تم اور نہ تمہارا ننگ و ناموس محفوظ رہے گا۔ بازار میں ان گنتی کے آدمیوں کو صف آرا دیکھ کر سکھ اور ہندو ٹھہر گئے۔ سکھوں کے پاس بندوقیں بھی تھیں۔ اندھا دھند فائر شروع کئے۔ اس وقت ایک مسلم نے اپنی

بندوق اور بک شوٹ کے کارتوس مسلمانوں کے حوالے کر دیئے انہوں نے بھی دو تین فائر کیئے۔ مگر اندھا دھند مسلمان جمع ہو رہے تھے۔ ان میں ایک ولایتی پٹھان بھی تھا۔ اس نے بندوق سنبھال لی۔ اور تین فائر ایسے تاک کر کیئے کہ تین سکھ بری طرح زخمی ہو کر گرے۔ اور تڑپ تڑپ کر سرد ہو گئے۔ مسلمانوں کے مکانوں سے اینٹ پتھر کی موسلا دھار بارش نے بھی انہیں پریشان کر دیا۔ مسلمان اب کافی تعداد میں جمع ہو رہے تھے۔ خالصہ جی نے پیٹھ دکھائی۔

اب مسلمانوں نے ہلہ بول دیا۔ کٹڑہ جمیل سنگھ تک تعاقب کیا۔ اس خیال سے کہ ان کی جمعیت کافی نہیں ہے واپس لوٹے۔ یہ تو چوک فرید میں اکٹھے ہو رہے تھے کہ سکھوں کا دوسرا جتھہ شکست خوردہ جتھے کو راستہ میں ملا۔ دونوں پلٹے اور بازار جمیل سنگھ کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بازار تو خالی تھا۔ دکانیں مسلمانوں کی تھیں۔ سب کو آگ لگادی۔

اس بازار میں وہ کوچہ ہے جو میرے دادا کے چھوٹے بھائی میاں اسد اللہ وکیل کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں میرے ہی عزیزوں کے مکان رہائشی تھے یہ بھی آگ کی نذر ہوئے۔ آسمان دھواں دھار ہو رہا تھا اور شعلے بلند ہو کر گردونواح کے رہنے والوں کو متنبہ کر رہے تھے۔ چوک فرید کے لوگوں نے بھی اب ہر طرف آگ لگانی شروع کر دی۔

دو روز تک ہنگامہ آرائی رہی۔ اس عرصہ میں نہ کوئی پولیس کا آدمی نہ کوئی فوجی سپاہی نظر آتا تھا۔ ادھر تو یہ حال تھا ادھر میرے دوست کی منظم فوج بھی نکل کھڑی ہوئی۔ جہاں کہیں مڈھ بھیڑ ہوئی سکھ بھاگے۔ آتش زدگی کی عام وارداتیں ہو رہی تھیں محلے کے محلے ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ اب سکھ بھاگ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم بالکل مسلمانوں کے رحم و کرم پر ہے۔ پولیس اور فوج آدھمکی اور امن بحال کر دیا۔ پکڑ دھکڑ بھی شروع ہو گئی۔

امرت سر سے باہر پنجاب کے دیگر اضلاع میں ہندو اور سکھ سن چکے تھے کہ امرت سر میں فساد شروع ہوگیا۔ انہیں یقین تھا کہ خالصہ جی کی فتح ہی فتح ہے اس لئے یہ بھی اٹھ کھڑے ہوتے۔ راولپنڈی میں ان کی تیاری مکمل تھی۔ ایک جلوس نکالا۔ جو مسلمان سامنے آیا مارا گیا۔ یہ جلوس نعرے لگا رہا تھا کہ "اسلام مردہ باد اور لاالہ مردہ باد" شہر میں تو مسلمان مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ علاقہ اکثر و بیشتر مسلمان فوجیوں کا ہے۔ جب آتش فساد کی خبر آگ کی طرح پھیلی تو مسلمان دیہاتی، اسلحہ کے ساتھ آگئے اور تھوڑے عرصہ میں شہر سکھوں سے خالی ہوگیا۔ یہی حال پنجاب کے دوسرے اضلاع کا تھا۔

تارا سنگھ پولیس کے محافظ دستہ کے ساتھ لاہور آیا اور گورنر بہادر جنکنز سے ملا۔ اس نے زہر خندہ کرتے ہوئے کہا کہ

"دو گھنٹہ کی جگہ میں نے دو دن تمہیں دئے۔ تم تو ڈنڈوں اور اینٹ پتھروں کی تاب نہ لا سکے۔ اب صبر کرو اور تقسیم ہند کا انتظار کرو"

۱۷ اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم کا اعلان ہوا۔ بھارتی فوج نے مشرقی پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ پھر فرقہ وارانہ فساد شروع ہوگیا۔ یہ داستان خونچکاں علیحدہ دفتر میں بیان ہو سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ پانچ لاکھ مسلمان زن و مرد نہتے مارے گئے۔ بچوں کو سنگینوں اور نیزوں کی نوک پر اٹھا اٹھا کر پھینکا گیا۔ پچاس ہزار عورتیں اغوا ہوئیں۔ پاکستان کے ارباب حل و عقد امن کمیٹیاں بنا رہے تھے۔ مہاجرین بدحواس ہو کر لاہور سیالکوٹ اور دیگر سرحدی اضلاع میں داخل ہو رہے تھے۔ "ٹرینیں" شہدا کی لاشوں سے بھری ہوئی لاہور کے پلیٹ فارم پر آ رہی تھیں۔ عوام میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور لوگ بے قابو ہو گئے۔ ردعمل مغربی پنجاب میں شروع ہوگیا۔ سکھ اور ہندو متمول تو نقدی اور منقولہ جائداد کے ساتھ مارچ کے واقعات کے بعد ہی بھارت کی طرف نقل مکانی امن کے ساتھ کر رہے تھے۔ لیکن لاہور میں ابھی تک ڈٹے ہوئے تھے اس لئے کہ یہاں سے پندرہ میل کے فاصلہ پر بھارت کی حد شروع ہو جاتی ہے۔

اور اس لئے بھی کہ ان کے محلے قلعے تھے اور کسی مسلمان کی جرأت نہ تھی کہ وہاں قدم رکھ سکے۔ امرت سر سے چالیس جوان آئے اور شاہ عالمی دروازہ کے اندر ہندوؤں کے سب سے بڑے گڑھ کو آگ کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اُدھر مسلمان اور اِدھر سکھ قتل ہو رہے تھے اب بھارت والوں کو بھی معلوم ہوا کہ ردعمل شروع ہو گیا اس لئے صلح صفائی کی بات چیت شروع ہو گئی۔ جانی نقصان مسلمان کا ہوا اور مالی ہندوؤں اور سکھوں کا۔ جب کبھی یہ داستان لکھی جائے گی خون کے حرفوں سے لکھی جائے گی۔

سکھوں کو یہ سبز باغ دکھایا گیا تھا کہ تقسیم کے بعد پنجاب کا جو بھی حصہ پاکستان سے علیحدہ ہو گا وہ سکھ ریاست ہو گا۔ یا ان کو یقین تھا کہ جو حصہ پاکستان میں شامل ہو گا اگر بزورِ کرپان لے سکے تو وہ بھی ان کا ہے۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان جن کا خانماں اور ننگ و ناموس لٹ رہا تھا یا تو مارے گئے اور بقیۃ السیف پاکستان میں بے سروسامانی کی حالت میں داخل ہو رہے تھے

ادھر تارا سنگھ بھارت سے مطالبہ کر رہا تھا کہ مجھے دو ڈویژن فوج دو۔ مغربی پنجاب چند گھنٹوں میں لے لیتا ہوں۔ دو گھنٹہ میں امرتسر تو مسلمانوں سے خالی نہ کرا سکا۔ لیکن اس وقت جو کچھ کہہ رہا تھا سچ کر دکھاتا اگر اس کو ایک ڈویژن ہی مل جاتا۔ مسلمان سپاہی جو برطانیہ کی فوج میں ملازم تھے ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر رکے ہوئے تھے۔ تقسیم کے بعد جو کچھ مغربی پاکستان تھا بمنزلہ صفر تھا۔ اگرچہ برطانیہ بھارت اور پاکستان کے تحفظ کا جب تک وہ دولت مشترکہ برطانیہ میں شامل ہیں ذمہ دار تھا اس لئے علانیہ بھارت پاکستان پر حملہ نہیں کر سکتا تھا لیکن

خوئے بد را بہانہ بسیار است

جب پاکستان کی حکومت نے بھارت کو اس انسانیت سوز حرکات کی طرف توجہ دلائی تو جواب ملا کہ

"ریاستوں سے تو ہمارا معاہدہ ہو چکا ہے کہ ہم ان کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیں گے اور عوام بالخصوص ہمارے قابو میں نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ سکھ قوم جس کی کل تعداد بمشکل چالیس لاکھ ہوگی۔ روایتی شورہ پشت تھی۔ نہ کبھی چین سے بیٹھی نہ کسی کو چین سے بیٹھنے دیا۔ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں سکھ حکومت قائم کرلی تھی اس کی آنکھیں بند ہوتیں۔ اور سکھ بے قابو ہوگئے۔ جو بھی رنجیت سنگھ کی گدی پر بیٹھا۔ ایک دو روز کے عرصہ میں مارا گیا۔ برطانیہ نے آسانی سے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ برطانوی عہد میں بھی یہ قتل و غارت سے باز نہ آتے۔ اگرچہ پاکستان کو لاکھوں جانوں کی قربانی دینی پڑی۔ لیکن اس لعنت سے پاک ہوگیا بھارت کے مدبر اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان کے پہلو میں یہ ایک کانٹا ہے اور ہمیشہ کھٹکتا رہے گا۔ اس لئے اس کو پاکستان کے سامنے کھڑا کردیا۔ اور اس کو فرقہ وارانہ فساد سے تعبیر کیا۔ غرض یہ تھی کہ سکھ اگر ختم نہ ہوئے تو اتنے کمزور ہو جائیں گے کہ ان میں اتنی سکت باقی نہیں رہے گی کہ سر اٹھا سکیں اور پاکستان کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ جائے گا اور اکھنڈ ہندوستان کا خواب بھی پورا ہو سکے گا۔ اس قتل و غارت میں سکھوں نے ہی عملاً حصہ لیا اور وہی زیادہ تر مارے گئے۔ جب امن قائم ہوگیا۔ تو سکھ پنتھ نے بھارت سے مطالبہ کیا کہ مشرقی پنجاب میں ایک سکھ ریاست قائم کی جائے جو بھارت کے تحت رہے گی۔ "پٹیل" نائب وزیر اعظم بھارت نے خالصہ جی کو صاف صاف لفظوں میں کہا کہ "تمہاری کرپانیں اب نیام ہی میں زنگ آلود ہو کر رہ جائیں گی۔" سکھوں نے کہیں کہیں تارا سنگھ کی قیادت میں شورش برپا کی۔ پٹیل نے دو دفعہ تارا سنگھ کو "جیل یاترا" کرائی۔ کسی سکھ سورما نے دم نہ مارا۔

قائد اعظم نے ایک دفعہ فرمایا تھا کہ "میں نہ ہندوؤں اور نہ برطانیہ سے ڈرتا ہوں لیکن سکھوں کی طرف سے مطمئن نہیں۔" اور مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا کہ "تمہیں سکھوں کے ہاتھ سے نقصان پہنچے گا۔" قائد اعظم سکھوں کو جہاں ان کی اکثریت تھی سکھ ریاست کی پیشکش سے مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ مگر تارا سنگھ نے یہ کہہ کر ٹھکرادی کہ گو بلحاظ مذہب ہم مسلمانوں کے قریب تر ہیں مگر قومیت ہماری ہندو ہے اور میں اس کے تقاضے کو ترجیح دیتا ہوں۔"

تارا سنگھ جیل میں تھا اور سکھ اس پر لعنت بھیج رہے تھے کہ ریاست بھی ہاتھ سے
دی اور "نقصان مایہ و شماتت ہمسایہ" بھی مول لی۔

۲۵ جولائی ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بحیثیت گورنر جنرل اور وائسرائے
تاج برطانیہ راجوں اور نوابوں اور ان کے وزراء کی کانفرنس میں تقریر کی کہ

"انڈین انڈی پینس ایکٹ" (INDIAN INDEPENCE ACT) کی
شرائط کے تحت ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے دن سے برطانیہ کا اقتدار ان کے
سروں پر سے اٹھ جائے گا۔ ریاستیں مجاز ہیں کہ یا تو پاکستان یا بھارت سے
اپنا الحاق کر لیں یا دونوں سے آزاد خود مختار رہیں۔"

مگر مخلصانہ مشورہ یہ بھی دیا کہ

"پاکستان اور بھارت میں سے جو بھی ان کے ملحق الحدود ہو اس سے
رابطہ اتحاد قائم کر لیں۔ اگر وہ آزاد ہی رہنا چاہیں تو دفاع اور خارجی تعلقات
اور بیرونی رسل و رسائل ایسے امور ہیں کہ اس میں انہی کا مفاد ہے کہ ان
دونوں میں سے کسی ایک کے حوالے کر دیں۔"

ہندوستان میں ریاستوں کی تعداد پانچ سو چھیاسی ۵۸۶ تھی۔ چند بڑی اور اکثر
چھوٹی تھیں۔ اکثر کے حکمران ہندو راجے تھے اور اکثریت آبادی ہندو تھی۔ اس لئے
خیر اسی میں دیکھی اور ہندو دھرم کے نام پر ان سے اور ان کی رعایا سے بھی اپیل کی گئی
تھی اس لئے اکثر بھارت میں مدغم ہو گئیں یہ چاروں طرف سے بھارتی علاقہ میں گھری
ہوئی تھیں کیا کر سکتی تھیں۔

سوال صرف دو ریاستوں کا تھا۔ ایک حیدر آباد دکن اور جوناگڑھ کا۔ دونوں
ریاستوں میں ہندو اکثریت تھی۔ حیدر آباد تمام ریاستوں میں سب سے بڑی ریاست
ہے۔ اس وقت مسلم ثقافت کا مرکز تھی۔ جوناگڑھ براہ بحر پاکستان سے ملحق ہے اس
نواب نے الحاق پاکستان کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ مگر بھارت نے پہلے ہمسایہ ریاست
میں فوج جمع کی۔ پھر اس بنا پر کہ ہندو اکثریت پاکستان کو نہیں دی جا سکتی ریاست

میں داخل ہوگئی اور قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد استصواب رائے بھی بھارتی فوجوں کی موجودگی میں ہوا۔ پاکستان نے "یو۔این۔او" کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ یہ مسئلہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہے۔

حیدرآباد میں "سید قاسم رضوی" نے رضاکاروں کی ایک فوج تیار کی اور مقابلہ کے لئے تیار ہوا۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ ریاست میں سولہ اطراف سے بھارتی فوج داخل ہو گئی۔ ریاستی فوج نے بغیر لڑے مرے ہتھیار ڈال دیئے۔ خود حضور نظام نے ۲۳ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پر تقریر نشر کی کہ

"میں تو شروع سے ہی بھارت سے دوستانہ الحاق کا خواہشمند تھا مگر وزراء مانع تھے:"

قاسم رضوی اور اس کے رفقاء کار اب حیدرآباد جیل میں ہیں۔ حیدرآباد کا معاملہ بھی یو این او میں پیش ہے۔

جوناگڑھ کے بارہ میں مسلمانوں کی یہ رائے تھی کہ وہاں ہندو اکثریت ہے اور یہ بھارت سے الحاق کی خواہاں ہوگی لیکن کشمیر میں چالیس لاکھ کی آبادی میں تینتیس لاکھ مسلمان ہیں اور پاکستان سے ملحق الحدود ہے۔ اس کا الحاق تو ضرور پاکستان سے ہونا چاہیئے۔ جوناگڑھ میں نواب مسلمان ہے اور ریاست جموں و کشمیر میں ہندو ڈوگرہ راجہ۔

خود پنڈت نہرو یہ اعلان کر چکا تھا کہ کسی نواب یا راجہ کو یہ اختیار نہیں کہ اپنی ہندو یا مسلم رعایا کے علی الرغم بھارت یا پاکستان سے الحاق کی خواہش کرے۔ لیکن یہ اعلان اس وقت کا ہے جب مسئلہ جوناگڑھ پیش نظر تھا۔ اب کشمیر کا معاملہ آیا تو یہ اعلان حافظہ سے اتر گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھارت کا گورنر جنرل مونٹ بیٹن تھا۔ ہم بیان کر آئے ہیں کہ "ریڈکلف ایوارڈ" کے ذریعہ ضلع گورداسپور جہاں مسلم اکثریت تھی اور پاکستان سے ملحق بھی تھا بھارت کو دیا گیا۔ یہ صریح بے ایمانی اس لئے روا رکھی گئی کہ ریاست جموں اور کشمیر کا یہی واحد راستہ تھا جو بھارت کو ریاست سے ملاتا ہے۔ اگر یہ ضلع نہ دیا جاتا تو ظاہر ہے کہ بھارت کا الحاق کشمیر سے ممکن نہ تھا۔ اس الحاق کی بنیاد "ریڈکلف ایوارڈ" میں رکھی گئی۔ لیکن ریاست میں مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنا بھی مد نظر تھا۔ اور مونٹ بیٹن نے بھارتی فوجوں

کو بھیج دیا تھا۔ مسلمانان ریاست بعض مقامات پر جو پاکستان کی سرحد پر واقع ہے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ قبائلی پٹھان بھی شمال کی طرف سے آئے۔ مسلمانان ریاست نے آزاد کشمیر گورنمنٹ قائم کرلی جس کا مرکزی مقام "پلندری" ہے۔

مجھے بھی بحیثیت اعزازی ڈسٹرکٹ وسشن جج اس کے تحت چھ ماہ کام کرنے کا شرف حاصل رہا۔

قائد اعظم محمد علی جناح نے شروع میں فخریہ کہا تھا کہ "میں نے پاکستان خون ریزی کے بغیر لیا ہے" لیکن جب عام قتل وغارت کا بازار گرم ہوگیا جس کا مذکور ہم کر آئے ہیں اور کشمیر کے الحاق کا اعلان راجہ نے کردیا تو ایسا صدمہ ہوا کہ جانبر نہ ہوسکا۔ تمام کاروبار سلطنت کا بوجھ اس کے کندھوں پر آپڑا تھا اور اس کی جیب میں چند سکے تھے مگر کھوٹے۔ ستر سال سے زیادہ عمر تھی اور صحت بھی جواب دے چکی تھی۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء میں حرکت قلب بند ہوگئی اور یہ شخصیت جس کی قیادت سے تمام دنیائے اسلام کی توقعات وابستہ ہو رہی تھیں ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"

پاکستان کیا کل دنیائے اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ میں نے بھی ہدیہ عقیدت ذیل کے اشعار میں شیخ سعدیؒ کی زمین میں لکھے۔ لاہور کے ایک روزنامہ میں شائع ہوا۔

آسمان را حق بود گر خوں بگرید بر زمین

بر وفات قائد اعظم امیر المومنین

آج اٹھتا ہے جنازہ اس مسلماں جاہ کا

ملک پاکستان کل تک جس کے تھا زیر نگین

زندہ پاکستان جس کے دم سے تھا اے ہم نفس

آج وہ ہے ہم نشین عیسی گردوں نشین

کوئی بتلائے خدا را وہ کہاں روپوش ہے

وہ مرا خضر طریقت رہنمائے مسلمین

محمل لیلی کی مجنوں کر رہا ہے جستجو

سنتا ہے بانگ درا صحرا ہیں وہ شاید کہیں

آئینہ خانہ میں عالم کے میں ششدر رہ گیا

مثل اس کا اب کہیں مجھ کو نظر آتا نہیں

کون اس بار امانت کو اٹھائے گا یہاں

ساکنان نہ ملک سے جب کہ اٹھ سکتا نہیں

یا الٰہی قائداعظم کا دے نعم البدل

استجب ھذا دعائی یا الٰہ العٰلمین

چوں مسلماناں دعاء مغفرت از جاں کنند

از زمین عرش آمیں می کند روح الامین

بھارت کو بھی اچھا موقعہ ہاتھ لگا۔ حیدرآباد دکن پر حملہ کر دیا۔ کشمیر میں جنگ جاری تھی پاکستان کی سرحدوں پر جو بھارت سے ملحق ہیں پانچ ہندوستانی ڈویژن اس انتظار میں تھے کہ اگر پاکستان نے مداخلت کی تو اس پر ہلہ بول دیا جائے۔

قائداعظم کراچی ہی میں ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء میں پیدا ہوئے اور یہیں مدفن بنا جو اب زیارت گاہ دنیائے اسلام ہے۔

کشمیر میں بھارت کی منظم فوج نئے اسلحہ سے آراستہ غیر منظم قبائلی مجاہدین کے ہاتھ سے بری طرح پٹ رہی تھی۔ ٹھیک وہی حالت تھی جو فلسطین میں یہود کی عربوں کے مقابلہ میں تھی۔ کشمیر میں متارکہ (CEACE FIRE) نے نقشہ بدل دیا۔ یو این او کا دروانہ بھارت کھٹکھٹا چکا تھا۔ نمائندے آئے اور خان لیاقت علی خاں (مرحوم) کو جو اس وقت پاکستان کے وزیراعظم تھے۔ متارکہ پر مجبور یا رضامند کر لیا۔ مفتوحہ علاقہ کا بھی زرخیز حصہ متارکہ کی حدبندی کے ذریعہ واپس دینا پڑا۔ قبائلیوں کو نکالا گیا۔ اور بھارت کو موقعہ دیا گیا کہ اپنا عسکری قبضہ اس حصہ ریاست پر کرلے جو سرسبز اور زرخیز ہے۔ پاکستان کے ملحق المحدود پہاڑی علاقہ اور جنگل پر آزاد کشمیر کی فوج باقی رہ گئی۔

پاکستان کی عمر چار سال ہے اور کشمیر پر بھارت کے قبضہ کی بھی یہی عمر ہے۔ بلا مداخلت

خارجی وہ اپنی سلطنت یہاں مضبوط اور مضبوط تر بنا چکا ہے۔ اس میں بھارت کا وقار اور پنڈت نہرو کی وطنی محبت کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔

مسئلہ کشمیر کی گتھی "یو این او" سلجھانے میں لگا ہوا ہے۔ اگر یہ "گوریا" کا معاملہ ہوتا تو کبھی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا۔ ایک کمیشن کے بعد دوسرا کمیشن آتا ہے۔ اور اپنا سامنہ لے کر یا پاکستان کا منہ چڑا کر چلا جاتا ہے۔ غرض بظاہر تو اتنی ہے کہ وقت گذر جائے۔ معاملہ دیرینہ ہوتا جائے اور عوام کی ذہنیت سے رفتہ رفتہ یہ اہم مسئلہ اتر جائے۔ آخری کمیشن ڈاکٹر گراہم (GRAHAM) کا چند روز ہوئے واپس گیا۔ اور اپنی رپورٹ مرتب کر کے "یو این او" میں پیش کریگا۔ پاکستان کی حدود پر حسب بیان خان لیاقت علی خان نوے فیصدی بھارتی فوج پر جمع ہو چکی ہے۔ اور ریاست میں شیخ عبداللہ وزیر اعظم منجانب بھارت کی نگرانی میں استصواب رائے ہو رہا ہے۔ اور یہ وہ مطالبہ ہے جو "یو این او" میں پاکستان کا ہے کہ غیر جانبدارانہ ہو۔

میں نے مسئلہ کشمیر پر بہت کچھ لکھا۔ میرے مقالے مسلم روزناموں میں جو لاہور سے شائع ہوتے ہیں شائع ہو چکے ہیں۔ اور میری روزنامہ یادداشت میں شامل ہیں جس کا ذکر میں نے پاکستان کے شروع میں کیا ہے اور سردست مناسب بھی یہی ہے کہ زبان منہ میں خاموشی اختیار کرے۔ اور زبان قلم بھی چپ سادھ لے کہ

"رموز مملکت خویش خسرواں دانند"

ان حالات میں کہ مجھے "راز درون پردہ" کا علم نہیں۔ اور کسی پاکستانی مسلمان کو نہیں کہ ارباب حل وعقد اور برطانیہ اور امریکہ میں کیا گفت و شنید ہو رہی ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے۔ یہ باتیں صیغہ راز میں ہیں۔ پنڈت نہرو بھارتی وزیر اعظم کہہ چکا ہے کہ "ڈاکٹر گراہم نے مجھ سے مسئلہ کشمیر پر مبادلہ خیالات ہی نہیں کیا" اور اسی کی موجودگی میں بھارت نے اپنی نوے فیصدی فوج پاکستان کی حدود پر جمع کر دی۔ ڈاکٹر گراہم نے بھی اتنا ہی کہا کہ میں نے پنڈت نہرو کو مشورہ دیا تھا کہ

"اسمبلی جو اس ماہ ستمبر میں مجوزہ ہے۔ اس کا انتخاب جنوری ۱۹۵۱ء پر ملتوی کر دو۔ مگر اس نے نہ مانا"

خان لیاقت علی خان

خوش قسمتی سے خان لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان، کرنال کے جاگیردار خاندانی نواب ہیں ۔ قائد اعظم کے دست راست رہے اور شروع سے وزارت عظمیٰ پاکستان ان کے ہاتھ میں رہی ۔ انٹرم گورنمنٹ میں مسلم ارکان کی قیادت بھی آپ نے کی۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین ہوئے جو ڈھاکہ کے مشہور کشمیری نواب خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔

وزیر خارجہ چودھری سر ظفر اللہ خان سیالکوٹی احمدی قادیانی ہیں جو برطانوی عہد میں اعلیٰ ذمہ دار عہدوں پر ممتاز رہے ۔ فن تقریر میں ید طولیٰ ہے ۔ بیرسٹر ایٹ لا ہیں "یو این او" میں کئی تقریریں کر چکے ہیں ۔ ایک تقریر چھ گھنٹے تک جاری رہی " ریکارڈ" توڑ دیا " ریڈ کلف باونڈری کمیشن" کے سامنے پاکستان کی نمائندگی کی اب تنازعہ جونا گڑھ اور ریاست جموں و کشمیر میں پاکستان کی وکالت کا حق عرصہ چار سال سے فرما رہے ہیں۔

مال و مالیات کی الجھنوں کو ہر ایک شخص نہیں سمجھ سکتا ۔ خوش قسمتی سے پاکستان کو غلام محمد صاحب لاہوری سی شخصیت مل گئی ۔ انہی ایام میں جب کہ برطانیہ نے سکّہ کی قیمت گرادی اور بھارت نے بھی تقلید کی تو اس روشن دماغ نے پاکستانی ساکھ بحال رکھی ۔ بلکہ دنیا پر اپنی قابلیت اور پاکستانی ساکھ کا سکہ جما دیا۔

ریاست جموں اور کشمیر " زندہ دلان" پنجاب کے نزدیک زندگی اور موت کا مسئلہ ہے ۔ "پاکستان" کے لفظ کا حرف "کاف" اس کی جان ہے اگر یہ اڑ گیا تو پاکستان داستان" پاستان" ہو کر رہ جائے گا ۔ پنجاب کے تین دریاؤں کا منبع ریاست میں ہے ۔ اور بھارت اعلان کر چکی ہے کہ ان پر اس کا حق ہے اور یہ بھی حق ہے کہ ان کا رخ بدل دے ۔ اگر کبھی ایسی صورت ہو تو حرف "پ" بھی حرف غلط کی طرح محو ہو جائے گا اور پاکستان اگر زندہ رہا تو "استان" ہی رہ جائے گا معلوم نہیں کس کا ہوگا ۔ کشمیر کی حدود تبت اور چین سے ملتی ہیں اور روس سے چند میل ہی فاصلہ ہے ۔ اس لئے پاکستان کے لئے اس کا قبضہ پاکستان کی زندگی کے لئے ناگزیر ہے ۔ جس پر پاکستان کی خارجہ اور مدافعانہ حکمت عملی (POLICY) اور تحفظ کا

انحصار ہے۔ اس لئے کچھ تعجب نہیں اگر ریاست جموں وکشمیر کے پاکستانی ملحقہ علاقہ پنج
اور سرحدی صوبہ میں احساس نسبتاً شدید ہو۔

ہمارے وزیر اعظم بڑی ٹھنڈی طبیعت کے آدمی واقع ہوئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ
دور میں جس سے پاکستان گزر رہا ہے۔ ایسی ہی شخصیت کی ضرورت بھی ہے۔ مسئلہ کشمیر
سب سے زیادہ اہم ہے مگر اور مسائل اقتصادی اور سیاسی بھی ہیں۔ پاکستان کی خوشحا
بمقابلہ بھارت، وزارت عظمیٰ اور اس کے رفقاء کار کی مرہون ہے۔ مہاجرین کا بوجھ کر
ثابت ہوتا اور محدود رقبہ میں جو پہلے ہی آباد ہے ان کی آبادکاری کا سوال دماغ پریشان کر
کے لئے کافی تھا مگر جن مردانہ ہمت اور استقلال سے اسے حل کیا گیا ہے اور حل کیا جار ہا
(مہاجرت تاحال جاری ہے) لائق صد تحسین ہے۔ مسئلہ کشمیر کے بارہ میں زندہ دلان پنجاب
بے پناہ جوش شاید اس صبر آزما چار سال کے عرصہ کے بعد رنگ لاتے اور خاص رنگ لا
اگر بر وقت اس فوجی سازش کا انکشاف نہ ہوتا جس میں بڑے بڑے فوجی مسلم جرنیل شا
تھے۔ یہ ماخوذ ہوتے اور مقدمہ کی سماعت کراچی میں بصیغہ راز جاری ہے۔ سازش کی تفص
اور جرم کی حقیقت فیصلہ مقدمہ کے بعد ہی معلوم ہو سکتی ہے جس کا انتظار ہے۔ کچھ شک نہیں
وزارت مآب کی خنک طبعی جو شاید تفریط کی حد تک پہنچ چکی ہے آپ کی ہر دلعزیزی پ
جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے مخالفانہ اثر انداز ہوتی۔ لیکن بھارت کے متوقع حملے
پھر سے بحال کر دی۔ اور آپ کے سیاسی تدبر سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ قائم رہے گ

اس وقت حالات یہ ہیں کہ بھارت اور پاکستان کی فوجیں ایک دوسرے کے سا
پڑی ہیں۔ گویا "یک تک" منا رہی ہیں۔ ریاست متنازعہ میں اسمبلی کی تشکیل کی ابتدائی کا
جاری ہے۔ ۷۵ میں سے ۴۵ ممبروں کا انتخاب بلا مقابلہ ہو گیا۔ یہ کہنا چاہیئے کہ عوام نے اس
میں کچھ حصہ نہیں لیا۔ کسی وقت اس بارودخانہ میں ایک چنگاری بھارت اور پاکستا
کو آتشکدہ بنا دے گی۔

بھارت اور پاکستان میں جو واقعات رونما ہو چکے ہیں یا متوقع ہیں۔ عوام ان
دونوں کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں دیکھتے ہیں۔ لیکن ایک مورخ ان حالات میں ح

دنیا جہاں کی قوموں میں ایک ربط قائم ہو چکا ہے عالمگیر سیاست سے علیحدہ نہیں دیکھتا اور سمجھتا ہے کہ انہی الجھنوں نے مسئلہ کشمیر کی گتھی بھی پیدا کر رکھی ہے اور جب تک یہ نہ سلجھے یہ گتھی بھی سلجھ نہیں سکتی۔

پنڈت نہرو کی تمام زندگی ہی سیاسیات میں گذری اور گذر رہی ہے۔ وہ اور اس کے رفقاء اس بساط پر شاطران برطانیہ سے یہ کھیل ایک صدی سے کھیل رہے ہیں مسلمانوں میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جس کو اس فن میں مہارت ہو۔ پنڈت تو عالمگیر سیاست اور اس کی الجھنوں کو خوب سمجھتا ہے اور اس کا فائدہ بھی اٹھا تا رہا۔ اور ہمیں ہر ایک محاذ پر خواہ یہ حیدر آباد میں تھا یا جونا گڑھ میں یا اب کشمیر میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا خود برطانیہ بھی مات کھا گیا۔ اگر مونٹ بیٹن پلان کے تحت کم از کم حیدر آباد کی کامل آزادی کا اعلان کر دیتا اور بمبئی علاقہ کا کچھ حصہ جو ریاست کو سمندر سے ملاتا ہے اپنے قبضہ میں اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے رکھتا اور رکھ سکتا تھا تو آج ایران اور مصر میں جن مشکلات کا سامنا ہے اور جو مشکلات بھارت نے کمیونسٹ چین اور جاپان سے ربط کے ساتھ پیدا کر دی ہیں پیش نہ آتیں۔ لیکن برطانیہ کی پرانی پالیسی یہ تھی کہ ریاستیں ختم ہونی چاہئیں۔ وہ خود معاہدات کے ہوتے ایسا اعلان نہیں کر سکتا تھا۔ برار کا علاقہ ہتھیا لیا تو اورنگ آباد بھی لینا چاہتا تھا غرض اس کا ارادہ یہ تھا کہ اکھنڈ ہندوستان پر اس کی حکومت بلا واسطہ براہ راست ہو۔ یہ منصوبہ بھارت کے ذریعہ تکمیل پا گیا۔

جس طرح برطانیہ ہندوستان یک بینی دو گوش نکلا اور بے آبرو ہو کر نکلا۔ عوام کا بھی خیال ہے کہ وہ اپنی جان بچا کر نکلا۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ تاج و تخت، بقول ایمپرر پولین اول برطانیہ کی سوداگری کا مال ہے جسے چاہے اور جس قیمت پر چاہے اور جب چاہے دینے کو تیار رہا اور ہے۔ بشرطیکہ گاہک اس کے کام کا آدمی ہو۔ اور اس لین دین میں اسے زیادہ سے زیادہ فائدہ نظر آئے۔

امیر افغانستان کو حضرت اعلیٰ جلالت مآب کا خطاب دینا چند الفاظ ہی تھے اور اندر دنوں کے بعد بچہ سقہ کو تخت کابل پر بٹھانا بھی کچھ مشکل نہ تھا اور پھر نادر خاں کو شاہی کا تاج

پہنانا بھی سہل تھا۔ اور اب پاکستان کے خلاف اس کی معاندانہ روش میں بھی اسی کا ہاتھ ہے۔

ایٹلی کی ہدایات کے تحت مونٹ بیٹن نے ریڈکلف ایوارڈ کے ذریعہ پہلے ریاست جموں و کشمیر کا واحد راستہ ضلع گورداسپور بھارت کے حوالہ کر دیا پھر فوج بھی داخل ہو گئی پاکستان کے سر پہ بال سے بندھی ہوئی تلوار افغانستان رکھی کہ یہ سمجھ لو کہ اگر ریاست میں مداخلت کی تو افغانستان پاکستان پر حملہ کر دے گا اس کا اپنا مطالبہ بھی ہے کہ تمام پختون اور پختونستان اس کا اپنا ہے۔ پاکستان غاصب ہے۔ یہ پختون کا ڈھونگ اتحاد اسلامی (PAN ISLANISM) پر گہری کاری ضرب ہے جس کا خواب سید جمال الدین افغانی دیکھ رہا تھا۔ ترکوں نے "اتحاد ترک" کو اور عربوں نے "اتحاد عرب" کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ افغانستان میں خالص اسلامی آبادی ہے مگر نسلی امتیاز کی وحشت نے وحدت اسلامی کا بھی پاس نہ کیا۔

کشمیر میں مسلمان صدہا سال سے محکوم ہیں۔ بالخصوص دو صدی کی ڈوگرہ حکومت اور اس کے مظالم نے احساس خودداری بھی مٹا دیا۔ اگر شیخ عبداللہ بھارت کی بساط سیاست پر مہرہ نہ بنتا تو اور بہت تھے۔ ان سے پاکستان کو کیا توقع ہو سکتی ہے کانگرس تو ابتدا سے ہی ان کے معاملات پر نگران رہی۔ اس کے اکابر ہمیشہ اکثر یہاں آیا کرتے تھے اور ان سے ربط و ضبط بھی قائم کر چکے تھے۔ لیگ نے نہ کبھی اس طرف توجہ دی اور نہ کبھی مظلوم کشمیریوں کی مدد کی۔ لیکن کشمیری مسلمان اتنا بے وقوف نہیں کہ یہ نہ سمجھے کہ پاکستان ہی اس کی جائے پناہ ہے اور جو کچھ ہمسایہ پنجاب میں ہوا وہی کچھ یہاں بھی ہوگا۔ اور اس "المیہ" کا پہلا پارٹ تو کشمیر میں کھیلا بھی جا چکا ہے۔ ابھی پردہ نہیں گرا۔

بہر حال یہ حقیقت جو بدیہی بھی ہے نا قابل انکار ہے کہ لارڈ مونٹ بیٹن کی گورنر جنرلی میں بھارت نے ریاست پر قبضہ جمایا اور ضلع گورداسپور بھی ہتھیا لیا۔ انگریزی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی "پالیسی" ذاتی نہیں ہوتی قومی ہوتی ہے اور قوم کی نمائندہ اس کی وزارت ہے۔ وزارت اس وقت ایٹلی اور اس کے کابینہ کی ہے۔ مونٹ بیٹن

لے جو کچھ کیا خود سرا نہیں کیا

آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گوید

اگر ہماری وزارت یہ توقع برطانیہ سے رکھے کہ وہ ریاست میں پاکستان کا حق اصول تقسیم کے تحت تسلیم کرے تو خود فریبی کی بھی یہ ایک تاریخی مثال ہوگی۔ پاکستان مشترکہ دولت برطانیہ میں شامل ہے اور اگر اس کے ارباب نظم ونسق سے بھی کوئی دل خوش کن وعدہ کیا گیا ہے تو کاش امیر افغانستان حبیب اللہ اور والئے حجاز شریف مکہ کی روح کسی کے خواب میں آئے اور یہ کہے کہ "من نہ کردم شما حذر بکنید" یا نظام حیدرآباد کی زندہ مثال سے درس عبرت لے۔

ارباب حل وعقد کو یہ بھی سیاسیات کا ابتدائی درس نہ بھولا ہوگا کہ جب حکومت اصل حالات سے عوام کو آگاہ نہیں کرتی تو عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ یا تو وہ رازداری کے لائق ہی نہیں یا ان پر حکومت کا اعتماد کسی وجہ سے نہیں۔ دونوں صورتوں میں عوام قیاسات سے کام لیتے ہیں اور افواہیں اگر ان کی تردید نہ کی جائے حقائق کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اسی ایک افواہ کا کرشمہ تھا کہ خان لیاقت علی خاں پہلی دفعہ لندن کانفرنس وزراء دولت مشترکہ میں شریک ہوتے تو لاہور کے موقر انگریزی روزنامہ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے یہ بے پر کی اڑائی کہ

"ہمارے وزارت مآب ایک معاہدہ کے ذریعہ ریاست جموں وکشمیر کے دعوٰی سے دستبردار ہوگئے"

اس خبر نے ایک ہیجان برپا کر دیا مرکز سے تردید نہ ہوئی۔ تو یقین پختہ ہو گیا۔ مگر وقت پر صوبائی گورنمنٹ نے اخبار مذکور کی اشاعت تین ماہ کے لئے بند کر دی۔

وہ زمانہ گیا جب معاہدہ کی تقدیس اور احترام قومی وقار کا نشان تھا۔ اب معاہدے کمزور کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لئے کئے جاتے ہیں اور ایسے معاہدے غیر مساوی ہوتے ہیں۔ مصر اور ایران میں حالیہ واقعات واضح مثالیں ہیں۔ ایسے معاہدات جب حالات سازگار ہوں اسی لائق ہیں کہ توڑ دئے جائیں۔

پاکستان کی گذشتہ چار سالہ تاریخ بلحاظ اقتصادیات اور سیاسیات و معاشرت کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اگر خدا نے توفیق دی تو یہ بھی لکھی جائے گی۔ ہم نے بالاختصار ان اسباب کی وضاحت کی ہے جو پاکستان کے ظہور کا موجب ہیں۔ لیکن ایک بات جو امید افزا بھی ہے اور حوصلہ شکن بھی ہے یہ ہے کہ سیاسیات میں جذبات کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اس بساط پر عقل اور صرف عقل کا کام ہے۔ ہندوؤں کی مسلسل شورش اور فساد جس سے انگریز نالاں تھا مسلمانوں کی غیر منقطع دوستی اور وفاداری جس کی تعریف میں انگریز رطب اللسان تھا سیاسی نقطہ نظر سے بے معنی تھی۔ برطانیہ نے سب کچھ دشمن کو دیا۔ اور دوست کو مکمل محرومی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسے بھی برطانیہ کی عالمگیر پالیسی کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ ہندو ہندوستان میں محدود ہے اور لسان اور الوان کا اختلاف کسی وقت بھی اسے ختم کر سکتا ہے۔ اگر آج انگریز سکھوں کو شہ دے تو بھارت کے حواس خمسہ درست ہو جائیں۔ لیکن مسلمان امت واحدہ کم از کم اعتقاداً ضرور ہیں اور اوقیانوس سے بحر کاہل تک پھیلے ہوتے ہیں اور برطانیہ یا امریکن بلاک کو دنیائے اسلام سے نپٹنا ہے۔ یہ بلاک جب چاہے بھارت کو چنے چبوا سکتا ہے مگر دنیائے اسلام سے نپٹنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔

پاکستان بنا تو اس لئے کہ بھارت خوفزدہ رہے۔ لیکن پاکستان اگر طاقتور ہو جائے تو اینگلو امریکن بلاک کو اپنی خیر نظر نہیں آتی۔ خیر اسی میں ہے کہ پاکستان کمزور اور اس بلاک کی امداد کا محتاج رہے مگر قائم رہے۔ روس اور اینگلو امریکن بلاک متوقع جنگ ہی بھارت اور پاکستان کی آئندہ قسمت کا فیصلہ کرے گی۔

وہ مورخ ہی کیا جو واقعات کی رفتار دیکھ رہا ہے اور نہیں جانتا کہ منزل کہاں اور کتنی دور ہے۔ لیکن ہم تو واقعات لکھ رہے ہیں پیشگوئی کے لئے ابھی ... ہے۔ لیکن اتنا تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ خواہ روس متوقع جنگ میں شکست کھا جائے یا فنا ہو جائے۔ کمیونزم مسلسل اقوام میں شائع ہو گا اور آخر یہی غالب آئے گا۔ کمیونزم کو جمہوریہ روس سے علیحدہ دیکھنا چاہیئے۔

ہم خلافت اسلامیہ پر جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکے تھے۔ کتابت ہو رہی تھی اور کتاب پریس جانے والی تھی کہ یہ واقعہ ریڈیو پاکستان نے بروز منگل بتاریخ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء نشر کیا کہ وہ۔

"قائد ملت ڈاکٹر خان لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان بمقام راولپنڈی جبکہ آپ ایک مجمع عام میں تقریر کے لئے اٹھے تھے کہ ایک سفاک کی گولی کا نشانہ بنے۔ قاتل ایک افغان باشندہ ہے اور کچھ عرصہ سے ایبٹ آباد صوبہ سرحد میں رہائش اختیار کر چکا تھا۔"

ریڈیو نے یہ بھی بتایا کہ

"افغان قونصل متعینہ پشاور اس واقعہ سے پانچ گھنٹہ پیشتر پشاور سے پر اسرار طریقہ سے گم ہو گیا۔ سرحدی پوسٹ سے مزید حالات معلوم ہوئے کہ یہاں وہ دو گھنٹے ٹھہرا۔ جب اسے اس واقعہ کی اطلاع ملی تو فوراً کابل کی طرف روانہ ہو گیا۔"

غرض قتل کا الزام افغانستان پر منجانب پاکستان عاید کیا گیا۔ کابل ریڈیو نے پرسوں اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا۔ لیکن اتنا تسلیم کیا کہ

"قاتل ضرور افغانستان کا باشندہ تھا مگر جب حکومت افغانستان کو اس کی سازش کا علم ہوا جو برطانیہ سے افغانستان کے خلاف کر رہا تھا۔ تو حکومت افغانستان نے اسے نکال دیا۔ برطانیہ نے اسے ایبٹ آباد میں بسایا اور پنشن بھی مقرر کر دی۔ یہ واقعہ آج سے دس سال پیشتر کا ہے۔"

افغان حکومت اس قتل سے اپنے آپ بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حال ہی میں وزیر اعظم افغانستان دہلی گیا اور وہاں حکومت بھارت سے اس کا کچھ خفیہ معاہدہ بھی ہوا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ معاہدہ باہمی امداد کے بارے میں ہے جو دونوں حکومتیں بحالت جنگ ایک دوسری کی کریں گی۔ اس کے بعد بھارت حدود پاکستان پر اپنی نوے فی صدی فوج جمع کر دی اور کشمیر میں انعقاد اسمبلی کی کاروائی

بھی شروع کردی جواب تکمیل پا چکی ہے۔

بھارت سیاسی چال چل گیا۔ دو مسلمان حکومتوں کو ایک دوسرے سے الجھا دیا۔ اور کشمیر کی طرف سے مطمئن ہوگیا۔ پنڈت نہرو ڈاکٹر گراہم کی موجودگی میں اعلان کرچکا ہے کہ "ہم کشمیر کی جنگ جیت چکے ہیں۔"

ماننا پڑتا ہے کہ حریف یہ جنگ جیت گیا۔ اور ہم ہار گئے۔ اور کہاں اور کس جگہ نہیں ہارے۔ ہر ایک محاذ پر ہمیں پسپا ہونا پڑا۔ لیکن جنگ جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آخر فتح ہماری ہی ہو گی۔ ان اوراق میں ہم ان اسباب پر بحث کر چکے ہیں جو واقعات حاضرہ کے پس منظر کارفرما ہیں۔

ہمارے وزیر اعظم کے قتل کی تمام تر ذمہ داری "یو این او" پر عاید ہوتی ہے بھارت اور افغانستان کی سازش اور اس کا نتیجہ خواہ بظاہر یہ بزدلانہ حملہ ہو جو ہمارے وزیر اعظم پر ہوا۔ مگر اس کی تہ میں وہی مسئلہ کشمیر ہے جو بھارت اور پاکستان کے درمیان مابہ النزاع ہے۔ بھارت کی غرض تو یہ ہے کہ پاکستان افغانستان سے الجھے یا افغانستان الجھائے رکھے دونوں لڑیں اور کمزور ہوں۔ اور پاکستان کی توجہ کشمیر سے ہٹ جائے۔ یہ ایک سیاسی غلطی ہوگی اگر ہم نے بھارت کے منصوبے کو کامیاب ہونے دیا۔ پاکستان کا دشمن بھارت ہے۔ افغانستان سے ہم بعد سمجھ لیں گے۔ افغان قوم کو حکومت افغانستان سے بالکل علیحدہ دیکھنا چاہیئے ان سے ہمارا برادرانہ تعلق مذہبًا ہے اور قائم ہو سکتا ہے۔ البتہ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ موجودہ افغان حکومت جو ایک خاندان کی حکومت ہے ختم ہو جائے اور افغانستان بھی آزادی فضا میں سانس لے۔ بھارت سے ہمارا تعلق کبھی دوستانہ نہیں ہو سکتا۔ ارشاد قرآن بھی ہے کہ

"تم ایسے احمق ہو کہ ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہو اور وہ تمہارے دوست نہیں۔"

بہرحال "یو این او" یا اسلام کا بدترین دشمن برطانیہ ہی اس قتل کا ذمہ دار ہے

ں نے مسئلہ کشمیر کو اتنے سالوں سے کھٹائی میں ڈال رکھا۔ کوریا اور ایران اور مصر کے
مسائل جو کل کی پیداوار ہیں "یو این او" میں مسلسل زیر بحث ہیں اور عملی کاروائی بھی ہو
رہی ہے۔ مگر مسئلہ کشمیر کی اتنی بھی اہمیت نہیں کہ اس کو زیر بحث لایا جائے۔ ڈاکٹر
گراہم اب ایک اور کمیشن کی سفارش فرماتے ہیں۔

تا تریاق از عراق آوردہ شود
مار گزیدہ مردہ بود!

ہم لکھ چکے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر خود برطانوی مدبروں نے بھارت کو دی
اور اس کا راستہ ضلع گورداسپور جہاں مسلم اکثریت تھی "ریڈ کلف ایوارڈ" میں دیا
گیا۔ اینگلو امریکن بلاک سے یہ توقع کہ وہ بھارت سے چھین کر پاکستان کو دے گا
ایک سیاسی غلطی تھی جو ہماری حکومت سے سرزد ہوئی۔ اور اس بلاک نے ہماری
کمزوری کا خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

ہم لکھ چکے ہیں کہ اگر ہم ریاست جموں و کشمیر اور مشرقی پنجاب کے اضلاع
کو اپنی طاقت کے بل بوتے پر نہیں لے سکتے تو ہمیں تیسری جنگ عظیم کا انتظار کرنا
چاہیئے اور بالکل غیر جانبدار رہنا چاہیئے۔

یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کرنی چاہیئے کہ بھارت اگر ہمارا "عدو مبین"
ہے تو برطانوی امریکن بلاک پوشیدہ دشمن ہے۔ اگر یہ بھارت کا پشت پناہ نہ
ہوتا اور اس کو تقویت بہم نہ پہنچاتا تو ہم بھارت کو باوجود بے سروسامانی کچل کر
رکھ دیتے۔

ہمارے مقتول اور مرحوم وزیر اعظم سے سیاسی غلطی یہ ہوئی کہ اس بلاک سے
مدد کی توقع رکھی اور لندن اور واشنگٹن کو قبلہ حاجات سمجھا۔ ہم نے تو پہلے ہی دن
کہہ دیا تھا کہ

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بانگلستان است

جو کچھ ہونا تھا ہوچکا اور متوقع تھا۔ لیکن اب مرحوم کے جانشین کو ان و
سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ قائد ملت کو قائد اعظم کے پہلو میں سپردخاک کیا
لیکن یہ قتل، بزدلانہ قتل ایسا نہیں کہ تاریخ فراموش کر دے۔ مسلمانوں کی حمیت
ملی اور قومی کو کھلا چیلنج ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ میری قوم اسے قبول کرتی ہے ؟ اور
دیتی ہے۔ مگر ہمیں جذبات کی رو میں نہیں بہنا چاہیئے۔ ناخن فکر و تدبیر سے اس
کو سلجھانا چاہیئے۔

خوش قسمتی سے گورنر جنرل ہمارے زندہ دلان پنجاب کے نمائندہ منتخب
ہیں۔ اور خان لیاقت علی خاں کے جانشین خواجہ ناظم الدین خود کشمیری ہیں۔ ا
کو اپنے وطن سے محبت ہے تو خواجہ کو اس سے زیادہ ہے۔ پاکستان پائندہ

دیگر مطبوعات ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ لاہور

انگریزی	آنے	روپے
ئیڈیالوجی (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم اے ایل ایل بی، پی ایچ ڈی)	۸	۸
مثل ہیومن رائیٹس (" " " " ")	۸	۰
لیسی آف مارکسزم (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے، پی ایچ ڈی)	۱۲	۰
اردو		
دو اعمال (مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی)	۱۲	۰
ایں حریت، مساوات، اخوت (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر)	۰	۱
م اور حقوق انسانی (" " " ")	۴	۱
م کا معاشی نظریہ (مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی)	۸	۱
ی فطرت (" " ")	۸	۱
م کی بنیادی حقیقتیں (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم و دیگر رفقائے ادارہ)	۸	۲
لام کا نظریہ تعلیم (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین	.	.

زیرِ طبع کتابیں

ل فقہ اسلامی اور حدود اللہ و تعزیرات
زام کا نظریہ اخلاق
تصوف
نام سنت
ملہ اجتہاد

۶۔ تہذیب و تمدن اسلامی
۷۔ قرآن و علم
۸۔ خلافت اسلامیہ حصہ اول، دوم، سوم۔
۹۔ اکونامکس آف اسلام
۱۰۔ اسلام و کمیونزم

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

(پاکستان)



مؤرخین اسلام

جلیل الدین انصاری۔
۸۷۰۸۹۱۰

ہماری کتاب خلافت اسلامیہ کا ماخذ مؤرخین اسلام کی مشہور کتابیں ہیں ان میں سے کچھ تو ہم نے اصل اور کچھ تراجم میں مطالعہ کیں۔ کچھ اقتباس ہیں جو اُن کتابوں میں جو ہمارے مطالعہ میں رہیں دیئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ یورپین مورخین کی بہت کتابیں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں ان میں سے "گبن" انگریز مؤرخ کا حوالہ ہم نے مناسب مقام پر دیا ہے۔ ہم نے اپنی کتاب "دمشق" اور "بغداد" میں مورخین اسلام اور اُن کی تواریخ کا حوالہ دیا ہے اس لئے ان اوراق میں بار بار حوالہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔

تواریخ کے اصناف بہت سے ہیں۔ ان میں سے "تواریخ عموی" میں مؤلف اپنے زمانہ کے حالات عمومیہ کے علاوہ وہ واقعات بھی قلم بند کرتا ہے جو اس کے اپنے زمانہ سے پیشتر مختلف اقوام اور ممالک میں رونما ہو چکے ہیں۔ اس قسم کی تواریخ "طبری" اور "ابن اثیر کی مشہور ہیں۔ کہ حضرت آدم سے لے کر اپنے زمانہ کے حالات لکھے۔ دوسری قسم "تواریخ خصوصی" کی ہے۔ اس میں مؤرخ کسی ایک زمانہ یا قوم یا ملک کے حالات بیان کرتا ہے اس قسم کی تاریخ میں "واقدی" کی فتوح الشام وغیرہ داخل ہیں۔ اور ہماری کتاب بغداد اور دمشق بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی قسمیں ہیں جن میں سے "طبقات" ہیں۔ اس میں مؤرخ کسی ایک طبقہ کے